
میراث المزمل ﷺ
سیرۃ المزمل ﷺ
جلد بیس
www.KitaboSunnat.com
افتخار احمد افتخار



افتخار احمد افتخار

رہائش؛ ڈنگہ ضلع گجرات تحصیل کھاریاں

فون ؛ 03006281898

میل ایڈریس ؛ ift1167@gmail.com

نام کتاب؛ سیرۃ المزمل ﷺ

جلد نمبر؛ جلد بیس (میراث المزمل ﷺ)

سنہ تحریر؛ اپریل 2016ء

اہتمام؛ کتاب وسنت ڈاٹ کام

مطالعہ کے لیے؛ https://kitabosunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ چند

امت کا نوحہ طویل ہے ۔ہزار سال تک دنیا پہ حکمرانی کرنے والی امت کا آج کوئی پرسان حال نہیں ۔ کبھی غرناطہ ،اشبیلیہ اور قرطبہ کی سڑکوں پہ صاحب علم لوگوں کا ہجوم رہا کرتا تھا۔مسلم ہسپانیہ کی یونیورسٹیوں میں یورپ بھر سے علم کے پیاسے اپنی پیاس بجھانے آیا کرتے تھے ۔علمی ، اخلاقی ، عسکری ، سماجی میدانوں میں کوئی مسلمانوں کا مقابل نہ تھا ۔ دنیا کے چوٹی کے سائنس دان مسلمانوں کے پاس تھے ، علم طب میں مسلمان ساری دنیا سے آگے تھے ۔ زبانیات، ادبیات ، طبعیات ، کیمیا، علم حساب ، علم حرب و ضرب ، علم معاشیات، علم

فلکیات،علم مکانیات، علم معدنیات، علم نباتیات، علم حیوانیات، علم رضیات، علم زراعت غرض کوئی میدان ایسا نہ تھا جہاں مسلمانوں کی اجارہ داری مسلّم نہ ہو۔ علم کا ہر میدان مسلمانوں کا میدان تھا ، فلسفہ ، تاریخ ، ادب، موسیقی ، زبان ، تراجم،جغرافیہ اور جہاز رانی تک تمام شعبہ ھائے جات مسلمانوں کے قبضے میں تھے ،پانچ صدیوں تک مسلمانوں کے علاوہ خطہ ارض پہ اور کوئی قوم نہ تھی جس کو علم کا دعوٰی ھو ۔ جس کو آسودگی کا دعوٰی ھو ، جس کو طاقت کا دعوٰی ھو جس کو حق کا دعوٰی ھو ، جس کو برتری کا دعوٰی ھو، جس کو جس کوفخر کا دعوٰی ھو، جس کو سیادت کا دعوٰی ھو ، جس کو قیادت کا دعویٰ ھو ، جس کوامارت کا دعوٰی ھو ،جس کو راھنمائی کا دعوٰی ھو ، جس کو کتاب کا دعوٰی ھو ۔ اور کتاب ھی تو تھی جس کی بنا پہ مسلمان دنیا پہ حکمران تھے اور اھل مغرب اُن کے باج گزار ۔ کتاب ھی تھی جس نے دنیا کو وہ قیادت اور راھنمائی عطا کی جس کی مثال انسانی تاریخ سے دینا مشکل ھے ۔ کتاب ھی تو تھی جس کی پیروی میں بادشاہ ایك ادنٰی ملزم کی طرح قاضی کی عدالت میں کھڑا ھوا کرتا تھا ۔پھر مسلمان نے کتاب کو چھوڑ دیا ۔ کتاب موجود رھی ھدایت مفقود ھو گئی ۔ کتاب موجود تھی پیروی کرنے والے گمراہ ھو گئے ۔ کتاب موجود تھی اس میں اختلاف کیا گیا۔ کتاب موجود تھی مگر غیروں کے دستور کو اپنایا گیا ، کتاب موجود تھی مگر ذاتی مفاد کو اپنایا گیا ، کتاب موجود تھی مگر تفرقے کو اپنایا گیا ،کتاب موجود تھی مگر اُس کا انکار کر د یا گیا ۔ نتیجہ انتھائی ھولناك تھا ۔ سیادت ، قیادت ، امارت ، علم ، اخلاق ، فخر ،ھدایت ، راھنمائی ، دانش ، اتحاد ، تیقن سب

کچھ ھی تو امت سے چھین لیا گیا اور امت زوال کے سفر پہ رواں ھو گئی ۔تب پستیاں اس کا مقدر ٹھریں اور رزالت اس کا نصیب ۔ کوئی جانے تو کتاب تو آج بھی ھمارے پاس ھے پھر اس ذلت کا کیا جواز۔ اس کا صرف ایک ھی جواب ھے کہ ھم بہ حیثیت امت آج بھی کتاب کی تعلیمات سے انکاری ھیں ھم آج بھی اُس کی پیروی کے لیے تیار نہیں ۔اور جب تک یہ صورت حال قائم رھتی ھے بھتری کی کوئی صورت ، روشنی کی کوئی کرن ، امید کا کوئی سندیسہ ، برتری کی کوئی علامت حاصل ھونے کی قطعی کوئی امید نہیں۔ اللہ ھمیں ھدایت سے نوازے اور ھمارے دلوں میں رسول اللہ ﷺ سے محبت کے چراغ روشن کر دے ۔ اللہ سیرت المزمل ﷺ کی اس کوشش کو قبولیت عطا فرمائے اور لوگوں کے دل میں علم کی اھمیت کو زندہ کر دے کہ علم کے بغیر صرف اندھیرا ھے، کہ علم ھی تو انبیاء کی میراث ھے۔ جانے کب تک اُس عظیم میراث کے وارث غفلت کی نیند سوئے رھیں گے ۔ جس میں دنیا کے دکھوں کا مداوا ھے ، دنیا کی گمراھی کے لیے ھدایت ھے ، دنیا کے اندھیروں کے لیے روشنی ھے ، دنیا کے مسائل کا حل ھے ، دنیا کی آسودگی کے نشان ھیں ۔

حقیر

افتخار احمد افتخار

حسن ترتیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہم اپنے طالب علم سے کیا گلہ کریں جب اُسے پڑھانے والے استاد کو بھی معلوم نہیں کہ حرکت کے قوانین نیوٹن نے نہیں بلکہ ابوبکر رازی نے دریافت کیے تھے اور نظریہ اضافت پر بہت سے مضامین آئن سٹائن سے صدیوں پہلے ابو یوسف یعقوب کندی کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ آج کے مسلم نوجوان کو اپنی اس میراث کا سراغ لگانا چاہیے جو اس کے آباء کی ہزار سالہ علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی تمام تر سائنسی ترقی مسلمانوں ہی کی مرہون منت ہے!!

نوائے عصر (مقدمہ)

نوائے عصر خامشی کی اِک صدا ہے جن سماعتوں نے اِس کو سن کو لیا وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوئے ۔ جنھوں نے اس پہ کان نہ دھرے رسوائی کے مہیب سائے اُن کے تعاقب میں رہتے ہیں۔نوائے عصر قدرت کا وہ مخفی پیغام ہے عقل ودانش جس کے اسرار افشا کرتی ہے۔ یہ وہ صدائے لامکاں ہے جس میں تخلیق کائنات کے سربستہ راز ہیں، عقل احساس وشرف کا وہ سرمایہ ہے جو اِس صدائے لامکاں کی پہنائیوں سے رازِ زیست کشید کرتی ہے۔صدائے عصر مختلف خطوں اور مختلف اقوام کے حالات کے تحت مختلف ہوسکتی ہے۔اس لیے کہ کسی ایک عصر میں کوئی ایک ہی قوم یا امت منصبِ سیادت پہ فائز ہوتی ہے۔اور کوئی دوسری قوم اپنی سحر گم کشتہ کی تلاش میں سرگراں ہوتی ہے ،راہ جستجو پہ متعین ہوتی ہے۔تختۂ ارض پہ لوگوں کی کثیر آبادیاں ہیں جن کو مہذب ہونے کا دعویٰ ہے۔اگرچہ کچھ دوسرے لوگوں کو اُن کے مبادی تہذیب اور مظاہر تمدن سے اختلاف ہے۔اختلاف کی یہ خلیج نہایت گہری ہے جس کی بنا طبقاتی تقسیم اور معاشی حوالوں پہ رکھی ہے۔ چنانچہ مغرب نے

جسے موجودہ عصر کی سیادت کا دعویٰ ہے تیسری دنیا کا وہ تصور پیش کیا جو اُس کے خیال میں معاشی، سماجی، تمدنی اور عصری حوالوں سے مغرب سے کم تر ہے۔اور اسی تصور نے لوگوں کو مغرب سے دلبرداشتہ کیا اور اُن کی سیادت کو دل سے قبول نہ کیا گیا۔اگرچہ عملاً مغرب کی بالا دستی زیست کے بہت سے حوالوں سے فی الوقت ناپختہ ہے۔لوگوں میں دوسرا بڑا اختلاف طورِ زیست کو متعین کرنے میں ظاہر ہوا۔یہ اختلاف قدیمی ہے تاہم جب مغرب نے خدا سے بیزاری کا اظہار کیا تو پھر سے لوگوں کے دو گروہ وجود میں آ گئے۔

اولاً وہ جو کسی خالق کی موجودگی کے بغیر اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا محسوس کرتے تھے اور خالق کے وجود کے قائل تھے۔ثانیاً انسانوں کا وہ گروہ ہے جو مادیت کو دنیا کی سب سے بڑی حقیقت قرار دیتا ہے اور زندگی کی تعیش کا حصول ہی اس کے نزدیک مقصد زیست ٹھہرا۔اس نظریاتی ٹکراؤ نے مختلف تہذیبی پس منظر وضع کیئے،سماجی اخلاقی اور تمدنی پہلوؤں سے اختلاف کی خلیج وسیع تر ہوتی رہی ۔خطہ ارض پہ بسنے والے لوگوں میں تیسرا بڑا اختلاف تکوین عالم کی توجیہہ کرنے میں پیش آیا کہ ایک انسانی گروہ کا خیال ہے کہ یہ کارخانہ حیات یونہی محض ایک اتفاق سے وجود میں آ گیا تھا اور اس کے بعد سے زمانہ اپنے محور کے گرد گھوم رہا ہے۔وہ حیات کی ابتداء اور انتہا کے بارے میں مبہم سے تصورات پیش کرتے ہیں عقل جنھیں رد کرتی ہے۔اُن کے خیال میں نہ کوئی خالق ہے اور نہ کسی حیات کو مخلوق قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی خاص امر کو مقصدِ زیست کے طور پہ اپنایا جا سکتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اجزائے عناصر فضائے بسیط میں ازل سے بے مقصد بھٹکتے پھرتے ہیں،حسن اتفاق سے اگر انھیں متناسب ترتیب کا موقع مل گیا تو اُن کے ملاپ سے کوئی نیا عنصر وجود میں آ گیا، یہ نئے عناصر یونہی قرنوں تک بھٹکتے رہے اس کے بعد انھیں کبھی اتفاقیہ موزوں ماحول اور متناسب قربت راس آئی تو حیات پیدا ہو گئی۔حیات کو جب تک سازگار ماحول دستیاب رہا حیات پروان چڑھتی رہی ۔انھیں عناصر کی شکست وریخت کو انھوں نے موت کا نام دیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مقصد اور ارادے کا تصور انسان کی اپنی خوش فہمی ہے۔حقیقت میں جب کوئی خالق ہی نہیں تو مقصد اور ارادے کو تلاش

کرنا بے محل ہے۔ چنانچہ فلاسفہ کے اس گروہ نے جو تصورانسان کو منتقل کیا اُس میں کسی مابعدالطبیعاتی نظام کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی مگر انسانوں ہی کے ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جس نے ایک متعین مقصد کے تحت اس کائنات کو پیدا کو کیا ہے اور انسان اس کائنات کی سب سے اعلیٰ مخلوق ہے جو براہ راست خالق کی راہنمائی کی محتاج ہے۔ وہ کائنات کو خالق کے دستِ قدرت کا کرشمہ قرار دیتے ہیں اور نظم کائنات کو اس قدرت قاہرہ کے ماتحت تصور کرتے ہیں جو اصلاً اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور اس کا مالک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سے انسان نے شعور حاصل کیا ہے تب سے ہی اس گروہ انسانی کو اکثریت حاصل رہی ہے جو سر کائنات خالق کے وجود کا قائل ہے۔ دوسرا گروہ بھی اگر چہ ہمیشہ سے موجود رہا ہے مگر وہ ہمیشہ اقلیت میں ہی رہا ہے۔

تکوین عالم پہ ہر دور میں قیاس آرائیاں جاری رہی ہیں اور انسان نے اپنی عقلی استعداد کے مطابق اس کی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر دانش ور نے کچھ نہ کچھ سوچا ہے۔ اس ضمن میں کئی نظریات قائم کئے گئے جو شعوری ارتقاء کے ساتھ رد ہوتے رہے یہاں ہم صرف اُن نظریات کو جگہ دیں گے جو آج تک نہ صرف یہ کہ انسانوں کے کسی گروہ میں مروّج ہیں بلکہ قائم ودائم ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہم اُن نظریات کو قلم انداز کریں گے جن میں کائنات کی توجیہ میں افسانہ گوئی کا عکس پایا جاتا ہے اور جنھیں سنجیدہ غور و فکر میں کبھی کوئی مقام حاصل نہ ہو سکا۔

چنانچہ لوگوں کے ایک گرہ نے کہا کہ یہ کائنات کچھ دیوتاؤں کی محض دل بہلائی کا سامان ہے اور کچھ نہیں۔

لاکھوں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کائنات خیر اور شر کی دو قوتوں کی کرشمہ سازی ہے اور یہ تماشا گاہ عالم اُن کی ازلی کشمکش کی جولاں گاہ ہے اور کچھ نہیں۔

ہمارے ہمسائے ہندوستان کے باسیوں کا خیال ہے کہ یہ کائنات تین بڑی طاقتوں میں منقسم ہے یا یوں کہہ لیں تین دیوتا اس کائنات پہ متصرف ہیں۔ اُن میں سے ایک روحوں کو پیدا کرتا ہے، دوسرا اِن ارواح کو جسموں میں داخل کر کے انھیں قائم کرتا ہے یعنی حیات کو جاری کرتا ہے، ارواح کو

آواگون کے چکر میں ڈالتا ہے اور انسان کے گذشتہ جنم کے اعمال کے بدل میں اسے نئی صورت عطا کرتا ہے۔ بداعمال لوگوں کو اگلے جنم میں گدھا یا کتا بھی بنایا جاسکتا ہے اور یوں عمل تناسخ جاری رہتا ہے۔ تیسرا دیوتا فنا کا دیوتا ہے جو ارواح کو جسم کے چنگل سے آزاد کراتا ہے اور انھیں جہنم (نرک) یا جنت یعنی (سورگ) میں داخل کرتا ہے۔

کروڑوں لوگوں نے تکوین عالم کی یہ توجیہ کی ہے کہ خدا ایک بھی ہے اور تین بھی یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس۔ وہ کہتے ہیں خدا نے آدمؑ کو پیدا کو کیا اور پھر اُن کی بیوی حوا کو پیدا کیا اور انھیں جنت میں داخل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت کی کہ وہ آسودگی اور آسائش کے ساتھ زیست کریں اور جنت کے میووں میں سے جو چاہے کھائیں مگر صرف شجر ممنوعہ سے دور رہیں۔ شیطان نے آدم کی بیوی کو بہکایا کہ تمھارے خاوند کو تو ابدی جوانی وحیات سے نوازا گیا ہے مگر تمھیں اس سے محروم رکھا گیا ہے اگر تم اُس درخت کا پھل کھالو تو تمھیں بھی ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ حوا کے اصرار پہ آدم اور حوا نے اُس شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا جس سے اللہ نے انھیں منع کر رکھا تھا۔ انھوں نے حکم الٰہی کی نافرمانی کی جس کی بنا پہ انھیں جنت سے نکال دیا گیا۔ جب وہ زمین پہ پہنچے اور اُن کی اولاد ہوئی تو وہ اولاد گناہ کا خمیر اپنی ذات میں لے کر پیدا ہوئی جس کی وجہ سے تمام اولاد آدم گنہگار تصور ہوگی کہ آدم کی نسل قیامت تک اس موروثی گناہ سے نجات نہیں پاسکتی۔

اب خدا تو اپنی صفت انصاف کی وجہ سے مجبور تھا کہ وہ انسان کو اُس کے گناہ کی سزا دے لیکن اُس کی رحمت اُس کے قہر پہ غالب آگئی اور اُس نے انسان کی نجات کا ایک راستہ کھوج نکالا جس میں اُس کا انصاف بھی متاثر نہ ہو اور ابن آدم سزا سے بھی بچ نکلے۔ چنانچہ اُس نے روح القدس کے ذریعہ سے کنواری مریم کو حاملہ کیا اور خدا کا بیٹا (حضرت عیسیٰؑ) آدم کی اولاد کی شکل میں پیدا ہوا۔ بڑا ہو کر خدا کا یہ بیٹا انسانی گناہوں کے کفارے میں سولی چڑھ گیا۔ یوں خدا کا وہ انصاف جو ٹل نہیں سکتا تھا اور رحم جو نسل انسانی کی بقاء کے لیے مضطرب تھا نے یکجائی کی اور اس طرح تکوین عالم کے مقصد کا متعین ہو گیا جس کا مقصد آدم کی لغزش کا کفارہ اور خدا کی رحمت کا ظہور تھا۔ قبل ازیں یونانی فلاسفہ نے بھی

کائنات کی توجیہ کرنے کی کئی کوششیں کیں اور مختلف فلاسفہ نے کئی آراء کو لوگوں کے سامنے رکھا۔تب یونان میں فلسفہ کا راج تھا اور علم فلسفہ چیزوں کی ماہیت پہ غور کی دعوت دیتا ہے۔وہ اشیاء کے ظاہر سے گزر کر اس کے باطن تک پہنچنا چاہتا ہے۔ظاہر ہے کہ کائنات کی یہ عظیم ہماہمی اُس دور کے فلاسفہ کا سب سے اہم موضوع رہی ہوگی۔یونانی فلاسفہ نے کائنات اور زندگی کی جو تشریح کی اگرچہ وہ ایک عرصہ تک انسانی ذہنوں پہ حاوی رہی۔مگر حقیقت یہی ہے کہ اہل فلسفہ کی پانچ ہزار سالہ جہد وسعی کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور کوئی فلسفی کائنات اور حیات کے راز کی تہہ تک نہ پہنچ سکا جس کی بڑی وجہ یہ رہی کہ خود اہل فلسفہ اپنے افکار میں ارتقاء کا شکار رہے اور متفرق نظریات پیش کرتے رہے جس سے لوگوں کا اعتماد متزلزل ہوتا رہا۔

یونان کا معاشرہ شدید طور پہ ایک مذہبی معاشرہ تھا مگر اُن کے فلاسفر اُس مذہبی دیو مالا پہ ایمان لانے کو قطعی تیار نہ تھے جس کی بنیاد عقل کی بجائے توہم اور تخیلات پہ رکھی تھی۔اس لیے یونان کے فلاسفہ نے مذہب کو ایک طرف رکھ کر کائنات کی عقلی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے مذہب کو توہم قرار دیا اور مذہب بیزاری کے اُن افکار کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا جن کا عکس آج کے مغربی معاشرے میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔چنانچہ یونانی فلاسفہ نے تکوین عالم کی جو توجیہات کیں کسی حد تک اُن کے معاشروں نے اُنھیں قبول کیا جس کی بناپہ ارتقاء کے اُس سفر کا آغاز ہوا جس نے سب سے پہلے اُن کے تصورِ معبود کو تبدیل کیا۔ازاں بعد اُن کے عقائد اور اطوارِ زیست میں بھی نمایاں تبدیلی دیکھنے میں آئی اور وہ مذہبی دیو مالا کے اثرات سے بتدریج دور ہٹتے گئے۔پھر جب مادیت پسندی اور سائنس نے خدا کے عدم وجود پہ زور دینا شروع کیا تو وہ مذہب کے اثرات سے مکمل طور پہ آزاد ہوگئے۔اس لیے کہ اُن کے فلاسفہ نے حیات اور کائنات کی جو تشریحات اُن کے سامنے پیش کی تھیں اُن میں کہیں بھی کسی خالق کے وجود کی کوئی گنجائش نہ نکلتی تھی اور جب کوئی خالق ہی نہ ہو تو مخلوق کو کیا پڑی ہے کہ وہ کسی ان دیکھے معبود کی پرستش کرتی رہے۔چنانچہ فیساغورث، ہیر کلیتس، پارمی نائیدس، زینوفنیس اور افلاطون کے افکار میں جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ کائنات محض ایک

مادی وجود ہے جس کے لیے کسی خالق کے وجود کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔تاہم ذہن میں رہے کہ اِن فلاسفہ نے کبھی خدا کا مطلق انکار نہیں کیا بلکہ بعض نے تو اثبات کیا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہب اُن کا موضوع ہی نہ تھا۔اُن کا موضوع فلسفہ تھا جس کی بنا پہ انھوں نے کائنات کی جو تشریح کی وہ سراسر مادی تھی۔اس لیے یونانی فلسفہ کو مادیت کی بنیادیں فراہم کرنے کا مکروہ اعزاز بھی حاصل ہے۔

اگر چہ خود یونانی فلاسفہ روحانیت کے انکاری نہ تھے مگر سولہویں اور سترہویں صدی میں یونانی فلاسفہ کے افکار کی جو تشریحات دورِ جدید کے مغربی فلاسفہ نے کیں اُس میں انھوں نے روحانیت سے مطلق انکار کیا اور کائنات کی مادی تشریح کو از سرنو فروغ دیا۔اِن صدیوں میں اہل مغرب کلیسا کے جبر سے نجات حاصل کرنے کے عمل سے گزر رہے تھے اور اُن کے فلاسفہ اور سائنس دان ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے کہ کسی طرح لوگوں کو مذہب سے بیزار کر دیا جائے۔کیونکہ اُن کے خیال میں مذہب سے وابستہ رہ کر کوئی انسان ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتا۔چنانچہ اہل مغرب میں فلاسفہ اور سائنس دانوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو نہ صرف مذہب بیزار تھا بلکہ متحرک بھی تھا۔چنانچہ انھوں نے مذہب کو لوگوں کا ذاتی معاملہ بتایا اور اُن کی راہنمائی سائنس اور مادیت کی اُن منزلوں کی طرف کی جن میں اُن کو روشنی دکھائی دے رہی تھی۔اُن کے پاس مسلمانوں کا چھوڑا ہوا وسیع علمی سرمایہ موجود تھا کہ مسلمان اپنے ہزار سالہ عروج کے بعد زوال کی منزلوں میں تھے اور اس قابل بھی نہ تھے کہ اپنے علمی اثاثوں کی حفاظت ہی کر سکتے۔

چنانچہ مغرب نے کلیسا سے نجات حاصل کی اور مذہب بیزاری کی راہ پہ چل دیا۔اُن کی راہنمائی کے لیے بہت سے صاحب دانش موجود تھے جنھوں نے اپنی قوم کی سمت کا تعین کیا۔اِن دو تین صدیوں میں انھوں نے بہت سے اہل علم کو جنم دیا جن میں فرانسس بیکن، تھامس ہابس، ڈیکارٹ، جان برکلے ، سپینوزا، جان لاک، ڈیوڈ ہیوم، جیکو روس، عمانویل کانٹ، شوپنہائر، فریڈرک نٹشے، آگسٹ کومٹ، ہربرٹ سپنسر اور برٹرنڈ رسل جیسے نامور فلاسفہ شامل تھے۔ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کا سورج

طلوع ہوا اور ایک صدی سے بھی کم عرصے میں پوری دنیا پہ چھا گیا کہ اسلام کا پیغام اپنے اندر حقانیت اور علم کے بے بہا سمندر لیے ہوئے تھا۔ مسلمانوں نے اپنی کتاب تمام لوگوں تک پہنچائی جس کو دنیا کی غالب اکثریت نے قبول کرلیا۔ مسلمانوں کی عسکری طاقت اس قدر مہیب تھی کہ کئی صدیوں تک کوئی اور قوم اُن کے مقابلے میں نہ آسکی اور اسلام ساتویں صدی عیسوی سے تیرویں صدی عیسوی تک دنیا کی غالب تہذیب کے طور پہ جانا گیا۔ تب اہل مغرب مسلمانوں کے باج گزار تھے۔ وہ قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ کی علمی روایت کے غلبے میں تھے۔ اس دور میں مسلمانوں نے علم کی بہت خدمت کی اور جہانِ دگر کی نشان دہی کی اُس دور کی مثال انسانی تاریخ سے پیش کرنا مشکل ہے۔ علماء فضلا، اہل فلسفہ اور سائنس دانوں کا ایک ہجوم تھا جو مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے علم کے نئے نئے در وا کر رہا تھا۔ چنانچہ ابوموسیٰ جابر بن حیان، ابوعبداللہ محمد ابن موسیٰ الخوازمی، ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی ،ابوالحسن علی بن حسین المسعودی، ابولوفا محمد بن یحییٰ البزجانی، ابوریحان محمد بن احمد البیرونی، ابوفتح عمر ابن ابراہیم المعروف عمر خیام، ابومروان بن زہر، ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد، ابومحمد عبداللہ ابن احمد البیطار، محمد ابن مسعود قطب الدین شیرازی، ابولندا اسماعیل بن علی عماد الدین الایوبی، عبدالرحمان ابن خلدون اور عمر بن عثمان جاحظ جیسے صاحب علم و دانش لوگ دنیا کی راہنمائی کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔

اِن لوگوں نے قرآن حکیم کی روشنی میں جہاں لوگوں کے بہت سے دوسرے سوالوں کے جواب دیئے وہیں انھوں نے قرآن حکیم سے کائنات اور حیات کی جو تشریح پیش کی وہ نہ صرف سادہ اور سہل تھی بلکہ عقلی طور بھی متاثر کن تھی اس لیے دنیا کی غالب اکثریت نے اسے اختیار کرنے میں کوئی تعامل نہیں کیا۔ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات پیدا کی ہے اور انسان کو اس کائنات میں اپنا نائب بنا کے اتارا ہے تا کہ وہ اس کی اطاعت کرے اس کے بتائے ہوئے احکامات کی پیروی کرے ۔جس کے نتیجے میں اسے موت کے بعد ابدی جنت کا وارث بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ اسلام آنے کے بعد خطہ ارض پہ مقیم انسانوں کے مابین جو سب سے بڑا اختلاف سامنے آیا وہ علم کی تشریح کے ضمن میں

تھا۔ایک گروہ کے مطابق عقل تمام انسانی معاملات کو محیط ہے یہ اہل مغرب اور مادیت پسند معاشروں کا تخیل ہے۔دوسری طرف مسلمان ہیں جو کہتے ہیں اگر عقل تمام انسانی معاملات کو محیط ہے تب علم وحی کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے اس لیے وہ عقل کی ایک انتہا کے قائل ہیں اور علم وحی کو دوسرے تمام علوم پہ ترجیح دیتے ہیں۔اس امر میں تو کوئی شک نہیں کہ علم جاننے کو کہتے ہیں معلوم سے نامعلوم عناصر تک کے سفر ہی کو علم کا نام دیا جاتا ہے۔مگر یہ سوال ہنوز حل طلب ہے کہ اس جاننے کی آخری حد کیا ہے۔اولین انسانی معاشروں نے جب آگ جلانا سیکھ لیا اور نوک دار لکڑی سے شکار کرنا سیکھ لیا تو انھوں نے جانا کہ وہ جاننے کی آخری حد تک آپہنچے ہیں انھیں اپنے تمام مسائل کا حل شکار ہی میں نظر آیا کہ اُن کا بنیادہ مسئلہ خوارک تھی۔پھر جاننے کی اس حد میں توسیع ہوئی اور انھوں نے مل جل کے رہنا سیکھا جس سے انسانی تمدن کی اولین بنیادیں وضع ہوئیں۔ذاتی ملکیت کا تصور تو بہت بعد کی بات ہے۔

اول اول تو انسان کو صرف اپنے بقا کی فکر تھی۔مگر جب ذاتی ملکیت کا سماج استوار ہوا تو انسانی جذبات میں مفاد پرستی کے داعیہ نے جڑ پکڑ لی۔اہل فلسفہ نے اس ضمن میں جو مطالعہ پیش کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسانی جذبات میں مفاد پرستی کا جذبہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔یہ انسانی اعمال کا سب سے بڑا محرک ہے۔کارخانہ قدرت کی کارفرمائی پہ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے ہر ذی حیات میں اس کے بقا کے لیے جہد للبقاء کی صلاحیت رکھی ہے۔مضرت سے بچنے اور منفعت کو حاصل کرنے کی یہ صلاحیت خوف وامید کے جذبات پہ استوار کی گئی ہے۔یعنی ہر پیش آمدہ مضرت کا خوف اور ہر پیش نظر منفعت کے حصول کی امید،چنانچہ یہ دو جذبات ہی ہر اختیاری حرکت،ہر انسانی فعل اور ہر عمل کے محرک ہوا کرتے ہیں۔کہا گیا کہ انسان کی تمام جدوجہد کے سوتے خوف وامید کے چشموں ہی سے پھوٹتے ہیں اور یہی دونوں جذبات حیات کے محافظ بھی ہیں اور راہبر بھی۔خوف وامید کی یہ دو شاخہ قوتِ متحرکہ ہی تمام کشمکش حیات کی ذمہ دار ہے اور مفاد پرستی کے تمام مظاہر اسی سرزمین سے جنم لیتے ہیں۔چنانچہ علم وعقل بذاتِ خود قوت متحرکہ نہیں ہے بلکہ اصلاً قوت متحرکہ کا منبع

خوف وامید کے وہ جذبات ہی ہیں۔ عقل کا کام علم کی روشنی مہیا کرنا ہے اور اس روشنی میں انسان اپنے خوف ورجاء کے مراجع متعین کرتا اور نبرد آزمائی کے مناسب سامان مشخص کرتا ہے۔ نبرد آزمائی کا عمل خوف ورجا کی قوتیں بیدار ہو کر خود سرانجام دیتی ہیں۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ عاملہ قوت خوف و امید ہی کا جذبہ ہے نہ کہ علم وعقل اس کے محرک ہیں۔ خوف وامید کے مراکز متعین کرنے میں حضرت انسان نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اُس نے جنگلی درندوں کی مضرت سے بچنے کے لیے اُن کی پرستش کی ہے۔ کبھی وہ ناگ پوجا میں مصروف دیکھا گیا تو کبھی وہ ہاتھیوں کے آگے سر جھکائے دیکھا گیا۔ کبھی اُس نے سورج کو سجدہ کیا تو کبھی چاند کی پوجا کی، کبھی اُس نے گرجتے بادلوں کو اپنے بیم و رجاء کا مرجع جانا تو کبھی چمکتی بجلیوں سے امید وابستہ کی۔ چنانچہ خوف وامید کے فطری جذبات، مضرت سے بچنے کی جبلی تمنا اور منفعت کے حصول کی خوشنما آرزو حضرت انسان کو مختلف دہلیزوں پہ سر جھکانے پہ مجبور کرتی رہی۔

پھر زمانہ بدل گیا لوگوں کے معبود بدل گئے، طورِ زیست بدل گئے، تہذیب وتمدن بام عروج تک جا پہنچے زندگی کی تیز رفتاری اور مادیت کی دوڑ نے حضرت انسان کے ذہن سے خوف وامید کے وہ سارے بت توڑ ڈالے جو اُس کے خدشات کو مہمیز عطا کرتے تھے۔ اُس نے خدا کے قدیمی تصور کو بھی پس پشت ڈال دیا کہ اشتراکی دنیا کو تو سرے سے کسی خدا کی ضرورت ہی نہ تھی اور سرمایہ داری نظام حیات میں خدا کے لیے وقت ہی نہیں بچتا اس کے باوجود انسان خوف ورجا کے اُس بنیادی داعیہ کو شکست نہیں دے سکا ورنہ روس امریکہ اور چین کبھی کے جدید اسلحہ کی اس دوڑ کو خیر باد کہہ چکے ہوتے جس میں وہ آج بھی مبتلا ہیں۔

تمدن کے اولین ادوار کی نوائے عصر اور تھی اور آج ہزاروں سال گذرنے پر بھی ہر قوم ہر امت کے لیے ایک نوائے عصر ہے جسے سننا اور سمجھنا ہی دانش کی علامت ہے۔ آج کے انسانی سماجوں میں انسانیت کا استحصال ہو رہا ہے، عدم مساوات کا چلن ہے۔ کمزور اقوام کو اُن کے بنیادی حقوق تک سے محروم کر دیا گیا ہے۔ انگلستان، ناورے اور امریکہ میں کسی عام کتے کی خوارک وعلاج پہ اس قدر

رقم خرچ کر دی جاتی ہے کہ تیسری دنیا کے کسی ملک کی کئی بستیاں اس رقم سے آسودہ ہو سکتی ہیں۔ نائجیر یا افغانستان اور مالی کے لوگ کسی کھانے والی چیز کے ایک ایک نوالے کو ترستے رہتے ہیں جب صرف امریکہ ہزاروں ٹن ضرورت سے زائد گندم سمندر میں پھینک دیتا ہے کہ اُس کو اِس کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ آج کی نوائے عصر ہمہ جہت ہے جس کے لیے ہمیں آج کے انسانی سماجوں کے پس منظر میں جھانکنا ہوگا۔ آج انسانیت اُس سامراج کے جبڑوں میں محصور ہے جس کو بہت سے مہذب نام عطا کر دیئے گئے ہیں۔ ہم اُن کو IMF، word bank کے ناموں سے جانتے ہیں اور دوسرے بے شمار مالیاتی ادارے ہیں جن کی بنیادوں میں انسانی خون اور آنسو ہیں جن کے نظریہ میں مادی مفاد اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

مادیت کی اس انتہا کی ابتدا تو اسی روز ہو گئی تھی جب انسان نے ذاتی ملکیت کی بنا پہ اپنے دوسرے بھائی کا خون بہایا۔ اس کے بعد ابن آدم کے اندر ہر اُس شئے کی ملکیت کی خواہش سر اٹھانے لگی جو اسے مفید لگی۔ تب اُس کے جذبات نے اُس کی راہنمائی کی اور انسان ملکیت کے شدید احساس سے مغلوب ہو گیا۔ اب ذاتی مفاد کے حصول کے لیے طاقت کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی۔ بود و باش کے طریقے جوں جوں اجتماعی شکل اختیار کرتے چلے گئے مفاد پرستی کے بھی نئے نئے پہلو سامنے آنے لگے خاندان قبیلہ گاؤں اور قوم کے جتھوں کی عصبیت پروان چڑھنے لگی۔ حقوق کا تصفیہ طاقت کی بنا پہ ہونے لگا۔ مگر پھر جب خون ایک حد سے زیادہ بہنے لگا تو لوگ مل بیٹھے حق کوشی اور انصاف پرستی کی ضرورت کا احساس شدت اختیار کر گیا۔

حق و انصاف کا فلسفہ فروغ پانے لگا۔ صاحب فہم اور سلیم الطبع لوگوں نے نظری طور پہ اس اصول کو تسلیم کر لیا کہ بنی نوع انسان کی ہمہ گیر فلاح کے لیے ضروری ہے کہ حق و انصاف کے تقاضوں کو مفاد پرستی اور خودغرضی کے تقاضوں پہ ترجیح دی جائے۔ یہ تمدن کے اولین دھندلکے تھے جب انسانی شعور بھی اپنی پختگی تک نہ پہنچا تھا۔ تب انسان نے بنیادی انسانی حقوق اور اخلاق کے جس تصور کو پیش کیا آج کا انسان تو اُس سے بھی پست اخلاقی سطح پہ کھڑا ہے اس لیے کہ آج کے تیز ترین میڈیا میں بجلی کی

طرح چمکتی کیمروں کی آنکھوں کے سامنے جس ڈھٹائی سے جھوٹ اور منافقت کا مکروع کھیل کھیلا جاتا ہے اُسے دیکھ کے تو پتھر کے زمانے کا انسان بھی شرما جائے۔متمدن اقوام کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اِن اقوام کے با اقتدار اصحاب،علوم و فنون کے ماہر،خارجہ امور کے چوٹی کے ماہرین،فطرت انسانی کے نبض شناس، زمانہ کے سرد گرم سے آشنا اخلاق کے دھنی، مہذب ہونے کے دعویدار،اعلیٰ لباسوں میں ملبوس،عمدہ اور پر شکوہ عمارات کے وسیع و عریض حال میں عالمی میڈیا کے کیمروں کی چنگھاڑتی فلیش لائٹوں میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں کرتے کہ انھوں نے انٹیلی جنس کی غلط رپوٹوں کی بنا پہ عراق پہ حملہ کیا تھا۔عراق میں دس لاکھ انسانوں کو قتل کیا گیا جن میں چار لاکھ دس سال سے کم عمر کے بچے شامل ہیں۔

چنانچہ طاقت اور معیشت کا ایک مہیب عدم توازن ہے جس سے آج کی دنیا نبرد آزما ہے۔دولت کا بہاؤ مغرب کی طرف ہے کہ انھوں نے جدید علوم معاشیات اور طاقت کے ذریعے زمانے کی لگام تھام رکھی ہے۔اہل مغرب نے ذاتی مفاد کے وہ پہلو وضع کیے جس سے باقی ساری دنیا مغلوب ہو کے رہ گئی۔انھوں (G8) کے نام سے معاشی غلبہ کی ترکیب کی تو (NATO) کے ذریعے عسکری طور پہ اقوام عالم کو مرعوب کیا۔چنانچہ آج کی دنیا جس انارکی اور افتراق کا شکار ہے اُس کی مثال نہیں دی جا سکتی۔آج اقوام عالم خاص طور پہ خود کو مہذب کہنے والی اقوام نے زمین کا چہرہ انسانی خون سے رنگ دیا ہے۔انسان نے دوسری جنگ عظیم سے کوئی سبق نہیں سیکھا جس میں دو کروڑ سے زائد لوگ مارے گئے تھے اور یہ ابھی کل کی بات ہے۔مہذب اقوام کے مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں۔چین کی معیشت امریکہ کے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہے تو امریکہ کی جارحانہ پالیسیاں مسلمان ملکوں کا سانس روکے ہوئی ہیں۔عالمی ادارے عدل سے عاری اور استحصال کی روش پہ گامزن ہیں۔

چنانچہ کارگاہِ حیات میں اس قدر شور ہے کہ کوئی بات واضح طور پہ سنائی نہیں دیتی۔انسان بہ حیثیت مجموعی خالق سے منہ موڑے بیٹھا ہے اُس نے اپنی زندگی کو کچھ اس طرح متعین کیا ہے جس میں وہ ہر لمحہ زیست کو شادمان بنانا چاہتا ہے۔مگر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اطمینان آسودگی اور سکون کی منزل

سے دور ہے کہ اُس نے اپنی مادی زندگی کو مزین کرنے کے لیے تو بہت کچھ سامان فراہم کیا مگر اپنی روحانی زندگی کو اس قدر تشنہ بنا دیا کہ وہ اندر ہی اندر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس انفرادی رویے کا عکس اقوام کی اجتماعی ہیت میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جو ردعمل اور جارحیت کی طرف مائل ہیں۔ خطہ ارض پہ دو بڑے انسانی گروہوں یعنی مسلمان اور غیر مسلم خاص طور پہ اہل مغرب کو اپنے رویوں میں جن مثبت امور کی طرف متوجہ ہونا چاہیے وہی اُن کے لیے نوائے عصر ہے۔ مغرب کو اپنی سماجی عقائدی، معاشی بنیادوں پہ نظر ثانی کرنی چاہیے کہ انھوں نے مادیت کی انتہا پہ بھی جا کے دیکھ لیا ہے کہ سکون اور اطمینان کی دولت اُن سے دور ہی رہی۔

دوسری طرف مسلمان ہے جو سیادت کی بازیافت میں محو ہے مگر جدید علمی روایت سے نابلد ہونے کی وجہ سے راستہ کھوجنے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔ اُن کی دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب یعنی قرآن کو بھی پس پشت ڈال رکھا ہے۔ وہ تفرقے میں پڑ چکا ہے اور ایک بے جا مذہبی جنون میں مبتلا ہے جس کی دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان کئی صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی کی دولت سے سرفراز ہوا ہے ابھی اُس کی بنیادیں مستحکم نہیں۔ ابھی اُس نے کئی مشکل مراحل سے گزرنا ہے۔ ابھی اُس نے اپنی سحر گم گشتہ کو تلاش کرنا ہے۔ ابھی اُس نے اپنے علم کی اُس کھوئی ہوئی میراث کو تلاش کرنا ہے جس کی بنا پہ اُس نے ہزار سال تک دنیا کی راہنمائی کی۔ ابھی اُس نے خود کو پھر سے قرآن کی تعلیمات پہ استوار کرنا ہے کہ قرآن ہی اُس کا فخر ہے اور قرآن ہی کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ قرآن صرف مسلمانوں کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ قرآن تو انسان کو مخاطب کرتا ہے قرآن ہی دنیا میں علم کا وہ واحد منبع ہے جو خالص ہدایت سے مزین ہے۔ مگر انسان نے علم کی جو تشریحات کی ہیں وہی اُس کے رویے میں کجی کا باعث ہیں، علم کی تشریح میں اُسے کہاں کہاں ٹھوکر لگی ہے اُس کا مفصل جائزہ لینا ہی یہاں مقصود ہے۔

✡ ✡ ✡

علم کی ماہیت

سکول و کالج میں نصاب پڑھتے ہوئے اساتذہ ہمیں بتاتے رہے کہ علم سے مراد ہے جاننا۔ یعنی نامعلوم سے معلوم کے بیچ کا فاصلہ علم کہلائے گا۔ اگرچہ علم کی یہ تعریف کوئی غلط تعریف نہیں ہے تاہم علم کی حقیقی ماہیت اس سے کافی بعید ہے۔ علم دراصل اس شعور کا نام ہے جو انسان نے طویل تہذیبی منزلوں کے بیچ حاصل کیا۔ علم کی داستان کئی ہزار سالوں پہ محیط ہے۔ اول اول انسان کی ضروریات محدود تھیں اس لیے اُس کا علم سطحی تھا تاہم جب تمدن کی بنا پڑی اور انسان خود کو مہذب کہنے لگا۔ تب اُس کے علم میں وسعت آتی چلی گئی۔ صاحبِ دانش فضلا نے بیان کیا کہ جاننا انسان کی جبلی خواہش ہے۔ یعنی علم کی طرف مراجعت قدرت کی منشا ہے۔ قدرت نے انسان کو کئی جبلی خصائص سے نوازا ہے جن سے وہ اپنی حیات کی ڈور قائم رکھتا ہے۔ جن سے وہ مضرت اور منفعت کا شعور حاصل کرتا ہے۔ اور انھی جبلتوں کی بدولت انسان اپنے اندرون کا حال کسی بھی دوسرے شخص سے بہتر طور پہ جانتا ہے۔ چنانچہ اگر اُسے بھوک لگی ہے تو بھوک کا یہ احساس اُس کا ذاتی احساس ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہوسکتا۔ جس کو بھوک لگی ہو وہی جان سکتا ہے کہ وہ بھوکا ہے، اُسے کھانا چاہیے۔ اسی طرح انسان کی دوسری جبلتوں کا معاملہ ہے۔ شعوری ابتداء ہی سے وہ جان لیتا ہے کہ آگ کے نزدیک نہیں جانا کہ یہ جلا دیتی ہے۔ سانپ سے دور رہنا ہے کہ وہ ڈس لیتا ہے۔ چنانچہ علم

کی یہ وہ قسم ہے جو قدرت کی طرف سے انسان کو عطیہ کے طور عطا کی گئی ہے دراصل یہ اسی احسان کا تسلسل ہے جو خالق کی طرف سے ہمیشہ انسان کا احاطہ کیئے رہتا ہے۔علم کی دوسری قسم وہ ہے جو انسان اپنے خارج سے حاصل کرتا ہے۔اُس کی سب سے پہلی درسگاہ اُس کی ماں کی گود ہے۔اُس کی دوسری درسگاہ اُس کی گلی،اُس کا محلّہ ہے اُس کے ساتھی اور دوست ہیں۔اُس کا سکول اور اُس کے اساتذہ ہیں۔جن سے وہ زیست کے اطوار سیکھتا ہے اور معاشرتی طور پر خود کو ایک اہل اور ذمہ دار شہری بنانے کی کوشش کرتا ہے۔یہ علم کا وہ تسلسل ہے جو ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔اپنے شعوری ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ اور نظریات میں تبدیلی آتی رہی ہے۔چنانچہ اس سفر زیست میں جس نے جتنا جانا وہی اُس کا علم کہلائے گا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اُسی کلاس میں جس میں ہمارا بچہ پڑھ رہا ہے۔دو تین ایسے بچے بھی ہوں گے جو غیر معمولی طور پہ ذہین ہوں گے۔اساتذہ کو اُن کے ساتھ زیادہ مغز کھپائی نہیں کرنی پڑتی۔ایک دفعہ بات سمجھانے سے بات اُن کی سمجھ میں آجاتی ہے۔اس سے ہم اصول ذہانت کا استخراج کرتے ہیں کہ اگرچہ اُن بچوں اور دیگر بچوں کی نہ تو عمر میں زیادہ تفاوت ہے اور نہ ہی وہ اُن کی شعوری سطح مختلف ہے فرق صرف ذہانت کا ہے۔جس کی وجہ سے وہ بچے ممتاز نظر آتے ہیں جو اپنے دوسرے ہم عمروں سے زیادہ ذہین ہیں۔اب چونکہ علم کا ذہانت سے براہ راست تعلق ہے۔اس لیے جب اسی کلاس کے تمام بچے شعوری پختگی تک پہنچیں گے تو وہ دو تین بچے جو کلاس میں پہلے روز سے نمایاں تھے اُن کے علم کی سطح اپنے ساتھیوں سے بہت بلند ہو چکی ہوگی۔

چنانچہ یہ شعور کہ ایک ذہین آدمی اشیا کی ماہیت کو کس طرح پہچانتا ہے یا اسی بات کو یوں کہہ لیں کہ آئین سٹائن اور نیوٹن جب طالب علم ہوں گے تبھی سے یہ بات دکھائی دے رہی ہوگی کہ اِن ہونہار بچوں کی دلچسپی کے امور دوسرے بچوں سے قدرے الگ ہیں اور وہ اشیا کی ماہیت کو دوسروں سے زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھتے ہیں اور اپنے ہی ہم سن دوستوں سے مشاہدے میں بہتر نتائج اخذ کرتے ہیں۔چنانچہ صاحب علم لوگوں نے اس بات کا تذکرہ کیا کہ اول اول انسانی تمدن کو اشیا کی ماہیت

جاننے کی ضرورت ہی نہ تھی اس لیے کہ وہ سادہ اور سہل زندگی کرتے تھے جس میں انھیں مشاہدے اور تدبر کی ضرورت کم ہی محسوس ہوتی تھی۔ مگر جب انسانی سماج نے تمدن کے کئی پڑاؤ عبور کر لیے اور اُسے ابلاغ کا سلیقہ بھی آ گیا تو یہ سوال انسان کی مشکلات میں اضافہ کرنے لگا کہ وہ اشیا کی ماہیت کو کیسے جانچے۔

چنانچہ معلوم انسانی تاریخ اس ضمن میں ہماری جو راہنمائی کرتی ہے اُس کے مطابق اولین دور سے ہی انسان نے اشیا کی ماہیت پہ غور کرنا شروع کر دیا تھا اور قبل از تاریخ سے ہی اس میدان میں انسان کی جہد و سعی کے نشان ملتے ہیں۔ مدون تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ سے پہلے یونانی صاحب دانش اس سوال کو حل کرنے کی کوشش میں تھے اور انھوں نے اس ضمن میں کئی نظریات بھی پیش کیے۔ اگر چہ وہ نظریات نہ تو کلی طور پہ قابل قبول تھے اور نہ ہی اس ضمن میں انھیں مسئلے کو حل قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کوشش سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ آنے والی نسلوں تک یہ سوال منتقل ہو گیا کہ انھوں نے اشیا کی ماہیت کو جاننا ہے۔ کائنات کے اسرار کھولنے ہیں، سمندروں کی تہوں میں جھانکنا ہے، آتش فشاؤں سے نبرد آزما ہونا ہے۔

چنانچہ اس جہد و سعی کے نتیجے میں اس دور کی انسانی فکر نے ارتقاء کی کئی منزلیں طے کر لیں اور علم کی طرف تیزی سے گامزن رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُسی دور میں انسان نے مذہب، اخلاقیات، سیاسیات، فلسفہ، سماجیات اور دیگر کئی فنون میں حیرت انگیز مراحل طے کیے اور انسان کی راہنمائی اُن منزلوں کی طرف کی جو بنی نوع انسان کی منتظر تھیں۔ علما نے کہا کہ اس ساری گہما گہمی سے علم کی ایک نئی دنیا وجود میں آئی اور یونان کے صاحبِ دانش فضلا نے سیاسی، معاشی اور علمی تجربات کے ایک نئے عہد کا آغاز کیا جسے ہم بلاشبہ انسانی تاریخ کا روشن باب قرار دے سکتے ہیں۔ انسان کے سامنے کی چیز حیات ہے اس لیے علم کے ابتدائی خدوخال حیات کی بقا کے علم سے ہی وابستہ ہیں۔ انسان چونکہ محض ایک مادی وجود ہے اور جب تک اللہ کے پیغمبر انسان کو یہ بات نہیں بتاتے کہ اُن کی روحانی حیات میں رونق اُن کے کن اعمال سے آئے گی اُس وقت تک انسان نے محض مادی محور میں ہی علم کی تگ و

دو کی۔کوئی کہہ سکتا ہے کہ آج بھی تو مادیت ہی کے علوم چار سو غالب نظر آتے ہیں اور روحانی علوم کو انسانی معاشروں میں چنداں اہمیت حاصل نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ صریحاً انحراف ہے اور یہ ایک الگ موضوع ہے جس پہ انشاءاللہ الگ سے بحث ہوگی۔ یہاں ہم انسان کے اُس شعوری ارتقاء سے بحث کر رہے ہیں جسے طے کرتے ہوئے وہ آج کی اس ہمہ رنگ دنیا تک پہنچا ہے جس میں ہر طرف علم کے انگنت جلوے دکھائی دیتے ہیں۔چنانچہ جب انسان نے مادی علم کی ابتدا کی اور حیات کی بقا کی جدوجہد میں نت نئے راستے تلاش کرنے شروع کیے تو اُس کے سامنے علم کی کوئی واضح منزل نہ تھی بلکہ یہ تگ ودو اور جہدِ مسلسل کا ایک عہد تھا جس میں انسان نے اپنی طبی حیات کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھی۔

چنانچہ جب انسان نے اپنے مادی وجود کی بقا کے بارے میں یقین کی ایک منزل کو حاصل کر لیا تو اُس کے سامنے دوسری منزل یہ تھی کہ اس حیات کو درپیش مسائل سے کیسے نمٹا جائے۔چنانچہ اس سوچ سے علم کے ایک نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے جس میں انسان نے اپنی طبیعی عمر میں آسانی اور آسائش کے حصول کی طرف توجہ مرکوز کی۔اس نقطہ نظر کے تحت انسان کے تدبر و تفکر کی بنیاد یہ قرار پائی کہ وہ قدرتی آفات اور بیماریوں سے کس طرح نجات پا سکتا ہے۔انسان کی چشم حیراں نے اُس منظر کا مشاہدہ بھی کیا کہ جب وبائیں آبادیوں کی آبادیاں کھا جاتیں،تب اُس نے علم طب کی طرف رجوع کیا اور غور و فکر سے کسی نتیجے تک پہنچنے کے سفر کا آغاز کیا۔

انسان نے دیکھا کہ بھوک اُس کا سب سے بڑا مسئلہ ہے،چنانچہ اُس نے خوراک حاصل کرنے اور اسے اُگانے کی طرف خصوصی توجہ کی اور جلد ہی وہ اس قابل ہو گیا کہ اب لوگ بھوک کی وجہ سے نہ مرتے تھے۔وہ مسلسل غور کرتا رہا کہ وہ دکھ اور مصائب جو اُسے زندگی کی راہ میں درپیش ہیں اُن کے تدارک کا طریقہ کار کیا ہو۔کس طرح سے انسانی زندگی کو زلزلوں سے،سیلابوں سے،آتش فشاؤں سے،اور وباؤں سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔یہی وہ ابتدائی سوچ تھی جس پہ آج کے جدید علم طب،علم سائنس،علم معاشیات،علم عمرانیات،علم سماجیات اور علم سیاسیات کی بنا رکھی ہے۔انسان نے جہد و

سعی کا ایک طویل دور گزارا ہے۔ جس کے بعد اُس نے اپنی زندگی کے اُن مسائل کا مطالعہ کیا اور اُن مسائل و مصائب کا حل تلاش کیا۔ یوں علم کے ان گنت شعبہ ہائے جات وجود میں آتے چلے گئے اور انسان نے اُن حیرت انگیز کمالات کی طرف اپنا سفر شروع کیا جس سے ہمارے دن رات میں آسائش اور آسودگی ہے۔ مگر اس ساری داستان تگ و دو میں ایک بات کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ انسان نے علم کی دنیا میں جو بھی نیا شعبہ دریافت کیا اُس کے پس منظر میں اُس کی مادی زندگی کی بقاء اور آسانی ہی کی خواہش کارفرما تھی۔ ہر نئی ایجاد اور ہر پیش رفت کے پیچھے مادی زندگی کو باقی رکھنے اور اسے محفوظ بنانے کا تصور ہی کارفرما رہا ہے۔ اور انسان کی یہی سوچ برقرار رہی حتی کہ صدیوں پہ صدیاں گزرنے لگیں۔ اگرچہ بیچ میں انسان کو کچھ ایسے لوگوں کا سامنا بھی کرنا پڑا جنھوں نے اُن سے کہا تم غلط سمت کی طرف جا رہے ہو تب انسان نے نگاہِ حیرت سے اِن لوگوں کی بات کو سنا مگر در کر دیا کہ انھیں مادیت کی جن منزلوں کی تلاش تھی وہ اِن کے بہت قریب آپہنچے تھے۔

مادیت کی منزل کی طرف بنا رُکے بھاگنے والے اِن انسانی گروہوں کو جن لوگوں نے ٹوکا وہ اللہ کے پیغمبر تھے جن کے پاس دانش کی بات تھی جن کے پاس علم کا وہ ذریعہ تھا جس سے انسان ناآشنا ہے جنھوں نے انھیں مادیت سے روحانیت کی راہ پہ آجانے کی تلقین کی۔ مگر لوگ کم ہی شکر کی راہوں کو منتخب کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نئے دور میں جب سن عیسوی کا آغاز ہو چکا تھا انسان نے علم و عمل کی بہت سی منزلیں طے کیں اگرچہ اُن میں روحانیت کی کوئی منزل نہ تھی بلکہ صرف مادیت کے مظاہر تھے جن کی طرف انسان نگاہ حسرت سے دیکھتا تھا اور اُن اہداف کو حاصل کرنے کے جنون کا شکار تھا جس کو اُس نے خود ہی متعین کر لیا تھا۔ مادیت کی اِن منزلوں کی طرف انسان کا سفر جاری رہا۔ وہ بہت سے میدانوں میں سرخرو ہوا اور خود کو علم کا راہی جانتا رہا کہ اُس نے جو بھی منزل حاصل کی اُس کے پیچھے اُس کی شدید محنت، گہرا مشاہدہ اور من پسند نتیجے کے حصول کی خواہش تھی۔ انسان کے اہداف میں تیزی سے اضافہ ہوتا رہا۔ یوں علم منقسم ہونے لگا۔ کوئی طب کی مہارت اختیار کرنے لگا تو اُس کا ساتھی بڑی بڑی عمارتوں کو بنانے کا شائق نکلا۔ پہلے پہل یہ تمام شعبہ جات متصل تھے اور ایک ہی

آدمی عمارت بھی بناتا تھا اور علم طب میں بھی کسی قدر ادراک رکھتا تھا مگر اس طرح بات نہ بنی اور لوگوں نے مہارت کی آخری حد تک جانے کا سوچا۔ یوں علم کے وہ بہت سے شعبہ جات سامنے آئے جن سے آج ہماری آنکھیں مانوس ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ انجنیئر عمارت بناتا ہے، ڈاکٹر بیماری کا علاج کرتا ہے، پائلٹ جہاز آڑاتا ہے، سیاست دان حکومت کرتا ہے اور سائنس دان نت نئی ایجادات سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ جدید دنیا تک پہنچتے پہنچتے علم کے اس قدر حصے بخرے ہوئے کہ آج علم کے اس قدر شعبہ جات ہیں جن کی گنتی تک ممکن نہیں۔ لوگوں کی سوچ اس نہج تک آ پہنچی کہ انھوں نے سوچا کہ مادیت کی اس جہد و سعی کی انتہا آ گئی ہے اور اس کے بعد کوئی ترقی نہیں بلکہ محض جمود ہے۔ انسان نے فکری ترقی اور ارتقا کی تمام منزلیں طے کر لی ہیں اب تمام دنیا ایک جمہوری اور سرمایہ دارانہ نظام کی طرف بڑھ رہی ہے جس میں اُن کی سوچ کے مطابق انسان کی فلاح کی دیگر منزلیں ہیں۔ چنانچہ اس نظریہ علم میں انسانی فکر اور اعمال کی کامیابی کی آخری منزل بھی مادی آسودگی ہی ہے اور کامیابی کا معیار انسان کا سماجی اور معاشی معیار ہی ٹھہرا۔

یہ ایک بڑے انسانی گروہ کی علمی کاوش ہے جس کے نتیجے میں مادی نظریہ حیات پرورش پاتا رہا۔ یہ بحث اس علمی نظریہ ہی سے پیوست ہے کہ اس نظریہ علم نے انسانیت کو کیا دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جدید سائنس نے انسان کی زندگی کو بہت سہل بنا دیا ہے اور انسان اب منٹوں میں وہ فاصلہ طے کر لیتا ہے جو پہلے دِنوں میں بھی طے نہیں کر سکتا تھا۔ انسان نے غذا کی قلت کو دور کر دیا اور اپنے زرائع پیداوار میں بے پناہ ترقی کی ہے اور اب لوگ بھوک سے نہیں مرتے۔ انسان وبائی امراض پہ بڑی حد تک قابو پا چکا ہے اور اب وبائیں لوگوں کی بستیاں نہیں اجاڑتیں۔ انسان ایک لمحے میں ہزاروں میل دور بیٹھے اپنے دوست سے اس طرح بات کر رہا ہوتا ہے جس طرح کہ وہ اس کے سامنے بیٹھا ہو۔ انسان آواز کی رفتار سے تیز سفر کر رہا ہے، اُس نے ہواؤں میں اڑنا سیکھ لیا ہے، اُس نے سمندر کی پہنائیوں میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں، انسان چاند پہ چہل قدمی کر چکا ہے اور اُس کے مشن مریخ کی سرزمین پہ اترنے لگے ہیں۔ سیاسی، سماجی اور معاشی میدانوں میں بھی بنی نوع انسان کی ترقی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پہ بیسویں صدی میں انسان کی مختلف علمی میدانوں میں ترقی کی رفتار اس قدر

تیز رہی ہے کہ گذشتہ صدیوں سے اس کا موازنہ کرنا لا حاصل ہے۔ مگر وہ سوال جو اس بحث کا نقطہ آغاز تھا کہ کیا مادی میدان میں اس قدر رفعتیں حاصل کرنے کے باوجود اس ماہیت علم نے انسان کو دکھ سے آزاد کر دیا ہے، انسان کو غربت سے نجات دلا دی ہے، انسانیت کو عدل و انصاف فراہم کر دیا ہے یا مختصر لفظوں میں یوں کہہ لیں کہ کیا آج کا انسان خوش ہے، مطمئن ہے۔ تو اس کا جواب نفی میں آئے گا کیونکہ اگرچہ مادیت کے اِن علمی مظاہر کی چمک دمک بظاہر اسی بات کا عندیہ دیتی ہے کہ لوگ خوش ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ لوگ ناخوش ہیں۔ اس لیے کہ خوشی کا دولت سے کوئی تعلق نہیں۔ خوشی تو اُس احساس اور آسودگی کا نام ہے جس میں انسان کی روح آسودہ ہو اور وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرے۔ مغرب نے خوشی و اطمینان کو مادیت کی انتہاؤں میں کھو جا مگر اُسے ناکامی کا سامنا ہے۔ یہ تو اُن اقوام کا حال ہے جن کو مادی رفعت بہرصورت حاصل ہے اگرچہ تیسری دنیا کے اکثر ممالک دکھوں کے مہیب سائے میں زیست کر رہے ہیں۔

آج خطہ ارض پہ انسانوں کی اکثریت غربت میں زندگی بسر کر رہی۔ معدودے چند ممالک ہیں جنھوں نے اپنے شاطر ذہنوں کی بنا پہ استحصال کا وہ نظام وضع کیا ہے جس کی بنا پہ وہ معاشی طور پہ آسودہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ورنہ دنیا بھر کی آبادیاں زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے سسک رہی ہیں۔ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک تعلیم صحت اور عدل و انصاف جیسے بنیادی انسانی حقوق سے محروم ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ مادیت کا وہ نظام جس پہ مغرب اترا رہا ہے انسان کے بنیادی مسائل کا حل پیش نہیں کرتا۔ چنانچہ انسان کو علم کی دیگر جہتوں کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اُسے نئے جہانوں کی تلاش کرنا ہو گی۔

اگر علم کی یہ ماہیت انسان کے بنیادی مسائل حل نہیں کر رہی تو بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کی یہ جہد و سعی عبث ثابت ہوئی ہے اور انسان کو اپنے نظریہ حیات پہ نظر ثانی کرنا پڑے گی۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی عقل اس قابل ہے کہ وہ محض عقل و شعور کی بنا پہ اُس تصوراتی معاشرے کی تشکیل کر سکے جس کا خواب علم مادیت کی بنیادیں فراہم کرنے والوں نے فراہم کیا تھا۔ کچھ اسی

طرح کے خواب اشتراکیت کے بانیوں نے بھی اپنی عوام کو دکھائے تھے مگر وہ نظام ایک صدی سے بھی کم عرصے تک چل سکا۔اور لوگ جلد ہی اس کے کھوکھلے پن سے آگاہ ہو گئے۔آج جن معاشروں کو آسودہ سمجھا جاتا ہے انھیں معاشروں میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مظاہرے کیے جا رہے ہیں انھی ممالک کے شہری (G8) کے مالیاتی منصوبوں کو غیر انسانی اور غیر منصفانہ قرار دے رہے ہیں۔یہاں ایک لمحہ رُک کے اس سوال پہ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ انسان نے زندگی کے مختلف میدانوں میں علم کے جو نظام وضع کیے ہیں اُن کا ثمر میٹھا ہے یا کڑوا ہے۔انسان اس علم کے مبادیات سے مطمئن ہے یا غیر مطمئن،انسان اِس نظام زندگی کے تحت آسانی میں ہے یا مشکل میں، کیا اس نظام زیست نے انسان کے اُس تصوراتی معاشرے کو متشکل کر دیا ہے جس میں ہر طرف خوشیاں اور ہر طرف آسودگی نظر آئے اِن تمام سوالوں کا جواب یہ ہے کہ نہیں انسان غیر مطمئن ہے۔ وہ بھی جو معاشی طور پہ آسودہ ہے اور وہ بھی جو معاشی پستی کا شکار ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر علمی میدانوں میں اتنی ترقی کے باوجود انسان منزل سے ہنوز دور ہے تو آخر اس مسئلے کا حل کیا ہے؟۔اس مسئلے کا آسان اور سیدھا حل یہ ہے کہ انسان عقل کی نارسائی کو تسلیم کرے۔اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو اور خالق کی ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرے تب اُس کی زندگی میں بہار کے وہ رنگ ظاہر ہوں گے جن کی تشنگی اس کے رگ و پے میں موجود ہے۔کوئی کہہ سکتا ہے کہ خدا کی ہدایت یافتہ قوم جن کو اُس نے اپنی آخری کتاب عطا فرمائی جس میں علم کی حقیقت کا بیان ہے جس میں زیست کی الجھنوں کا حل ہے،جس میں انسان کے سارے مسائل کا حل ہے۔وہ تو خود عسرت اور پس ماندگی میں زندگی بسر کر رہی ہے۔تو اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ انھوں نے کتاب پہ عمل ہی نہیں کیا اگر وہ عمل کرتے تو زمام کار اُن کے ہاتھ میں ہوتی وہ جنھوں نے دنیا کی راہنمائی کا فریضہ ادا کرنا تھا انھوں نے کتاب ہدایت کو ریشمی غلاف چڑھا کے بلند مقام پہ رکھ چھوڑا ہے تا کہ وہ بچوں کی پہنچ سے بھی محفوظ رہے اس طرح وہ بڑوں سے بھی محفوظ ہو گئی کہ وہ بھی اسے کبھی کبھار گرد جھاڑنے کے لیے ہی اتارتے ہیں ہدایت حاصل کرنے کے لیے نہیں؟؟؟

✡ ✡ ✡

علم کے ارتقائی مراحل

انسان نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ایک خوف نے اس کا حصار کر رکھا تھا۔ وہ اپنی بقا کے خوف کا شکار تھا، وجودیت کے زائل ہو جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ زندہ اور موجود رہنا چاہتا تھا مگر اِس کے لیے اُس کو شدید جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ زرعی انقلاب سے پہلے انسان اپنی ڈورِ حیات کو برقرار رکھنے کے لیے شکار کھیلا کرتا تھا۔ اُس سے قبل کے حالات قدرے اندھیرے میں ہیں کہ انسان کی مدون تاریخ کی عمر دس ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ قبل از تاریخ کے انسان کی جہدوسعی کا محض قیاس کیا جا سکتا ہے ۔خیال کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اُس نے نوکدار لکڑی سے جانور کا مقابلہ کیا اگرچہ وہ جانوروں سے زیادہ طاقت ور نہ تھا۔ تاہم اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عقل عطا کی گئی تھی اُس کی بنا پہ رفتہ رفتہ اُس نے خود سے طاقتور اور پر ہیبت جانوروں کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا۔ جس کے بعد وہ اُن پہ غالب ہو گیا اور یہ غلبہ ابدی تھا اس لیے کہ اس کے بعد جانور کبھی بھی انسان کے لیے مسئلہ نہیں بنے۔ البتہ انسان جانوروں کے لیے ضرور مسائل پیدا کرتا رہا کہ شکار کی بے پناہ عادت نے جانوروں اور پرندوں کی کئی نسلوں کو معدوم کر دیا۔ جب انسان نے آگ جلانا سیکھا تب تمدن کی بنا پڑی۔ انسانوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ مل جل کر رہنے سے وہ خطرات سے زیادہ محفوظ ہو جاتے ہیں ۔چنانچہ وہ غاروں میں پہاڑوں کی کھوؤں میں اور گھنے جنگلات میں گروہ کی شکل میں رہنے لگا جس

سے علم سماجیات کا آغاز ہوا۔شعوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر اس احساس نے بھی انگڑائی لی کہ وہ مخلوق ہے تو یقیناً کوئی خالق بھی ہوگا۔چنانچہ اول اول اُس نے کسی غیر مرئی اور انتہائی طاقت ور مخلوق کی تلاش میں کی جسے وہ اپنا معبود قرار دے کر اُس کی پوجا کرے۔اِس دور میں انسان نے ہر اُس چیز کو پوجا کی جو پر ہیبت ہو جس سے وہ ڈرتا ہو، جو جسامت میں بڑی ہو چنانچہ ہاتھی، گینڈا، سانپ، پہاڑ سورج، چاند، ستارے، سمندر اُس کے معبود رہے اور انسانی تاریخ میں علم مذاہب کی بنا رکھی گئی۔عصر حاضر کے ایک مورخ سیّد علی عباس جلالپوری انسان کے اس دور کی تمدنی تہذیبی اور مذہبی ارتقاء پہ روشنی ڈالتے ہوئے اپنی کتاب " **کائنات اور انسان** " میں لکھا ہے کہ!

"انسان کے قدیم آباء جولنگور، چمپانزی اور گوریلا کے چچیرے بھائی تھے ابتداء میں انھی کی طرح درختوں پہ بسیرا کرتے تھے۔یخ (ICE AGE) کے طویل زمانوں میں جب جنگل برفانی تودوں کی لپیٹ میں آگئے تو انسان نے پہاڑوں کی کھوہوں میں پناہ تلاش کی۔زمانہ گذرنے کے ساتھ انسان نے دو ٹانگوں کے بل چلنا سیکھ لیا جس سے اُس کے ہاتھ کام کرنے کے لیے آزاد ہو گئے۔اور وہ لٹھ تھام کر گھومنے پھرنے لگے۔لٹھ اُن کے بچاؤ کا ہتھیار بن گیا اور اِس سے وہ جانوروں کا شکار بھی کھیلنے لگے۔ قدیم پتھر (STONE AGE) کے زمانے میں انسان نے دو پتھروں کی باہمی رگڑ سے لکڑی کو جلانے کا طریقہ سیکھ لیا۔ازاں بعد انھوں نے آگ کو محفوظ کرنے کا طریقہ بھی سیکھ لیا۔آگ کے آلاؤ اُن کی اندھیری راتوں کو روشن کرتے اور درندوں کو اُن کی غاروں اور کمین گاہوں سے بھی دور رکھتے۔چنانچہ لٹھ اور آگ کے استعمال سے ایک نیا حیوان نمودار ہوا جسے نیم انسان کہا جا سکتا ہے۔نیم انسان نے قدرت کے جبر کو توڑ کے

رکھ دیا جس سے دوسرے حیوانات آج تک آزاد نہیں ہو سکے۔رفتہ رفتہ اُس نے لٹھ کے سرے سے نوکیلا پتھر باندھ کر اسے برچھا بنالیا جب کہ دوسرے درندے بدستور پنجوں اور دانتوں سے کام لیتے رہے۔اس ہنرمندی کی تہہ میں وہ تبدیلیاں کارفرما تھیں جو یخ کے زمانوں میں قدرت کے شدائد کے خلاف طویل دور کشمکش میں انسان کے ذہن میں واقع ہوئی تھیں۔اول تو یہ کہ اُس کے سر مغز کے حجم میں اضافہ ہو گیا تھا ثانیاً یہ کہ اس کے دماغ کے اس حصے میں جسے (NEO CORTEX) کہتے ہیں سوچ اور خود شعوری (SELF CONSCIOUSNESS) کی صلاحیتیں بیدار ہو گئیں۔اس جوہرِ ذہن کی نشو ونما نے جہاں اس کے ذہن میں عقدوں کا شعور پیدا کیا وہاں انھیں سلجھانے کے لیے وسائل بھی فراہم کیے۔داخلی پہلو سے دوسرے حیوانات، درندے اور پرندے بدستور اپنی قدیمی جبلتوں کے اسیر رہے۔اور آج بھی جب کہ نیم انسان کے ذہنی ارتقاء نے اِن جبلتوں کے تصرف کو توڑ دیا ہے اور اپنی نئی فکری صلاحیتوں کے طفیل اس نے فطرت کے قوانین کو سمجھنے اور انھیں اپنے حق میں ڈھالنے کا آغاز کیا ہے تب بھی برچھے کے استعمال، آگ کی دریافت پہیے اور کشتی کی ایجادات اور گفتگو نے اس کے اعتماد نفس میں اضافہ کیا ہے۔اِس نے ہڈی کی سوئی اور تسمے سے کھالیں سی کر جاڑے کی یخ سے محفوظ رہنے کا راز معلوم کر لیا اور گوشت کے مچوں کو آگ پہ بھون کر زیادہ خستہ اور مزیدار بنالیا۔اُس نے ذہنی ترقی کے باعث جہاں اپنے خارجی ماحول کے ساتھ مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی وہیں اُس کی داخلی دنیا میں بھی عجیب وغریب تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔نفسیات کا ایک قانون ہے کہ انسانی ذہن سدا حرکت میں رہتا ہے۔وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی بات سوچتا رہتا ہے ۔ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ایک صحیح الدماغ شخص کا ذہن جامد ہو جائے یا سوچنا چھوڑ دے ۔سوچ کا یہ عمل بیداری سے ہی خاص نہیں بلکہ سوتے میں بھی جاری رہتا ہے۔اسی وجہ

سے ہم خواب دیکھتے ہیں جو انسان سے خاص ہیں کہ جانور اس خاصیت سے محروم ہیں۔اگرچہ حیوانات اور پرندے بھی ذہن رکھتے ہیں مگر خود شعوری کے نہ ہونے کے سبب وہ خواب نہیں دیکھ سکتے۔اور نہ اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں ۔اس دور کے انسان کو اپنے مخصوص ذہنی جوہر کے طفیل ہتھیار بنانے، خوارک ذخیرہ کرنے، تن ڈھانپنے اور کتے اور گدھے وغیرہ کو سدھانے میں کچھ زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔لیکن خواب اُس کے لیے بدستور پریشانی کا سبب رہے۔یہ بات ممکن نہ تھی کہ انسان خوابوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دے یا خوابوں کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔چنانچہ خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ اس نے داخلی عالم پر بھی غور کرنا شروع کر دیا۔اور اپنی توفیق کے مطابق اسے سمجھنے کی کوشش بھی کی۔وہ دیکھتا کہ سوتے میں اس کا جسم تو غار میں ہے لیکن وہ جنگلوں میں شکار کھیلتا پھرتا ہے یا اپنے مرے ہوئے عزیزوں سے ملاقاتیں کر رہا ہے۔اس عجیب وغریب صورت حال کی یہی توجیہ کی جا سکتی تھی کہ اس کے اندر کوئی ایسی شے موجود ہے جو سوتے ہوئے اس کے جسم سے جدا ہو جاتی ہے اور جاگنے پر لوٹ آتی ہے۔اس کے ساتھ اس کا روزمرہ کا مشاہدہ تھا کہ اس کی زندگی کا انحصار سانس کی ڈوری پر ہے جب تک یہ ڈوری باقی ہے انسان زندہ رہتا ہے اور اس کے ٹوٹ جانے سے وہ مر جاتا ہے سانس کی اس ڈوری یا ہوا کے اس جھونکے کو ابتداء میں وہ روح سمجھتا رہا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ روح کے لغوی معنی سانس یا ہوا کا جھونکا ہی رہے مگر اس کے اصطلاحی معنی بدل گئے اور روح کا اطلاق بھوت پریت، چلتی پھرتی کایا، یا ہمزاد پہ ہونے لگا جو انسان کا ہم شکل ہی ہے۔اور انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اُس کا ہمزاد بھی وجود میں آ جاتا ہے مگر موت کے بعد اس سے جدا ہو کے کسی نامعلوم عالم کی طرف چلا جاتا ہے۔روح کے معنوی مفہوم کی یہ تبدیلی بنی نوع انسان کی تاریخ میں بڑی انقلاب آفریں اور دوررس

ثابت ہوئی کیونکہ مذاہب عالم کی بنیاد اسی تصور پہ اٹھائی گئی‘‘۔

(*1)

✡✡✡✡✡✡

انسان کے ارتقاء کا سفر انتہائی سست ہے۔شعور کی منزل یعنی سوچنے اور سمجھنے کے مراحل طے کرتے ہوئے انسان نے تفکر اور تعقل کے بہت سے مدارج حاصل کیے، بہت سے اہداف حاصل کیے۔علم سماجیات کی بنا رکھی گئی، تحفظ کی خاطر علم حرب وضرب میں مہارت کے بے پناہ انداز اپنائے اور بدلے گئے، یعنی کہا جاسکتا ہے کہ تجسس فطرت انسانی کا ایک لازمی عنصر ہے۔یہی وجہ ہے انسان کے شعوری ارتقاء کے ہر ہر مرحلے میں علم کی راہیں اور جہتیں اور علم کے مختلف زاویئے انسانی فہم و ادراک اس کے زمانی ومکانی مقاصد سے وابستہ رہے ہیں۔اگرچہ ہر زمانہ میں علم محدود اور اضافی رہا ہے کہ کوئی علم کبھی مکمل نہیں ہوسکتا کیونکہ علم تو پوشیدہ اسرار کے انکشاف کا نام ہے اور اِن پوشیدہ اسرار کی آخری حد کوئی نہیں جانتا سوائے خالق کے جس نے کائنات اور انسان کو خلق کیا ہے۔انسان چاہے اس کا تعلق معروف یونانی معاشرے سے ہو جہاں فلسفے کی حکمرانی تھی یا اُس کا تعلق انسان کے اُس عہد سے ہو جہاں وہ اپنے معبود کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا یا اُس کا تعلق انیسوی صدی کے جدید فلسفیانہ رجحانات سے ہو وہ انسان اور کائنات کے باہمی ربط کا عقلی حل نہیں کھوج سکا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس نے اس اہم انسانی مسئلے کو مذہب یا یوں کہہ لیں کہ الہٰامیات سے الگ رکھ کے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ نہ کائنات کے اسرار ختم ہوتے ہیں اور نہ انسان کی علمی تشنگی۔یہی وجہ ہے کہ انسان محوسفر ہے اُس کا سفر اُس راز کو جاننے تک جاری رہے گا جہاں پہنچ کہ وہ کہہ سکے کہ علم ختم ہوگیا۔مگر انسان کو یہ منزل کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی اس لیے کہ اُس کی یہ آرزو خالق کی منشا اور منصوبے کے خلاف ہے۔یونانی فلاسفہ نے انسان اور کائنات کے باہمی ربط کو علم فلسفہ کے تحت حل کرنے کی کوشش کی

مگر ناکام رہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کو انسانی تاریخ میں بڑی تبدیلیوں کی صدیاں قرار دیا گیا ہے۔ بلاشبہ انسان نے اِن صدیوں میں فلسفہ سائنس اور تاریخ کے میدانوں میں بہت سے مراحل طے کئے۔ اور علم کی بہت سی نئی جہتوں کو اجاگر کیا جس سے انسان بہتر زندگی کے قابل ہوا۔ مگر بدقسمتی سے یہ صدیاں لادینیت یا خالق سے بیزاری میں بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہیں اس لیے کہ وہ قوم جو صاحب کتاب تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت کے لیے چن لیا تھا وہ زروال کی راہوں کی مسافر تھی اور جن قوموں کے نے علم میں ترقی حاصل کی اُن کی دنیا میں ایک ایسی تہذیب کا غلبہ ہے جس کی فکری و نظریاتی بنیادیں خالق کی منشا سے متصادم ہیں۔ چنانچہ اس غالب تہذیب کے سائے میں پروان چڑھنے والے علوم آسمانی ہدایت سے عدم التفات کے نتیجے میں انسانیت کی کوئی راہنمائی نہ کر سکے اور وہ اُس منزل سے ہنوز دور ہے جو مطلوب ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی میں انسان نے مختلف علوم کی مختلف جہتوں میں جو رنگ بکھیرے ہیں اُن کا عکس چار سو دکھائی دیتا ہے۔ مگر پھر سوال سامنے آ کھڑا ہو گا کہ کیا انسان نے اس مادی ترقی سے مقصدِ زیست کا تعین کر لیا ہے۔ کیا اُس نے کسی منزل کی نشاندہی کر لی جہاں پہنچ کے وہ آسودگی سے آشنا ہو سکے۔

بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں جن علمی نظریات نے جنم لیا فلاسفہ نے علم کی جو توجیہات کیں انھوں نے انسان کی منزل کے راستوں کا تعین کرنے کی بجائے انھیں اور بھی الجھا دیا ہے اور اب انسان باوجود اُس علم کے جو اُس کا احساس تفاخر ہے منزل کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ چنانچہ انسان کی تخلیق اور کائنات کے بسیط نظام کے پس پردہ حقیقت تک رسائی کے بغیر انسان کا علمی سفر تشنہ ہے اور یہ بات بھی اب کافی حد تک ثابت ہو چکی ہے کہ میسر علمی ذرائع سے اِن امور کی حقیقت تک رسائی ممکن بھی نہیں چنانچہ لامحالہ علم کی کوئی ایسی جہت کھوجنی پڑے گی جو اس اہم سوال کا جواب دے سکے۔ اس سوال کا جواب مسلمان کے پاس ہے۔ قرآن میں موجود ہے مگر مسلمان اُس علمی حیثیت سے کافی نیچے کھڑا ہے جہاں پہنچ کر وہ باآواز بلند اس بات کا دعویٰ کر سکتا کہ میری بات سنو میرے پاس علم کی جو اساس ہے وہ قابل یقین ہے، ہر انسانی سوال کا جواب دینے

کی صلاحیت رکھتی ہے، مگر علمی روایت سے انحراف کی وجہ سے کوئی اس کی بات سننے کو تیار نہیں اس لیے بھی کہ غالب تہذیب سرے سے اُس نظام علم کی مخالف ہے جس کو اصطلاحاً علم وحی کہا جاتا ہے۔ وہ صدیوں کلیسا کا جبر سہتے رہے اور سمجھتے ہیں کہ مذہب ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ تیرہویں صدی سے سولھویں صدی تک مغرب کے کلیسا نے پیش کیا تھا اس لیے اہل مغرب کے صاحب دانش میں سے چاہے وہ روسو ہو، والٹیر ہو، برگساں ہو، نٹشے ہو، ول ڈیورانٹ ہو، ہسکلے ہو، اگسٹ کومٹ ہو ،سینٹ سائمن ہو، ڈارون ہو اینجلز ہو یا کارل مارکس ہو مذہب کے نام سے یوں بدکتے ہیں جیسے انھیں کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو چنانچہ خالق کائنات سے یہی بیزاری، الہٰامیات سے یہی بے اعتنائی اور حقیقت سے یہی تساہل انھوں نے اپنے لوگوں کو منتقل کیا اور اُن کے یہی افکار اہل مغرب کی رگوں میں خون بن کے سرایت کرنے لگے۔

چنانچہ گذری ایک دو صدیوں میں انسان خالق کے اُن نشانات کو بھی بھلا بیٹھا جو اُس نے اپنے آباء سے پائے تھے، وہ قرآن پر تو کیا یقین کرتے انھوں نے تو توارت و انجیل سے بھی منہ موڑ لیا۔ چنانچہ اس پس منظر میں علم نے جو بھی ترقی کی اُس نے انسانیت کے شرف کو بحال کرنے میں قطعی کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ علم کی تدریج کا سفر ابھی جاری ہے اور اُس روز تک جاری رہنے والا ہے جس تک کہ اس کائنات کی بساط کو سمیٹ نہ لیا جائے۔ یہاں ہم اسلام کے اُس سادہ اور سہل تصورِ علم کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اس نے انسان اور کائنات کی غایت بیان کرتے ہو ئے پیش کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ!

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ۝ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوۡدًا وَّ عَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَ یَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 190-191/3)

ترجمہ:

''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور کرتے ہیں (تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں) کہ پروردگار تو نے یہ سب کچھ (کائنات) فضول اور بے مقصد نہیں بنایا اور تو پاک ہے اس سے کہ تُو کوئی عبث کام کرے پس تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے''۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوا ہے کہ!

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِہٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ وَسَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِہٖ وَسَخَّرَ لَکُمُ الْاَنْھٰرَ ○ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ ○ وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَاسَاَ لْتُمُوْہُ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا اِنَّ الْاِ نْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ ابراھیم 32-34/14)

ترجمہ:

''اللہ وہی تو ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے تمھاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمھارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمھارے لیے

مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمھارے لیے مسخر کیا کہ لگا تار چلے جارہے ہیں اور رات اور دن کو تمھارے لیے مسخر کیا۔ جس نے وہ سب کچھ تمھیں دیا جو تم نے مانگا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے"۔

✡✡✡✡✡✡

آگے فرمایا گیا کہ!

اَوَلَمْ يَرَا لْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِىَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِىَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِىْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ○ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ○ اَوَلَيْسَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ○ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ فَسُبْحٰنَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَىْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ یسین 36/83-77)

ترجمہ؛

"کیا انسان دیکھتا نہیں کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کے کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے"کون اِن ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی"۔ اِن سے کہو! انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلے پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی

اورتم اُس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو۔کیا وہ جس نے آسمانوں اورزمینوں کو پیدا کیا ہے اِس پہ قادر نہیں کہ اِن جیسوں کو پیدا کرسکے؟ کیوں نہیں جب کہ وہ ماہر خلاق ہے۔وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اسے حکم دے کہ ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے،اوراسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو‘‘۔(2*)

✡✡✡✡✡✡

اِن چند آیات کے مطالعے سے ہی یہ بات کھل کے سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات اس مقصد کے لیے پیدا کی ہے کہ یہاں اپنے نائب انسان کوایک آزمائش میں ڈالے اوراُسے پرکھے۔جواس کسوٹی پہ پورااترے وہ کامیاب ٹھہرا۔اورجس نے خالق کی منشا کے خلاف زندگی بسر کی اُس کے لیے جہنم کا عذاب تیار کیا گیا ہے۔انسان کی پانچ ہزار سالہ جہد وسعی کو سامنے رکھیں کہ اُس نے حیات اور کائنات کی غایت تک پہنچنے کے لیے کس قدر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ قدیم اور جدید فلاسفہ نے اس سوال کو کس قدر گہرائی میں جا کے کھوجا ہے مگر اُن کا طریقہ کار غلط تھا۔اُن کے علم کی رسائی ناقص تھی اُن کی دلیل میں کوئی وزن نہ تھا۔اس لیے کہ کائنات کو کھوجنے کے لیے اول خالق کو کھوجنا لازم ہے۔کائنات کی غایت کو جاننے کے لیے خالق کائنات کی منشا کو جاننا لازم ہے۔اسکے بعد راستے کھلتے چلے جاتے ہیں انسان شکر کی اُن راہوں کا مشتاق ہوجاتا ہے جن پہ چل کے وہ خالق کی رضا کو حاصل کرسکے یہی حقیقی علم ہے اور یہی حیات وکائنات کی اصل غایت۔ایک بار پھر مڑ کے دیکھیں کہ پانچ ہزار سال کی معلوم انسانی تاریخ میں انسان نے خالق کے تصور سے عاری جس فلسفہ علم کو تشکیل دیا اُس نے انسانیت کو کیا دیا؟

روحانی تشنگی کا احساس؟

گمراہی ورذالت کے راستے؟

مادیت کا وہ گہرا غار جس کی تہہ میں کوئی خیر نہیں؟

قومیت کا عفریت؟

مسابقت کے اندھے راستے؟

اشتراکیت کے مصنوعی معاشی فلسفے؟

بڑی بڑی جنگوں میں کروڑوں انسانوں کی ہلاکت؟

اِن جنگوں سے انسان نے یہ سبق سیکھا کہ ایٹم بم بنائے؟

بے مقصدیت کا بارِگراں؟

بدامنی اور استحصالی نظام معیشت؟

کمزور اقوام سے امتیازی سلوک؟

فحاشی اور عریانی کا سیل بے کراں؟

اخلاقی قدروں سے آزاد معاشرے؟

علم کا تفاخر مگر جہل کے عملی مظاہر؟

بے روح زیست جو کسی منزل کے احساس سے عاری ہے؟

مادی جدوجہد جس کی کوئی آخری حد نہیں؟

یہ کم سے کم بیان ہے اُس انسانی ماحصل کا جو اُس نے خالق سے بے اعتنائی کے بعد کمایا ہے۔

علم کا فلسفیانہ مزاج

علم فلسفہ اشیا کی ماہیت کو گہرائی میں جا کر جانچنے کی دعوت دیتا ہے۔ عام طور پہ فلسفیانہ تصور کی بنا مادیت پہ رکھی ہے۔ علم فلسفہ کی ابتداء یونان سے ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ کی آمد سے ہزار سال پہلے ہی اس علم کی بنیادی اصلاحات وضع کر لی گئی تھیں۔ فلسفے کا باوا آدم طالیس یونان کے قدیم شہر میلٹس میں (۶۴۰ق م) پیدا ہوا۔ سائنس ریاضی اور علم ہیت کی ابتداء بھی اسی دور میں ہوئی۔ طالیس ہی کو اِن علوم کا موسس خیال جاتا ہے اگرچہ ریاضی (جیومیٹری) کے بیشتر ابتدائی اصول اقلیدس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ یونان کے معاشرے میں صدیوں سے قائم مذہبی دیو مالا کے اثرات کو فلاسفہ کے عقلی علوم نے رفتہ رفتہ معدوم کر دیا تھا۔ فلسفے کے قبول و رواج کے ساتھ ساتھ ارواح کے مت کے اثرات بھی بتدریج کم ہوتے رہے اور فلسفہ اور مادی سائنس کی روایت غلبہ حاصل کرتی رہی۔ یونانی فلسفے کا اہم موضوع بھی حیات اور کائنات ہی تھا۔ فلاسفہ کے ابتدائی کائناتی تصور میں خالق کا موہوم سا تصور موجود ہی تھا۔ اگرچہ انھی فلاسفہ کی بنیادی فکر کی جب سترہویں اور اٹھارویں صدی کے فلاسفہ نے تشریحات کیں تو کائنات کو سراسر مادی قرار دے دیا۔ چنانچہ قرن اول کے فلاسفہ میں سے مثالیت پسندوں نے حقیقت کبریٰ کو وجودِ مطلق شعور مطلق، یا عین الاعیون کو جو اُن کی فکری کاوشوں کا مقصود منتہا ہے خدا کا نام دیا تھا۔ مثالیت پسندوں کے وجودِ مطلق یا خدا اور اہل

مذاہب کے خدا میں البتہ ایک فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ مثالیت پسندوں کا وجودِ مطلق یا خدا واجب الوجود ہے، غیر شخصی ہے جب کہ اہل مذہب کا خدا ذی ارادہ شخصیت ہے جو انھی کی طرح جذبات و احساسات رکھتا ہے اور کائنات میں ہر وقت ہر قسم کے تصرف پہ قادر ہے۔ تاہم مثالیت پسند بھی اہل مذہب کی طرح روح کے وجود اور اُس کی بقاء کے قائل ہیں اور انسان کو فائل مختار مانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب ہمیشہ سے تصور روح کا قائل ہے جس کے وسیلے سے انسان کائنات سے اپنا فکری اور جذباتی رابطہ قائم رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اہل یونان کے فلاسفہ کا علمی تخیل اُن کے مذہبی رجحانات سے متعلق ہے اہل علم نے یونان کے فلاسفہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

فلاسفہ کے پہلے گروہ کا آغاز طالیس سے ہوتا ہے۔ طالیس کا نظریہ کائنات یہ تھا کہ کائنات پانی سے بنی ہے۔ طالیس کا کائنات کے متعلق یہ نقطہ نظر اہل یونان کے مذہبی دیو مالا کے خلاف تھا جس کی بہت مخالفت کی گئی۔ تاہم طالیس نے کائنات کی تشریح مذہبی دیو مالا کے توہمات سے ہٹ کر عقلی طور پہ کرنے کی کوشش کی۔ اُس کے تخیل کو اُس کے شاگرد ''انا کسی مینڈرس'' نے آگے بڑھایا۔ چنانچہ طالیس اور انا کسی مینڈرس کے کائنات کے بارے میں اس عقلی نظریے نے رفتہ رفتہ مقبولیت حاصل کر لی۔ بعد میں علم کا یہی اندازِ نظر اس قدر مقبول ہوا کہ دو ہی صدیوں میں سائنس اور فلسفے کی تدوین عمل میں آ گئی۔ فلاسفہ کے اس پہلے گروہ میں جن فلسفیوں کے افکار کو پذیرائی حاصل ہوئی اُن میں انا کسی مینڈرس، زینوفینس، پروٹا گروس، ہپو کریٹس، دیما قریطس، ابیقوروس اور لکریشس شامل ہیں۔

فلاسفہ کے دوسرے گروہ کا آغاز فیثا غورث سے شروع ہوا اور پارمی نائیدس، ہیر یقلیتس اور افلاطون کے واسطے سے فلاطیونس پہ منتہا ہوا۔ فیثا غورث کروٹونا کا شہری تھا اُس نے عورت اور مرد کی مساوات کا تخیل پیش کیا۔ فیثا غورث نے علم ریاضی اور فلسفے کی مبادیات پیش کیں۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے کہا کہ دنیا گول ہے اُس نے سب سے پہلے سورج گرہن اور چاند گرہن کی تشریح کی۔ فیثا غورث اپنی طرز کا منفرد طبیب تھا جو موسیقی سے لوگوں کے امراض کا علاج کیا کرتا تھا۔ اس کے افکار

میں الٰہیات کا عکس پایا جاتا ہے اور وہ تناسخ ارواح کا بھی قائل تھا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مذہبی فلسفی تھا۔ ہیریکلیتس کے کائناتی فلسفے کو یونانی ذہن و دماغ کی عظیم تخلیق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُس نے کہا کہ کائنات کی بنا پانی نہیں بلکہ آگ ہے جسے وہ "یزدانی آگ" کہا کرتا۔ پارمی نائیدس سے مابعد الطبیاتی فلسفے کا آغاز ہوا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ کائنات کی ہر چیز ثابت و قائم ہے اور اُس کی کسی شئے کو تغیر نہیں۔ پارمی نائیدس ہی کو مثالیت پسندی کا بانی کہا جاتا ہے اور اُسی سے ظواہر و حقائق کی تفریق اور غیر مرئی حقیقت اور غیر حقیقی ظواہر کے مابین نزاع کا دور شروع ہوا جو انیسویں صدی میں کانٹ کے عہد تک جاری رہا جس کے فلسفے میں نزاع کا یہ سلسلہ عروج تک پہنچ گیا۔ مثالیت پسندوں کا خیال تھا کہ آغاز و انجام، پیدائش و مرگ، کون و فساد صرف ظواہر میں ہوتا ہے۔ حقیقت واحد کا نہ آغاز ہے نہ انجام ہوگا صرف وجود ہے اور تکوین و تخلیق محض واہمہ ہے۔ وجود واحد یعنی (خدا) کائنات میں ہر کہیں محیط ہے اور ساکن ہے۔ چنانچہ بجا طور پہ پارمی نائیدس کو فلسفہ واحدت الوجود کا اولین شارح قرار دیا جاتا ہے۔

پارمی نائیدس کے بعد لیوکپس کے افکار کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ لیوکپس میلٹس کا شہری تھا۔ لیوکپس دراصل پارمی نائیدس ہی کے افکار کا تسلسل تھا کیونکہ وہ پارمی نائیدس کے علمی تخیل سے متاثر تھا۔ یونان کا مقبول ترین فلسفی دیما قریطس لیوکپس ہی کا شاگرد تھا لیوکپس کے افکار کو آگے بڑھاتے ہوئے دیما قریطس نے پہلی بار کائنات کے بارے میں ایک سائنسی نظریہ پیش کیا جس کے مطابق کائنات کی بنا ذرے (ایٹم) پہ رکھی ہے اور کائنات ایٹموں ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ دیما قریطس کو مادیت پسندوں کا امام بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ انسان کے مادی اور روحانی مجموعے کے تصور کا مخالف تھا اُس نے کہا انسان بھی چھوٹے چھوٹے ذرات یعنی ایٹموں ہی کا مجموعہ ہے اور روح کچھ بھی نہیں۔ موت کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ موت ایٹموں کے منتشر ہو جانے کا نام ہے۔

دیما قریطس فطرت میں کسی بھی نوع کی مقصدیت اور غایت کا منکر تھا۔ اُسی نے سب سے پہلے یہ فلسفہ پیش کیا کہ ہر سبب کا ایک مسبب ہوتا ہے۔ کہکشاں کو اُس نے ستاروں کا جھرمٹ کہا۔ وہ اپنی قوم کا صاحب دانش شخص تھا لوگ اپنے معاملات کے حل کے لیے اس سے رجوع کیا کرتے تھے۔

اُس کے بہت سے اقوال مورخین نے رقم کیے ہیں جنھیں ہم طوالت کے خوف سے قلم انداز کرتے ہیں۔ دیماقریطس نے خوشی کا بھی منفرد تصور پیش کیا جس کی اُس سے قبل کوئی مثال نہ تھی۔ اُس کے خیال میں خوشی کا مال و متاع سے کوئی تعلق نہیں بلکہ خوشی براہ راست انسان کے بطون کا معاملہ ہے۔ اس کے بعد ایمپی ویکلس کا دور آتا ہے جس کا نظریہ کائنات کچھ اس طرح کے نظریات پہ مبنی ہے جیسے کہ اُس نے ڈارون کو وہ بنیادیں فراہم کی ہوں جس پہ انیسویں صدی میں ڈارون نے انسانی ارتقا کے متعلق مقبول عام نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ ایمپی ویکلس کہتا ہے کہ انسان کا ارتقاء حیات کی اسفل صورتوں سے ہوا تھا۔ اُس نے انسان کے دورِ وحشت سے تہذیب کی طرف ارتقائی سفر پہ مقالہ تحریر کیا جسے اپنے وقت میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ حیات کے آغاز اور انسانی تہذیب کے مبادیات پہ مباحث کے علاوہ اُس نے پہلی بار کائنات کی وہ تشریح کی جسے بعد کے کئی مذاہب کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُس نے عناصر اربعہ یعنی آگ ہوا پانی اور خاک کو کائنات کی بنیاد قرار دیا۔ جب اُس نے کہا کہ دریائے نیل میں طغیانی نوجوان لڑکی کی قربانی کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ اُس کی وجہ مصر اور حبشہ کے بالائی علاقوں میں ہونے والی بارش پہاڑوں پہ پگھلنے والی برف ہے تو اہل مذہب نے اس کا حصار کر لیا اور لوگوں کو اس کے نظریات سے متنفر کرنے کی کوشش کی۔

سقراط سے پہلے یونانی فلاسفہ کائنات کے مظاہر اور اُس کی تکوین و تخلیق کے آفاقی مسائل پر غور و فکر کرتے رہے۔ سقراط کے عہد میں سوفسطائیوں کا زور تھا۔ سوفسطائی تحریک کے عمومی معنی تو عقلمند کے ہیں۔ وہ صاحبانِ علم کی ایک تحریک تھی جو فن و اظہار کے موضوع پہ لیکچر دیتے اور نوجوانوں کو سیاسی زندگی کے لیے تیار کرتے۔ تاہم سوفسطائی مکتب فکر میں ایک فرد کی سوچ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی یعنی وہ نفرادی سوچ کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک آدمی کے نزدیک وہی سچ ہے جو وہ سوچتا ہے۔ اُن کے مطابق کسی شئے کی کوئی معروضی حیثیت نہیں ہے بلکہ ہر چیز محض ایک موضوعی وجود ہے۔ اُن کے نزدیک انسان کو کسی قانون کا پابند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اُسے آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ علم کے معاملے میں سوفسطائیوں کا کہنا تھا کہ علم کے مسئلے میں ہر فرد اپنے لیے خود ہی قانون ساز ہے۔ اس بات سے

قطع نظر کہ وہ اپنے معاملات کے متعلق کیا فیصلہ کرتا ہے اور معاشرے کے دیگر شہریوں پہ اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ خود کو آزاد خیال کرتے۔ اخلاقیات اُن کے نزدیک ایک رواجی معاملہ ہے اس لیے انسان کے لیے کسی خاص اخلاقی دائرہ عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ کہتے کہ اخلاقیات پہ مبنی پابندیاں فطرت کے خلاف ہیں۔ قانون کے متعلق اُن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ قانون تو کمزور لوگوں کی طرف سے ایک خوف کے تحت بنائے جاتے ہیں تا کہ اُن کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے ورنہ طاقت ور اُن کا حق کھا جائیں گے۔ کسی بھی قسم کے قانون کو وہ خلاف فطرت قرار دیتے اور کہتے کہ انسان کا بنیادی حق ہے کہ وہ اپنی طاقت اور صلاحیت سے جو چاہے حاصل کر لے اُس پہ کوئی قدغن نہیں ہے۔ سوفسطائی تحریک کے متعلقین نے مختلف انسانی آرا اور نقطہ ہائے نظر کو تو ملحوظ رکھا مگر انسانوں کے ہاں پائے جانے والے وسیع تر اتفاق رائے کو سرے سے نظر انداز کر دیا اس لیے عہد جدید میں سوفطسائیوں کو بیوقوف کہا جاتا ہے۔ تاہم سوفسطائی تحریک کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ علم کے معاملے پہ غور فکر کا آغاز ہوا اور علم کو ایک سنجیدہ مسئلے کے طور پہ لیا جانے لگا حالانکہ اس سے قبل یونان کے بڑے بڑے فلسفی علمی معاملات سے پہلو تہی اختیار کرتے رہے اور محض حیات اور کائنات کی تشریح میں محو رہے۔

مذہب کے معاملے میں یونان کے اہل فلسفہ نے کوئی قابل قدر کردار ادا نہیں کیا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اہل یونان جس مذہبی دیو مالا کے پیرو تھے اُس کا عقل کے ساتھ دور کا بھی کوئی تعلق نہ تھا اس لیے فلاسفہ جو ہر معاملے میں عقل کی شہادت طلب کرتے تھے فطری طور پہ مذہب سے باغی ہو گئے۔ اگرچہ لوگوں کے خوف سے پہلے اور دوسرے دور کے فلاسفہ نے مذہب کے خلاف محاذ آرائی کو اختیار نہیں کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ چند ہی صدیوں بعد یہود و نصاریٰ نے متعدد تبدیلیوں اور تحریف کے ذریعے انھی فلاسفہ کے نقطہ نظر کو مذہب کا حصہ قرار دے لیا۔ اہل یونان کے فلاسفہ کے دوسرے گروہ کے کائناتی نقطہ نظر کو بھی کچھ اتنا قابل قدر قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ وہ اپنے پیش روؤں کے افکار میں اضافے کا باعث تو ضرور بنے تاہم کسی اساسی تبدیلی کو محسوس نہیں کیا

گیا۔ چنانچہ سقراط کائنات کے ظواہر کے پس پردہ ایک حقیقت اولیٰ کا قائل تھا اور وہ الٰہیات اور مابعد الطبعیات کا انکاری تھا بلکہ اُس کے افکار اکثر و بیشتر اخلاقیات اور سیاسیات پہ مبنی تھے۔ اگرچہ وہ مذہب کے خلاف تھا مگر اُس نے کبھی کھل کے اس کا اظہار نہ کیا تھا اس کے باوجود مذہب پرستوں نے اسے الجھا لیا اور اُس پہ مروّج دیوتاؤں کی طاقتوں سے انکار کا الزام عائد کر دیا گیا عدالت میں اُس کا جرم ثابت کر دیا گیا اور اُسے سزائے موت سنا دی گئی۔ جس کے بعد اُس کے شاگرد افلاطون نے نظام فلسفہ کو باقاعدہ مدون کیا اور اسے ایک نظام فکر کی شکل میں پیش کیا۔ دنیائے فلسفہ میں افلاطون کو مثالیت پسندی کا شارح اول مانا گیا ہے اس لیے کہ اُس کا کہنا تھا کہ امثال ازلی و ابدی ہیں اور غیر متحرک ہیں۔ دنیا میں جتنی اشیاء دکھائی دیتی ہیں وہ سب امثال کے عکس ہیں۔ مثل اعلیٰ ہی حقیقت اولی ہے مثل حقیقی ہے اور مادہ غیر حقیقی ہے اور اپنے وجود کے لیے مثل کا محتاج ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام مادی اشیاء فریب نظر کا کرشمہ ہیں۔ امثال کا ادراک بنیادی قوت اشراق سے ہوتا ہے اس لیے افلاطون کو اشرقیت کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔

افلاطون نے خدا کو خیر محض کہا ہے اور اپنے مکالمات میں سقراط کی تین اعلیٰ اخلاقی اقدار خیر حسن اور صداقت سے مفصل بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیکی کی طرح حسن بھی توافق و تناسب ہی کا دوسرا نام ہے۔ افلاطون کے بعد فلاطینوس نے اشراقیت کے نام پر افلاطون ہی کے افکار کی نئے سرے سے تدوین کی اور فلاطینوس ہی پہ اہل یونان کے فلاسفہ کے اُس دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے جس نے علم و عمل اور حیات و کائنات پہ علمی افکار کو اختیار کرنے کی روایت کا آغاز کیا۔ اگرچہ اُن کے کائناتی تخیل کو قابل قبول قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم اول اول حیات اور کائنات کے بارے میں علمی تخیل اختیار کرنے کی بنا پہ اہل یونان کی جہد و سعی کو عبث بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ انھوں نے آنے والے لوگوں کے لیے علم کی روایت کو فروغ دیا۔ بعد کی بہت سی صدیوں میں انھی افکار کو الہامی مذاہب کے سائے میں فروغ حاصل ہوتا رہا۔ اس کے بعد جب انسان بلوغت کی ارفع حالت کو پہنچا تو اُسے قرآن کی نعمت سے نوازا گیا جس نے حیات اور کائنات کے بارے میں ہر ابہام کو دور کر دیا۔ پھر

مسلمان فلاسفہ کا دور آیا جن کے نظریات و افکار لامحالہ قرآن و سنت کی متابعت میں مرتب ہوئے ۔مسلمانوں کی علمی خدمات کو اس جلد میں الگ سے بیان کیا جائے گا یہاں ہم فلاسفہ کے اُس عہد پہ کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جس کو فلسفہ اور علم کا نیا دور قرار دیا گیا ہے۔اس دور میں مذہب بیزاری اور خالق سے بے اعتنائی کا رویہ عمومی طورِ زیست کے طور پہ اپنا لیا گیا تھا جس کے پس منظر میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے فلاسفہ کے افکار کار فرما ہیں۔فلاسفہ کے عہد جدید کا بانی دے کارت کو قرار دیا جاتا ہے۔وہ فلسفی ہونے کے علاوہ سائنس دان اور علم ریاضی کا بھی ماہر تھا۔اُس نے اپنی فلسفیانہ جستجو کا آغاز شک سے کیا اور اپنی جستجو کے آخر میں اُس نے وجودیت کے فلسفے کو پیش کیا اور کہا کہ شک سے مبرا صرف یہ بات ہے کہ میں ہوں۔یعنی اُس نے کہا کہ ذہن کا وجود مادے سے زیادہ یقینی ہے اور مادے کو ذہن کے حوالے ہی سے جانا جا سکتا ہے۔اُس نے کہا کہ خارجی اشیا کا علم حواس سے نہیں بلکہ ذہن سے حاصل ہوتا ہے چنانچہ دے کارت کی یہ موضوعیت جدید فلسفے کی روح میں سما گئی اور مثالیت پسندوں نے خاص طور پہ اسے اپنے منطقی استدلال کا موضوع بنا لیا۔

ازاں بعد روسو کا عہد آیا جس نے عقلی تفکر اور سائنسی نقطہ نگاہ کی مخالفت کی اُس کے فلسفے کی بنیاد فطرت تھی وہ لوگوں کو فطری قوانین سے مطابقت اختیار کرنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔اُس نے اہل فرانس کی خرد پرستی اور دانش دوستی کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔روسو کے عہد میں ہی لوگوں کی بہت بڑی اکثریت نے اپنا دامن سائنس اور مادیت پہ استوار نگاہ فکر سے وابستہ کر لیا تھا۔اُن کا کہنا تھا کہ عنقریب انھیں مذہب کی جاہلیت سے نجات مل جائے گی اور وہ مذہبی توہمات سے آزاد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جہاں روشن خیالی اور حقیقت پسندی کا دور دورہ ہو گا۔چنانچہ لوگوں کے دل کی اس آواز کو گبن اور ہیوم نے استدلالی اور علمی پس منظر فراہم کر دیا جس سے اُس فلسفیانہ نقطہ نظر کا آغاز ہوا جو خالق کے وجود سے عاری تھا۔

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کے فلاسفہ نے سائنسی بنیادوں پہ ایک نیا مذہب وضع کرنے کا تصور پیش کیا اگر چہ وہ اس میں تو کامیاب نہ ہو سکے تاہم وہ ایک ایسا طورِ زیست وضع کرنے میں ضرور کامیاب رہے جس میں کسی خالق کی کوئی گنجائش نہ تھی ۔ چنانچہ کانٹ ہو یا ہیگل ،شیلنگ ہو یا

برگساں، دے کارت ہو یا جیمز واٹ، ول ڈیورانٹ ہو یا اینجل ہو، مارکس ہو یا تھامس ہابس اُن کی فکر کے ذیلی عنوانات سے قطع نظر اُن کے نظریات کی کسی ایک مشترک اساس پہ نگاہ کی جائے تو وہ خالق کا انکار ہے۔ چنانچہ خالق کے انکار پہ اِن فلسفیوں نے علم کی جو عمارت تعمیر کی وہ ریت کا ایک ایسا قلعہ ہے جو علم قرآن کے ہلکے سے جھونکے سے ہی زمین بوس ہو جائے گا مگر صد افسوس کہ اہل قرآن ابھی غفلت میں ہیں۔ اللہ ہمیں ہدایت سے نوازے۔ (3*)

علم کے ان پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے ہم انسان کے علمی ارتقاء کا جائزہ لے رہے ہیں۔انسان کے اولین دور سے لے کر آج کے چمکتے دمکتے معاشروں تک انسان نے کن کن علمی سنگ میل کو عبور کیا انھی کا مطالعہ ان صفحات میں مقصود ہے، دراصل تو ان صفحات میں اُن انسانی تفکرات کو موضوع بحث بنایا ہے جن کے آج کے متمدن معاشروں کی اکثریت کسی خالق کے وجود سے عاری ہے۔اگر اُن میں سے کم سلیم الطبع لوگ کسی خالق پر یقین بھی رکھتے ہیں تب بھی خالق کے ساتھ اُن کا تعلق معدوم ہے۔

علم کا صوفیانہ امتزاج

تصوف سے صوفی ازم کی بنیاد پڑی۔ طریقت صوفی ازم کا دستور ہے۔ اگرچہ تصوف کی تاریخ بہت قدیم ہے تاہم اسلام میں رائج تصوف اسلام کی اجلی اور سفید چادر پہ سیاہ اور بدنما دھبے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ تصوف کی بنیاد راہبانیت ہے اور راہبانیت اسلام کی ضد ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ دین میں جو کچھ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات سے زائد ہے وہی تصوف ہے۔ اس لیے کہ جب قرآن حکیم میں اس امر کو واضح کر دیا گیا کہ انسان کی آنکھیں اُس ذاتِ باری تعالیٰ کو نہیں پا سکتیں تو پھر قرآن کی ضد میں شوق وصال کی منزلوں کو کیا نام دیا جائے۔ مشاہدہ حق کی خاطر چلہ کشی رجال غیب سے روابط کے دعوے، کشف و مشاہدات کے کرشمے، آئینہ باطن کی صفائی کا تخیل، سمع و وجد کے طریق، دین طریقت کے اندھے نظریات، ترک لذات کی روایت، خواہش نفس سے اجتناب، ترک اکل ونوم، فہرست حلال سے انکار، کشف و کرامات، حالت سکر اور مکاشفات، نظریہ حلول کی تقرار، ولایت و نبوت کا تقابل، عشق و سرمستی کے مظاہر جیسے تمام امور کا اسلام کے ساتھ سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ یہ سب امور وہ زوائد ہیں جن کا نہ تو رسول اللہ ﷺ کی مبارک زیست سے کوئی حوالہ پیش کیا جاسکتا ہے اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں اس طرح کا کوئی چلن ثابت

کیا جاسکتا ہے۔

اور قرآن تو بہ بانگ دہل کہہ رہا ہے۔

وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔

القرآن الحکیم (سورۃ الحدید 27/57)

ترجمہ؛

''اور انھوں نے لذات سے کنارہ کشی کی خود ایک نئی بات نکال لی، جس کا ہم نے اُن کو حکم نہیں دیا تھا مگر انھوں نے (اپنے خیال کے مطابق) خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (خود ہی ایسا) کر لیا تھا، پھر جیسا اس کو نباہنا چاہیے تھا نباہ بھی نہ سکے۔ پھر جو اُن میں سے ایمان لائے اُن کو ہم نے اُن کا اجر دیا اور اُن میں سے زیادہ نافرمان ہی ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

دستورِ تصوف جس کو عرف عام میں طریقت کہا جاتا ہے وہ شریعت اسلامی سے زائد ایک ایسا دستورِ عمل ہے جس کی بنیاد میں انسان کی خواہش نفس کار فرما ہے۔ چنانچہ لوگوں نے دین اسلام میں وہ بہت سے امور وضع کر لیے جو اسلام کی ضد ہیں۔ تاریخ مذاہب کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی دین میں جب بھی بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ابتداء ہمیشہ مقدس اور نیک آرزوؤں سے ہی ہوتی ہے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے لیے بھلائی کے کسی تصور سے سیر نہیں ہوتا اور کامیابی کی ہر منزل کو جلد از جلد حاصل کرنے کی خواہش پالتا رہتا ہے۔ علم تصوف کی بنیاد اس مفروضے پہ رکھی گئی

ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے آخرت میں جمع کر رکھا ہے اُس کا کچھ حصہ اسی دنیا میں حاصل کرلیا جائے۔ چنانچہ اُس نے غیب کے پردوں کے اس پار جھانکنے کی ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں ۔تب اُس نے جانا کہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مادیت ہے ،خواہش نفس ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اس گروہ نے خود پہ ہر اُس چیز کو حرام کرلیا جسے اللہ اور اُس کے رسول نے مسلمانوں کے لیے حلال قرار دیا تھا۔ وہ اپنی بیویوں سے دور رہنے لگے، اپنے بچوں کو پہچاننے سے انکار کرنے لگے، اپنے ساتھیوں سے بے اعتنائی برتنے لگے ۔اپنے فرائض سے کوتاہی کی روش اختیار کرلی، اس کے بعد انھوں نے سماج سے منہ موڑ لیا اور دور جنگلوں اور ویرانوں میں جا کر اُس مشقت میں پڑ گئے جس کی انھیں کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی اُن کو اس امر کا حکم دیا گیا تھا۔

علم تصوف کی بنیاد ترک دنیا، ترک لذات، ترک حلال اور ترک مباحات پہ رکھی ہے۔ اس مشقت سے اُن کا مقصود خدا کی تلاش تھا مگر عجیب بات ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے جو طریقہ امت کو سکھایا امت کے اس گروہ نے اسے یکسر بھلا دیا اور خدا کی تلاش میں ہوائے نفس کی خواہش کو رسول اللہ ﷺ کے طریقے پہ ترجیح دی انھوں نے خدا تک پہنچنے کے ایسے طریقے ایجاد کیے جن کا کوئی ثبوت قرآن وحدیث سے نہیں ملتا۔ انھی طریقوں کی تفصیلات کو طریقت کہا گیا۔ بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ طریقت یا تصوف دین اسلام سے متعلق کوئی چیز ہے حالانکہ تصوف کی تاریخ تو اسلام سے کئی ہزار سال قدیم ہے۔ اول اول یونانیوں کے ہاں کچھ ایسے لوگوں کا پتہ چلا ہے جو دنیا کو ترک کر کے جنگلوں اور ویرانوں کو نکل جاتے تھے۔

وہ جادو کا عمل سیکھتے اور لوگوں کی گمراہی کا سامان کرتے۔ اہل یونان نے جب مذہب نصرانیت اختیار کیا تو تصوف کی کئی صورتیں اُن میں مروّج تھیں۔ چنانچہ یونانی فلسفہ کے ساتھ ساتھ تصوف کی بھی کئی صورتیں دین عیسوی میں منتقل ہو گئیں ۔ یہودیوں میں اگرچہ حضرت موسیٰ کی تعلیمات پہ پختگی سے قائم رہنے والا ایک طبقہ بھی موجود رہا مگر اُن کی اکثریت نے دین میں بگاڑ کو رواج دیا۔ چنانچہ اہل نصاریٰ کے راہبوں اور یہودیوں کے ربیوں نے لوگوں سے کہا کہ نجات کا رستہ اجتناب میں ہے

۔چنانچہ دین نصرانیت میں راہبانیت رواج پانے لگی۔یاد رہے کہ دین عیسوی میں بھی راہبانیت کو انھوں نے اللہ کے حکم سے اختیار نہ کیا تھا بلکہ انھوں نے اس راہ کو خواہش نفس کی بنا پہ اختیار کرلیا تھا ۔اُن لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ روحانیت کے راستے میں حائل سنگ گراں ہمارا مادی جسم ہے۔لٰہذا اس جسم کو مضمحل اور کمزور بنانے کے لیے طرح طرح کے عذاب دیئے جانے لگے۔کم سے کم کھانا،کم سے کم پینا کہ جس سے بمشکل جسم وروح کا نظام قائم رہ سکے۔کم سے کم سونا،دنیوی لذات جن سے فائدہ اٹھانے کا خدا نے انھیں حق دیا ہے اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔شدید سردی میں ننگے بدن رہنا اور باہر رہنا،اور کہیں شدید گرمی میں خود کو دھوپ میں باندھے رکھنا،کئی کئی دن تک ایک ہی جگہ کھڑے رہنا اور ایک ہی پاؤں پر کھڑے رہنا،کیچڑ میں پڑے رہنا،چپ کا روزہ رکھنا اور اس طرح کی سینکڑوں اذیتیں ہیں جن کی تفصیل لامحدود ہے جو وہ خود کو پہنچاتے اور بزعم خود اُن کے یہ سارے اعمال خدا کی خوشنودی کے لیے ہوتے کہ شاید انھیں خدا کا دیدار ہو جائے۔

اُن میں سے بعض اپنے جسموں پہ زخم کر لیتے اور اُن کا کوئی علاج نہ کرتے حتیٰ کہ اُن میں کیڑے پڑ جاتے اور جب اُن کیڑوں میں سے کوئی کیڑا زخم سے پھسل کر نیچے آ گرتا تو اُسے اٹھا کے دوبارہ زخم پہ رکھ دیتے اور کہتے کیوں اپنی خوراک سے انکاری ہو۔گویا اپنی جان سے دشمنی تصوف کا پہلا اصول ٹھہرا۔چنانچہ جسم کی تعذیب اور اس کے تقاضوں کی تکذیب کے ذریعے وہ اپنے جسم کو تحلیل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے۔اِن لوگوں کا دوسرا قدم دنیا والوں سے قطع تعلق تھا۔یہ لوگ اپنے لیے کوئی گوشہ تنہائی چن لیتے یا پھر باہر جنگلوں اور ویرانوں کو نکل جاتے۔اس لیے کہ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح وہ لوگوں سے دور اور خدا سے نزدیک ہو جائیں گے۔وہ سمجھتے کہ اُن کے معاشرتی تعلقات اُن کو خدا سے دور لے جا رہے ہیں چنانچہ وہ دنیا سے الگ تھلگ اور دور ویرانوں میں اپنا ٹھکانہ بناتے۔یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ عیسائیت سے راہبانیت ہندوؤں میں منتقل ہوئی اس لیے کہ ہندوازم نصرانیت سے قدیم مذہب ہے۔تاہم اِن دونوں کی راہبانیت میں بہت سے امور مشترک ہیں۔ ہندومت کے راہنماؤں نے انسان کی عمر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور عمر کے آخری حصے میں

راہبانیت کو لازم قرار دیا ہے۔تاہم چونکہ ہندوازم کوئی مربوط اور مدون مذہب نہیں ہے اس لیے ہندوؤں کے ہر شہر کا دیوتا الگ ہے اور ہر شہر اور علاقے کے رسم ورواج بھی الگ الگ ہیں۔اور ہندوؤں میں بہت سے فرقے ہیں، جن میں چولی مارگ، بھکشو، سنیاسی اور جوگی ہیں جو جنگلوں اور ویرانوں میں رہتے اُن کا مقصد شکتی (طاقت) حاصل کرنا ہوتا۔ پھر بدھ ازم ہے جس کی بنیاد ہی راہبانیت پر ہے۔بدھ تو سارے کے سارے راہبانیت پہ عمل پیرا تھے۔ہندوستان کی سرزمین میں جب اسلام پہنچا تو وہ خالص تھا اور بغیر کسی ملاوٹ کے لوگ اللہ کی توحید پہ کار بند تھے۔پھر لوگوں نے دین میں ملاوٹ کر دی اور طریقت کے دستور اپنا لیے۔قبریں بنا لیں مزار بنا لیے اور اُن کی پوجا کی جانے لگی۔اور یہ وہ امور ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ سب امور دین اسلام کی ضد ہیں کہ دین اسلام تو دین توحید ہے اور اِن سب امور سے شرک کی بو آتی ہے۔انسان سوچے تو اہل قریش اور رسول اللہ ﷺ کا کیا اختلاف تھا یہی کہ وہ بتوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کرتے تھے تو چاہے کسی بت کو اللہ کی ذات میں شریک کر لیں یا کسی قبر کو اللہ کی صفات میں شریک کر لیں تمام صورتیں شرک ہی کی صورتیں ہیں اور شرک وہ ظلم عظیم ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم میں بصراحت بیان کر دیا گیا کہ روز محشر میں جس کو چاہوں گا بخش دوں گا مگر کسی مشرک کو ہرگز معاف نہ کروں گا۔

اسلام میں راہبانیت کے اولین نشان دوسری صدی ہجری میں ملتے ہیں۔تاہم اُس وقت مسلمان اپنے عقائد میں پختہ تھے۔انھیں رسول اللہ ﷺ کے ارشادات زبانی یاد تھے اس لیے وہ راہبانیت کو دین کی ضد سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ جس بات سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا اُس کو اختیار کرنا دراصل دین سے ہی انکار ہے۔چنانچہ خیر القرون میں عبداللہ بن سبا اور اُس کے پیروکاروں کو کافر قرار دے دیا گیا اور امت کے اس ناسور کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا مگر پھر یہ سلسلہ نہ رُک سکا۔امت کا پہلا شخص جس نے فقر و فاقہ اختیار کیا اور نفلی عبادت میں غلو کا شکار ہو اُس کا نام حارث بن اسد محاسبی بیان کیا گیا ہے(4*)۔ اُس کا باپ رافضی تھا اُس نے اپنے باپ کی میراث لینے سے انکار کر دیا

تھا۔ یہ وہ دور تھا جب یونانی فلسفے کا اثر اسلامی نظریات پہ محسوس کیا جانے لگا تھا۔ حارث بن اسد نے علم کلام کے سلسلے میں بعض مسائل پہ گفتگو کی۔ وہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہم عصر تھا۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو پہلے حارث بن اسد سے ملتے رہتے تھے حارث کے نظریات میں تبدیلی، تصوف کی طرف اُس کے رجحان کی وجہ سے انھوں نے اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ صوفی کی اصطلاح بھی دوسری صدی ہجری ہی کی ایجاد ہے سب سے پہلا شخص جو صوفی کے نام سے مشہور ہوا۔ اُس کا نام ابو ہاشم محمد بن احمد الصوفی تھا۔ صوفی کے لفظ کی کئی توجیہات بیان کی جاتی ہیں تاہم راجح یہی ہے کہ چونکہ وہ لوگ اون کا موٹا کپڑا پہنتے تھے اور خرقہ یا گدڑی اُن کا شعار بن چکی تھی لہٰذا یہ لوگ صوفی کہلائے۔ صوفیا کے مخصوص نظریات وعقائد بھی اسی دور کی پیداور ہیں (5*)۔

تیسری صدی عیسوی کے اواخر میں ابوعبداللہ الحکیم ترمذی (م 268ھ) نے تصوف پہ پہلی کتاب لکھی جس کا نام "**ختم الولایۃ**" تھا۔ اس کتاب میں بہت سے خلاف شریعت امور وضع کیے گئے اُس نے کہا کہ جس طرح انبیاء کے سلسلے کا اختتام ہوتا ہے اسی طرح اولیاء کے سلسلے کا بھی اختتام ہوتا ہے اُس نے تصوف کے بعض مسائل پر بھی اپنا خاص نقطہ نظر پیش کیا۔ علمائے وقت نے اُس کی مدافعت کی اور بہت بڑی شورش بپا ہوئی۔ بلآخر اُس کو کافر قرار دے دیا گیا اور اسے ترمذ سے جلاوطن ہو کے بلخ میں پناہ حاصل کرنا پڑی۔ یاد رہے کہ منصور حلاج اور ابوعبداللہ ابوالحکم ہم عصر تھے۔ ابوعبداللہ ابوالحکم کے نظریات پہ ابن عربی نے مزید حاشیہ آرائی کی اور حد ہی کر دی اُس نے کہا کہ ولایت نبوت سے افضل ہے بعد میں اُس نے خود کو اولیا کے سلسلے کا آخری ولی قرار دے دیا۔

پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔ لوگ گمراہ ہوتے رہے دین میں ملاوٹ بڑھتی۔ اور تصوف کے مقدمات لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ علماء نے رہبانیت کی کشش کی وجوہات پہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کہنا غلط ہو گا کہ قرآن وحدیث میں دنیا سے بے رغبتی کے بارے میں جو ارشادات پائے جاتے ہیں وہ رہبانیت کی بنیاد ہیں کہ اِن ارشادات کو سمجھنے والے سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب تھے لیکن اُن کی زندگیوں میں رہبانیت کا کوئی عکس نہیں پایا جاتا۔ بلا شبہ

دنیا اور اُس کے مال و اسباب سے بے رغبتی بھی دین کا ایک حصہ ہے لیکن یہ پورا دین نہیں کہ معاشرتی، معاشی اور عائلی حقوق اور ان کی ذمہ داریاں زندگی کا اہم حصہ ہیں جو اِن ترغیبی ارشادات سے ساقط نہیں ہوتیں۔ بلکہ رہبانیت کو اختیار کرنے کے بہت سے دیگر اسباب ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ دنیا کے جھمیلوں میں پھنس کر کبھی یکسوئی کے ساتھ روحانی ترقی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اُن کا خیال ہے کہ روحانی ترقی کا کوئی راستہ دنیا کے اندر سے ہو کر نہیں گزرتا لہٰذا درویش قسم کے لوگ اسے نیکی سمجھ کے اختیار کر لیتے ہیں۔ جب کہ اسلام صرف ایسی روحانی ترقی کا قائل ہے جس کا راستہ دنیا کے اندر سے ہو کر نکلتا ہو۔ اگرچہ یہ روحانی ترقی تھوڑی ہو یا بہت بہرحال مقبول ہے اس لیے کہ وہ شریعت کی حدود کے عین مطابق ہوگی۔ چنانچہ اگر کوئی شخص روحانیت کی ترقی کے لیے وہ امور اختیار کرتا ہے جس میں شرع کی حدود کو پھلانگ جاتا ہے تو ایسی ترقی کی اسلام میں کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

اب چاہے وہ ہندو جوگی بن جائے یا سادھو اسلام کو اُس سے کوئی غرض نہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں نے روحانی مدارج حاصل کرنے کے لیے کشف اور مراقبے کا طریقہ اپنایا ہے۔ یہ لوگ عالم ارواح یا رجال الغیب سے تعلق قائم کرتے ہیں، چلہ کشی کرتے ہیں، کبھی وہ کسی کنویں میں کئی روز تک الٹے لٹکے رہتے ہیں تو کبھی سردی کی یخ راتوں میں دریا کی سرد لہروں میں ایک ٹانگ پہ کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی یہ لوگ گندگی نگل جاتے ہیں تو کبھی کئی کئی سال تک نہ بالوں میں کنگھی کرتے ہیں اور نہ ہی کپڑے بدلتے ہیں اُن کے جسموں کی بو دور دور تک جاتی ہے اور سادہ لوح لوگ انھیں اہل علم خیال کرتے ہوئے اِن کی تعظیم کرتے ہیں۔ کبھی اندھیری راتوں میں قبروں پہ ڈیرا ڈالے بیٹھے ہوتے ہیں تو کبھی اس طرح کی حرکتیں کرتے ہیں کہ لوگ انھیں لعنت و ملامت کریں۔ یہ لوگ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں عورت یعنی اپنی بیوی سے الگ ہو جاتے ہیں اور یہ سب امور شریعت اسلامیہ کے خلاف اور دستور طریقت کے مطابق ہیں۔ اس لیے جب اِن لوگوں سے کہا جائے کہ تم تو خود کو مسلمان کہتے ہو تو وہ نام نہاد باطنی علم کے حوالے دیتے ہیں۔ اِن لوگوں کو قرآن حکیم کے احکامات اور

ارشادات نبوی کی چنداں پرواہ نہیں ہوتی بلکہ اُن کے نزدیک اُن کے شیخ کی بات قرآن وسنت سے اولیٰ ہے۔اسی ذہنیت کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ!

''اپنی جانوں پہ سختی نہ کرو۔کیونکہ ایک قوم نے اپنی جانوں پہ سختی کی پھر اللہ نے بھی اُن پہ سختی کی۔(یعنی اُن کی ایجاد کردہ معیار عبادت ہی اُن کی جانچ کے لیے مقرر کردیا گیا)اس قوم کا بقایا گرجوں اور خانقاہوں میں ہے (پھر آپ ﷺ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ)لوگوں نے راہبانیت کو خود ہی اختیار کرلیا اللہ نے تو انھیں اس قسم کا کوئی حکم نہ دیا تھا''۔ (6*)

✡✡✡✡✡✡

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بلاشبہ دین آسان ہے کوئی شخص دین میں (اپنے آپ پر) سختی نہ کرے کہ وہ عمل (اسے بعد میں) عاجز کردے۔پس ہر عمل ٹھیک طرح بجالاؤ اور میانہ روی اختیار کرو اور خوش ہو جاؤ اور صبح وشام اور آخری رات کے کچھ حصے میں اللہ سے مدد طلب کرتے رہو۔'' (7*)

✡✡✡✡✡✡

دستورِ طریقت میں قلب کی صفائی کے لیے یہ لوگ طرح طرح کی مشقتیں کرتے ہیں تب انھیں کچھ نہ کچھ حاصل ہو ہی جاتا ہے۔مگر یہ کچھ نہ کچھ کبھی حاصل خیر نہیں ہوتا بلکہ انھیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ شیاطین کے واسطے سے حاصل ہوتا ہے۔چنانچہ شیطان سے حاصل کی گئی کچھ شعبدہ بازیاں دکھا کر یہ لوگ خود کو دوسروں سے ممتاز قرار دے لیتے ہیں اور مشاہدہ حق کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔جو ایک

بہت بڑا دعویٰ ہے حالانکہ اُن کے دامن سے تو ایمان تک رخصت ہو چکا ہوتا ہے اور وہ ملائے اعلیٰ اور ذات باری تعالیٰ سے اتصال کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ نے فرما دیا کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے تو اب چاہے کوئی ہمیں ہوا میں اُڑ کے دکھا دے ہم اُس کے نظریہ کو رد ہی کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کو راہبانیت سے اجتناب کی جو تعلیم دی وہ بالکل واضح ہے اور اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی زبان اطہر سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ موجود ہے، سلامت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد بھی کوئی شخص جہل کی اُس وادی میں اترنا چاہے جس کو تصوف کہتے ہیں تو اُس کی مرضی ہے کہ انسان کو خیر و شر کے مابین اختیار جو دے دیا گیا ہے۔

صحابہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کسی غزوے پہ تشریف لے گئے۔ راستے میں کسی جگہ قیام فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے ایک شخص نے دیکھا ہے، ایک غار ہے جس میں انسان آرام و سکون کے ساتھ رہ سکتا ہے، ساتھ ہی ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ رواں ہے ہر سو پھل دار درختوں کی کثرت ہے۔ انھوں نے یہ سب دیکھا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور عرض کی:

یا رسول اللہ ﷺ! مجھے ایک غار مل گیا ہے جس میں رشتہ حیات برقرار رکھنے کے تمام لوازم موجود ہیں آپ ﷺ مجھے اجازت دیں تو میں یہیں رُک جاؤں اور گوشہ نشین ہو جاؤں۔

رسول اللہ ﷺ نے فوراً فرمایا:

نہیں! میں یہودیت اور نصرانیت لے کر نہیں آیا میں تو دین ابراہیم لے کر آیا ہوں جس میں سہولت اور آسانی ہے۔(8*)

✡✡✡✡✡✡

اسی ضمن میں ایک اور روایت میں ہے کہ:

حضرت عثمان بن مظعونؓ رسول اللہ ﷺ کے مقرب صحابی تھے۔انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے اعضائے شہوت کو کاٹ ڈالیں یا خصی ہو جائیں۔دنیا کی تمام لذتوں کو ترک کر دیں اور تارک دنیا ہو جائیں۔

رسول اللہ ﷺ کو اِن باتوں کا علم ہو تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو طلب کیا اور فرمایا:

جو شخص جان بوجھ کر اپنے اعضائے شہوت کو فنا کرے گا وہ میری امت میں نہیں اٹھے گا۔کیا تمھارے لیے میری ذات کا اسوہ کافی نہیں کہ میں نکاح بھی کرتا ہوں اپنی بیویوں کے پاس بھی جاتا ہوں گوشت بھی کھاتا ہوں۔روزے بھی رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں۔

بیان کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی فہمائش کے بعد حضرت عثمان بن مظعونؓ اپنے ہر اس ارادے سے باز آ گئے جس کو رسول اللہ ﷺ نے ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

(*9)

✡✡✡✡✡✡

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ بڑے زاہد و عابد تھے۔اُن کو عبادت کا اس قدر شوق تھا کہ ساری ساری رات نوافل میں گزار دیتے۔اور سارا سارا دن روزے سے رہتے۔وہ اپنے اہل و عیال سے دور ہو گئے اور ہمہ وقت یادِ الٰہی میں گزارنے لگے۔وہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔

اُن کے والد حضرت عمرو بن العاصؓ اپنے بیٹے کی اس رہبانیت سے پریشان تھے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت عبداللہؓ کی شکایت کی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو طلب کیا اور اُن کے شب و روز کے بارے میں استفسار کیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو سچ تھا وہ کہہ دیا۔

تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عبداللہؓ یہ سب چھوڑ دو اور میرا طریقہ اختیار کرو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے دریافت کیا رسول اللہ ﷺ آپ کا طریقہ کیا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''روزہ بھی رکھا کرو، ناغہ بھی کیا کرو، رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو کیونکہ تمھارے جسم کا بھی تم پہ حق ہے، تمھاری آنکھ کا بھی تم پہ حق ہے، تمھاری بیوی کا بھی تم پہ حق ہے، تمھارے مہمانوں کا بھی تم پہ حق ہے، تمھارے دوستوں کا بھی تم پہ حق ہے، ہمیشہ روزہ رکھنا تو ایسے ہے جیسے کسی نے روز رکھا ہی نہ ہو، چنانچہ مہینے میں تین روزے رکھ لینا کافی ہیں اور یہ تین روزے ایسے ہیں جیسے تو نے ہمیشہ روزہ رکھا ہو۔ اور مہینے میں ایک قرآن ختم کر لیا کرو یہ کافی ہے۔

حضرت عبداللہؓ نے عرض کی:

یا رسول اللہ ﷺ میں اس سے زیادہ کی قدرت رکھتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

پھر تم داؤدؑ کا طریقہ اختیار کر لو۔ جو ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک روز ناغہ کرتے تھے اور سات راتوں میں قرآن ختم کر لیا کرو۔

حضرت عبداللہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

نہیں اس سے زیادہ نہیں۔

حضرت عبداللہ خاموش ہوگئے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے آگے سر جھکادیا۔

(10*)

✡✡✡✡✡✡

حضرت عثمان بن مظعونؓ ہی کے بارے میں ایک اور روایت ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ کو علم ہوا کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ رات بھر نماز پڑھتے ہیں اور دن بھر روزے سے رہتے ہیں۔عبادت کے لیے انھوں نے گھر میں ہی ایک حجرہ بنالیا تھا۔وہ بیوی بچوں سے بے نیاز ہو چکے تھے،وہ حجرے میں ہی معتکف رہا کرتے تھے۔رسول اللہ ﷺ کو اُن کے اس طرزِ عمل کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ اُن کے گھر تشریف لے گئے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ اپنے حجرے میں ہی مقیم ہیں اور عبادت میں مشغول ہیں۔رسول اللہ ﷺ اُن کے حجرے کی چوکھٹ میں کھڑے ہوگئے اور حضرت عثمان بن مظعونؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

اے عثمانؓ: اللہ تعالیٰ نے مجھے رہبانیت کے لیے دنیا میں نہیں بھیجا۔اللہ کے نزدیک دین حنیف ہی تمام ادیان سے بہتر ہے یہ آسان بھی ہے اور سہل بھی۔

✡✡✡✡✡✡

یہی روایت مسند ابی داؤد میں ذراسی تبدیلی کے ساتھ درج ہوئی ہے کہ:

بیان کیا گیا ہے رسول اللہ ﷺ کو حضرت عثمان بن مظعونؓ کی عبادت کا حال معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن مظعونؓ کو طلب کیا اور فرمایا:

عثمانؓ! کیاتم کومیری سنت پہ عمل کرنا پسند نہیں۔

حضرت عثمانؓ نے جواب دیا :

یارسول اللہ ﷺ: میرے ماں باپ آپ پہ قربان ہوں آپ کی سنت ہی تو مشعل راہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو سنو

میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزے بھی رکھتا ہوں افطار بھی کرتا ہوں، عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، عثمان اللہ سے ڈرو۔ تمہاری بیوی کا بھی تم پہ حق ہے، تمھارے مہمان کا بھی تم پہ حق ہے، تمھارے نفس کا بھی تم پہ حق ہے، اس لیے تم روزہ بھی رکھو، اور افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔

(11*)

✡✡✡✡✡✡

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

ایک بار میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں ایک جوان آدمی ہوں میں اپنے نفس سے پریشان ہوں کہیں میں گناہ میں ملوث نہ ہو جاؤں۔ میں شادی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ مجھے خصی ہونے کی اجازت دی جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی بات کو سنا: مگر سکوت اختیار کیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے دوبارہ عرض کی:

رسول اللہ ﷺ پھر بھی خاموش رہے:

حضرت ابو ہریرہؓ نے پھر اپنی بات کہی۔

تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ابو ہریرہؓ! اللہ کا حکم اٹل ہے جو ٹل نہیں سکتا۔

یعنی تمہارے خصی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو اللہ کو منظور ہو گا وہ ہو کے رہے گا ۔پھر جلد ہی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو ہریرہؓ کے لیے ایسے سامان پیدا کر دیا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی شادی ایک امیر خاتون سے ہو گئی۔

✡✡✡✡✡✡

ابن سعدؒ نے اس ضمن میں یہ روایت بیان کی ہے کہ:

حضرت کہمس الہلالیؓ رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے۔ وہ مدینہ سے کہیں دور دراز کے رہنے والے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے مبلغین کی دعوت پہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اس کے بعد وہ مدینہ تشریف لائے اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پہ اپنے اسلام کی تجدید کی۔ اس کے بعد واپس چلے گئے۔ اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔

وہ عبادت سے بہت محبت کرتے تھے اس لیے اپنے وطن گئے تو دن رات عبادت میں مشغول ہو گئے۔ وہ رات بھر نوافل پڑھتے رہتے، دن کو روزہ رکھتے۔ اور اسی معمول پہ طویل عرصہ تک قائم رہے جس کی وجہ سے اُن کی صحت بہت گر گئی ۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔

کوئی ایک سال بعد رسول اللہ ﷺ سے ملنے کے لیے مدینے تشریف لائے۔

رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا مگر رسول اللہ ﷺ اُن کو نہ پہچان سکے اس لیے کہ اُن کی حالت ہی بدل گئی تھی شدید مشقت کی وجہ سے وہ بہت لاغر ہو گئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا ؟ تم کون ہو۔

انھوں نے جواب دیا:

یارسول اللہ ﷺ میں پچھلے سال ہی تو آپ سے ملا تھا اور اسلام قبول کیا تھا کیا آپ مجھے بھول گئے ہیں میرا نام کہمس الہلالی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو یاد آ گیا۔تاہم آپ ﷺ نے فرمایا:

مگر تمہیں ہوا کیا ہے؟

حضرت کہمسؓ الہلالی نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ یہ سب تو عبادت کی کثرت کی وجہ سے ہوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے قدرے غصے سے انھیں مخاطب کیا اور فرمایا:

تمھیں اس قدر تکلیف اٹھانے کا حکم کس نے دیا تھا۔

پھر میں کیا کروں۔حضرت کہمسؓ نے سوال کیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

پورے مہینے میں بس ایک روزہ کافی ہے۔

حضرت کہمسؓ نے فرمایا مگر میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

چلو تین سہی مگر اس سے زیادہ نہیں۔(12*)

✡✡✡✡✡✡

اسی طرح ایک دفعہ کچھ صحابہ ازواج مطہرات کے پاس حاضر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے متعلق دریافت فرمایا:

رسول اللہ ﷺ کی بیویوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نماز بھی پڑھتے ہیں سوتے بھی ہیں۔گھر کے کام بھی کرتے ہیں اور دیگر امور میں بھی مشغول رہتے ہیں۔

صحابہ کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ بہت زیادہ عبادت کرتے ہوں گے مگر انھیں یہ جان کے حیرت ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ اس قدر عبادت نہیں کرتے جس قدر کہ اِن کا خیال تھا۔

تاہم پھر انھوں نے سوچا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت اللہ تعالیٰ نے اُن کے تمام گناہ معاف فرمادیئے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے آپس میں اس بات کا تذکرہ کیا۔

پھر اُن میں سے ایک بولا:

میں تو اب دن رات اللہ کی عبادت میں ہی گزاروں گا تا کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہو جائے۔

دوسرا بولا:

میں تو اب مسلسل روزے رکھوں گا حتی کہ میرا رب مجھ سے راضی ہو جائے۔

تیسرا بولا:

میں عمر بھر شادی نہیں کروں گا بلکہ ہمیشہ اللہ کی عبادت کروں گا۔

رسول اللہ ﷺ حجرے کے اندر ہی تھے اپنے اِن صحابہ کی باتوں کو سن رہے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے آواز دے کہ اِن تینوں صحابہ کو بلالیا۔

نبی اکرم ﷺ نے اِن سے فرمایا:

''واللہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں، مگر میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو یاد رکھو تم میں سے جو میرے طریقے پہ نہیں چلتا وہ میری جماعت سے خارج ہو گیا''۔

(13*)

✡✡✡✡✡✡

رہبانیت کے حوالے سے بہت سی حدیثیں ہیں۔ہم نے تو صرف انتخاب پیش کیا ہے۔یاد رہے کہ ہندوؤں کے قریب ہونے کی وجہ سے ہم پاکستانی مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کی تعلیمات میں قدرے تفاوت آ گیا ہے۔اور ہم بہت سے اُن لوگوں کو جانتے ہیں جنھوں نے ہندوؤں سے جوگی ازم کو اپنایا اور راہبانیت کی طرف مائل ہوئے ۔سادہ لوح مسلمان انھیں قابل عزت اور صاحب تقویٰ جانتے ہیں، حالانکہ اُن کے منکوں اور گندے کپڑوں سے آتی بو ہی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم طہارت سے کس قدر دور ہیں ۔یہی معاملہ کچھ طریقت کا بھی ہے کہ بعض نادانوں نے شریعت کی موجودگی کے باوجود طریقت کے رسم ورواج کو وضع کیا اور لوگوں کی گمراہی کا سامان کیا ۔اس نظام زیست کو اسلام سے کوئی علاقہ نہیں اس لیے کہ رہبانیت فطرت سے بغاوت ہے، حقیقت سے فرار ہے۔فرائض سے کوتاہی ہے ۔اعمال میں تساہل ہے جس کی وجہ سے اسلام نے رہبانیت کی مخالفت کی ۔جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو عربوں میں موجود عیسائی رہبانیت کی طرف مائل تھے اور اسے نیکیوں کا درجہ کمال جانتے تھے۔

رہبانیت سے مراد ترک دنیا ہے ترک لذات ہے ۔دوسرے لفظوں میں یہ خاندانی اور سماجی نظام کی نفی ہے، راہب عورت کے قریب نہیں آتے جس سے اُن کی نسل منقطع ہو جاتی ہے ۔وہ شہروں اور آبادیوں سے دور ویرانوں جنگلوں اور غاروں میں اللہ کی عبادت کرتے اور ہر دم خود کو اسی امر میں مشغول رکھنے کی کوشش کرتے۔بعض راہب اور ننیں (جو عورتیں رہبانیت اختیار کریں) گرجوں میں اکٹھے ہی گوشہ نشین ہو جاتے اور بظاہر تجرد کی زندگی گزارتے ۔لیکن یہ طرز زندگی چونکہ قانون فطرت کے خلاف تھا اس لیے اُن کے اندر شرمناک اخلاقی برائیاں جنم لے لیتی تھیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے جہاں زہد وقناعت کو اعلیٰ درجے کی اخلاقی صفت قرار دیا ہے وہاں رہبانیت کو سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے اور صحابہ کو رہبانیت سے اجتناب برتنے کی تلقین فرمائی ہے۔زہد و

قناعت تو یہ ہے کہ انسان دنیا میں رہ کر دنیا کی لذتوں میں اس قدر نہ کھو جائے کہ آخرت اُس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے چنانچہ زہد گناہوں سے بچنے اور سادہ زندگی گزارنے کا نام ہے اور قناعت یہ ہے کہ جو کچھ اللہ نے دیا ہے اُس کا شکر ادا کیا جائے اور جو کچھ اُس نے اپنی کسی مصلحت کی بنا پہ روک لیا ہے اُس کا شکوہ نہ کیا جائے۔ اوپر پیش کی گئی روایات میں بھی راہبانیت سے رُک جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اِن ارشادات کے بعد بھی اگر کوئی شخص دستور طریقت کی پیروی اختیار کرنے پہ بضد ہے تو اسلام میں کوئی جبر نہیں کہ خالق نے لوگوں کو ارادے کی آزادی اور اختیار سے نواز ہے کہ وہ خیر اور شر کی جس راہ پہ جانا چاہے اُس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں یہ الگ بات ہے کہ خالق کی اطاعت میں خیر ہے اور دنیاوی اور آخروی کامیابی ہے اور نفس کی پکار میں اس دنیا کی ذلت ہے اور جہنم کا کڑا عذاب ہے۔

اب ہم کچھ نظر دستور طریقت پہ ڈالنا چاہتے ہیں کہ آخر اس کے نظریات ہیں کیا؟

دین طریقت کے آفاقی مذہب ہونے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے تو وہ اس لحاظ سے نہیں کہ اس میں عالمگیریت اور ہمہ گیریت پائی جاتی ہے اور جملہ بنی نوع انسان کو پیش آمدہ مسائل کے حل کرنے کا ضامن ہے بلکہ یہ دعویٰ اس لحاظ سے ہے کہ یہ دین زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں موجود رہا ہے۔ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دین طریقت کے پیروکاروں کو سینٹ کہتے تھے۔ قرآن نے اِن کو راہبان کہا ہے۔ ہندوؤں میں دین طریقت کے پیروکاروں کے کئی نام ہیں۔ اور لوگ انھیں مختلف اشکال کی وجہ سے مختلف نام دیتے رہے ہیں چنانچہ ایسے لوگ جوگی، گرو، سادھو، رِشی، منی جیسے ناموں سے موسوم کیے جاتے ہیں۔

بدھ مت میں ایسے لوگوں کو بھکشو کہا جاتا ہے، سکھ انھیں گیانی کہتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں ایسے لوگوں کے بے شمار نام ہیں جن سے لوگ آشنا ہیں مگر بدقسمتی سے اُن کی حقیقت سے آشنا نہیں چنانچہ ایسے لوگوں کو ہمارے ہاں پیر، فقیر، مرشد، درویش صوفی، خدا رسیدہ، عارف، مجذوب، واصل باللہ، واصل بحق، قطب، ابدال، غوث کہا جاتا ہے۔ اِن میں کوئی بادشاہ ہے تو کوئی وزیر کوئی چپڑاسی ہے تو

کوئی سپاہی یعنی اِن کے یہ نام اِن کے مختلف درجات کو ظاہر کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو برملا فرما دیا تھا کسی عجمی کو کسی عربی پہ کسی عربی کو کسی عجمی پہ کسی گورے کو کسی کالے پہ کوئی برتری حاصل نہیں اگر اللہ کے نزدیک کوئی برتر ہے وہ تقویٰ کی بنیاد پہ برتر ہے۔ دستور طریقت میں بنیادی امر ذاتی مکاشفات و مشاہدات ہیں، لیکن اِن مشاہدات اور مکاشفات میں فروعی اختلاف کے باوجود چند باتیں ایسی ہیں جن پہ اِن سب مذاہب کا اتفاق ہے۔ ایسی ہی متفقہ باتوں کو دین طریقت میں نظریات وعقائد کی حیثیت حاصل ہے۔ اُن میں سب سے پہلا نقطے کو وحدت الوجود کہا جاتا ہے یعنی انسان چلہ کشی اور ریاضتوں کے ذریعہ اس مقام پہ پہنچ جاتا ہے کہ اُسے کائنات کی ہر چیز میں خدا نظر آنے لگتا ہے۔ بلکہ وہ ہر چیز کو خدا کی ذات کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس قدرِ مشترک کے لحاظ سے ایک بدکار انسان، ایک نیک بزرگ، ایک درخت، ایک کار، ایک بچھو، ایک باغ، ایک دریا، ایک ستارہ، ایک سائیکل، ایک طوائف، گندگی کے ایک ڈھیر، غرض ہر جگہ اس شخص کو خدا ہی نظر آتا ہے کہ یہی وحدت الوجود کی بنیاد ہے۔

اس کے بعد جب انسان مزید چلہ کشی کرتا ہے، مزید ریاضتیں کرتا ہے، خود کو مزید ذلیل کرتا ہے، اور اُس کے جسم میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اُس کے کپڑوں کی بدبو دور تک جاتی ہے اور اُس کے گلے میں پڑے ہوئے منکے تک سیاہ ہو جاتے ہیں تب وہ وحدت الشہود کے منصب پہ فائز ہو جاتا ہے۔ اور وحدت الشہود کیا ہے؟ وحدت الشہود یہ ہے کہ انسان جب وحدت الوجود کی حالت میں ایک وقت گزار لیتا ہے تو اس کی ہستی خدا کی ہستی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ گویا خدا کی حیثیت ختم ہوئی اور وہ خود ہی خدا بن گیا۔ اگرچہ یہ نظریہ خدا کی ہستی کو کائنات سے الگ تو تسلیم کرتا ہے اور اس کائنات کو خدا کا پرتو یا سایہ تصور کرتا ہے مگر جب وہ وحدت الشہود کی منزل کو عبور کر لیتا ہے تو اس روحانی ترقی کی بنا پہ انسان خود کو خدا کی ذات میں مدغم کر دیتا ہے۔ اس سے اگلا مقام یہ ہے کہ انسان اپنے آئینہ دل کو اتنا صاف اور لطیف بنا لیتا ہے کہ خدا کی ذات خود اس کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے یا حلول کر جاتی ہے اور اس روحانی رتبے کو دین طریقت میں حلول کہا جاتا ہے۔ گویا وحدت الشہود میں تو خیر انسان

روحانی ترقی کرتا کرتا خدا کی ذات میں گم ہو جاتا ہے مگر حلول کی صورت میں خدا خود اپنے مرتبے سے نیچے اتر کر انسان کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔(استغفراللہ)

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ دستورِ طریقت کے صرف اِن تین نکات پہ ہی غور کریں اور دیکھیں کہ اسلام سے اِن نظریات و عقائد کا کیا تعلق ہے تو اس کا صاف اور سیدھا جواب یہی ہوگا کہ اِن غیر معقول اور جاہلی نظریات و عقائد کا اسلام سے کیا تعلق۔ اور اس سے قبل نظریہ حلول قوم بنی اسرائیل میں رائج تھا جس کی مذمت میں قرآن اترتا رہا۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ!

وَ قَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِوُنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ توبہ 31/9)

ترجمہ؛

”اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ اُن کے منہ کی باتیں ہیں پہلے بھی کافر اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے“۔

✡✡✡✡✡✡

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حلول کا عقیدہ جسے بعض کم عقل مسلمانوں نے اختیار کر لیا ہے وہ تو یہود و نصاریٰ سے بھی پہلے اس دنیا میں موجود تھا۔ تاہم قرآن نے لوگوں کو بتایا کہ حلول کا عقیدہ ایک

باطل عقیدہ ہے اور لوگوں کے منہ کی بات ہے اور لوگ ہمیشہ سے اس طرح کی باتیں کرتے آئے ہیں اور خدا نے قرآن حکیم میں فرما دیا ہے کہ جس نے مریم کے بیٹے مسیح کو خدا کہا اُس نے کفر کیا۔ کیونکہ عیسائی کہتے کہ خدا کی ذات حضرت عیسیٰ میں حلول کر گئی ہے۔ جس کی طرف قرآن حکیم میں بھی اشارہ کیا گیا۔

ارشاد ہوا کہ!

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔۔

القرآن الحکیم (سورۃ المائدہ 72/5)

ترجمہ؛

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مریم کے بیٹے مسیح خدا ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

یہود و نصاریٰ تو راہبانیت کی پستی میں جا کر دین کی اساس کو بالکل ہی بھلا بیٹھے تھے جیسا کہ مسلمانوں کے ایک طبقے نے کیا ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کے مطابق ضروری نہیں خدا کسی نبی کی ذات میں ہی حلول کرے بلکہ وہ کسی پیر کسی فقیر کسی زاہد کسی عابد بلکہ کسی سازشی شخص یعنی سینٹ پال جیسے شخص کی ذات میں بھی حلول کر سکتا ہے۔ (14*) سینٹ پال پہلے یہودی تھا پھر اس نے عیسائیت اختیار کر لی۔ اُس نے عیسائیت کو اُس کی بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا۔ نظریہ حلول کے بارے میں وہ کہتا ہے۔

''ہم ذاتِ باری میں مسلسل تحلیل ہوتے رہتے ہیں۔ جب ایک شئے دوسری میں مدغم ہو جائے تو اِن دونوں کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ میں بھی خدا میں تحلیل ہو

رہا ہوں اور ذاتِ حق مجھ سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔قسم ہے اس زندہ جاوید خدا کی کہ اب مجھ میں اور خالق کائنات میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ہم دونوں اب ایک ہی ہیں‘‘

✡✡✡✡✡✡

اس عیسائی راہب سینٹ پال کا نقطۂ نظر آپ نے ملاحظہ کیا۔اب ایک مسلمان صوفی کے نقطۂ نظر پہ نگاہ ڈالیں۔صوفی عبدالکریم جیلی (م820ھ) حلول کے متعلق اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ!

میں نے اپنا وجود کھو دیا، پھر وہ (یعنی اللہ) میری طرف سے مجھ میں قائم مقام ہوا اور یہ عوض جلیل القدر تھا۔بلکہ بعینہٖ ہی تھا۔پس میں وہ تھا اور وہ میں تھا، وجود مفرد تھا جس کے لیے کوئی جھگڑنے والا نہ تھا۔میں اس کے ساتھ اس میں باقی رہا اور ہمارے درمیان سے فرق اٹھ گیا اور میرا حال ماضی و مضارع ایک ہی جیسا ہو گیا لیکن میں نے اپنے نفس کو بلند کیا۔پھر حجاب اٹھ گیا اور میں اپنی نیند سے بیدار ہو گیا گویا کہ میں لیٹا ہی نہ تھا۔میں نے اپنی چشم حقیقت سے اپنے آپ کو حق دیکھا‘‘۔

(*15)

✡✡✡✡✡✡

غور فرمائیے! ایک عیسائی راہب اور ایک مسلمان صوفی کے انداز بیان یا انداز فکر میں کچھ بھی فرق نہیں۔چنانچہ اس سے ہمارا استدلال محکم ہوا کہ تصوف تو دراصل ایک قدیمی تسلسل ہے جس نے اسلام میں بھی راہ بنالی ورنہ اسلام کی تعلیمات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔متاخرین نے مسلمانوں میں تصوف کی آمد کے بارے میں امت کو اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ تمام تر تفصیلات سے آگاہ فرمایا

ہے۔ چنانچہ بیان کیا گیا کہ اسلام کی اولین صدی میں ایک یہودی عالم عبداللہ بن سبا نے اسلام قبول کیا کہ وہ جان چکا تھا کہ اُس کی قوم اب مسلمانوں کا مقابلہ علمی اور عسکری میدانوں میں نہیں کر سکتی چنانچہ اُس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا اور مسلمانوں کی جڑ کاٹنے کا عزم کیا۔ اُس نے درویشی کا لبادہ اوڑھ کر زہد و تقویٰ اختیار کر لیا۔ اور اسی زہد و تقویٰ کی آڑ میں سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کر لیا ۔ یہ حضرت عمر فاروقؓ کا زمانہ تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک سخت منتظم تھے اس لیے عبداللہ بن سبا احتیاط سے کام لیتا رہا اور زیرِ زمین اپنے مشن کی تیاری میں مشغول رہا۔ وہ اسلامی مرکز سے دور کوفہ بصرہ اور مصر میں اپنی تحریک کو منظم کرتا رہا اُس نے لوگوں کو باور کرایا کہ خلافت تو دراصل حضرت علیؓ کا حق تھی جس پہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ زبردستی قابض ہو گئے تھے ۔ وہ مناسب وقت کے انتظار میں رہا اور آخر کار حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حالات اُس کو موافق نظر آئے تو وہ کھل کے سامنے آ گیا اس دوران اُس نے کافی لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔

عبداللہ بن سبا کے ساتھی ہی وہ بدبخت تھے جنھوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا اور بالآخر انھیں شہید کیا۔ اس کے بعد یہی وہ لوگ تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد جمع ہو گئے تھے یہی وہ لوگ تھے جن کی وجہ سے جنگ صفین اور جنگ جمل وقوع پذیر ہوئیں۔ عبداللہ بن سبا کے ساتھیوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گھیر رکھا تھا اور اُن کی خلافت کا نعرہ لگایا تھا۔ اول اول حضرت علی رضی اللہ عنہ اُن کے تخیل دین سے واقف نہ تھے مگر جب اُن کو احساس ہوا تو انھوں نے اِن لوگوں پہ لعنت کی حتیٰ کہ انھیں قتل بھی کرایا۔ عبداللہ بن سبا ایک عیار درویش کے روپ میں رہتا تھا اُس نے لوگوں کو ظاہری اور باطنی علوم کے بہکاوے میں ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ دین اسلام کا حلیہ بدل کے رکھ دیا اُسی نے اسلام میں سب سے پہلے رموز طریقت اختراع کیے۔ اُس کے ساتھیوں میں اکثریت اُن عراقیوں کی تھی جو نومسلم تھے اور دین کی تعلیمات سے کماحقہٗ آگاہ نہ تھے اس لیے عبداللہ بن سبا انھیں جو بتاتا رہا وہ اسے سچ سمجھتے رہے۔ پھر اُس نے لوگوں سے کہا کہ خدا حضرت علیؓ کی ذات میں حلول کر گیا

ہے لہٰذا تمھارے لیے اُن کی پوجا کرنا لازم ہے حضرت علیؓ کو اس بارے میں پورا علم نہ تھا کہ اُن کی خلافت کی چھتری کے سائے تلے عبداللہ بن سبا کیا گل کھلا رہا ہے۔

چنانچہ ایک بار جب عبداللہ بن سبا خود حضرت علی رضی اللہ عنہم سے ملا اور کہا:

اَنْتَ ھُوَ ۔ تو وہی ہے!

تو حضرت علیؓ نے اسے پکڑ لیا کہا:

مجھے تمھارے بارے میں لوگ بتاتے رہتے ہیں اور آج تو میرے منہ پہ ہی جھوٹ اور کفر بک رہا ہے مجھے بتا تو کلمات تو نے کہے اُس سے تیری کیا مراد ہے۔

عبداللہ بن سبا نے کھل کے بات کی۔

جس پہ حضرت علی رضی اللہ عنہم سکتے میں آ گئے اور اُسے شدید سرزنش کی حتیٰ کہ اُسے کہا میری نظروں سے دور ہو جا مبادا کہ میں تجھے قتل کرا دوں۔

عبداللہ بن سبا چلا گیا مگر اب اُس کے چاہنے والے بہت تھے اور اُسے حضرت علی رضی اللہ عنہم کی دھمکیوں کی ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔

اُس کے جانے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہم کے غلام قنبر نے آپ کو مطلع کیا کہ سر بازار لوگ انھیں خدا کہہ رہے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہم بہت پریشان ہوئے اور انھوں نے کہا اِن لوگوں کو میرے پاس لے آؤ۔

جب وہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہم کے پاس آئے تب بھی اُن کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا حضرت علی رضی اللہ عنہم نے انھیں پیار سے بھی سمجھایا کہ یہ کفر ہے سختی سے بھی سمجھایا کہ یہ کفر ہے مگر وہ لوگ باز نہ آئے۔

اگلے روز پھر یہی ہوا۔ وہ لوگ سرِعام حضرت علی رضی اللہ عنہم میں خدائی صفات بیان کر رہے تھے۔ حضرت علیؓ اب کے خود اُن کے پاس تشریف لے گئے اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا واللہ یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں میں اس سے بری الزمہ ہوں حضرت علی رضی اللہ عنہم نے اِن لوگوں سے کہا اگر تم نے اب یہ کفریہ کلمات کہے تو میں تمھیں آگ میں ڈال دوں گا اور اب کے حضرت علی رضی اللہ عنہم سنجیدہ تھے کہ

وہ دیکھ رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ یہ اسلام کی بنیادوں پہ براہ راست حملہ ہے اس لیے انھوں نے سخت اقدام کا فیصلہ کرلیا تھا۔ گلے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم پر بہت سے لوگوں کو اس جرم میں گرفتار کرلیا گیا کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا کہا تھا۔ حضرت علیؓ نے اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ اِن لوگوں کو آگ میں جلا دیا جائے حکم کی تعمیل کی گئی اور ستر سے زائد زنادقہ کو آگ میں جلا دیا گیا۔ (16*)

اِن ستر لوگوں کے قتل سے فتنہ اور بھی بھڑک اٹھا اور باقی رہ جانے والے زنادقہ نے کہا!

لَایُعَذِبُ بِالنَّارِ الَّاَرَبُّ النَّارِ ۔

انھوں نے ھمیں آگ میں جلایا اور آگ کا عذاب تو اللہ ھی دیتا ھے۔

چنانچہ یہ فتنہ مٹ نہ سکا اور اس نے اپنے ارتقاء کا سفر جاری رکھا۔ مختلف زمانوں میں لوگ انھیں مختلف ناموں سے پکارتے رہے۔ کبھی اِن کو نصیریہ کہا گیا، کبھی یہ کیسانیہ بنے، اس کے بعد انھیں قرامطیہ کہا گیا۔ باطنیہ بھی یہی لوگ ہیں اور ملامتیہ بھی انھی میں سے ہیں۔ آج کے عہد میں انھیں صوفی یا اہل طریقت کہا جاتا ہے۔ شیخ اکبر المعروف ابن عربی (م 638ھ) اور حسین بن منصور حلاج (م 309ھ) کا تعلق اسی سلسلہ سے تھا۔

علامہ سیّد سلیمان ندوی کا ایک رسالہ "**معارف**" میری نظروں سے گزرا جس میں انھوں نے حسین بن منصور حلاج کے متعلق ایک بصیرت افروز مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے حسین بن منصور حلاج کو اعلیٰ درجے کا شعبدہ باز قرار دیا ہے۔ وہ ایران میں ایک پارسی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا آبائی وطن بیضا تھا وہ باسط نامی ایک بستی میں رہتا تھا جو بصرہ اور کوفہ کے درمیان تھی۔ اُس نے خدائی کا دعویٰ کیا تو وقت کے علماء نے اسے کافر قرار دے دیا۔ یہ خلیفہ المقتدر باللہ کا دور تھا۔ حسین بن منصور حلاج لوگوں کو ورغلاتا رہتا اور انھیں دین حق سے برگشتہ کرتا رہتا۔ صالح مسلمانوں نے کئی بار خلیفہ کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی اور خلیفہ نے بھی کئی بار اسے بلا کے کہا کہ چونکہ وہ کافر قرار دیا جا چکا ہے اس لیے ہمارا تم سے کوئی تعلق نہیں تاہم اگر تم اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو تمھیں قتل کر دیا

جائے گا۔مگر حسین بن منصور حلاج اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔اُس کا عقیدہ کیا تھا اُس کے شعروں سے ظاہر ہے تاریخ بغداد سے اُس کے کچھ شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں جس میں برملا وہ اپنے کفر کا اظہار کرتا ہے اور دین اسلام اور عقیدہ توحید کی نفی کرتا ہے۔یہی وجہ تھی کہ خلیفہ کے حکم پہ بلآخر اسے قتل کر دیا گیا۔

عَقَدَ الْخَلَائِقُ فِی الْاِلٰہِ عَقَائِدٌ

وَاَنَا اعْتَقَدْتُ جَمِیْعَ مَا اعْتَقَدُوْا

اللہ کے بارے میں لوگوں میں بہت سے عقیدے ہیں اور میں اِن سب عقیدوں سے الگ عقیدہ رکھتا ہوں۔

✿✿✿✿✿✿✿✿

کَفَرْتُ بِدِیْنَ اللّٰہِ وَالْکُفْرُ وَاجِبٌ

لَدَیَّ وَ عِنْدَالْمُسْلِمِیْنَ قَبِیْحٌ

میں اللہ کے دین سے کفر کرتا ہوں اور یہ کفر میرے لیے واجب ہے، جب کہ دوسرے مسلمانوں کے لیے یہ واجب نہیں۔

✿✿✿✿✿✿✿✿

سُبْحَانَ مَنْ اَظْھَرَنَا سُوْتَہٗ

سِرًّا سَنَا لَاھُوْتِہِ الْمَثَاقِبٌ

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے ناسوت (یعنی حسین بن منصور حلاج) کو اپنے

لاہوتِ ثاقب کی چمک کا رازدار بنایا۔

ثُمَّ بَدَا فِیْ خَلْقِهٖ ظَاهِرًا
فِیْ صُوْرَةِ الْاٰكِلِ وَالْشَّارِبِ

پھر وہ اپنی مخلوق میں ایک کھانے اور پینے والے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

حَتّٰی لَقَدْ عَایَنَهٗ خَلْقَهٗ
كَلَحْظَةِ الْحَاجِبِ بِالْحَاجِبِ

یہاں تک کہ اس کی مخلوق نے اِس کو اس طرح دیکھا جس طرح ایک دیکھنے والا دوسرے کو دیکھتا ہے۔(17*)

علم کے صوفیانہ تصور پہ جس قدر روشنی ہم ڈالنا چاہتے تھے اُس میں کامیاب نہیں ہوئے۔اس لیے کہ یہ موضوع اپنی وسعت کے اعتبار سے الگ سے ایک کتاب کا متقاضی ہے۔مگر سیرۃ المزمل ﷺ میں اس کی گنجائش نہیں بنتی اس لیے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک لکھ رہے نا کہ جھوٹے شعبدہ بازوں کے قصے۔حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس قدر لکھا اس سے بھی ایک بات تو بہر حال کھل کے

ظاہر ہو جاتی ہے کہ دین طریقت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ۔ چاہے کوئی کتنی ہی کھینچا تانی کرے اسلام سے دستور طریقت کو ثابت نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ دین طریقت کو الگ سے ایک مذہب تو کہا جا سکتا ہے مگر اسلام نہیں کہا جا سکتا ۔ کیونکہ دستور طریقت کا سارا نظم اسلام کے خلاف ہے، اسلام کی ضد ہے، قرآن کی ضد ہے، رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے انکار ہے ۔ اس لیے کہ یہ تو ایک سازش تھی جو بدقسمتی سے قائم رہی اور مسلمان بہت سے اجنبی تخیلات کی طرف متوجہ ہو گئے ۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ پاک و ہند کے سوا دنیا کے بیشتر مسلم ممالک اس لعنت سے پاک ہیں اور دین کے اصل تصور سے آگاہ ہیں ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ایسے خطے کے باسی ہیں جہاں دین طریقت کے ماننے والے بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اسی لیے تو ہماری مسجدیں ویران قبریں پر رونق ہیں ۔ لوگوں نے مزاروں پہ لاکھوں روپے لگائے ہیں اور کروڑوں روپے کما رہے ہیں ۔ عوام جاہل ہے اور علماء کا بڑا طبقہ قبر پرستی کو جائز قرار دیتا ہے جس کی وجہ سے دین توحید پس منظر میں چلا گیا ہے تاہم اب ہمارے بچے پڑھ لکھ گئے ہیں اس لیے اس تاریک رات کا سحر کسی حد تک ٹوٹنے کو ہے ۔ تاہم ابھی اس سلسلے میں کافی کام کی ضرورت ہے کیونکہ عقیدہ تو بنیاد ہے جب عقیدہ ہی غلط ہو گا تو عمارت یقینی طور پہ ٹیڑھی ہی بنے گی ۔

نظام طریقت کے چل نکلنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں میں اس بد تاثر کو پھیلا دیا گیا ہے کہ وہ روز محشر کی فکر نہ کریں پیر صاحب اُس روز اُن کا بازو تھام کے انھیں جنت میں لے جائیں گے، نماز کی کوئی ضرورت نہیں بس پیر صاحب کے آستانے پہ حاضری ضروری ہے، حج کی کوئی ضرورت نہیں بڑے پیر صاحب کی قبر پہ جانے سے حج کا ثواب مل جاتا ہے، زکواۃ دینے کی کوئی ضرورت نہیں آستانے پہ چڑھاوا ہی کافی ہے روزہ رکھنے بھی کوئی ضرورت نہیں اس لیے کہ پیر صاحب بھی روزہ نہیں رکھتے ۔ مگر جب تم روزہ نہ رکھو تو فدیہ پیر صاحب کو پہنچا دینا ۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عام آدمی جو اپنے کاروبار میں مصروف ہے جس کو دولت کمانے سے ہی فرصت نہیں ۔ وہ ایک دو ماہ میں ایک بار پیر صاحب کے حاضری لگوا آتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اُس نے دین کو حاصل کر لیا ہے ۔ پیر صاحب کے دربار پہ چڑھاوا چڑھا کے وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے انفاق کا

حق ادا کر دیا ہے۔اس سارے سلسلے میں انسان اپنا ہی فائدہ دیکھتا ہے اور پیر صاحب کا ممنون ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے نماز جیسی مشکل اور تکلیف دہ عبادت سے بچالیا ہے کیونکہ جب اُس نے چند دن نماز پڑھی تھی تو اکتا گیا تھا ابھی دو گھنٹے بھی نہ گزرتے کہ پھر سے نماز کا وقت آجاتا۔دین طریقت نے انسانی نفس کی کمزوریوں کو سمجھا اور اُس کو عمل سے آزاد کر دیا اُسے غیر مرئی قوتوں کا یقین دلایا اور انسان سے خاص طور پہ مسلمان سے نہ صرف اُس کی مہلت عمر کو چھین لیا بلکہ اُس کے ایمان تک کو ختم کر دیا کہ اسلام تو دین توحید ہے جب پیر ہی خدا بن بیٹھا تو کہاں کی توحید اور کہاں کا اسلام؟ چنانچہ یہ وہ نظریہ علم ہے جو اگرچہ قدیمی ہے اس کے باوجود اس سے کسی علمی پہلو کی خوشبو نہیں آتی اہل تصوف نے انسان اور کائنات کے باہمی ربط پہ کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا۔اس لیے کہ دراصل تصوف کا نظم کبھی بھی کسی علمی راہ پہ نہیں چلا بلکہ اِن کا سارا اثاثہ تو زبانی ہے کہ میرے دادا نے فلاں پیر صاحب کو ہوا میں اڑتے دیکھا تھا چنانچہ اس پیر صاحب کی پوجا ضروری ہے۔اب اسلام میں تو رسول اللہ ﷺ کی پوجا کو بھی شرک کہا گیا ہے تو یہ لوگ پیر صاحب کی پوجا کو کیسے راضی ہو جاتے ہیں اس کا سیدھا اور صاف جواب یہی ہے کہ قرآن میں انسان کی ایک قسم کو جانوروں سے بھی گیا گزرا بتایا ہے ۔شاید یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کا عکس اپنے جیسے بندے ہی میں تلاش کرتے ہیں۔پس دین طریقت طریق جاہلیت ہے اور اس پہ یقین کرنا اسلام سے انکار کرنا ہے۔

دین طریقت اسلام نہیں بلکہ اسلام سے الگ ایک دین ہے جسے لوگوں نے اپنی خواہش نفس کی بنا پہ اپنا لیا ہے۔اللہ ہمیں ہدایت دے کہ وہی تو ہے جو ہدایت دیتا ہے، وہی تو ہے جو بیٹے دیتا ہے، وہی تو ہے جو رزق دیتا ہے وہی تو ہے جو خوشی دیتا ہے، وہی تو ہے جو غم دیتا ہے، وہی تو ہے جو حاجت روا ہے، وہی تو ہے جو سنتا ہے، وہی تو ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے، وہی تو ہے جو علم دیتا ہے، وہی تو ہے جو عقل دیتا ہے، وہی تو ہے جو رہنمائی کرتا ہے، وہی تو ہے جو مالک کائنات ہے وہی تو ہے جو ہر چیز جس پر قابض ہے، وہی تو ہے جس کا حکم چلتا ہے زمینوں پہ اور آسمانوں پہ، وہی تو ہے جس نے انسان کی راہنمائی کے لیے قرآن اتارا، وہی تو ہے جس کے حکم سے ہوائیں بادلوں کو لیے ہوئی چلتی

ہیں، وہی تو ہے جس کے حکم سے علم ورزق بانٹا جاتا ہے، وہی تو ہے جو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے وہی تو ہے جس کے حکم سے دن رات کا تسلسل قائم ہے، وہی تو ہے جس کے حکم سے روحیں قبض کی جاتی ہیں، وہی تو ہے جس سے انعام کی توقع ہے، وہی تو ہے جس کی رحمت اُس کے غضب پہ غلبہ پانے والی ہے، وہی تو ہے جس سے بھلائی کی امید ہے، وہی تو ہے جس کے حکم سے ہمیں کامیابی کا پروانہ تھمایا جائے گا، وہی تو ہے جو سراپا نور ہے، وہی تو ہے جس کے دم سے حسن کائنات میں رونق ہے، وہی تو ہے جس کے حکم سے زمان ومکان لرز جاتے ہیں وہی تو ہے جس نے شیطان کو مردود قرار دیا، وہی تو ہے جس کے حکم سے زمین وآسمان لپیٹ دیئے جائیں گے۔۔۔اور تیرے پیر کے پاس کیا ہے؟

کچھ بھی تو نہیں؟؟؟

علم کا جاہلی تصور

علم کا ہر وہ تصور جاہلی ہے جس میں خالق سے بے اعتنائی اختیار کی جائے۔ اور اُس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ رہنمائی کا کوئی اہتمام نہ کیا جائے۔ چنانچہ آج کے نظام علم خاص طور پہ علم کے جاہلی تخیلات ہیں جن کی بنیاد (Rationaism) عقلیت پہ رکھی ہے۔ دورِ جدید کے فلسفہ علم کی بنیاد (Reason) یعنی عقل اور (Experiment) یعنی تجربے پہ رکھی ہے۔ عقلیت پسندی انسان کا قدیمی تخیل علم ہے۔ ہر دور میں لوگوں کے ایک گروہ نے عقل کو لامحدود قرار دیا ہے اور اسی کے ذریعے حیات اور کائنات کے عقدے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فلسفہ اور سائنس جس کی بنیاد عقلیت پہ رکھی ہے اپنی پانچ ہزار سالہ تاریخ میں انسان کی رہنمائی میں ناکام رہی ہے اور اُس نے حیات و کائنات کی جو تشریحات بھی کی ہیں اُس سے یہ مسئلہ سلجھنے کی بجائے الجھ کے رہ گیا ہے۔ بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ دورِ جدید کے فلاسفہ نے علم کے جو بہت سے چراغ روشن کیے ہیں وہ انسان کی راہنمائی کے لیے کافی ہیں اور انسان کو کسی الہامی علم کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک فکری مغالطہ ہے جس نے مغرب کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ مغرب کے نظام ہائے فکر و فلسفہ کی بنیاد عقل ہے اور وہ علم کا معیار وحی یا کسی منصب (Authortiy) کے ساتھ منسلک کرنے کو تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کو بس عقل کافی ہے حالانکہ ابھی تک وہ یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکا کہ علم کے

نظامِ عقلیت کے ماخذ کیا ہیں۔اس سلسلہ میں مغرب کے اہل فلسفہ باہم متفق نہیں۔اس ضمن میں جو مختلف آراء سامنے آئی ہیں اُن کے مطابق۔۔۔

۱۔

علم محض حواس یا تجربے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس کی کوئی عقلی یا فکری بنیاد موجود ہو۔وہی شے حقیقت رکھتی ہے جس کی بنیاد ذہن انسانی میں موجود ہو۔

✡✡✡✡✡✡

۲۔

دنیا میں کوئی حقیقت پیدائشی نہیں ہوتی۔تمام علم یا تو حواس سے حاصل ہوتا ہے یا پھر تجربے سے، چنانچہ جنھیں ہم علم کا لازمی جزو قرار دیتے ہیں وہ کچھ ایسے لازم بھی نہیں بلکہ انھیں زیادہ سے زیادہ امکانی علم ہی کا ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

۳۔

دنیا میں دو طرح کے اجسام پائے جاتے ہیں ایک قدرتی اور دوسرے مصنوعی۔علم اِن دونوں کے مابین تعلق اور توافق کو اجاگر کرتا ہے۔اور فلسفہ اِن اجسام کی حرکات کے مطالعہ کا نام ہے۔

✡✡✡✡✡✡

جدید علم فلسفہ کی بنیادیں فرانس بیکن (1561 - 1626ء)، تھامس ہابز (1588 - 1679ء) اور ڈیکارٹ (1596 - 1650ء) نے فراہم کیں۔اِن کو لوگوں کے تخیل علم کو سراسر مادی تخیل علم قرار دیا جاسکتا ہے۔اِن کے ہاں کسی خالق کا کوئی تصور نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ عقل کی لامحدودیت کے قائل ہیں۔اِن لوگوں کے علمی تخیل نے مغرب کو خدا سے لاتعلق اور مذہب سے دور کر دیا۔اس فلسفہ علم کے تحت جو معاشرے معرض وجود میں آئے وہ بظاہر مطمئن اور

آسودہ نظر آتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اِن لوگوں کی زندگی میں چمکتے رنگ ایک دھوکا ہیں جو وہ باقی دنیا کو دینا چاہتے ہیں۔ ایک مثال سے سمجھیں کہ اُن کی زندگی کے اصل حقائق کیا ہے۔ میرا ایک دوست پچھلے دِنوں امریکہ سے آیا اور وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اندرون ملک ایک پرواز کے دوران اُس نے دیکھا کہ اُس کی ساتھ والی سیٹ پہ ایک بوڑھا امریکی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بے تحاشا شراب پی رہا تھا۔ ہر پانچ منٹ بعد وہ میزبان کو طلب کرتا اور اُس سے شراب حاصل کر لیتا۔ ہر پندرہ بیس منٹ بعد وہ غسل خانے میں جاتا اور پھر ہانپتا لڑھکتا واپس آ جاتا۔ مگر اُس کے شراب پینے کے تسلسل میں کوئی کمی نہ آئی حتیٰ کہ اُس نے سیٹوں کے بیچ میں ہی قے کر دی۔ جہاز کا عملہ صفائی کے لیے آیا انھوں نے اُس بوڑھے کو اٹھایا اور پچھلی سیٹوں پہ منتقل کر دیا۔ جہاز کے میزبان نے میرے استفار پہ بتایا کہ انھیں اس طرح کے کئی کیسوں سے نمٹنا پڑتا ہے۔ یہ دراصل ایک ہوس ہے جو اس جیسے بوڑھوں کو اس طرح کی نامعقول حرکتوں پہ اکساتی ہے۔ اُس میزبان نے مجھے اس بابت تفصیلات فراہم کرتے ہوئے بتایا کہ اس طرح کے بوڑھے اولڈ ہومز میں رہتے ہیں جہاں اگرچہ شراب موجود ہوتی ہے مگر وہ عام سی شراب ہوتی ہے جس سے یہ لوگ سیر نہیں ہوتے۔ اندرون ملک سفر کے لیے ہماری کمپنی رعایتی نرخوں پہ ٹکٹ جاری کرتی ہے اِن لوگوں کو گورنمنٹ کی طرف سے جو پیسے ملتے ہیں وہ انھیں اس طرح کی عیاشیوں میں خرچ کرتے ہیں۔ اس بوڑھے ہی کو لے لیں جس شہر کو یہ جہاز جا رہا ہے وہاں سے اسے کوئی کام نہیں یہ محض عمدہ اور اعلیٰ شراب کے حصول کے لیے ہمارے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ واپسی پہ بھی یہ اسی طرح شراب مانگے گا اور غسلخانے میں جا کر قے کرے گا اور پھر شراب مانگے گا۔ پھر جہاز کے اندر ہی قے کرے گا اور جب ہم منزل پہ پہنچیں گے تو سے اٹھا کر نیچے لے جایا جائے گا۔

اب اگر کوئی کہے کہ یہ جدید علم ہی کا کرشمہ ہے کہ انسان چمکتے دھمکتے اور چنگاڑتے ہوئے خوبصورت جہازوں میں بیٹھ کر ہوا میں اڑتا ہے اور انتہائی تیز رفتاری سے سفر کرتا ہے۔ تو اُس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اس جدید سائنس نے اگر جہاز بنا لیا تو پھر وہ انسانوں کو اس کے اندر بیٹھنے کی درست تعلیم کیوں

نہ فراہم کرسکا۔یہیں سے اُس اخلاقی علم کی ضرورت کا احساس شروع ہوتا ہے جس میں شرفِ انسانی کے مدارج اور رویے طے کیے جاتے ہیں۔عقلیت پسند معاشروں نے اگرچہ اخلاقی ضوابط وضع کرنے میں کوتاہی نہیں کی ۔اُن کی کوتاہی یہ ہے کہ انھوں نے انسان سے کسی مقتدر طاقت کے سامنے جوابدہی کے تصور کو چھین لیا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ رہی کہ وہ انسان کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے یا جانور کی طرح۔یہ تو خیر جملہ معترضہ تھا اب ہم اُن علمی بنیادوں پہ کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جن کے منطقی نتائج کے طور پہ مغرب کا انسان خود کو جانور سے ممتاز نہیں کر پایا۔کہ خالق کے شعور کے بغیر انسان جانور ہی تو ہے؟؟؟

تھامس ہابز کا نظریہ علم یہ ہے کہ فلسفہ علت سے معلول اور معلول سے سبب اخذ کرنے کا نام ہے یعنی ہم حواس یا تجربے سے حاصل ہونے والے علم سے اصول زیست دریافت کرسکتے ہیں۔یا جو بات اس سے پہلے انسانی تجربے میں آچکی ہو اس سے استدلال ممکن ہے۔ہابز کے نزدیک حقیقی سائنس یہی ہے کہ سوچ کا عمل درست اصولوں سے شروع ہو۔اب فلسفہ کے سامنے یہ سوال کھڑا تھا کہ کس عمل کو پہلا اصول قرار دیا جائے اس کے بعد ہی اس کی علت اور معلول کی طرف جایا جاسکتا ہے چنانچہ ہابز نے حرکت کو پہلا اصول قرار دیا اور کائنات کے مادی اجسام کی حرکات کے مطالعے کو علم فلسفہ کی بنیاد قرار دیا۔

فرانسس بیکن کے نزدیک عقل اور مشاہدہ علم کی بنیاد ہیں۔انسانی عقل ہی ہے جو اشیا کی ماہیت کو متعین کرتی ہے۔

دیکارٹ نے وجودیت پہ زور دیا اور کہا کہ سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ میں ہوں چونکہ میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں۔اُس کے نزدیک کائنات کے تمام اصول علم ریاضی سے دریافت کیے جا سکتے ہیں کیونکہ کائنات ریاضیاتی اصولوں کے ماتحت ہے۔

سپینوزا کے نزدیک عقل اور وجدان علم کا ماخذ ہیں اور الہامی علوم علم کی اعلیٰ ترین شکل ہیں۔وہ کہتا ہے کہ غلطی علم کی کمی کا نام ہے۔ایک تصور کبھی غلط یا صحیح نہیں ہوتا جو بات اس کو صحیح یا غلط بناتی ہے وہ ایک ایسے وجود کا فرض کرنا ہے جو درحقیقت موجود ہی نہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اہل دانش کے ہاں بھی حیات و کائنات پہ تفکر کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ جان برکلے (1685 - 1753ء)، جان لاک (1632-1706ء) اور ڈیوڈ ہیوم (1776- 1711ء) کا نظریہ کائنات ملتا جلتا ہی تھا کہ اِن کے نزدیک انسانی ذہن سے خارج کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے انسان کے ذہن ہی میں ہے۔ تاہم یہ امر خوش آئند ہے کہ اِن فلاسفہ نے انسان کو جانور سے بہر حال ممتاز قرار دیا اور اسے کائنات کی سب سے اہم مخلوق قرار دیا۔ جیکوروس (1712-1778ء) نے البتہ کہا کہ انسان کوئی مشین نہیں ہے بلکہ انسان احساسات اور جذبات سے لبریز ایک وجود ہے جسے زبردستی سائنس اور ثقافت کی زنجیروں سے باندھا جارہا ہے۔ اور آلات سے اس کے احساسات کو کچلا جا رہا ہے۔

عمانویل کانٹ (1724-1804ء) نے سابقہ نظریاتِ علم کا ابطال کیا۔ جرمنی کے کانٹ کو مغربی فلاسفہ میں عہد جدید کا ارسطو کہا جاتا ہے۔ اس عظیم فلسفی نے انسان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ مشینیت سے ہٹ کر انسان کا ایک اخلاقی وجود بھی ہے انسان کے اندر سے ابھرنے والی آوازوں کا مطالعہ کرنے سے انسان کائنات کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے اور انسان کا دل اس بات کا گواہ ہے کہ وہ کسی خالق کے در پہ جھکنا چاہتا ہے چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات خدا نے بنائی ہے اور اسی نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے۔

شوپنہائر (1787-1860ء) کا تعلق بھی جرمنی سے تھا مگر اُس کا فلسفہ مادیت کے گرد ہی گھومتا ہے اُس نے انسانی خواہشات کی تکمیل کو ہی مقصد کائنات قرار دیا ہے۔

فریڈرک نطشے (1844-1900ء) کا تعلق بھی جرمنی سے ہے تاہم اُس نے جو علمی نظریہ پیش کیا اُسے بھی قابل قدر قرار نہیں دیا جاسکتا ہے اُس نے کہا کہ کائنات میں طاقت کا اصول غالب ہے طاقتور کمزور کو کھا جاتا ہے اور یہ کائنات یونہی چلتی رہے گی اور ایک روز ختم ہو جائے گی۔ انسان کو چاہیے کہ وہ طاقت حاصل کرے تا کہ دوسروں پہ غلبہ پا سکے۔

اگسٹ کومٹ (1798-1857ء) کا نقطہ نظر قدرے علمی ہے وہ کہتا ہے کہ کائنات مشاہدے اور

تجربے کی دنیا ہے۔جس کی بدولت ہمیں مختلف چیزوں کا باہمی ربط نظر آتا ہے۔اور انسان اپنی عقل سے زندگی کے لیے قاعدے اور قانون وضع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

جان سٹوارٹ مل(1883 -1806ء) نے اسی نقطہ نظر کی توسیع کی جسے اگسٹ کومٹ نے پیش کیا تھا۔اُس نے کہا کہ کائنات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نظم انتہائی مربوط ہے اس لیے انسان کو کائنات کے اس نظم سے اصول زیست اخذ چاہییں اور اپنی زندگی کو بھی اسی طرح مربوط بنانا چاہیے جس طرح کہ کائنات کا نظم مربوط ہے۔

ہربرٹ سپنسر(1820-1903ء)نے کہا کہ انسان اس ارتقائی عمل کا حصہ ہے جو اس کائنات میں پایا جاتا ہے۔ارتقاء یعنی تبدیلی کا قانون ہی اس دنیا کا بنیادی قانون ہے۔

ولیم جیمز(1842-1910ء)بھی عقلیت پسند ہے اور تجربہ اور مشاہدہ کی دنیا کا قائل ہے البتہ اس نے انسان کو کائنات کی سب سے ارفع مخلوق قرار دیا ہے اور کہا کہ کائنات کو انسان ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

برٹرنڈرسل(1872-1970ء) کے نزدیک دنیا ایک عظیم حسابی مشین ہے جو سائنس کے کلیات پہ چل رہی ہے جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی انسان اس نظام کا حقیر سا پرزہ ہے۔اس عظیم مشین کا بھاری چکر چل رہا ہے اس کے اندر جو بھی آتا ہے وہ پس جاتا ہے۔انسان بھی اس کے اندر پس رہا ہے۔وغیرہ وغیرہ

یہ چند حوالے اہل مغرب کی اس سوچ کو واضح کرتے ہیں کہ انھوں نے علم کے مسئلے کے بارے کس طرح سوچا اور وہ اشیا کی ماہیت تک رسائی کے بارے میں کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔اس سے ایک واضح نتیجہ تو یہ نکل کے سامنے آتا ہے کہ مغرب کا فلسفی کائنات کے ہر مسئلے کو عقل کی بنیاد پہ ہی حل کرنا چاہتا ہے۔دوسری بات جو اُن کے اس علمی طرز عمل سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر مسئلے کو خالق کے کسی بھی تصور کے بغیر حل کرنا چاہتے ہیں اور اپنے اسی تصور کی بنیاد پہ وہ زندگی گزارنے کے

فلسفے کو استوار کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے تصور زِیست کی جو صورت گری کی اُس میں کسی خالق کے وجود کی گنجائش نہ چھوڑی۔ اس لیے وہ کسی جوابدہی یا انعام ورحمت کے تصور سے بھی خالی رہے ان نظریات کا دائرہ پوری انسانی حیات پہ محیط ہے۔ مذہب کے استثناء کے ساتھ آج تک جو مختلف نظریات انسانی معاشروں میں رائج رہے یا جن نظریات کی بناپہ معاشرے وجود میں آتے رہے اُن کی بنیاد عقلیت پہ ہی رکھی ہے۔ مثال کے طور پہ دیکھیں کہ مارکس فلسفے کی مادی تعبیر پہ یقین رکھتا ہے۔ انسانی تاریخ کو وہ دو گروہوں کی کشمکش کا نام دیتا ہے پھر اس کی بنیاد پہ ایک معاشرے کا تصور پیش کرتا ہے۔

مزید براں ایک تصورِ زیست وہ ہے جس کے رد میں مارکس کیمونزم کا نظامِ حیات مرتب کرتا ہے ۔چنانچہ غور سے دیکھا جائے تو قدیم سے لے کر جدید تک تمام معاشروں کی تعمیر میں عقل کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے اور انسانی ارتقاء کی تاریخ کو عقل ہی کا کرشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس پورے سلسلہ فکر میں علم کے بنیادی ماخذ حواس اور عقل ہی رہے ہیں۔ اور ہمیں جو مختلف علمی نظریات دکھائی دیتے ہیں اُن میں علم کی مختلف تعبیرات کی عقلی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ فلاسفہ کے جس دور سے ہم بحث کرر ہے ہیں اسی دور میں سائنس اور مذہب کے مابین تصادم کے بنیادی تصور نے جنم لیا۔ کیونکہ مغرب مذہب کے نام پہ جس حقیقت سے واقف تھا وہ عیسائیت تھی۔ کلیسا کا وہ جبر تھا جس نے زندگی کے ہر دائرے کو تنگ کرر کھا تھا۔

اِن فلاسفہ کے کلی نظام میں ردعمل کا وہ زہر محسوس کیا جا سکتا ہے جو کلیسا نے اہل مغرب کی رگوں میں انڈیلا تھا۔ تب وہاں کے تمام اجتماعی معاملات پہ چرچ کا قبضہ تھا تب ہر بات کو کلیسا کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور کوئی بھی ایسا علمی نظریہ جس کو بائیبل کی پشت پناہی حاصل نہ ہونا قابل معافی گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ گلیلو کا واقعہ ان نفسیات کو سمجھنے کے لیے کفایت کرتا ہے۔ چنانچہ کلیسا جبر کا ایک ایسا نظام تھا کہ اُس سے آزاد ہونے کے بعد اہل مغرب نے صرف کلیسا کو ترک نہیں کیا بلکہ خدا ہی کو ترک کر دیا ۔جس کے نتیجے میں علوم کی وہ مادی تشریحات ہمارے سامنے آئیں جنھوں نے مغرب کے اُس

معاشرے کی تشکیل کی جس سے خیر وافادیت کے بہت ہی کم پہلو ظاہر ہوئے۔کلیسا جس نظام جبر کا نام تھا اُس کے خلاف نفرت اور بغاوت بالکل فطری تھی۔ چنانچہ کلیسا کے لیے اہل مغرب کے دلوں میں جو نفرت پیدا ہوئی اُس نے مذہب کو بحیثیت مجموعی مسترد کر دیا۔یہی وجہ ہے کہ اُس دور کے فلاسفہ کے علمی نظریات میں تصور کائنات کے جو نظریات وجود میں آئے اُن میں خدا کا کوئی تصور موجود نہ تھا اور یہ ردعمل کی ایک لہر تھی جس سے اگرچہ دنیا گزر گئی مگر جو اسلوب علم وضع ہوئے وہ برقرار رہے اور اُن کے قبیح اثرات تلے آج کی دنیا سسک رہی ہے۔کلیسا کے خلاف ایک زبردست تحریک بپا ہوئی۔ بائبل پہ بے پناہ تنقید کی گئی اور بالعموم لوگوں کے دلوں سے تقدس کے وہ آثار مٹ گئے جن سے وہ کئی صدیوں تک آشنا رہے تھے۔

ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے چنانچہ کلیسا کے خلاف زبردست شورش نے مذہب پسندوں کے اندر بھی ردعمل کا شعور اجاگر کیا اور بنیاد پرستی کی اصطلاع وضع ہوئی۔ تب ایک طرف مذہب پسند یعنی بنیاد پرست تھے جنھوں نے صدیوں لوگوں کے دلوں پہ حکومت کی تھی مگر جب وہ جبر کی حد سے گزر گئے تو بغاوت ہوئی اور اس بغاوت نے سیکولرازم کو جنم دیا۔ مذہب سے بیزار علمی نظریات کو اب عوامی تائید حاصل ہو چکی تھی اس لیے وہ غالب آگئے اور بنیاد پرست پس منظر میں چلے گئے۔

مذہب بیزاری کی یہ تحریک خدا بیزاری کی تحریک بن گئی۔ علمی حلقوں نے یہ کہہ کر جان چھڑا لی کہ مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ مذہب جب اجتماعیت سے نکلتا ہے تو انفرادیت میں بھی برقرار نہیں رہتا اور یہی سب مغرب کے ساتھ ہوا۔دیکھیں کہ اس کے مقابل قرآن حکیم کے ماننے والوں نے عملاً ایک معاشرت کو وجود بخشا اور قرآنی احکام کی روشنی میں ایک ایسا معاشرہ قائم کر دکھایا جس میں اجتماعیت کا رنگ غالب تھا۔اسلام نے بتایا کہ مذہب جس طرح انفرادی سطح پہ ایک حقیقت ہے اسی طرح اجتماعی سطح پر بھی ایک حقیقت ہے اور یہ کہ مذہب کسی بھی پہلو سے انسان کے فکری وعملی ارتقاء میں مانع نہیں۔ اسلام اگر کہیں انسان پہ کوئی قدغن لگاتا بھی ہے تو ذہنی یا فکری نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسان کو کسی ضرر ونقصان سے محفوظ رکھنا ہی ہے۔مغرب میں

عیسائیت کے علمبردار ایسی کسی اجتماعیت کو برپا نہ کر سکے جس کا تصور اسلام پیش کرتا ہے۔ بلکہ عیسائیت کے ساتھ بڑا المیہ یہ ہوا کہ اس کے سب سے بڑے وکیل پال نے عیسائیت کو اس کی اصل بنیاد سے ہٹا کر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جسے اُس نے عیسائیت کا نام دے دیا۔ پال کی اس خود ساختہ عیسائیت میں اجتماعی انسانی مسائل کا کوئی ایسا الہامی حل موجود نہ تھا جو انسانی مسائل کا مداوا کرتا اس لیے لوگوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ مذہب کی بجائے عقلیت کی بنا پہ اپنے مسائل کا حل تلاش کریں اُن کی اس تلاش کو اُس عہد کے فلاسفہ نے آسان کر دیا اور انھوں نے حیات اور کائنات کے ایسے درجنوں حل پیش کیے جن کی مشترک اساس مذہب بیزاری اور خالق کی عدم موجود پہ رکھی تھی یہی علم کا وہ جاہلی تصور تھا جس کا عکس پیش کرنا یہاں مقصود تھا۔ (18*)

✡ ✡ ✡

علم کا اسلامی تصور

حیات و کائنات کا مسئلہ پیچیدہ اور عمیق ہے مگر اُن فلاسفہ کے لیے جنھوں نے اسے جاننے کے لیے خالق کے وجود کی نفی کی۔ علم کے اسلامی تصور میں یہ معاملہ سادہ اور قابل فہم ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا اور کہا ہو جا اور یہ کائنات قائم ہو گئی۔ حیات کے بارے میں اہل مغرب نے تخلیق انسان یعنی علم الانسان کی بنیاد جن قیاس آرائیوں پہ رکھی ہے اُن کی بنیاد قدیم زمانے کے کھنڈروں سے برآمد ہونے والی وہ چند ہڈیاں ہیں، زمین کی تہوں سے نکلنے والی وہ کھوپڑیاں ہیں اور وہ چند ٹوٹے پھوٹے برتن ہیں جن پہ جدید علم عمرانیات کی بنیاد رکھی ہے۔ جب کہ اسلام نے اس بارے میں جو تصور پیش کیا ہے وہ نہایت آسان سادہ اور سہل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ میں زمین پہ اپنا خلیفہ اتارنے والا ہوں۔ فرشتوں نے چند تحفظات کا اظہار کیا تو اللہ نے کہا کہ تم میرے پورے منصوبے سے آگاہ نہیں ہو۔ میں انسان کو اختیار اور ارادہ کی آزادی دوں گا تو اس کی ہدایت کا اہتمام بھی کروں گا۔

چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد ہوا کہ!

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى الْأَرْضِ خَلِيفَةً

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/33-30)

ترجمہ:

”پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں“۔ انھوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اُس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا ؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں“ فرمایا: میں وہ جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے“۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمھارا خیال صحیح ہے تو اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ انھوں نے عرض کیا۔ نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے ہم تو بس اُتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو بتا دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے والا اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا تم اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب آدم نے اِن تمام چیزوں کے نام بتا دیئے تو اللہ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے اسے بھی میں جانتا

ہوں"۔

✡✡✡✡✡✡

اوراسی اہتمام کے پس پردہ علم کی وہ حقیقی اساس بیان کی گئی جس کی تلاش میں انسان نے صدیوں ٹھوکریں کھائیں۔فلسفہ اور مادی علوم ایک طویل جہد وسعی کے بعد بھی جن مسئلوں کا کوئی حل پیش نہ کر سکے اللہ تعالیٰ نے اسے دو چار آیات کے ذریعے بیان کر دیا اور ساتھ ہی انسان کی منزل اور طریق عمل کو بھی متعین کر دیا۔اسلام نے انسان کو جو تصورِ حیات دیا وہ اس نظریہ علم کے سراسر متضاد ہے جو قدیم اور جدید فلسفے نے پیش کیا۔اسلام نے انسان کی زندگی کے اُس تسلسل کو بیان کیا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔قرآن نے ہمیں بتایا کہ موت جس کو بعض کم فہم زندگی کا اختتام جانتے ہیں وہ تو محض منظر کی تبدیلی کا نام ہے۔موت کے بعد انسان کو ابدی حیات عطا کی جائے گی اور اِس دنیا کے اعمال کی بنیاد پہ اُس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کیا جائے گا۔

قرآن مجید میں ارشاد کیا گیا کہ!

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ
ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○
هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى
اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 2/28-29)

ترجمہ:

"تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویہ کیسے اختیار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے اُس نے تم کو

زندگی عطا کی۔ پھر وہی تمھاری جان سلب کرے گا پھر وہی تمھیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تمھیں پلٹ کے جانا ہے۔ وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں، پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے، اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے"۔

✡✡✡✡✡✡

اس تصورِ حیات کے تحت ظاہر ہے کہ انسان کے لیے صرف وہی عمل نافع ہو سکتا ہے جو دونوں زندگیوں کو محیط ہو۔ جو اس زندگی میں بھی انسان کو آسانی اور راحت بہم پہنچائے اور موت کے بعد جو زندگی شروع ہونے والی ہے اُس میں بھی انسان کامیابی حاصل کرے۔ اسلامی نظریہ حیات اور مادی تصورِ حیات میں ایک قدر مشترک ہے کہ انسان نے بہر حال پوری زندگی کا کچھ حصہ اس دنیا میں بھی گزارنا ہے اس لیے اسلام اسلوبِ زیست کے لیے وضع کی گئی اُن مادی سہولیات کو رد نہیں کرتا جو انسان نے علم و عقل کی بنا پہ حاصل کی ہیں۔ وہ اس بات پہ یقین رکھتا ہے کہ عقل انسان کی راہنمائی کرتی ہے مگر وہ عقل کی ایک حد مقرر کرتا ہے اور اُسے استعمال کرنے کی ہدایت بھی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا کہ!

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ○ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيۡنِ ○ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البلد 8-10/90)

ترجمہ؛

"کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور دونوں نمایاں راستے اسے دکھا نہیں دیئے"۔

☆☆☆☆☆☆

مزید ارشاد ہوا کہ!

اَفَلَا یَنظُرُونَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ○ وَاِلَی السَّمَاءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ○ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ○ وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الغاشیۃ 88/10-8)

ترجمہ؛

”کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیے گئے؟ اور آسمانوں (کو نہیں دیکھتے) کہ کس طرح اِن کو بلند کیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں، اور زمین کو (نہیں دیکھتے) کہ کس طرح بچھائی گئی ہے“۔

☆☆☆☆☆☆

آگے مزید ارشاد ہوا کہ!

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنۡدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الۡبُكۡمُ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡقِلُوۡنَ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانفال 22/8)

ترجمہ؛

”یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے“۔

☆☆☆☆☆☆

مزید ارشاد ہوا کہ!

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الحج 46/22)

ترجمہ:

''کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں، جس سے اِن کے دل ایسے ہوجائیں کہ وہ اِن سے سمجھ کا کام لینے لگیں یا اِن کے کان ایسے ہوجائیں کہ وہ اِن سے سننے کا کام لینے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ یہ دل ہیں جو سینے کے اندر اندھے ہوجاتے ہیں''۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات سے ظاہر ہوا کہ اللہ تعالیٰ عقل وحواس کے ذریعے سے حاصل ہونے والے علم کی نفی نہیں فرماتا بلکہ صرف انسان کی توجہ اس جانب مبذول کراتا ہے کہ عقل سے راہ دیکھی جاسکتی ہے منزل کا علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ جس طرح کہ انسانی تجربہ شاہد ہے کہ محض عقل وحواس سے حاصل ہونے والا علم تو زندگی کے بارے میں بھی کبھی یکسو نہیں رہا بلکہ اُس کا نظریہ ہائے کار اور نظام ہائے فکر تبدیلیوں اور انتشار کا شکار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی مادی تعبیر پر ایمان رکھنے والے کبھی کسی ایک حل پہ اکٹھے نہیں ہوئے آج کی دنیا ہی پہ نظر ڈال لیں انسانوں کا ایک بڑا گروہ سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے تحت زیست کر رہا ہے تو انسانوں کا ایک اور گروہ اشتراکی فلسفہ زیست پہ یقین رکھتا ہے اسی طرح جدید دنیا میں کہیں تو فلاحی ریاست کا تصور پنپ رہا ہے تو کہیں جمہوری اقدار کو انسانیت کے مسائل کا حل قرار دیا جا رہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت ظاہر ہو رہی ہے کہ عقل اگرچہ اللہ تعالیٰ کا بیش بہا تحفہ ہے

مگر انسان عقل و حواس کی بنا پر کبھی اُس ابدی سچائی (Absolute Truth) تک نہ پہنچ سکا جس کی طرف اُس کی رہنمائی علم وحی کے ذریعے کی گئی۔ لہٰذا عقل ہی انسان کی راہنمائی اس امر کی طرف کرتی ہے کہ علم کا کوئی ایسا ماخذ ضرور ہونا چاہیے جو عقل سے بلند تر ہو اور وہ عقل کا ہاتھ پکڑ کر اسے ابدی سچائی تک پہنچا دے۔

وحی کے ذریعے سے انسان تک جو علم منتقل کیا جاتا ہے وہ انسان کو دونوں جہانوں میں کفایت کرتا ہے جب کہ مادی نظام حیات اور نظریہ علم میں یہ صلاحیت بھی نہیں کہ وہ اس زندگی کے مسائل ہی کا کوئی ایسا حل پیش کر سکے جس پہ تمام انسانیت متفق ہو جائے اگر ایسا ممکن ہوتا تو پہلی اور دوسری جنگ عظیم جیسے وحشیانہ مناظر سے انسانی آنکھ نا آشنا ہی رہتی۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحی کا علم ہی علم حقیقی ہے اور دوسرے تمام علوم علم محض ہیں۔ وحی کے علم کی بنیاد خالق کی منشا پہ رکھی ہے اور وحی انسانوں کی راہنمائی اُن سنگ میل کی طرف کرتی ہے جو منزل کے خدوخال کی وضاحت کے لیے متعین کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کائنات کو پیدا کیا اور اُس کے لیے کچھ قوانین وضع کیے۔ پھر کائنات کی ہر چیز کو اِن احکامات کا پابند کر دیا گیا، کائنات کی ہر چیز اُسی حکم کے تابع ہوگئی جو اُس کے لیے خالق کی طرف سے متعین کیا گیا۔

چنانچہ سورج اپنے وقت پہ نکلتا ہے اور وقت پہ ہی ڈوبتا ہے اُس میں اتنی جرأت نہیں کہ کبھی ایک سیکنڈ کے لیے بھی دیر سے نکلے یا ایک سیکنڈ پہلے غروب ہو جائے۔ اسی طرح چاند پہاڑوں اور سمندروں کا معاملہ ہے کہ وہ اللہ کے احکامات کی تعمیل میں مگن ہیں اور انحراف کا اُن کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں پایا جاتا۔ اب انسان اور کائنات کی دیگر مخلوقات میں جو تفاوت ہے اُس کو سمجھ لیں کہ کائنات کی ہر مخلوق کو چاہے اُس کا تعلق جمادات سے ہو یا حیوانات سے ہو یا نباتات سے ہو براہ راست حکم دے دیا گیا کہ سرِ کائنات اُس کے ذمے کیا فرض ہے مگر انسان کو یہ حکم براہ راست نہیں دیا گیا بلکہ اُسے یہی حکم یعنی اطاعت کا حکم وحی کے ذریعے سے منتقل کیا گیا۔ انسان کو کائنات کی دیگر مخلوقات سے ممتاز پیدا گیا اور اسے یہ اختیار اور آزادی بھی دے گی گئی کہ اگر چہ درست راستہ تو وہی ہے جس کی تعلیم انسان

کو اللہ کے پیغمبر دیتے ہیں جو اُن پہ وحی کی جاتی ہے تاہم اگر انسان چاہے تو وہ اس سے انحراف کی راہ بھی اختیار کر سکتا ہے اگرچہ اس راہ میں اُس کے لیے کوئی خیر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں پہ مزید احسان یہ کیا کہ اُن کی ہدایت کے لیے انھی میں سے رسول بھیجے جو اُنھیں خالق کی منشا سے آگاہ کرتے رہے۔ اگرچہ انسان اکثر و بیشتر شکر کی راہوں سے گریزاں ہی رہا ہے۔ بعض لوگوں نے علمِ وحی پر بھی شبہ کیا ہے اور وہ علم کی اس ماہیت سے انکاری ہیں۔ ایسے لوگ قدیم زمانوں ہی سے چلے آرہے ہیں اور جب بھی اللہ نے کسی قوم کی طرف اپنا پیغمبر اتارا ہے تو اول اول لوگوں نے اُس کا انکار ہی کیا۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے اللہ کے رسول ہمیشہ غالب رہے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ پہ بھی اہلِ قریش نے یہ الزام عائد کیا کہ جو کلام وہ ہمیں سناتے وہ اللہ کا کلام نہیں ہے بلکہ وہ کسی سے سیکھ لیتے ہیں اور ہمیں سنا دیتے ہیں اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یوں دیا:

اِنَّآ اَوۡحَيۡنَآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ ۚ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ ۚ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۚ‏ وَرُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ ؕ

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 5/ 164-163)

ترجمہ:

''اے نبی! ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اُس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیمؑ اسماعیلؑ، اسحٰق و یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس ہارون اور سلیمان کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے داؤد کو زبور دی، ہم نے اُن رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور اِن رسولوں پہ بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا گیا''۔

✡✡✡✡✡✡

اسلام کے نزدیک سب سے اعلیٰ ترین علم تو وحی کا علم ہی ہے۔ باقی سب علوم جن کے لیے ہم مادی علوم کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں انسان نے اپنی خواہش نفس سے گھڑ لیے ہیں اِن علوم کی بھی کئی اقسام ہیں اِن میں سے بعض علوم تو وہ ہیں جو براہ راست خالق کی منشا کی ضد ہیں۔ جیسے کہ سرمایہ دارانہ نظام زیست یا اشتراکیت کا فلسفہ زیست۔ اور بعض علوم ایسے ہیں جس سے انسانیت فائدہ حاصل کرتی ہے۔ اسلام اِن علوم کا انکار نہیں کرتا بلکہ صرف یہ چاہتا ہے کہ اِن علوم کو اُن اصول و ضوابط کے تابع بنا دیا جائے جس میں خالق کی منشا ہے۔ علم وحی کو دوسرے علوم سے ممتاز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اسے ''العلم'' قرار دیا ہے۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 18/3)

ترجمہ:

''فرشتوں اور اہل علم (اولوالعلم) کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کو قائم رکھنے والا ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ غالب اور حکمت والا ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

بیسویں صدی کے ممتاز مفسر مولانا امین احسن اصلاحیؒ (1904-1997ء) اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تدبر قرآن میں لکھتے ہیں۔

''العلم قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ علم حقیقی ہوتا ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعے دنیا کو ملا ہے۔اس علم کے حاملین نے ہر دور میں خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی ہے۔ یہ مصلحین ومجددین کے اُس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور جنھوں نے اللہ کے دین کو بدعات اور آمیزشوں سے پاک کر کے عقائد کو توحید خالص کی بنیاد پر شرائع وقوانین اور اعمال و اخلاق کو حق وعدل کی اساس پر استوار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔حکمت دین کا یہ نقطہ ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ اور ملائکہ کے ساتھ حاملین علم کا حوالہ ہے اور توحید کے ساتھ عدل وقسط کا۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اہل علم کا کیا مقام ہے اور خدائی شریعت کے نظام میں عدل وقسط کا کیا درجہ اور مقام ہے۔علم حقیقی حاملین ملائکہ کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہیں''۔

(19*)

قرآن مجید میں صاحب علم لوگوں کے '' **راسخون فی العلم** '' کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ!

لٰکِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْھُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَالْمُقِیْمِیْنَ الصَّلٰوۃَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓئِکَ سَنُؤْتِیْھِمْ اَجْرًا عَظِیْمًاO

القرآن الحکیم (سورۃ النساء 162/4)

ترجمہ؛

''البتہ اِن میں جو علم میں راسخ اور صاحبِ ایمان ہیں،وہ ایمان لاتے ہیں اُس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور روزِ

آخرت پہ یقین رکھنے والے' یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجرِ عظیم سے نوازیں گے''۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات کا ترجمہ اور تشریح بھی تدبر قرآن سے تحریر کی جاتی ہے۔ امام امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں کہ!

''**راسخون فی العلم** سے مراد یہاں وہ علماء ہیں جن کے قدم شریعت میں خوب جمے ہوئے ہیں' جو عقیدہ اور عمل ہر چیز میں راسخ اور کردار و اخلاق' ہر پہلو سے جادۂ مستقیم پر استوار تھے۔ یہود میں علماء کم نہیں تھے' بے شمار تھے لیکن شریعت اِن کے لیے بس ایک نمائشی جامے کی حیثیت رکھتی تھی۔ جسے پہن کر وہ باہر بازاروں اور عوام میں نکلا کرتے تھے۔ اِن کے فکر و نظر اور اِن کے قلب و روح سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ علماء تمام جرائم میں اپنی قوم کے ساتھ نہ صرف شریک تھے بلکہ وہی اِن امور میں اُن کے مرشد تھے' اس وجہ سے اِن سے اگر کسی چیز کی توقع کی جا سکتی تھی تو صرف اس چیز کی کہ وہ قرآن اور پیغمبر ﷺ کی مخالفت میں اپنی قوم کی پیشوائی کریں۔ البتہ اِن میں جو نفوس قدسیہ حکمتِ دین کی لذت سے آشنا تھے' اُن کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے۔ اس وجہ سے اُن کو اپنی قوم کی متفقہ مخالفت کے طوفان کے مقابلے کے لیے کھڑا ہونے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی۔ یہاں انھی نفوس قدسیہ کو عام علمائے یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علما کی بجائے ''**راسخون فی العلم**'' کے لقب سے مشرف فرمایا ہے۔ یعنی یہ آندھی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رخ اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقف حق پہ جمے رہنے والے ہیں''۔ (20*)

✡✡✡✡✡✡

علم کے بارے میں ہمارا موقف اب قدرے واضح ہو کے سامنے آچکا ہے کہ ہم علم کی صرف اُسی صورت کو علم حقیقی کا درجہ دیتے ہیں جو خالق کی طرف سے اپنی مخلوق کی طرف وحی کی صورت اتارا جاتا ہے۔ باقی علوم سے ہم انکاری نہیں اور نہ اِن کی افادیت سے انکاری ہیں۔تاہم وہ علوم جو خالق کی رضا کے خلاف ہوں اُن کو بہر حال ہم علم کی کوئی صورت تسلیم کرنے کو تیار نہیں بلکہ وہ اُس عقلی جہالت کے نشانات ہیں جہاں جہاں انسان نے علم کی جستجو میں ٹھوکر کھائی۔چنانچہ جب علم وحی باقی تمام علوم سے برتر ثابت ہوا تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پہ حاملین وحی کو دوسرے تمام لوگوں پہ برتری حاصل ہونی چاہیے۔اگر حقیقت اس کے برعکس ہے تو وہ اُس انحراف اور بے اعتنائی کا لازمی نتیجہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا ہے۔حالانکہ یہی قرآن ہے جس کی تعلیمات کے بل بوتے پر اُس نے ہزار سال تک خطہ ارض پہ حکومت کی ہے حاملین وحی کی تین اقسام ہیں،اول تو انبیاء و رسل ہیں جن کی طرف براہ راست وحی کی جاتی ہے۔انبیاء کا علم راسخ ہوتا ہے اور اُس میں کسی شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ازاں بعد حاملین وحی کا دوسرا گروہ وہ ہے جو علم وحی کی تشریح کرتا ہے علم کے اُس نور کے سائے میں فقہ و شریعت کے قوانین وضع کرتا ہے۔اصطلاح میں اِن کو علماء فقہا کہا جاتا ہے۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو عام مسلمانوں پہ مشتمل ہے جنھوں نے اُن امور کی پیروی کرنی ہوتی ہے جن کو حاملین وحی نے واضح کیا ہو۔انحراف اور بے اعتنائی کا سب سے زیادہ داعیہ اسی طبقے میں پایا جاتا ہے کہ یہی طبقہ اکثریت میں ہوتا ہے۔

وحی کی ایک قسم وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حیوانات و جمادات پہ اتارا ہے۔تاہم یہ اُس وحی سے قدرے مختلف ہے جو انسان کی طرف کی جاتی ہے۔انسان اور جانور کے مابین کی جانے والی وحی کے باہمی تفاوت کو جاننے کے لیے مرشد مودودیؒ کی تفہیم القرآن پہ ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔سورۃ النحل کی تفسیر کرتے ہوئے مرشد مودودیؒ نے لکھا ہے۔

پہلے آیات پہ ایک نگاہ ڈال لیں۔

وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا
وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ۝ ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ
الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِہَا
شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً
لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ النحل 16/69-68)

ترجمہ:

”اور دیکھو تمھارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پہ چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں لوگوں کے لیے شفا ہے“۔

✡✡✡✡✡✡

اِن ایات کی تفسیر میں سیّد ابو الاعلیٰ مودودیؒ تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

”وحی کے لغوی معنی خفیہ اور لطیف اشارے کے ہیں، جسے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا اور کوئی محسوس نہ کر سکے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ ”القاء“ (دل میں ڈال دینے) اور الہام (مخفی تعلیم و تلقین) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی مکتب و درسگاہ میں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیف طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بظاہر نہ کوئی تعلیم دیتا نظر آتا ہے نہ تعلیم پاتا۔ اس لیے اس کو قرآن میں وحی، الہام اور القاء کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں لفظ

الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔لفظ وحی انبیاء کے لیے مخصوص ہو گیا ہے،الہام کو اہل علم اور بندگانِ خاص کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے اور القا کی نسبت عام ہے۔لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا یہاں آسمانوں پہ بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق اس کا سارا نظام چلتا ہے (دیکھیں سورہ حم سجدہ) زمین پر بھی وحی کی جاتی ہے جس کا اشارہ پاتے ہی وہ اپنی سرگزشت سنانے لگتی ہے۔

(دیکھیں سورہ الزلزال) ملائکہ پہ بھی وحی کی جاتی ہے جس کے مطابق وہ کام کرتے ہیں (دیکھیں سورۃ الانفال)۔

اور شہد کی مکھی کو اُس کا پورا کام فطری تعلیم کے ذریعے سمجھایا جاتا ہے،اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی تک محدود نہیں، مچھلی کو تیرنا، پرندے کو اڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دودھ پینا بھی وحی خداوندی ہی سکھاتی ہے۔ پھر انسان کو غور وفکر تحقیق وتجسس کے بغیر جو صحیح تدبیر یا صائب رائے یا فکر وعمل کی صحیح راہ سمجھائی جاتی ہے وہ بھی وحی ہے۔

(دیکھیں سوہ القصص)۔اور وحی کی اس شکل سے کوئی بھی انسانی دل محروم نہیں ہے۔

دنیا میں جتنے بھی اکتشافات ہوتے ہیں، جتنی بھی مفید ایجادات ہوتی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاتحین، مفکرین اور مصنفین نے جو معرکے کے کام کیے ہیں اِن سب میں اس وحی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آئے دن اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کبھی یونہی بیٹھے بیٹھے دل میں ایک بات آئی یا کوئی تدبیر سوجھ گئی یا خواب میں کچھ دیکھ لیا اور بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو انھیں غیب سے عطا کی گئی۔اِن بہت سی اقسام میں ایک خاص قسم کی وحی ہوتی ہے جس سے انبیاء علیہ السلام نوازے جاتے ہیں۔اور یہ وحی اپنی خصوصیات میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔اس میں وحی کیے جانے والے کو پورا شعور حاصل ہوتا ہے کہ یہ وحی اُسے خدا کی طرف سے کی جارہی ہے اور اسے اس کے من

جانب اللہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔وہ عقائد احکام قوانین اور ہدایات پہ مشتمل ہوتی ہے اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی کے ذریعے سے نوع انسانی کی رہنمائی کی جا سکے۔(21*)

✡✡✡✡✡✡

وحی کے بعد عقلی علوم کا درجہ ہے جو انسان عقل وحواس سے غور وفکر اور تحقیق وجستجو کے بعد حاصل کرتا ہے۔اسی مقام پہ مغربی مفکرین نے ٹھوکر کھائی ہے کہ وہ عقلی علوم کو علم کا آخری درجہ قرار دیتے ہیں جبکہ عقل وحواس کے ذریعے حاصل ہونے والے علوم علم وحی کے تابع ہیں یا علم کے وحی کے بعد ہیں۔اللہ تعالیٰ عقل وحواس سے حاصل ہونے والے علوم کی نہ صرف حوصلہ افزائی فرماتے ہیں بلکہ انسان کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ مظاہر کائنات پہ نگاہ کرے اور تفکر وتدبر کے ذریعے خالق کی رضا کو تلاش کرے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ○ وَلِسَانًا وَّ شَفَتَيۡنِ ○ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ البلد 8-10/90)

ترجمہ:

"کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے اور دونوں نمایاں راستے اسے دکھا نہیں دیئے"۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَهُوَ الَّذِىٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ المومنون 78/23)

ترجمہ؛

"وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھیں سننے اور دیکھنے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیئے مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو"۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو جو آنکھیں اور کان دیئے ہیں اُن کا مقصد محض بولنا اور سننا نہیں ہے بلکہ یہ اصلاً علم کے وہ ذرائع ہیں جن سے کام لے کر انسان کو اللہ کی رضا تلاش کرنی چاہیے۔ ہم آنکھوں سے بدلتے منظروں کو دیکھتے ہیں، کانوں سے بدلتے نظریات کو سنتے ہیں۔ جس سے حق سچ کے مابین تفاوت کھل کے سامنے آ جاتا ہے۔ خیر و شر کے بیچ کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے جس کی بنا پہ انسان خیر و شر کی دونوں راہوں کو شناخت کر لیتا ہے اور اِن میں سے کسی ایک راہ کو اپنے ارادے اور طبع کے باعث اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ سماعت و بصارت اللہ کی وہ نعمتیں ہیں جن سے کام لے کر انسان حق تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر جیسا کہ قرآن حکیم ہی میں اس امر کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر چہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں مگر وہ کفرانِ نعمت کرتا ہے اور آنکھیں ہونے کے باوجود حق نہیں دیکھتا، کان ہونے کے باوجود حق نہیں سنتا، دل ہونے کے باوجود غور نہیں کرتا۔ اگر وہ اِن نعمتوں کو معرفت سے حقائق تک رسائی کے لیے استعمال کرتا تو حق کو پہچان جاتا۔ اِن نعمتوں سے حاصل ہونے والی معلومات کی بنیاد پہ غور و فکر کرتا اور اِن سے نتائج اخذ کرتا تو حق کسی شفاف آئینے کی طرح اس پہ آشکار ہو جاتا۔ تاہم ساتھ ہی قرآن حکیم نے اسی

آیت میں فرمادیا کہ "قَلِيْلاً مَّا تَشْكُرُوْنَ" کہ انسان کم ہی شکر کی راہوں پہ چلتا ہے۔یعنی ایسے لوگوں کی تعداد ہمیشہ قلیل ہی رہی ہے جنھوں نے اِن نعمتوں کو اُس طرح استعمال کیا کہ اِن نعمتوں کا حق ادا ہوجائے اور وہ آنکھوں کانوں اور دل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشیاء کی حقیقت اور پھر اپنی ذات اور کائنات پہ نگاہ تدبر ڈال سکے۔قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ آفاق والنفس میں پھیلے ہوئے یہ مظاہر اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ بعض نشانیاں ہیں جو انسان کو اُس کے خالق تک لے جاتی ہیں۔اب ظاہر ہے کہ کائنات میں ہر قدم پہ پھیلی اللہ تعالیٰ کی بسیط نشانیوں کو صرف وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جو اِن نعمتوں کا حق ادا کرنے کا شعور رکھتے ہوں۔ورنہ سورج روز نکلتا ہے رات روز آتی ہے۔مگر ایک جاہل اور اجڈ چرواہے کے لیے اس میں غور فکر کی کوئی بات نہیں۔اس کے برعکس ایک عالم کے لیے دن اور رات کا یہ تسلسل ہی خدا تک پہنچنے کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔قرآن حکیم میں ایسے لوگوں کی تحسین کی گئی ہے جو افاق والنفس کی نشانیوں پہ غور کرتے ہیں اور اپنے مالک کی صناعی پہ کھل اٹھتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ!

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 190-191/3)

ترجمہ:

"زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد

کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور کرتے ہیں (تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتے ہیں) کہ پروردگار تو نے یہ سب کچھ (کائنات) فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، اور تو پاک ہے اس سے کہ تُو کوئی عبث کام کرے پس اے رب تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے‘‘۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات کی تشریح میں علماء نے لکھا ہے کہ جب انسان مظاہر کائنات پہ نگاہ تدبر دوڑاتا ہے تو وہ کائنات وحیات کی وجودیت کے بارے میں اُس تصور کے متعلق جان جاتا ہے، حق تک پہنچ جاتا ہے جس تک فلسفہ پہنچنے میں اہل فلسفہ نے پانچ ہزار سال تک اپنا سر زمین سے ٹکرایا ہے مگر اُن سے یہ راز مخفی ہی رہا۔ آیت کے آخری حصے سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ یہ توفیق انھی صاحبِ دانش لوگوں کو ارزانی فرماتا ہے جو اُس کے شکر گزار بندے ہوتے ہیں۔ جو اُس سے التجا کرتے ہیں کہ وہ انھیں دوزخ کے عذاب سے بچالے جو اس بات پہ یقین رکھتے ہیں کہ خالق نے کائنات میں یہ جو رنگ بکھیرے ہیں تو یہ محض اسی لیے ہیں کہ انسان اُن کے ذریعے خالق کے در تک جا پہنچے۔ اہل مغرب کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ کائنات وحیات کی توجیہ کرتے ہوئے خالق سے بے اعتنائی کا رویہ اپنایا ہے۔ اگرچہ انھوں نے عقل کا نعرہ لگایا مگر ہمیشہ اپنے اندر سے اٹھتی عقل کی اُس گواہی کا گلا گھونٹ دیا جو انھیں سچ تک لے جانا چاہتی تھی۔ اس لیے حقیقت میں عقلیت پسندوں نے عقل کی آواز پہ کان نہیں دھرے بلکہ اپنے نفس کے پکار کے آگے سر جھکایا ہے۔ چنانچہ میرے نزدیک عقلیت پسندی کی اصطلاح ہی سرے سے غلط ہے۔ میرے خیال میں مغربی فلاسفہ کو نفس پرست کہنا چاہیے۔ کیونکہ علم کا تو براہ راست تعلق عقل کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا کہ اللہ سے وہی ڈرتا ہے جو علم والا ہے۔

''اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤا ط اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ غَفُوۡرٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ فاطر 28/35)

ترجمہ؛

''اللہ کے بندوں میں سے وہی اس سے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں، بے شک اللہ غالب اور ڈرانے والا ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ ثابت ہو گیا کہ اہل مغرب کے فلاسفہ عقل والے نہیں بلکہ نفس والے ہیں اگر وہ عقل والے ہوتے تو اللہ سے ڈرنے والے ہوتے۔ آیت بالا پہ مفسرین کی تشریحات دیکھتے ہوئے مجھے سب عمدہ بیان مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا لگا چنانچہ تدبر القرآن میں وہ لکھتے ہیں کہ!

''ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو محض ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ محسوسات سے آگے نہ اُن کو کچھ نظر آتا ہے اور نہ اس سے آگے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے اندر ظاہر اور باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو اپنے بطن و فرج کے مطالبات سے زیادہ اہمیت اپنی عقل اور روح کے مطالبات کو دیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور اللہ کے رسولوں کی دعوت اِن کو اپیل کرتی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحیح علم کا منبع درحقیقت اللہ کی معرفت ہے جس کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوگی وہ علم سے بالکل

محروم ہے۔اگرچہ وہ دنیا جہاں کی کتابیں حفظ کرڈالے۔اس طرح یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس کو خدا کی معرفت حاصل ہے۔اس کے اندر لازماً خدا کی خشیت بھی ہوگی۔اگرکوئی خدا کی خشیت سے محروم ہے تواس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی معرفت سے بھی محروم ہے۔یہی معرفت اورخشیت انسان کے تمام علوم وافکار میں حقیقی زندگی پیدا کرتی ہے جس سے علوم وفنون دنیا کے لیے موجب خیرو برکت بنتے ہیں۔اگر یہ چیز نہ ہوتو انسان کی ساری ذہانت شیطان کی مقصد برآوری میں صرف ہوتی ہے اور بالآخرتباہی کا موجب بنتی ہے۔(21*)

✡ ✡ ✡

علم کے مختلف پہلوؤں پر یہ مباحث تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہے انسان سطحی تصورات سے بالا ہو کر معاملات کو نگاہ عمیق سے دیکھے اور خود کو عام انسانوں کی سطح سے بلند کر کے علم کی راہوں کا مسافر ہو جائے اس لیے علم کی راہیں ہی انسان کو کامیابی کی اُس پر لے جاتی ہیں جو حتمی کامیابی کی دلیل ہیں۔ یہی وہ راہیں جن پر چلنے سے انسان کو سکون اور راحت کی وہ دولت حاصل ہوتی ہے جس کی تلاش میں وہ ساری زندگی سرگرداں رہتا ہے۔

علم حقیقت، علم مجاز

یہاں ہم علم کے مختلف پہلوؤں سے بحث کر رہے ہیں۔علم کی حقیقت اور ماہیت پہ غور کر رہے ہیں۔حیات و کائنات کے اسراروں پہ غور فکر کر رہے۔اِن مضامین میں علم کے مختلف پہلو زیر بحث ہیں جس سے یہ نتیجہ نکل کے سامنے آیا ہے کہ علم کی اگرچہ بیشمار اقسام ہیں مگر حقیقت میں علم کی اقسام دو ہی ہیں ۔''مادی علوم اور روحانی علوم'' علم کی انھی دو اقسام پہ کچھ لب کشائی یہاں مقصود ہے۔بعض لوگوں کو یہ شبہ گزرا ہے کہ اسلام مادی علوم کے سراسر خلاف ہے اور جو کچھ بھی انسان نے حواس و عقل سے حاصل کیا ہے اسلام اُسے رد کرتا ہے۔یہ ایک فکری مغالطہ ہے جس کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں۔اسلام دراصل صرف یہ کہتا ہے کہ انسان کو دنیا میں جو بھی کامیابیاں حاصل ہوتی ہیں اور تسخیر کائنات کے ضمن میں انسان نے جو بھی کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں اُن کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اسلام کو اس پہ کوئی اعتراض نہیں مگر اُس کے نزدیک یہ مقصود بالذات نہیں یعنی انسانی شرف کی کوئی حقیقی منزل نہیں کہ وہ ستاروں پہ کمندیں ڈالے یا چاند پہ چہل قدمی کرے۔قرآن انسان کی

تگ ودو اور جہد وسعی کا مدار متعین کرتا ہے اور اُنسان کی راہنمائی اُس کو ہر مراد کی طرف کرتا ہے جو مقصود بالذات ہے۔اب اسی بات پہ غور کر لیں چاند پہ اترنے والے پہلے انسان خدا کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے تھے۔کچھ بھی نہیں وہ خدا کے وجود سے ہی انکاری تھے تو انھیں خدا کی اس مخلوق چاند پہ اتر کے بھی کچھ حاصل نہ ہوا۔نہ انھوں نے معرفت کی کوئی منزل طے کی نہ خالق کی ہیبت سے اُن کے دل لرزے۔اس لیے کہ اُن کی تعلیم وتربیت ہی اس انداز میں کی گئی تھی کہ وہ چاند کو محض ایک مادی وجود تصور کرتے ہیں جو ایک متعین نظام کے تحت اپنے محور کے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔

علم کی یہی وہ اقسام ہیں جنھوں نے انسان میں دو ہی قسم کے ذہنی رویوں کو پروان چڑھایا۔آیئے اِن کا مطالعہ قرآن کی روشنی میں کرتے ہیں۔اِن میں سے ایک رویہ تو وہ ہے جو مادی زندگی میں حاصل ہونے والی کامیابیوں اور مال ومتاع ہی کو اصل قرار دینے سے پیدا ہوتا ہے۔اور دوسرا رویہ وہ ہے جس میں انسان حقیقت تک رسائی کے لیے اللہ کی اطاعت اور اُس کے رسولوں کی پیروی اختیار کرتا ہے۔جو اسلام میں مطلوب ہے۔قرآن حکیم میں اِن دونوں رویوں پہ تاریخی کرداروں کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔قرآن نے قارون کو مادی نظام زیست کا نمائندہ قرار دیا ہے۔قارون اللہ ہی کا ایک بندہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے بے پناہ نواز رکھا تھا۔بیان کیا گیا ہے کہ اُس کے خزانوں کی محض کنجیاں کئی اونٹوں پہ لادی جاتی تھیں۔قارون کو اپنی دولت پہ بہت ناز تھا۔لوگ اُس کو کہتے کہ اس مال و دولت پہ مت اتراؤ بلکہ اللہ نے تمھیں جو کچھ عطا کیا ہے اس کا شکر ادا کرو اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو اور آخرت کی کامیابی کے لیے کوشش کیا کرو۔اس مال سے میں اگر تم اللہ کی راہ میں کچھ خرچ کرو گے تو موت کے بعد تمھیں اس کا فائدہ پہنچے گا۔مگر قارون بھی شاید نظام سرمایہ داری کا تربیت یافتہ تھا وہ لوگوں کو جواب دیتا کہ یہ کثیر مال ومتاع جو تم دیکھتے ہو یہ میں نے اپنی محنت اور ذہانت سے حاصل کیا ہے۔اس میں اللہ کی رحمت کو کوئی دخل نہیں اس لیے میں اللہ کی راہ میں کیوں خرچ کروں۔قارون کو معاشرے میں بہت شان وشوکت حاصل تھی لوگ اُس کے عظیم مال ومتاع کو دیکھتے تو اُن میں سے کچھ کہتے۔

’’کاش ہمیں بھی قارون کی طرح دولت حاصل ہوتی‘‘

کچھ اور لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے علم والے کہہ کے پکارا ہے قارون کو دیکھتے تو کہتے:

اللہ کے ہاں تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اُس کا اجر قارون کے خزانوں سے کہیں بڑھ کے ہے۔

یہ دو نقطہ ہائے نظر تھے اور انھی میں سے اول کو مادیت پسندی اور دوم کو حقیقت پسندی قرار دیا گیا ہے۔ قرآن نے تاریخ عالم سے اس کے نظائر اس لیے پیش کیے تا کہ انسان جان جائے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام حیات اور یہ اللہ تعالیٰ کی رضا پہ سر جھکا دینے کا نظریہ یعنی اطاعت کی روش، کوئی نئے اور انوکھے نظام فکر نہیں ہیں بلکہ زمانہ قدیم سے ہی انسانوں کا ایک گروہ شیطان کی پیروی میں محو ہے اور اپنے نفس کی پکار کے آگے سر جھکائے ہوئے ہے۔ اور انسانوں کا ایک گروہ زمانہ قدیم سے ہی اللہ تعالیٰ کی رضا پہ صبر کرنے والا چلا آیا ہے۔ اُس کے رسولوں کا مددگار رہا ہے۔ اب قارون ہی کو دیکھیں کہ بنی اسرائیل کی روایات کے مطابق تو وہ حضرت موسیٰ کا چچا زاد تھا اور حضرت موسیٰ اس کی تربیت کا پورا اہتمام بھی کرتے تھے مگر اُس کی ایک ہی رٹ تھی کہ یہ مال و متاع اس کے زور بازو کی کمائی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ وہ پرلے درجے کا بخیل بھی تھا اور یہ ایک نظریہ حیات ہے جسے قرآن حکیم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ارشادِ باریٰ تعالیٰ ہے کہ!

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِىْ زِيْنَتِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِىَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ○

القرآن الحکیم (سورۃ القصص 79-80/28)

ترجمہ:

”وہ (قارون) پوری شان شوکت کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے نکلا تو جو لوگ حیات کے طالب تھے انھوں نے کہا: کاش! ہمیں بھی وہی کچھ حاصل ہوتا جو قارون کو حاصل

ہے۔ بے شک وہ بڑے ہی نصیب والا ہے۔ اور جن لوگوں کو علم عطا ہوا تھا انھوں نے کہا: شامت زدو! ایمان اور عمل صالح والوں کے لیے خدا کا اجر اس سے کہیں بڑھ کے ہے اور یہ حکمت صرف صابروں ہی کو عطا ہوتی ہے"۔

✡✡✡✡✡✡

یہاں کچھ اُن لوگوں کا نقطہ نظر بیان کیا گیا ہے جو مادیت پہ یقین رکھتے ہیں اور قارون کے نظریہ حیات کو لوگ خاص طور سے اہل مغرب آج تک سینے سے لگائے چلے آ رہے ہیں۔ اِن لوگوں نے اپنے نفس کی اس کجی کو کوئی خوبصورت نام دے رکھے ہیں کبھی وہ خود کو مہذب اور تہذیب یافتہ کہتے ہیں تو کبھی آزاد خیال اور روشن خیال کہتے ہیں، کبھی وہ خود دین انسانیت کا پیروکار بتاتے ہیں تو کبھی سرمایہ کار نظام زیست اُن کی متاع فخر بن جاتی ہے۔ تاہم مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے ساتھ ہی مال و متاع کے متعلق اہل علم کے نقطہ نظر سے بھی آگاہ کر دیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو صبر کرنے والے ہیں خالق کی رضا پہ راضی رہنے والے ہیں اور اِن کے دل اس یقین سے مزین ہیں کہ انھیں جو نعمت حاصل ہے وہ اللہ ہی کی رضا سے حاصل ہوئی ہے اور جو نعمت اِن سے روک لی گئی ہے اللہ ہی اُس کو عطا کرنے والا ہے اور یقیناً اِس میں خالق کی کوئی مصلحت ہوگی جو اُس نے اِن کو آزمائش میں ڈالا ہے اور قارون جیسا مال و متاع اِن کو حاصل نہیں ہوا۔ دوسری طرف اہل ایمان کے اس تخیل کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اہل ایمان کو اس بات کی کوئی خاص پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ اُن پہ اللہ کی نعمت تمام کیوں نہیں ہوئی اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اُن کے صبر کا پھل آخر اُن کو حاصل ہو کے رہے گا چاہے اِس دنیا میں چاہے تو اُس دنیا میں، اور انھیں اِس دنیا سے زیادہ اُس دنیا کا خیال ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا تو چند روزہ ہے اور دوسری دنیا ابدی ہے جہاں نہ نعمت کو زوال ہے نہ اُس کی رحمت کم ہوگی۔ چنانچہ قرآن حکیم نے حقیقی علم کا نمائندہ سیّدنا داؤد علیہ السلام اور اُن کے بیٹے

حضرت سلیمان علیہ السلام کو قرار دیا ہے کہ اُن کو اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت سے بھی نوازا، مال ومتاع سے بھی نوازا، بادشاہی سے بھی نوازا بلکہ اُس بادشاہی سے نوازا جس کی مثال نہ تاریخ عالم سے کل مہیا کی جا سکتی تھی اور نہ ہی آج اُن کی مثل کوئی جلیل القدر بادشاہ خطہ ارض پہ موجود ہے کہ ہوائیں اُن کے حکم سے چلتی تھیں، شیاطین اور جن اُن کے غلام بنا دیئے گئے تھے، پرندے اُن کا حکم مانتے تھے۔ قرآن حکیم میں اُن کی اس عظیم بادشاہت کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِى الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ
غَنَمُ الْقَوْمِ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا
سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّسَخَّرْنَا مَعَ
دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ وَعَلَّمْنٰهُ
صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْ بَاْسِكُمْ فَهَلْ
اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ
اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ
عٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ
عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ الا نبیاء 21/82-78)

ترجمہ:

"اور اسی نعمت (علم وحکمت) سے ہم نے داؤد کو سرفراز فرمایا۔ یاد کرو وہ موقع جب وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ جس میں رات کے وقت بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم اِن کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا حالانکہ علم اور حکم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔ داؤدؑ کے ساتھ ہم

نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا' اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔ اور ہم نے اس کو تمھارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صفت سکھا دی تا کہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے' پھر کیا تم شکر گزار ہو؟ اور سلیمانؑ کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا جو اُس کے حکم سے اِس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے ہیں اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اُس کا تابع بنا دیا تھا' جو اُس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ اور اِن کے نگران ہم ہی تھے''۔

✡✡✡✡✡✡

حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اس قدر عظیم بادشاہ تھے کہ اِن کا اقتدار انسانوں کے علاوہ جنوں شیطانوں اور پرندوں اور ہواؤں تک پھیلا ہوا تھا اس کے باجود اپنی اس طاقت وثروت اور عظیم وعجیب طاقتوں سے مزین بادشاہت کے متعلق اُن کا یہ کہنا تھا کہ یہ سب تو ہمارے رب کا فضل ہے۔

اور یہی وہ فرق ہے جو مادیت اور روحانیت میں پایا ہے جو قارون اور حضرت داؤد علیہ السلام وسلیمان علیہ السلام کے نقطہ نظر سے ظاہر ہو رہا ہے۔ قرآن حکیم حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس اظہارِ تشکر کو یوں بیان کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَىْءٍ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ

الْمُبِيْنُ ۝ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ
وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ
قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا
يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝
فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ
اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ
اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ النمل 27/20-15)

ترجمہ؛

ہم نے داؤد و سلیمانؑ کو علم عطا کیا اور انھوں نے کہا شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو اپنے بہت سے مومن بندوں پہ فضیلت عطا کی۔ اور داؤد کا وارث سلیمان ہوا۔ اور اُس نے کہا: لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں۔ بیشک یہ اللہ کا (نمایاں) فضل ہے۔ سلیمان کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ اپنے لشکروں کے ساتھ) کوچ کر رہا تھا یہاں تک کہ وہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: چیونٹیو اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اُس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔ حضرت سلیمان نے چیونٹی کی بات سنی اور ہنس پڑے اور کہا: اے میرے رب مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے۔ اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھ کو اپنے صالح بندوں میں شامل کر“۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ دومختلف رویوں کا حوالہ دے کرقرآن مجید نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی علم کیا ہے اور جوعلم اللہ کی طرف سے انسان کوعطا ہوتا ہے اس کا اظہار عملی زندگی میں کیسے ہو۔ پھر ایک اور فرق جو قرآن نمایاں کر رہا ہے کہ قارون اپنے خزانوں کو اپنی صلاحیت، علم اور مہارت کا حاصل سمجھتا ہے۔ اپنی ذہنی اور جسمانی مشقت کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور وہ اسے خالق کی عطا یا بخشش قرار دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ چونکہ وہ اپنے مال ومتاع کا سرچشمہ اپنی ذات ہی کو قرار دیتا ہے اس لیے کسی کا شکر گزار ہونے کا بھی روادار نہیں۔ اس کے برخلاف اللہ کے پیغامبر علم، حکمت، نبوت ، اقتدار اور دولت غرض ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ یہ سب تو انھوں نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔

بلکہ اس معاملے میں وہ اس قدر دیانتدار اور صاف گو ہیں کہ ہر عطا پر منعم حقیقی کا نام لیتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی یہ تصریحات مادی اور حقیقی علم کے فرق کو نمایاں کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم حاصل کرنا، کائنات پہ غور وفکر کرنا، اور زندگی گزارنے کے لیے سہولیات حاصل کرنا، انسانوں کی آسانی اور بھلائی کے لیے قوانین وضع کرنا احسن انسانی اعمال ہیں۔ فرق صرف اُس طرزِ فکر کا ہے کہ جب انسان کو مادی ذرائع علم حاصل ہو جاتے ہیں تو حاملین وحی کا رویہ کیا ہوتا ہے اور خالق سے انکاری لوگوں کا رویہ کیا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پہ یقین رکھنے والے علم حاصل ہونے کے بعد خالق کا شکر ادا کرتے ہیں جب کہ مادیت پسند علم حاصل ہونے کے بعد خالق کی اس زمین کو خالق کے انسانوں کا چہرہ خون سے رنگنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے ایک اور بات بھی نمایاں ہو کے سامنے آ رہی ہے۔ اصل میں علم چاہے کوئی بھی ہو کسی بھی قسم کا ہو کبھی ضرر رساں نہیں ہوتا بلکہ اُس علم کو استعمال کرنے والے لوگوں ذہنیت اس علم کے اثرات کو زہریلا بنا دیتی ہے۔ یاد کریں کہ انسان نے ایٹم کو توڑ کر توانائی حاصل کرنے کا طریقہ دریافت کیا مگر بعض

ظالموں نے اسی ایٹم کو توڑ کر ابن آدم کے لیے بربادی کا نشان بنا دیا ایک محتاط اندازے کے مطابق اس دنیا میں اس وقت اتنے ایٹمی ہتھیار موجود ہیں جو کرہ ارض کو صرف تین منٹوں میں جلا کر راکھ کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ چنانچہ یورینیم کی افزودگی تو محض ایک علم ہے انسان اگر چاہے تو اس سے پیدا ہونی والی توانائی سے بستیوں کی بستیاں روشن کر دے اور اگر وہ چاہے تو انھی بستیوں کو خاک و خون میں نہلا دے۔ تاہم چونکہ جدید سائنسی علوم کی ترویج عام طور پچھلی دو صدیوں میں معرض وجود میں آئی ہے۔ اور یہ دونوں صدیاں حقیقتاً اہل مغرب کی صدیاں ہے اس لیے اِن صدیوں میں علم کے جو مظاہر منظر عام پہ آئے اُن میں خالق سے بے اعتنائی اور انسانیت کی بربادی اور استحصال کا عکس نمایاں طور پہ محسوس کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ علم جس سماجی پس منظر میں فروغ پاتا ہے وہ اس کے اثرات سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوتا ہے۔ اور مغرب کسی بھی قسم کے اخلاقی نظریے یا مذہبی تخیل سے خود کو آزاد قرار دیتا ہے اور وہ صرف طاقت کی زبان میں بات کرتا ہے جو اسے سائنس کے غلط استعمال سے حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ علم کی اقدار جب اُن ہاتھوں سے گزرے جو خالق کے انکاری ہوں تو ظلم وحشت کے سائے انسانیت پہ لہرانے لگتے ہیں اور یہی آج کی دنیا کا ظاہری منظر ہے۔ امریکہ جو اس مادی دنیا کا سربراہ تصور کیا جاتا ہے طاقت کے اندھے استعمال پہ یقین رکھتا ہے۔ اُس نے عراق اور افغانستان میں لاکھوں بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے اور محض اپنی سرداری کو قائم رکھنے کے لیے دنیا کے ستر سے زائد ممالک میں اپنے فوجی اڈے قائم کر رکھے ہیں۔

اس ساری بحث سے ایک اور سوال بھی ابھر کے سامنے آیا ہے کہ علم کا غلط استعمال اور ایجادات کا غلط استعمال کس طرح اور کیوں کر وقوع پذیر ہوتا ہے۔

اس کا جواب بھی قرآن حکیم ہی سے درج کیا جاتا ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے سارے علوم دراصل کائنات کے وہ اسرار ہیں جن کا پردہ انسان اپنی جستجو اور استقلالِ عزم کے باعث چاک کرتا ہے۔ اور جب کائنات کا کوئی راز منکشف ہو کے انسان کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے تو انسان کی آزمائش کا نیا دور شروع ہو جاتا ہے کہ وہ اس انکشاف کو مقاصد

کے تعین میں کہاں جگہ دیتا ہے۔ کیا وہ اسے انسانیت کی فلاح کے لیے استعمال کرتا ہے جیسا کہ پینسلین کے موجود نے اپنے انکشاف کو انسان کے نام کیا اور اسے انسانیت کی فلاح کے لیے وقف کر دیا۔ یا ایٹم کو توڑنے والے سائنس دانوں کی طرح اسے مہیب انسانی تباہی کے لیے آگ کا گولا بنا دیتا ہے۔ چنانچہ قرآنی نقطہ نظر کے مطابق پینسلین کا موجد سرخرو ہوا اور ایٹم کی توانائی کو انسانی فلاح کی بجائے انسان کی ہلاکت کے لیے مرتب کرنے والے سائنس دان شیطان کے قبیلے سے متعلق نکلے اور انھوں نے شیطان کے نظریہ کی پیروی اختیار کی۔

علم کے بارے میں چونکہ یہ بات بطور خاص اہمیت کی حامل ہے کہ علم فی نفسہ ضرر یا منفعت کا پہلو رکھتا ہے یا یہ انسان کا استعمال ہے جو علم میں خیر یا شر کی روح پھونک دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے جس سے علم کے اس پہلو کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر معلوم کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ!

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ

وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ
وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝
وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ
كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ البقرۃ 101-103/2)

ترجمہ؛

''اور جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اُس کتاب کی تصدیق کرتا ہوا آیا ہے جو اِن کے ہاں پہلے سے موجود تھی تو اِن اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اس طرح پس پشت ڈالا گویا کہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ اور لگے اُن چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیطان تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اُس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پہ نازل کی گئی تھی۔ حالانکہ وہ فرشتے جب کسی کو اس کی تعلیم دیتے تو پہلے متنبہ کر دیتے کہ دیکھو یہ علم ایک آزمائش ہے کہیں اس کے ذریعے تم کفر میں مبتلا نہ ہو جانا، پھر بھی یہ لوگ اُن سے وہ چیز سیکھتے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں، ظاہر ہے کہ اذِن الٰہی کے بغیر وہ اس علم کے ذریعے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ اُن سے ایسی چیز سیکھتے تھے جو خود اُن کے لیے بھی فائدہ مند نہ تھی۔ بلکہ نقصان دہ تھی اور وہ اس بات سے خوب اچھی طرح واقف تھے۔ اُس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، کتنی بری متاع تھی وہ جس کے بدلے میں انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ کاش انھیں معلوم ہوتا کہ اگر وہ ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے ہاں سے انھیں اس کا جو بدلہ ملتا وہ اِن کے لیے کہیں زیادہ بہتر تھا، کاش وہ جانتے''۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات کے آغاز میں تو اُن امور کی طرف اشارہ کیا گیا جن کے باعث قوم بنی اسرائیل کو سیادت سے منصب سے معزول کیا گیا مگر چونکہ یہ ہمارا موضوع نہیں اس لیے اس سے ہٹ کہ ہم اپنی توجہ اُن امور پہ مبذول کریں گے جو موضوع سے متعلقہ ہیں۔ اِن آیات میں ایک ایسے علم کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ کے دو فرشتوں کے ذریعے بابل کے لوگوں پہ اتارا گیا۔ فرشتوں نے لوگوں کو بتایا کہ ہمارے پاس ایک علم ہے جس سے تم چاہو تو فائدہ بھی اٹھا سکتے ہو مگر دوسری طرف یہی علم ایک آزمائش بھی ہے کہ اگر تم اس کا غلط استعمال کرو گے اسے انسانی فلاح کے خلاف استعمال کرو گے اور اس سے میاں بیوی میں جدائی ڈالو گے تو تم کفر کا شکار ہو جاؤ گے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میاں بیوی میں جدائی کا جو اشارہ اِن آیات میں کیا گیا ہے وہ کوئی حقیر امر ہے۔ یاد رہے کہ خاندان کی بنیاد میاں اور بیوی ہی تو ہیں اگر اُن کے درمیان جدائی ڈال دی جائے تو خاندان ٹوٹ جاتا ہے اور اگر یہ بنیادی ادارہ ٹوٹ جائے تو اس سے پورا سماج متاثر ہوتا ہے اور اگر اس ادارے کی ٹوٹنے کی شرح بڑھ جائے تو پورا معاشرہ انارکی کا شکار ہو جاتا ہے جیسا کہ آج کا مغرب اس امر کا شاہد ہے۔ اب ہم اس بات پہ غور کرتے کہ علم کی وہ کون سی قسم تھی جسے لے کر ہاروت و ماروت کو اتارا گیا تھا۔ غالب مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ وہ جادو کا علم تھا مگر بیسیویں صدی کے ممتاز مفسر امام امین احسن اصلاحیؒ کا نقطہ نظر معاصرین سے مختلف ہے آیئے اس پہ ایک نظر ڈالتے ہیں۔ تدبر قرآن میں وہ اِن آیات کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ!

''اگر یہ جادو کا علم ہوتا تو اس کا علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی قرآن نے اس کے لیے ''انزل'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پہ اتارا گیا۔ اس لفظ میں افادیت اور عنایت کی جو شان ہے اس

کے پیش نظر جادو جیسی ناپاک اور سراسر باطل چیز کے لیے اس کا استعمال ذوق پر گراں محسوس ہوتا ہے۔ یہ علم فرشتوں پہ اتارا گیا اور وہ اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، فرشتوں کا دامن شک وفکر کی ہر آلائش سے پاک ہوتا ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے قیام اور خیر وفلاح کی دعوت وتعلیم کا ذریعہ بنتے ہیں لہٰذا یہ بات عقل سے بعید تر ہے کہ جادو کا علم اُن پہ اترے اور وہ اس کی اشاعت کریں۔ شیاطین کا علم خود قرآن کے اپنے الفاظ کے مطابق کفر تھا لیکن فرشتوں کے ذریعے اتارے گئے اس علم کے لیے کفر کا نہیں بلکہ فتنہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ فتنہ کے معنی امتحان یا آزمائش کے ہیں۔ قرآن مجید میں اس لفظ سے مراد بالعموم وہ اشیاء ہیں جو اصلاً تو انسان کی فلاح و بہبود کے لیے پیدا کی گئی ہیں لیکن یہ اِن کا سوئے استعمال ہے جس کے باعث وہ انسانوں کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہیں''۔

✡✡✡✡✡✡

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی اس بحث سے یہ امر ظاہر ہوا کہ بعض علوم ایسے ہوتے ہیں جن کے حاصل کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے تاہم اِن علوم کے اندر اُن کے استعمال کے حوالے سے نزاکت کا ایک احساس ضرور پایا جاتا ہے۔ اور اُن کے استعمال میں ذراسی بے احتیاطی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ اس طرح کے علوم اگر کسی سنکی کے ہاتھ لگ جائیں تو اُس کا نتیجہ سوائے انسانیت کی بربادی کے اور کیا نکل سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی انھیں آیات کو اگر ہم جدید علوم پہ منطبق کریں تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اس کے نفس نے دھوکا دیا ہے۔ اور وہ علم، دولت، اقتدار، قوت اور حیات کے پس منظر میں موجود آزمائش کو نہیں سمجھ سکا۔ انسان کے سامنے جب کائنات کا کوئی راز منکشف ہوا یعنی اس کے ہاتھ علم کا کوئی نیا پہلو لگا تو وہ اس نے آزمائش کے اُس پہلو کو نظرانداز کیا جو اس انکشاف کا اصل مقصد تھا۔ چنانچہ اُس نے ایٹم کو پھاڑا تو ایٹم بم بنایا۔ اگرچہ اس وہ بے انتہا توانائی حاصل کر

سکتا تھا جس سے بہت سے مثبت اثرات انسانی زندگی پہ مرتب ہو سکتے تھے مگر اُس نے اسے انسانیت کے قتل کے لیے استعمال کیا۔ چنانچہ کئی صدیوں سے علم کا منفی استعمال کیا جا رہا ہے جو خالق کی منشا کے خلاف ہے۔ اس سے ایک تاثر ابھر کے سامنے آیا کہ قرآن جدید سائنسی علوم کے خلاف ہے۔ اگرچہ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں بات اگر کوئی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت دو ہی تہذیبیں ہیں ایک اسلامی تہذیب جس کے مظاہر اگرچہ قدرے معدوم ہیں مگر اُس کی اساس محکم ہے۔ دوسری طرف خالق سے بے اعتنائی یا خالق سے مطلق انکار پہ استوار وہ تہذیب ہے جس کی ظاہری چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے مگر اصلاً اُس کی بنیاد کھوکھلی ہے اس لیے کہ مادیت کی اس تہذیب کی بنیاد حقیقت پہ نہیں بلکہ تخیل پہ رکھی ہے۔ اور وہ تخیل ہے خالق کے وجود سے عاری ایک ایسے معاشرے کا قیام جس کے تمام اصول انسانیت کو خوشی اور لذت فراہم کرنے کے لیے مختص ہوں۔

چنانچہ یہ تاثر کہ اسلام سائنس کی ایجادات کے خلاف ہے اسلام کو محدود کرنے لیے وضع کیا گیا ایک نظریہ ہے جس کی بنیاد میں اسلام کو رجعت پسند مذہب ثابت کرنے کا تصور مغربی مستشرکین نے فراہم کیا ہے۔ مغربی صاحب دانش نے گذشتہ دو صدیوں میں اگرچہ انسانیت کو اخلاقیت اور سماجیات اور معاشرت کے کوئی عمدہ تخیل فراہم نہیں کیے۔ تاہم سائنس یعنی مادیت میں اُس کے کام کو خاطر خواہ قرار دے جا سکتا ہے جس سے انسانی زندگی میں بہت سہولت اور آسانی در آئی ہے۔ تاہم چونکہ اُن کے علم کا تصور عقلیت پسندوں نے وضع کیا ہے جس کو یونانی فلسفہ سے بنیادیں فراہم کی گئیں اس لیے اُن کے ہاں شکر کا کوئی مقام وضع نہ ہو سکا جو علم کی بنیادی اساس ہے۔ چنانچہ اسلام اُس سارے علم کو مجاز قرار دیتا ہے جس کے پیچھے شکر کا جذبہ نہ ہو، جس کے پیچھے خالق کا انکار ہو، جس کے پیچھے کوئی اخلاقی بنیاد نہ ہو، جس کے پیچھے انسانیت کی فلاح کا تصور مفقود ہو۔ اگرچہ اسلام ہر قسم کے علم کا اثبات کرتا ہے اور یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہر قسم کا علم اُسی عقل کی عطا ہے جو خالق ہی کی فراہم کردہ ہے۔ مگر وہ اس علم کو علم نہیں جہل قرار دیتا ہے جس کی بنیاد پہ انسان خالق کے گریبان پہ ہاتھ

ڈالنے لگے یعنی تکبر کی راہ کو چل نکلے۔

✡ ✡ ✡

اوراقِ پارینہ

تاریخ کی راہداریوں میں پھڑ پھڑاتے اوراقِ پارینہ کی گونج میرے دل میں ہے وہاں ابھرتے ڈوبتے کئی منظر ہیں جن میں میرے آباء کی عظمت کی داستانیں ہیں۔اُن لشکروں کی آمد کی دھول ہے جن کے ہاتھوں میں قرآن تھا، اُن گھڑسواروں کے پسینے کی مہک ہے جو جہاد کے لیے نکلے تھے اُن جھنڈوں کے رنگ میری پلکوں میں سمائے ہیں جو انھوں نے اٹھائے ہوئے تھے۔اُن راستوں میں گونجنے والے نعروں کی گونج میری سماعتوں میں ہے جو انھوں نے لگائے تھے، اُن کتابوں کے اوراق میرے تخیل میں پھڑ پھڑاتے ہیں جو انھوں نے لکھی تھیں۔میرے گمان میں غرناطہ اشبیلیہ اور قرطبہ کی عظیم درسگاہوں کے صحنوں کی وہ رونق ہے جس نے دنیا کو سائنس، جغرافیہ، طب، فلکیات سیاسیات، طبعیات اور علم کیمیا کی بنیادیں فراہم کیں۔جہانِ تخیل میں آج بھی وہ عکس نمایاں ہیں جو اشبیلہ، غرناطہ اور قرطبہ کی گلیوں میں وقوع پذیر ہوئے۔اِن شہروں کی گلیوں اور چوکوں میں عالموں طبیبوں، فلکیات کے ماہروں اور علم ریاضی کے عالموں اور تاریخ اور لسانیات کے ماہرین کا ہجوم رہا

کرتا۔الحمراء کے ایوانوں، قصرزہرا کے دالانوں اور جامع قرطبہ کی اذانوں نے ابھی تک میرا حصار کیا ہوا ہے۔وہ شامیں کیا ہوئیں جب اِن محلات میں بیٹھے صاحب عدل و دانش انسانیت کی فلاح کے لیے بے چین رہا کرتے تھے، وہ صبحیں اجڑ گئیں جن کے اجالوں میں مسلمانوں کی شان و شوکت کے سائے تھے۔وہ درس گاہیں اور اُن میں بسنے والے عالم خواب وخیال ہوئے جنھوں نے مغرب کو علم کے ابتدائی اسباق پڑھائے تھے۔وہ صدائیں دور کہیں آسمانوں کی پہنائیوں میں کھو گئیں جن میں یہ صدا سب سے نمایاں تھی "الحکم الا اللّٰہ" کہ حکم تو صرف اللہ ہی کا ہے ۔اموی خلیفوں کا یہی نعرہ اور یہی نسب العین تھا جس کی وجہ سے وہ آٹھ سو سال تک مسلم ہسپانیہ پہ حکمران رہے۔آٹھویں صدی میں مسلمان ایک ایسی عسکری طاقت کے طور پہ خطہ ارض پہ جانے جاتے تھے جو کم ہی شکست سے آشنا ہوئے ورنہ فتح اُن کے ہمراہ رہی تمام دنیا اُن کے سامنے سرنگوں ہو رہی تھی اکثر و بیشتر نے اسلام قبول کر لیا تھا جو ضد پہ اڑے تھے وہ مسلمانوں کے باج گزار بن گئے تھے۔711ء میں ہی طارق بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ سات ہزار کا لشکر لے کر اسپین کے ساحلوں پہ اترے ۔صرف چار سال میں انھوں نے پورے اسپین پہ قبضہ کر لیا۔اور وہاں ایک عالیشان تمدن کی بنیاد رکھی جس کا تذکرہ انسانی تاریخوں میں ہمیشہ کے لیے کیا جاتا رہے گا۔

خاص طور پہ کوئی مسلم مورخ تو اس کو قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتا کہ اسپین میں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں انسان نے عدل، علم، فراست، تدبر، تنظیم اور آسودگی کے وہ مناظر دیکھے جن کی مثال انسانی تاریخ سے پیش نہیں کی جا سکتی۔دنیا کا کوئی مورخ اس بات کا انکاری نہیں کہ جب مسلمان ہسپانیہ میں اترے تو پورا یورپ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔اہل یورپ کے ہاں نہ تو کوئی طبیب تھا نہ کوئی سائنس دان، پندرہویں صدی تک یورپ کا کوئی مصنف نہ تھا جو مسلمانوں کا نقال نہ ہو۔راجر بیکن جسے اہل مغرب جدید سائنس کا بانی قرار دیتے ہیں عربوں کا شاگرد تھا بلکہ پارمیدس، البرٹ بزرگ اور انفونسو دہم یہ سب عربوں ہی کے شاگرد تھے۔سارے کا سارا یورپ جہالت کی اُن اندھی راہوں کا مسافر تھا جو اُن کے لیے کلیسا نے وضع کی تھیں۔اور کلیسا کا یہ حال تھا کہ اُن کے عالم راہب

اور دیگر مذہبی راہنما تمام کے تمام دنیا پرستی میں بری طرح الجھ چکے تھے وہ خالق کی رضا کو بھول چکے تھے اور ہر قسم کے لالچ نے اُن کا حصار کر رکھا تھا۔ یورپ کا عام شہری ایک بری اور بدنصیب زندگی بسر کر رہا تھا۔ایک مغربی مورخ ڈاکٹر ڈریپر (المتوفی 1882ء) اپنی کتاب میں اہل مغرب کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زمانہ وسطیٰ میں یورپ کا بیشتر حصہ لق ودق بیاباں یا بے راہ جنگلوں پہ مشتمل تھا۔ کہیں کہیں راہبوں کی خانقاہیں تھی جس کے اردگرد چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں آبادی کا کثیر حصہ بدترین غربت میں مبتلا تھا۔لندن اور پیرس جیسے شہروں میں لکڑی کے مکانات تھے جن کی چھتیں محض گھاس پھونس کی ہوتی تھیں ۔ جا بجا دلدلیں اور غلیظ جوہڑ تھے ۔اُن کے مکانات کھڑکیوں اور روشن دانوں سے محروم ہوتے تھے۔آسودہ حال امرا فرش پر گھاس بچھا کے لیٹا کرتے تھے اور بھینس کے سینگ میں شراب ڈال کر پیا کرتے تھے۔گندے پانی کے نکاس کا کوئی اہتمام نہ تھا اُن کی سڑکوں پر بے پناہ کیچڑ ہوا کرتا اور روشنی کا کوئی اہتمام نہ تھا اس لیے شرفا اپنے گھروں سے باہر نہ نکلا کرتے ۔ رہائشی تنگی کا یہ عالم تھا کہ جانور اور انسان ایک ہی احاطے میں رہا کرتے تھے ۔ یہ لوگ سال بھر میں ایک ہی لباس استعمال کرتے تھے جس کی بو دور تک جاتی تھی۔نہانا اُن کے ہاں گناہ کبیرہ تھا اس لیے اُن کے سروں میں جوؤں کی بہتات ہوا کرتی تھی۔فقر و فاقہ کا یہ عالم تھا کہ لوگ سبزیاں درختوں کے پتے اور چمڑہ ابال کے کھایا کرتے تھے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیں اسی زمانے میں قرطبہ ہو یا بغداد دمشق ہو یا غرناطہ،سمرقند ہو یا بخارا دہلی ہو یا ہرات،تہذیب وتمدن کے چکتے دمکتے نمونے تھے۔اِن کے مکانات صاف عمدہ وسیع اور ہوا دار ہوتے۔ وہ پختہ مکان بناتے اور ہر مکان میں باغ ضرور ہوا کرتا۔گلیاں صاف ستھری اور سیدھی ہوتیں۔ پانی کے نکاس کا عمدہ اہتمام موجود ہوتا۔حکومت کی طرف سے ہر شہری کے گھر میں پانی کی فراہمی کو یقینی بنادیا گیا تھا۔عوام پہ حکومت کی طرف سے ٹیکسوں کا بوجھ بہت کم تھا۔لوگ خوشحال اور علم پسند تھے۔رات کو اُن کی گلیاں اور سڑکیں اُن روشنیوں سے روشن ہو جاتیں جو حکومت کی طرف سے جلائی جاتی تھیں۔شہروں میں جگہ جگہ عوامی غسلخانے اور ٹائلٹ بنائے جاتے جن کا مغرب میں

تصور تک موجود نہ تھا۔شہروں کی سڑکیں سیدھی صاف اور اجلی ہوا کرتیں جن کے دونوں طرف روشنیوں کا اہتمام کیا جاتا۔اور درخت تھے جو سڑک کے کناروں سے دور تک چلے گئے تھے۔شہر میں جگہ جگہ باغات بنائے گئے تھے جن کے فوارے دیکھنے والوں کو دعوت نظارہ دیتے تھے۔اور اُن کے شہروں میں نہریں بہتی تھیں حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگیوں کو اس طرح استوار کیا تھا کہ ساری دنیا میں اُن کی آسودگی اور آسائش کی مثال دی جاتی تھی۔دسویں صدی کا قرطبہ یورپ کا سب سے مہذب شہر تھا۔دنیا بھر کے لوگ اس پر حیرت واستعجاب کا اظہار کرتے تھے۔اور اس کی مدح وستائش میں رطب اللسان ہوتے تھے۔یورپ کے سیاح اس شہر کا حال سنتے تو اپنی انگلیوں کو اپنے دانتوں سے کاٹ لیتے کہ قرطبہ شہر میں 70 لائبریریاں تھیں اور نوسو حمام تھے اور ایک ہزار سے زائد عالیشان مساجد تھیں جو مسلمانوں کی اپنے دین سے محبت کا ثبوت پیش کرتی تھیں۔سیاح مدینۃ الزہرا کے گرمائی محل کے متعلق تفصیلات سنتے اور ششدر و مبہوت رہ جاتے۔

دوسری طرف ہندوستان میں مسلمان پوری شان وشوکت کے ساتھ حکومت کر رہے تھے۔دہلی سے آگرہ تک اور کلکتہ سے ہرات تک مسلمان ہی حکمران تھے ۔ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمان حکمرانوں کی نشانیاں جابجا پھیلی ہیں۔انھوں نے عالیشان باغات عظیم الشان مساجد اور جاذب نظر مقبرے تعمیر کرائے ۔دہلی کی لال مسجد اور لاہور کی بادشاہی مسجد مسلمانوں کی عظمت کے نشان ہیں۔ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے رواداری کو فروغ دیا اور محکوم اقوام کو مکمل مذہبی آزادی فراہم کی۔دنیا بھر کے مسلم حکمرانوں نے لوگوں کو اسلام کی روشنی سے آشنا کیا۔مسلم معاشروں کی اعلیٰ اخلاقی اقدار نے لوگوں کو متاثر کیا اور مسلم حکمرانوں کے عدل وانصاف نے لوگوں کے دلوں پہ انمٹ نقوش چھوڑے۔مسلمان حکمران عام طور پہ علم دوست تھے اور علوم وفنون کی سرپرستی کرتے تھے۔یہ مسلم دور ہی تھا جب جدید علوم کو بنیادیں فراہم کرنے کے لیے مسلمان علماء نے بے پناہ محنت کی۔

آج کے مسلم معاشروں کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے مرتبوں اور کارناموں سے آگاہ نہیں۔سکول کالج اور یونیورسٹی تک کے طالب علم کو اس بات کا علم نہیں کہ اُس کا تعلق کس قدر عظیم الشان قوم سے ہے۔اُن کے اسلاف کس قدر علمی رفعتوں پر فائز تھے۔یہی وجہ ہے کہ آج کا نوجوان

احساس کمتری اور یاسیت کا شکار ہے اور اپنے مسائل کے حل کے لیے اُس کی نگاہیں صرف مغرب کی طرف اٹھتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نااہل ہیں اور مغرب والے اہل ہیں۔ کسی نے اپنے اسلاف کو جاننے تک کی کوشش نہیں کی۔ ہم اپنے طالب علم سے کیا گلہ کریں جب کہ اُس کو پڑھانے والا استاد تک نہیں جانتا کہ حرکت کے قوانین کے متعلق وہ جو اپنے گلے کا پورا زور لگا کے طالب علموں کو بتا رہا ہے کہ حرکت کے قوانین (laws of motion) نیوٹن نے دریافت کیے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حرکت کے یہ قوانین بھی مسلمانوں ہی کی دریافت ہیں۔ اور نیوٹن کی پیدائش سے کئی سو سال پہلے حرکت کا پہلا قانون ابن الہیثم نے دریافت کیا، دوسرا قانون البغدادی اور تیسرا قانون ابن باجہ نے دریافت کیا۔ اور نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اہل مغرب کا علمی فخر نظریہ اضافت بھی دراصل مسلمانوں ہی کی دریافت ہے اور جعفر محمد ابن موسیٰ آئن سٹائن سے دو سو سال پہلے نظریہ اضافت کو بیان کر چکے تھے۔ مگر ہم وہ لوگ ہیں جو بے انت علوم کے وارث ہیں مگر ہمیں اپنی وراثت کا احساس تک نہیں۔ کوئی ہمیں یہ بتانے کے لیے تیار نہیں کہ ڈیکارٹ نے امام غزالی کی کتابیں اپنے نام پہ چھپوالیں اور ماڈرن سائیکالوجی میں خوب نام کمایا۔

ہمارا طالب علم نیوٹن، آئن سٹائن، ڈارون اور فرائیڈ کے نام سے تو آگاہ ہے مگر اُسے ابن سینا، امام غزالی، ابوبکر رازی اور ابن لہیثم کے نام نہیں آتے۔ ہمارے نوجوان کا تصوراتی ہیرو آرنلڈ شیوازگر سلویسٹر سٹالن اور انجلینا جولی ہیں تو اس لیے کہ استاد نے انھیں محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی اور ٹیپو سلطان کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا اور اس میں استاد کا بھی کیا قصور جب ہمارا نصاب تک اہل مغرب متعین کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے جب یونانی اور مغربی علوم کو اپنی زبان عربی میں منتقل کیا تو انھوں نے ایمانداری کے ساتھ مصنف کا نام کتاب کے باہر لکھا اس لیے کہ وہ علم چور نہ تھے مگر مسلمانوں کے عسکری زوال کے بعد جب اُن کو ہسپانیہ سے نکلنا پڑا یا ہلاکو کی وحشت کے بعد بغداد کے خرابے سے جو علمی اثاثے بچ گئے تو اہل مغرب نے انھیں اپنے ناموں سے شائع کیا اور یہ امر اِس بات کی غماز ہے کہ مغربی دانش ور علم کی چوری سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ مسلمانوں کے علمی

انکشافات اور دریافتوں کو اپنے نام کے ساتھ منسلک کرتے رہے جس کی وجہ سے جدید دنیا کو یہ اشتباہ پیدا ہوا کہ جدید دنیا کی تمام تر ترقی کا سہرا اہل مغرب کے سر بندھتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ علم مسلمانوں ہی کی وراثت ہے۔ اہل مغرب کو تو غسل تک کرنے کی توفیق نہ تھی۔ اُن کے ہاں ایک طویل دور گزرا ہے جس کو خود اہل مغرب (Dark age) ''تاریک دور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کلیسا نے اُن پہ علم کے تمام دروازے بند کر رکھے تھے۔ کلیسا اپنی قوم کے اہل دانش کو آگ میں ڈلوا دیا کرتا تھا یا اُسے ایک ایسی تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دیتا جہاں وہ گھٹ گھٹ کر مر جاتا بہت سے نابغہ روزگار شخص کلیسا کی بہیمت کی نظر ہو گئے۔ کلیسا سے آزادی کے بعد جب اُن کے ہاں علم کی روایت نے جنم لیا تو وہ خدا سے باغی ہو چکے تھے۔ اسی لیے اُن کے علوم میں مذہب سے بیزاری اور خدا سے بے اعتنائی کا عکس پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی مغلوبیت کا عرصہ زیادہ نہیں اور اب اُن میں علمی بیداری بھی جنم لے رہی ہے۔ علم کی روایت کو استحکام فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی میراث کی طرف متوجہ ہو۔ ضروری ہے کہ وہ اوراقِ پارینہ پہ جمی راکھ کو جھاڑے تب اُسے اپنے آباء کی عظمت اور اُن کی علمی و اخلاقی رفعت کا اندازہ ہوگا اور وہ اُس احساس کمتری سے باہر آجائے گا جس نے آج کے نوجوان میں یاسیت پیدا کر رکھی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم مسلمانوں کی علمی، سیاسی، فکری، معاشی، سماجی، اخلاقی اور عقائدی رفعتوں کے اُس تسلسل پہ تفصیل سے روشنی ڈالیں گے جو ہزار سال سے زائد عرصہ پہ محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا رہنما اور مددگار ہو۔

یلغارِ حق

مدینہ کی گلیوں میں اِک شور تھا، اِک ہجوم تھا۔ اونٹ تھے اور گھوڑے تھے اور اُن کے قدموں سے اٹھتی دھول تھی۔ گھوڑوں کے سازوں کا سنگیت تھا اور تلواروں کی جھنکار اُن کی بے قراری کا پتہ دیتی تھی۔ وہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کا لشکر تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی رحلت کی بنا پہ لشکر کی روانگی معطل کر دی گئی تھی ۔ اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم مسلمانوں کے خلیفہ تھے اور اس لشکر کو روانہ کر رہے تھے۔ قبل ازیں صحابہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم کی توجہ ریاست کی اُن مشکلات کی طرف مبذول کرائی جن سے ریاست نمٹ رہی تھی اور کہا کہ فی الحال اس لشکر کی روانگی کو مؤخر کر دیا جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم نے جواب دیا:

بخدا میں اُس لشکر کو روکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا جس کو رسول اللہ ﷺ نے ترتیب دیا ہو۔

خدا کی قسم! اگر مجھے معلوم ہو کہ اس لشکر کی روانگی کے بعد میں مدینہ میں تنہا رہ جاؤں گا اور درندے

مجھے پھاڑ کھائیں گے میں تب بھی اس لشکر کی روانگی میں تاخیر پسند نہ کروں گا۔

صحابہ خاموش ہو رہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم نے صحابہ کو حکم دیا کہ کوئی شخص جو اس لشکر میں شامل تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے مرتب کیا تھا پیچھے نہ رہے۔

لشکر شہر مدینہ کے باہر جمع ہونے لگا۔

سالار لشکر حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشاورت کی اور ایک پیغام دے کر انھیں امیر المومنین کی طرف بھیجا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم اس لشکر کے محض ایک سپاہی تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہم مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو بعض انصاری صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہم سے کہا:

امیر المومنین رضی اللہ عنہم سے درخواست کریں کہ وہ ہم پر کوئی ایسا سالار مقرر کریں جو جنگ آزما اور پختہ ہو۔

یاد رہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اس لشکر کو ترتیب دیا تو آپ ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کو اس لشکر کا امیر مقرر کیا تھا۔ تاہم بعض لوگوں میں ابھی جاہلیت کی کچھ خو بو باقی تھی اس لیے وہ ایک غلام زادے کی قیادت میں جنگ لڑنے کو اجنبی خیال کرتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کے باپ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے غلام تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہم امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی:

اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کا خیال ہے کہ آپ اپنی حفاظت کے لیے ایک جنگ آزما اور طاقتور دستہ اپنے پاس رکھیں کیونکہ اس بات کا امکان بہرحال موجود ہے کہ اسلامی افوج کی مدینہ سے عدم موجودگی میں دشمن کا کوئی دستہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے۔

اسی موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم کی زبان سے وہ تاریخی الفاظ نکلے تھے کہ اگر اس لشکر کو روانہ کرنے کے بعد اگر مجھے خدشہ ہو کہ درندے مجھے گھیر لیں گے اور چیر پھاڑ کھائیں گے میں تب بھی اس لشکر کی روانگی کو معطل نہ کروں گا۔

ازاں بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم نے انصاری صحابہ کا مشورہ امیر المومنین کے سامنے رکھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم یہ بات سن کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور غصے میں کہا:

اِن لوگوں کے دلوں سے تکبر ابھی تک دور نہیں ہوا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم حضرت عمر رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر خود ہی اُس جگہ کی طرف روانہ ہو گئے جہاں لشکر جمع ہو چکا تھا۔

امیر المومنین رضی اللہ عنہم نے اپنے ہاتھ سے اس لشکر کو روانہ کیا جسے رسول اللہ ﷺ نے خود رومیوں سے جنگ کے لیے تیار کیا تھا۔

اور وہ منظر سنہری حرفوں سے لکھنے کے قابل ہے کہ تاریخ عالم نے ایسے منظر کم ہی دیکھیں ہوں گے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم گھوڑے پہ سوار تھے اور اُس کی باگ امیر المومنین خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم نے تھام رکھی تھی۔

امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کو ضروری ہدایات دے رہے تھے انھیں نصیحتیں کر رہے تھے۔ تاہم حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم اس صورت حال سے بے چین تھے اور بار بار خلیفۃ المومنین سے درخواست کرتے کہ اے امیر المومنین یا آپ بھی سوار ہو جائیں یا مجھے اترنے کی اجازت دیں۔

اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیا حرج ہے اگر میں اللہ کی راہ میں بطریق مشایعت تمھاری رکاب میں تھوڑی دور تک چلوں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم نے جواب دیا۔

تمام لشکر خلیفۃ المسلمین کی امیر لشکر سے اس والہانہ محبت سے متاثر ہو رہا تھا اور اس سے قبل اُن کے ذہن میں امیر لشکر کے مطلق جو ابہام تھا وہ دور ہو رہا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم سے کہہ رہے تھے۔

اسامہ دیکھو: تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے ہو، اس لیے کسی سے خیانت نہ کرنا، کسی سے عہد کرو تو اُسے پورا کرنا۔ ہمیشہ سچ بولنا، بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔ کسی ثمر دار درخت کو نہ کاٹنا، نہ انھیں آگ لگانا، کھانے کی ضرورت کے سوا تفاخر کے لیے جانور ذبح نہ کرنا۔ جب کسی قوم سے تمھارا

سامنا ہوتو اُس کو نرمی اور محبت سے اسلام کی طرف بلانا۔ جس کسی سے ملو تو اُس کے حفظ مراتب کا خیال کرنا، جب کھانا تمھارے سامنے آئے تو اسے اللہ کے نام سے شروع کرنا یہودیوں اور عیسائیوں کے وہ لوگ جو ویران خانقاہوں میں اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں اُن سے کوئی تعرض نہ کرنا، اللہ کے احکامات کا خیال رکھنا رسول اللہ ﷺ کی سنت پہ عمل کرنا۔ میں تمھیں اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے رخصت کرتا ہوں۔

یہ کہہ کر آپ ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کے گھوڑے کی باگ چھوڑ دی پھر کوئی خیال آیا تو تیزی سے آگے بڑھے اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کو روک کے فرمایا۔

اگر تم اجازت دو تو معاملات میں مشاورت کے لیے میں عمر رضی اللہ عنہم کو تمھارے لشکر سے الگ کرلوں۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم نے اجازت دے دی۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم اپنے لشکر کے ہمراہ رخصت ہو گئے۔

دور بلقاء کی وادیوں میں رومیوں پر حملہ کرنا اُن کی اس مہم کا مقصد تھا رومیوں سے مسلمانوں کی کشمکش کا آغاز رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا جب رومیوں کے ایک حلیف عرب حکمران نے شرجیل بن عمرو غسانی نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد کو قتل کرا دیا تھا، نبی اکرم ﷺ نے اپنے قاصد کے قصاص کے لیے مسلمانوں کا ایک لشکر روانہ کیا، جس کے سالار حضرت جعفر بن طیار رضی اللہ عنہم تھے۔ اس جنگ میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہم حضرت عبداللہ بن واحہ رضی اللہ عنہم اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم نے جام شہادت نوش کیا اِن کی شہادت کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے مسلمانوں کی کمان سنبھالی اور دو لاکھ کے مہیب رومی لشکر سے محض تین ہزار افراد کے ساتھ جنگ کی اگر چہ وہ اس لشکر پہ کامل فتح حاصل نہ کر سکے تاہم انھوں نے رومیوں کے خوب دانت کھٹے کیے اور اپنے لشکر کو رومی حصار سے نکالنے میں کامیاب رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم کو فاتح قرار دیا۔ ازاں بعد نو ہجری میں رسول اللہ ﷺ تیس ہزار کے بہت بڑے لشکر کے ساتھ رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے روانہ ہوئے اور تبوک کے مقام پہ قیام فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کے مہیب لشکر اور خود رعب

رسالت کی وجہ سے رومیوں کو مسلمانوں کے خلاف نکلنے کی ہمت نہ ہوئی اور رسول اللہ ﷺ بیس روز تک اُن کا انتظار کرنے کے بعد واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے اپنی وفات سے چند روز قبل رومیوں کے خلاف ایک لشکر تیار کیا اور اُس کی کمان حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کو سونپی اس لشکر کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم نے روانہ کیا جس کا تذکرہ یہاں کیا جا رہا ہے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم اپنے لشکر کے ہمراہ منزل پہ پہنچے تو رومی لشکر اُن کا منتظر تھا۔ دونوں لشکروں کے مابین خوب گھمسان کی جنگ ہوئی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو رومیوں کے خلاف فتح عطا فرمائی حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم چالیس دن بعد مدینہ واپس پہنچے تو اُن کے ساتھ بہت سے اسیرانِ جنگ اور مال غنیمت کے انبار بھی تھے۔ اور مسلمانوں کے ہاتھوں یہ پہلی باقاعدہ شکست تھی جو رومیوں کو ہوئی۔ اس کے بعد جنگوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے بعد تاریخ کے صفحات سے روم اور ایران کا نام تک مٹ گیا۔ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار، جو لوگ قرآن کے سامنے سر جھکا دیتے اُن کی تعظیم کی جاتی اور جو قرآن سے انکار کرتے اُن کی قسمت پہ افسوس کیا جاتا اور اُن سے جزیہ لے کر انھیں اپنے مذہب کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دے دیا جاتا۔ تاہم جو لوگ طاقت کی زبان میں بات کرتے اور قرآن کے پیغام کی راہ میں کھڑے ہوتے اُن کے لیے مسلمانوں کی تلوار تھی جو سخت تیز تھی اور اُس کے سامنے ٹھہرنا مشکل تھا۔ کون کون اس کے سامنے آیا اور زخم کھائے، کون کون تھا جس کی گردن میں سریہ تھا مگر اُس گردن کو آخر جھکنا پڑا۔ یہ ایک طویل تذکرہ ہے مگر ہم اسے مختصراً بیان کریں گے۔

قیصر و کسریٰ کے خلاف عربوں کا نکلنا ہی باقی دنیا کے لیے حیران کن تھا وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ساتویں صدی عیسوی میں کوئی قوم ایک ساتھ روم وایران کو چیلنج کردے مگر زمین وآسمان نے دیکھا کہ انھوں نے ایسا ہی کیا نہ صرف عربوں نے روم وایران کو چیلنج کیا بلکہ وہ تو اُن پہ ٹوٹ پڑے تھے پھر لوگوں نے دیکھا کہ یہ عظیم الشان ریاستیں اپنے نظریات سمیت زمین بوس ہو رہی ہیں اور اس جگہ اسلام لے رہا ہے کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ اسلامی فوجوں نے روم وایران کو روند کر رکھ دیا۔

قیصر و کسریٰ

یہ محض دو بادشاہوں کے نام نہ تھے بلکہ صدیوں پہ محیط ایک تاریخی تسلسل تھا جس میں قیصر و کسریٰ کے ناموں کی گونج تھی۔ یہ دو مختلف تہذیبوں کا وہ عہد تھا جس میں صرف یہی دو نام لوگوں کی زبان پر تھے ۔رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد اب خطے میں عقائدی اور جغرافیائی تبدیلیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔روم اور ایران جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہے تھے اُن کو اب اسلام کی نوزائیدہ طاقت کا سامنا تھا اور وہ اس خطرے کو محسوس کر کے تیاریوں میں مصروف ہو چکے تھے۔رومی عیسائی تھے اور الہامی کتابوں اور رسولوں کی پیروی سے آشنا تھے مگر وہ اسلام کی ابدی ہدایت قبول کرنے سے انکاری تھے۔دوسری طرف ایرانی صدیوں سے آگ کے پجاری تھے اور مجوسی کہلاتے تھے وہ دین شرک پر تھے مگر اسلام کی روشنی سے اپنے دامن کو بھرنے کے لیے تیار نہ تھے۔چنانچہ لازمی طور پر اُن کی اس ضد کا نتیجہ ایسی جنگ تھا جس میں یا تو اُن کو فتح حاصل ہوتی یا مسلمان کامران رہتے ۔مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ اب ساری دنیا تک اسلام کے ابدی پیغام کو منتقل کر دیا جائے اس لیے

مسلمان مدینہ کی گلیوں سے نکلے اور دور تک چلے گئے۔ اُن کی کوئی جغرافیائی منزل نہ تھی اُن کے سامنے صرف ایک ہدف تھا کہ وہ دنیا کو ابدی فلاح کے اُس پیغام کی طرف بلائیں جو رسول اللہ ﷺ نے اُن تک پہنچایا تھا۔ بیس سال سے بھی کم عرصے میں روم بھی مٹ چکا تھا اور ایران کے آتش کدوں کی آگ بھی بجھ چکی تھی۔ مسلمان دور ایشیائے کوچک کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے میں مشغول تھے۔ وہ ثمر قند سے کر بخارا تک، ملتان سے لے کر غزنی ہرات تک، کاشغر سے لے کر آرمینیا تک، بغداد سے کر آذربائیجان تک، مکران کے ساحلوں سے لے کر یوکرائن کے برف زاروں تک، شام سے لے کر فلسطین تک، مصر سے لے کر طرابلس تک، طبرستان سے لے کر خراسان تک، الجزائر سے لے کر مراکش تک اور کوفہ سے لے کر غرناطہ تک پیغام قرآن کو لوگوں تک منتقل کرنے کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ یورپ کے مستشرق نے اس کو ملک گیری قرار دیا مگر حقیقت اس کے برعکس ہے مسلمان دنیا کی فلاح کے لیے نکلے تھے اور اُن کی یہی جہد وسعی تھی جس کی بنا پر آج دنیا کا تقریباً ہر شخص دین اسلام سے آشنا ہے۔ اور خطہ ارض پہ بسنے والا ہر پانچوں شخص اسلام کی دولت سے سرفراز ہے۔ لوگوں کی اکثریت اگرچہ آج بھی دین جاہلیت کی پیرو ہے یعنی انکار پر مائل ہے مگر وہ اسلام سے بطور دین ضرور آگاہ ہیں۔

اللہ کی طرف سے دی گئی آزادی کو انھوں نے اپنے نفس کی آواز سمجھ لیا ہے۔ وہ قرآن کی تعلیمات سے انکاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے انکاری ہیں اور زندگی سے خوشی کشید کرنے کو اپنی منزل سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں قوموں کے عروج زوال کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرائی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اِن واقعات سے سبق سیکھے اور اپنے خالق کو پہچانے۔ مسلمانوں نے قرن اول میں انسانوں کی کثیر تعداد تک پیغام حق منتقل کیا انکار کرنے والوں نے اُن کا راستہ روکا۔ جس سے ایک کشمکش وجود میں آئی اسی کشمکش کی ایک مختصر تصویر پیش کرنا یہاں مقصود ہے۔ چونکہ سب سے پہلے قیصر و کسریٰ کے مہیب لشکر مسلمانوں کی راہ میں آئے اس لیے ترتیب کے

حوالے سے پہلے انھیں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

✡ ✡ ✡

رزم گاہِ حق و باطل

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو شام کی طرف روانہ کیا تو اُن کے دل میں یہ بات موجود تھی کہ اگر اس دوران ایرانی مدینہ پہ حملہ کرتے ہیں تو مدینہ کا دفاع مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانی رضی اللہ عنہ کو ایک مختصر لشکر دے کر عراق کی طرف روانہ کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ ایرانی فوجوں کو الجھائے رکھیں تا کہ اُن کی توجہ بٹ جائے اور وہ مدینہ پر حملہ کے بارے میں نہ سوچیں۔ کم طاقت کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ ایک جگہ نہ ٹھہریں بلکہ حملہ کریں اور ہٹ جائیں۔ حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب رہے، انھوں نے کئی ماہ تک ایرانیوں کو الجھائے رکھا حتیٰ کہ اُن کو مدینہ سے کمک پہنچ گئی۔ پہلے ایک لشکر کے ساتھ عیاض بن غنم رضی اللہ عنہ اُن تک پہنچے اس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی مرتدین سے فارغ ہو کے حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے آ ملے۔ مسلمان ابلہ نامی مقام پر مقیم تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی کمان سنبھال لی تھی

مسلمان کل اٹھارہ ہزار تھے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ معرکہ حفیر:

اُن کے سامنے ایران کا ایک اہم صوبہ حفیر تھا جہاں ایران کا نامور جنگجو ہرمز حکمران تھا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے ہرمز کو خط لکھا یا جس کا ترجمہ ذیل میں تحریر کیا جا رہا ہے۔

"امابعد! تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جس نے تمھارے نظام میں خلل ڈال دیا ہے تمھارے مکر کو سست کر دیا ہے اور تمھارے اتحاد کو توڑ دیا ہے۔ اگر ہم تمھارے اس ملک پر حملہ نہ کرتے تو یہ تمھاری بدقسمتی ہوتی، اسلام قبول کر لو ہم یہاں سے چلے جائیں گے یا مطیع ہو جاؤ اور جزیہ ادا کرو ورنہ میں تمھاری طرف ایک ایسی قوم کو لے کر آیا ہوں جو موت سے اسی قدر محبت کرتی ہے جس قدر تم زندگی سے محبت کرتے ہو"۔

✡✡✡✡✡✡

ہرمز نے انکار کیا اور جنگ کے لیے آمادہ ہو گیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے افواج کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ میمنہ کی ذمہ داری حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہم کے سپرد کی، میسرہ پر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم کو مقرر کیا، قلب کی کمان اپنے پاس رکھی اور فوج کو ایران کے صوبہ حفیر کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ اگلے روز جنگ ہوئی۔ ہرمز خود آگے آیا اور اُس نے مسلمانوں سے مبازر طلب کیا۔ صحابہ کے منع کرنے کے باوجود حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم خود

اُس کے مقابل اترے۔ مقابل ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ ہرمز نے اپنی تلوار سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم پر حملہ کیا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم طرح دے گئے ساتھ ہی ہرمز کی کلائی تھام کر اُس کی تلوار چھین لی۔ ہرمز نے پوری کوشش کی مگر کلائی نہ چھڑا سکا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے ہرمز کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور زمین پر پٹخ دیا جس کے بعد ہرمز کبھی نہ اٹھ سکا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اُس کے سینے پر چڑھ گئے اور اُس کی گردن کاٹ دی۔ ہرمز تاج پہنا کرتا تھا جس کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے وہ تاج اتار لیا۔ اس کے بعد جنگ مغلوبہ شروع ہوئی جلد ہی کافر بھاگ اٹھے اور مسلمانوں کو کامل فتح حاصل ہوئی۔ اس جنگ کی جو خاص بات مورخین نے لکھی ہے وہ یہ ہے کہ ایرانیوں نے ایک دوسرے کو زنجیروں سے باندھ رکھا تھا تا کہ اُن کے دل میں میدان جنگ سے فرار ہونے کا خیال نہ آئے مگر اللہ کے شیروں کی للکار کے سامنے اُن کی ایک نہ چلی اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی زنجیریں کاٹیں اور بھاگ کھڑے ہوئے انھی زنجیروں کی وجہ سے اس معرکہ کو جنگ سلاسل کہا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ حصن المراۃ :

سالار لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم کو بھاگتے ایرانی لشکر کے تعاقب کا حکم دیا۔ ایرانی لشکر حصن المراۃ نامی قلعے میں پناہ لی تھی۔ حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم نے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے والے چند دن سے زیادہ مزاحمت نہ کر سکے۔ قلعے پر حملہ کر دیا گیا اور قلع فتح ہو گیا۔ قلعے کا حاکم قتل ہو گیا اُس کی بیٹی نے اپنی مرضی سے حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم سے نکاح کر لیا۔

☜ ابلہ کی فتح ؛

ہرمز نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ساتھ مقابلے سے پہلے اپنے حکمران کو خط لکھا تھا کہ اُسے امداد بھیجی جائے چنانچہ مدائن سے ایک بڑا لشکر اُس کی مدد کے لیے ابلہ کی طرف روانہ ہوا مگر اس سے قبل کہ وہ اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ کے ہرمز کی مدد کرتا ہرمز حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ ہرمز کی مدد کو آنے والے ایرانی لشکر کا سردار کا نام قارن تھا۔ قارن نے اپنے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا تھا ایک حصے کے سردار کا نام انوشجان تھا دوسرے حصے کا سالار قباد تھا اور قلب کی کمان قارن نے اپنے پاس رکھی تھی۔ ابھی یہ لشکر راستے ہی میں تھا کہ ہرمز کے بھگوڑ اسپاہیوں نے قارن کو ہرمز کی موت اور ایرانیوں کی شکست سے آگاہ کیا۔ قارن ایک مقام نہر پر رُک گیا مگر مسلمان ایرانیوں کو سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے قارن کا لشکر ابھی خیمے بھی نصب نہ کر پایا تھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کسی عقاب کی طرح اُن پہ جھپٹے اور اُن کو کھدیڑ کے رکھ دیا۔

قباد بھی قتل ہو گیا انوشجان بھی مارا گیا اور ایرانیوں کا سالار اعلیٰ قارن بھی جنگ میں کام آیا ۔اپنے سرداروں کے قتل کے بعد ایرانی لشکر بھاگ اٹھا۔ تین ہزار لاشیں میدان جنگ میں ایرانیوں کی شکست کا نا قابل تردید ثبوت کے طور پر موجود تھیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عام شہریوں سے کوئی تعرض نہ کیا صرف جزیہ لیا اور انھیں حفاظت کا یقین دلایا کہ یہی مسلمان سالاروں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حفیر کے صوبے میں مسلمان عامل کو مقرر کر دیا۔ مسلمان حکام کے عمدہ اخلاق اور اعلیٰ انسانی رویوں کے باعث اس ایرانی صوبے کے اہل مجوس نے جلد ہی اپنا دین ترک کر دیا اور اسلام کے پیغام فلاح کو سینے سے لگا لیا۔

☜ معرکہ لیس ؛

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم آگے بڑھ گئے کہ اُن کے جاسوسوں نے انھیں مطلع کیا تھا کہ مدائن سے آنے والا ایک بڑا ایرانی لشکر جس کی قیادت یزدگرد کررہا ہے۔دلجہ کے مقام پر اکٹھا ہو رہا ہے اور مزید کمک کا انتظار کر رہا ہے تا کہ وہ مسلمانوں سے مقابلے کے لیے خود کو مستحکم بنا سکیں۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اپنے لشکر کے ساتھ دلجہ پہنچ گئے اور مجوسیوں پر حملہ کر دیا ۔اہل ایران کو شکست ہوئی اُن کا سالار پیاس کی وجہ سے مر گیا۔اسی ایرانی لشکر کی مدد کو آنے والا لشکر لیس پہنچ چکا تھا۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم بھی اپنے لشکر کے ساتھ لیس کی طرف روانہ ہو گئے ۔ اس مقام پر سخت مقابلہ ہوا ایرانیوں کا سردار مالک بن قیس تھا اُس نے مسلمانوں کے لشکر سے مقابل مانگا تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم خود آگے بڑھے اور ایک ہی وار سے اُس کے دو ٹکڑے کر دیئے ۔ یہ بہت بڑا ایرانی لشکر تھا جس کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار بتائی جاتی ہے۔مگر مسلمانوں کے عزم و حوصلہ کے سامنے یہ عظیم الشان لشکر ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ستر ہزار ایرانی قتل کر دیئے گئے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ حیرہ کی فتح ؛

ایرانی بھاگ کر حیرہ پہنچے کہ یہ ایران کا نہایت اہم شہر تھا۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اُن کے تعاقب میں تھے انھوں نے حیرہ کا محاصرہ کر لیا۔اہل حیرہ کئی ماہ تک مدائن سے مدد آنے کا انتظار کرتے رہے مگر جب انھیں علم ہوا کہ اُن کی مدد کو آنے والا لشکر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں مارا جا چکا ہے تو انھوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم سے صلح کی

درخواست کی۔ جسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے قبول کرلیا۔اہل حیرہ نے دولاکھ دینار نقد پہ صلح حاصل کی اورشہر مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔اس دوران حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے اردگرد کے چھوٹے چھوٹے خودمختار حکمرانوں کے خلاف فوجی مہمات بھیجیں جن میں سے اکثر کو کامیابی حاصل ہوئی جلد ہی مسلمان دریائے دجلہ تک کا اکثر علاقہ فتح کر چکے تھے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ انبار کی فتح :

اس کے بعد مسلمانوں اور ایرانیوں میں جو خون ریز معرکہ برپا ہوا اُس مورخین ذات العیون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ معرکہ انبار نامی مقام پر پیش آیا حیرہ کھونے کے بعد ایرانی اب پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے اس کی پوری تیاری کی تھی۔انھوں نے شہر کے باہر ایک خندق کھودی تھی۔صوبہ ساباط کا ایرانی حکمران شیرزاد مسلمانوں کے مقابلے کے لیے اترا تھا۔مسلمان انبار نامی شہر کی طرف بڑھے تو اہل ایران نے بے پناہ تیراندازی کی ۔مورخین نے لکھا ہے کہ ایک ہزار مسلمانوں کی آنکھیں اس حملے میں ضائع ہوگئی تھیں۔تاہم حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ کمزور اور بوڑھے اونٹوں ذبح کر کے خندق میں پھینکو۔اس طرح مسلمانوں نے خندق کے اُس پار اترنے کا انتظام کرلیا تھا خندق کے اُس پار ایرانیوں نے سخت مزاحمت کی اور نہایت بے جگری سے لڑے بے شمار ایرانی مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔

شیرزاد نے شکست سامنے دیکھی تو اپنے لشکر سے پوشیدہ پیغام صلح حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم کی طرف بھیجا۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے قاصد سے کہا اب ہم قلعہ فتح کر چکے ہیں اب صلح نہیں ہوسکتی تاہم شیرزاد کو اجازت ہے کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ بھاگ جائے ہم اسے قتل نہیں کریں گے۔ چنانچہ شیرزاد بھاگ نکلا۔شیرزاد کے فرار کی خبر سے ایرانی لشکر میں بددلی

پھیل گئی اور انبار پر بھی مسلمانوں کا سبز ہلالی پرچم لہرانے لگا۔

✡✡✡✡✡✡

☜حیرہ کی فتح ؛

انبار سے بھاگنے والا لشکر عین التمر میں جمع ہونے لگا جہاں کا حکمران ایک عرب تھا جس کا نام عقبہ بن عقبہ بیان کیا گیا ہے۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے عین التمر پر حملہ کیا تو سب سے پہلے عقبہ بن عقبہ میدان جنگ میں اترا اور کسی کو مقابلے کے لیے پکارا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس بات کا دکھ تھا کہ وہ عرب ہو کر مجوسیوں کی طرف سے اُن کے مقابلے لیے اترا ہے اس لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور تلوار نکالنے کے بجائے زور کا ایک تھپڑ عقبہ بن عقبہ کے منہ پر مارا وہ دور جا گرا۔حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اُس کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنے لشکریوں سے کہا اس کو باندھ دو تا کہ یہ اپنی آنکھوں سے اپنی قوم کا حال دیکھے۔اپنے سردار کو یوں بندھا دیکھ کر عرب عیسائی واپس بھاگ گئے مگر ایرانیوں نے قلعے کا دروازہ بند کر دیا تو وہ مشرق کی طرف بھاگ گئے مسلمانوں نے اُن سے تعرض نہ کیا قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا چار روز بعد قلعہ والوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

✡✡✡✡✡✡

☜دومۃ الجندل کی فتح ؛

ایران ابھی مکمل فتح نہ ہوا تھا اگر چہ اُس کے کئی اہم صوبے مسلمانوں کے ہاتھ آ چکے تھے دوسری طرف مسلمان ابھی دِنوں رومیوں کے ساتھ بھی بر سر پیکار تھے۔ چنانچہ حضرت غیاض بن

غنم رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم پر اہل روم کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی اور اُن کا ہدف وہ خود مختار حکمران تھے جو نسلاً تو عرب تھے مگر مدتوں مملکت روم کے حلیف رہنے کی وجہ سے اُن کا دین قبول کر چکے تھے۔ حضرت غیاض بن غنم رضی اللہ عنہ بالائی عراق پر حملہ آور ہوئے تھے انھوں نے کئی عیسائی عرب حکمرانوں کو مطیع کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ دومۃ الجندل پر حملہ آور ہوئے۔ دومۃ الجندل میں بھی عرب ہی حکمران تھے مگر رومی اُن کی پشت پر موجود تھے اس لیے حضرت غیاض بن غنم رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ وہ اُن کی مدد کو پہنچیں۔ تب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عین التمر میں تھے وہ فوراً ہی دومۃ الجندل کی طرف روانہ ہو گئے۔ عیسائی حکمرانوں کو معلوم ہوا کہ مسلمان اس لیے جنگ سے گریز کر رہے کہ اُن کی کمک پہنچنے والی ہے چنانچہ دومۃ الجندل کی افواج نے حملہ کرنے میں جلدی کی مگر اُن کی یہ جلدی کام نہ آئی اس لیے کہ جب جنگ کی چکی خوب چل رہی تھی تو انھوں نے عین اپنے پیچھے شور سنا اور یہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا لشکر تھا عیسائی اب مسلمانوں کے محاصرے میں تھے اور بے دریغ قتل ہو رہے تھے۔ وہ زیادہ دیر تک مزاحمت نہ کر سکے اور بھاگ اٹھے دومۃ الجندل بھی مسلمانوں کے قبضے میں چلا گیا۔

✡✡✡✡✡✡

☜ معرکہ حیصد :

اسی دوران مسلمانوں کو جنگ حیصد کا سامنا کرنا۔ اہل ایران نے جب دیکھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ حیرہ کو چھوڑ کر دومۃ الجندل کی طرف روانہ ہو گئے ہیں تو انھوں نے عرب عیسائیوں کو ابھارا کہ وہ اپنے سردار عقبہ بن عقبہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے تیار ہو جائیں دو ایرانی سردار زرمہر اور روزبہ اپنے ساتھ بہت بڑا لشکر لے کر آئے تھے عرب بھی اُن کے ساتھ ہو گئے وہ مسلمانوں سے حیرہ کا شہر واپس لینا چاہتے تھے حیرہ میں حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ

موجود تھے اور اُن کے ساتھ ایک بڑی جمعیت بھی موجود تھی اگر چہ وہ ایرانی فوجوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ ایرانیوں اور عربوں کے اس متحدہ لشکر کی خبر پا کر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم نے اپنے ساتھیوں سے مشاورت کی اور طے ہوا کہ اگر قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا تو اُن کے لیے زیادہ مشکل ہو گی اس لیے انھیں آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ مسلمان نکلے اور قلعے سے دور حیصد کے مقام پر ٹکراؤ ہوا۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی سارے ایرانی سردار مارے گئے۔ ایرانیوں کا آدھے سے زیادہ لشکر مسلمانوں نے ذبح کر دیا تھا جو بچے وہ مضیح کی طرف بھاگ گئے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ جنگ یرموک :

اس دوران حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم اور حضرت ابو لیلیٰ رضی اللہ عنہم شام و عراق کی سرحدوں پر پھیلے اُن عرب قبائل سے نبرد آزما تھے جن میں سے کچھ تو عیسائی تھے اور باقی اپنے آبائی دین پر قائم تھے اس لیے کہ رومیوں کے حلیف عرب قبائل عام طور پر اُن کا مذہب قبول کر لیتے مگر ایران کے حلیف عرب قبائل مجوسیت سے ہمیشہ دور رہے۔ اس دوران حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے مضیح پر حملہ کیا اور فتح حاصل کی۔ یسیر کے مقام پر حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم نے عتاب بن اسید کو قتل کیا اور یسیر کو فتح کیا۔ یاد رہے کہ مسلمانوں کے ہر لشکر کی نقل و حمل پر خلیفہ کی گہری نظر تھی اور اُن کے احکامات لے کر قاصد ہر وقت رواں رہا کرتے۔ اور خلیفہ کے احکامات کی پیروی کرتے۔ رومی حکمران اب مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کرنا چاہتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم جانتے تھے کہ ہرقل کے ارادے کیا ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے امیر المومنین حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم کو

لکھا کہ ہرقل قسطنطنیہ سے شام کی طرف آرہا ہے اوراس کے ساتھ مہیب لشکر ہیں اس لیے فوری کمک روانہ کی جائے۔اتفاق کی بات ہے کہ جس روز حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا خط مدینہ پہنچا اسی روز حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ کسی جنگی مہم سے مدینے پہنچے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں حکم دیا کہ وہ بغیر آرام کیے شام کی طرف روانہ ہوجائیں حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوگئے۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تمام عرب قبائل کو جہاد کے لیے نکلنے کی دعوت دی اور عربوں کے قافلے مدینہ پہنچنے لگے۔چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت ایک لشکر ترتیب دیا گیا اور انھیں حکم دیا گیا کہ وہ فلسطین کے راستے شام پر حملہ کریں۔عرب قبائل جمع ہورہے تھے ایک اور لشکر ترتیب پا گیا ۔امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس لشکر کی کمان حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو سونپی اور انھیں ہدایت کی کہ وہ دمشق کی طرف سے شام پر حملہ کردیں اس کے فوراً بعد اگلے ہی روز مدینے سے ایک اور لشکر نکلا جس کی کمان حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی اور انھیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ حمص کی جانب سے دشمن پر حملہ کریں۔چند روز بعد رومیوں سے مقابلے کے لیے مسلمان مجاہدین کا ایک اور لشکر مدینے سے نکلا جس کی کمان حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی جس کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اردن کی جانب سے ملک شام پر حملہ کردیں۔

دوسری طرف ہرقل نے بھی ایک مہیب لشکر ترتیب دیا تھا۔ہرقل نے اپنے حقیقی بھائی تذراق کو نوے ہزار فوج دے کر فلسطین کی طرف روانہ کیا۔جرجہ بن نوذر کو چالیس ہزار کی فوج دے کر دمشق کی طرف روانہ کیا جہاں مسلمانوں کی فوجیں موجود تھیں۔ہرقل نے راقص نامی سردار کو پچاس ہزار فوج دے کر حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کا راستہ روکنے کا حکم دیا تھا۔نسطورس نامی سردار کو ساٹھ ہزار فوجی دے کر حمص کی طرف روانہ کیا تا کہ وہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سے جنگ کریں۔رومی لشکر کی تعداد دو لاکھ چالیس ہزار نفوس سے بڑھ چکی تھی جب کہ کسی بھی

مسلمان سالار کے پاس دس پانچ دس ہزار سے زیادہ فوجی نہ تھے۔ چنانچہ امیر المومنین سے مشاورت کی گئی اور یہ فیصلہ طے پایا کہ اگر مسلمان فوج مختلف محاذوں پر منقسم رہی تو نقصان اٹھائے گی اس لیے اُن کے لیے بہتر ہے کہ وہ کسی ایک میدان میں دشمن کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ مسلمان لشکر اپنے محاذوں سے یرموک کی طرف اترنے لگے۔ مسلمان سالار یرموک میں جمع ہونے لگے اُن کے لشکروں کی تعداد بہت زیادہ نہ تھی تاہم اُن کا عزم وحوصلہ اس بات کی دلیل تھا کہ انھیں شکست سے زیادہ موت پسند ہے۔ ہرقل نے دیکھا کہ مسلمان مختلف محاذوں سے ہٹ کر ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں تو اُس نے بھی اپنے لشکروں کو واپس بلا لیا اور رومی بھی یرموک میں جمع ہونے لگے۔

تاریخ کا یہ خونریز معرکہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اس کے بعد روم اور ایران کی مملکتوں نے جان لیا کہ مسلمانوں سے مقابلہ کرنا انتہائی دشوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یرموک کے بعد رومی اور ایرانی آگے آگے بھاگ رہے تھے تو مسلمان اُن کے تعاقب میں تھے حتیٰ کہ اُن کے ملک ختم ہو گئے تاریخ کی راہداریوں میں محض اُن کا تذکرہ بچا چنانچہ ربیع الثانی 13 تیرہ ہجری کو یرموک کا میدان سجا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم کے پہنچنے کے بعد مسلمان لشکروں کی تعداد چالیس ہزار سے بڑھ گئی تھی مگر اب بھی اُن کے ایک شخص کے مقابل آٹھ رومی فوجی تھے جس سے اس معرکہ کی شدت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جنگ شروع ہوئی تو رومیوں نے چالیس ہزار کے لشکر کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کیا۔ مسلمانوں نے دو ہزار کا ایک لشکر مقابلے لیے بھیجا جس نے چالیس ہزار کے لشکر کو مار بھگایا۔

منظر اُسی میدان کا ہے ایک رومی جرنیل جرجہ بن زید نکلا۔

اُس نے مسلمانوں کے لشکر سے کسی کو مقابلے کے لیے پکارا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اُس سے مقابلے کے لیے نکلے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے تلوار سے اُس پر وار کیا اُس کی تلوار ٹوٹ گئی اور وہ گر گیا۔ تاہم حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے اُسے قتل کرنے میں جلدی نہ کی۔

اس پہ وہ حیران ہوا اور کہا:

تم مجھے قتل کیوں نہیں کرتے؟

اس لیے کہ میں جو بات تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ ابھی باقی ہے۔

جرجہ بن زید حیران ہوا اور کہا: بولو۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے اُسے اسلام کی دعوت دی۔

جرجہ بن زید مزید حیران ہوا اور پوچھا؟

تم نے مجھے اس لیے قتل نہیں کیا؟

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے جواب دیا ہم لوگ اُس وقت تک کسی کو قتل نہیں کرتے جب تک اُسے اُس پیغام فلاح کی طرف نہ بلالیں جسے لے کر ہم اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔

جربہ بن زید نے کہا:

اچھا مجھے اپنے دین کے متعلق بتاؤ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے اُسے دین حق کی طرف بلایا اور حکمت سے دین اسلام اُس تک منتقل کیا۔

جرجہ بن زید نے کہا:

مجھے اپنے دین کے بارے میں مزید کچھ بتاؤ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے اُسے اسلام کے متعلق مزید معلومات فراہم کیں اور کتاب مقدس کی کچھ آیات بھی اُس کے سامنے پڑھیں۔

جرجہ بن زید کے دل پر پڑا پردہ اُٹھ گیا اور اُس نے کلمہ پڑھ لیا۔

دونوں کی طرف کی فوجیں اس حیرت ناک منظر کو دیکھ رہی تھیں کہ دو مقابل جنگ کے لیے

اترے ہیں مگر باتوں میں مصروف ہیں پھرانھوں نے دیکھا کہ وہ دونوں باہوں میں باہیں ڈالے اسلامی لشکر کی طرف رواں ہیں۔

اس کے بعد جنگ مغلوبہ چھڑ گئی۔

دونوں طرف سے حملہ بہت سخت تھا۔انسانی خون اچھلنے لگا ایمان کی آزمائش ہونے لگی۔راسخ العقیدہ مسلمانوں کے ایک گروہ نے جن کی تعداد چارسو کے قریب بتائی جاتی ہے اپنے لشکر سے الگ ہو کر موت یا فتح کا عہد کیا۔اس کے بعد مسلمان بھوکے شیروں کی طرح رومیوں کے مہیب لشکر میں گھس گئے۔حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہم سورۃ الانفال کی آیات پڑھ رہے تھے اور مسلمانوں کے جذبات کو مہمیز فراہم کر رہے تھے۔مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی رومیوں کی تعداد سے مرعوب نہ ہوئے تھے بلکہ وہ رومیوں کے مقابلے میں زیادہ حملے کر رہے تھے۔رومی چونکہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لیے اُن کے آدمی زیادہ تعداد میں قتل ہو رہے تھے۔

اللہ کی تلوار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اُن پہ قہر بن کر ٹوٹ رہے تھے۔حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم ،شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم ،زید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم ،حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہم حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم ،حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہم وغیرہ نے وہ کارنامے کر دکھائے کہ چشم فلک حیران ہو ہو جاتی تھی۔صبح سے شام ہو گئی تھی زمین و آسمان میں صرف تلواروں کی جھنکار تھی ،خون کی مہکار تھی اور حق کی پکار تھی۔تیروسناں اپنی دھن میں تھے مسلمانوں کا عزم رومیوں کی مہیب عددی قوت پہ بھاری پڑ رہا تھا۔شام کے قریب رومی تھکے تھکے لگ رہے تھے۔وہ مضمحل اور افسردہ سے تھے۔پھر وہ پیچھے ہٹنے لگے اُن کا خیال تھا کہ جنگ کو کل تک اٹھا رکھا جائے مگر مسلمان اب اُن کو کوئی موقع دینے کے لیے تیار نہ تھے۔

وہ پیچھے ہٹتے رہے حتیٰ کہ پیچھے ہٹنے کی گنجائش ختم ہو گئی اس لیے کہ اُن کی پشت پر موجود پہاڑ نے اُن کا راستہ راک لیا تھا اور اب وہ عجیب مشکل میں تھے اس لیے کہ اُن کے پیچھے ایک پہاڑ تھا تو اُن کے آگے بھی عزم و حوصلے کا ایک پہاڑ تھا جب پسپا ہونے والے رومیوں کو جگہ نہ ملی تو انھوں

نے دائیں پہلو یا بائیں پہلو سے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی مگر مسلمانوں نے انھیں تلوار کی نوک پر رکھ لیا۔شام ڈھلے رومی لشکر کی یہ حالت تھی کہ مسلمان بہ سہولت بغیر کسی دقت کے اُن کا قتل عام کررہے تھے۔قریب ایک دریا تھارومیوں کی بہت بڑی تعداد اُس دریا میں کود گئی کچھ بچ گئے مگر ہزاروں کی تعداد میں ڈوب مرے۔ بہت سے اُس خندق میں گرے جسے انھوں نے مسلمانوں کے لیے کھود رکھا تھا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ رومیوں کی اکثر پیادہ فوج کو قتل کر دیا گیا صرف سوار اپنی جان بچانے میں کامیاب رہے کہ اُن کی سواری انھیں مسلمانوں سے دور لے گئی تھی۔

فراریوں کا خیال تھا کہ مسلمان جیت کی خوشی میں اُن کو بخش دیں گے مگر مسلمانوں کے سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے اُن راہوں پر بھی اپنے دستے بٹھا رکھے تھے جہاں اُن کے خیال میں فرار ہونے والے رومیوں نے پہنچنا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور تھکے ماندے رومی تازی دم مسلمان دستوں کے ہاتھوں سے قتل ہوتے رہے۔

یہ ایک خوں آشام معرکہ تھا جس نے خطے میں اس بات کا فیصلہ کر دیا تھا کہ روم ایران کل کی طاقتیں تھیں آج کی طاقت صرف اور صرف اسلام ہے۔

ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ یہ جنگ نہ تھی بلکہ بعض موقعوں پر تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ صرف رومیوں کے قتل عام کا مظاہرہ ہے۔

ایک لاکھ تیس ہزار رومی فوجی یرموک کے میدان میں قتل ہو گئے۔مملکت روم کی طاقت ٹوٹ گئی نصرانیت ہار گئی اور اسلام جیت گیا تھا۔

اگلی صبح یرموک کا میدان عجیب منظر پیش کر رہا تھا وہاں لاشیں تھیں یا گدھ تھے کوئی زندہ رومی فوجی دکھائی نہ دیتا تھا رومی بھاگے تو ایسے بھاگے کہ رکنے کا نام نہ لیا رومیوں کا سالار اعظم ہرقل کا سگا بھائی تذراق کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ بلکہ شاید اُن کا کوئی بھی جرنیل میدان جنگ سے زندہ واپس نہ جاسکا تھا۔

مسلمانوں نے بھی اس فتح کی مقدور بھر قیمت چکائی تھی۔ وہ حضرت عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہم حضرت عمرو بن عکرمہ رضی اللہ عنہم ،حضرت سلمی بن ہشام رضی اللہ عنہم ،حضرت عمرو بن سعید رضی اللہ عنہم ، حضرت ابان بن سعید رضی اللہ عنہم ،حضرت ہشام بن العاصی رضی اللہ عنہم ،حضرت ہبار بن سفیان رضی اللہ عنہم ،حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہم جسے اکابر صحابہ سے محروم ہو گئے تھے۔

مسلمان شہدا کی تعداد تین ہزار سے کچھ زیادہ تھی۔

جرجہ بن زید رحمۃ اللہ علیہ جس نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم کی دعوت پر اسلام قبول کیا تھا شہدائے اسلام میں شامل تھا۔

جب یرموک سے بھاگے ہوئے سپاہی ہرقل کے پاس حمص پہنچے جہاں وہ اس جنگ کے نتیجے کا انتظار کر رہا تھا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ بوکھلا گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دو لاکھ کا مہیب لشکر جسے اُس نے آہن و آتش بنا دیا تھا مسلمانوں کے انتہائی قلیل لشکر سے کس طرح شکست کھا گیا تھا۔

رومی لشکر تہس نہس ہو گیا تھا۔ ہرقل کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔

وہ بدحواسی میں حمص سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے جرنیلوں کو حکم دیا کہ دمشق اور حمص کا دفاع مضبوط بنایا جائے اور مسلمانوں کو کسی صورت اِن شہروں کی طرف نہ آنے دیا جائے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ دمشق کی فتح :

یرموک کے معرکے کے بعد اصلاً مسلمان ملک شام پر قابض ہو چکے تھے اس لیے کہ اب اُن کی راہ میں کوئی بڑی رکاوٹ نہ تھی ہرقل کے لیے بھی ممکن نہ تھا کہ وہ فوراً ہی کوئی ایسا لشکر تیار کر سکتا جس طرح کی شان و شوکت اور ہیبت والا لشکر اُس نے یرموک کی طرف بھیجا تھا۔ رومی اب مسلمانوں پر حملے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے بلکہ یہ کام اب مسلمانوں نے ہی کرنا تھا۔ اس لیے

زیادہ دن نہ گزرے تھے جب ہرقل کو یہ خبر ملی کی مسلمانوں نے اُس سے دمشق جیسا شہر بھی چھین لیا ہے اور اب وہ حمص کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہرقل کو اس بات کا یقین ہی نہیں آیا اور اُس کی حیرت بجا تھی اور عسکری حوالوں سے تھی۔ تاہم اگر وہ سوچتا تو جان جاتا کہ مسلمانوں کی اِن پے در پے فتوحات کے پیچھے وہ یقین اور عزم ہے جو سچائی کی دلیل ہوا کرتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم راہی ملک عدم ہو چکے تھے جب یرموک کی فتح کی خبر مدینے پہنچی تب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم مسلمانوں کے خلیفہ بن چکے تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم کو مسلم افواج کی سالاری کے منصب سے معزول کر دیا تھا اور اُن کی جگہ حضرت ابوعبیدہ بالجراح رضی اللہ عنہم نے مسلمان لشکروں کی قیادت سنبھال لی تھی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے عہد میں روم وایران کی فتح کی تکمیل ہوئی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے منصب خلافت سنبھالتے ہی ایک لشکر حضرت ابو عبیدہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کی قیادت میں عراق کی طرف روانہ کیا۔ حضرت ابوعبیدہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کا تعلق بنوثقیف سے تھا اس لیے اُن کو ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم کہا جاتا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے چند ہی دنوں بعد ایک اور لشکر کو مدینے سے روانہ کیا جس کی قیادت حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہم کے سپرد تھی۔ اُن کی منزل نجران تھی جہاں کے عیسائیوں کی بہت بڑی آبادیاں تھیں۔

رومی لشکر کو اگرچہ یرموک میں شکست ہو گئی تھی مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ رومی سلطنت صفحہ ہستی سے مٹ گئی ہے رومی اب بھی ایک مہیب طاقت تھے اور مسلمانوں سے مقابلے کے لیے پھر سے اپنی طاقت کو مجتمع کر رہے تھے۔

یرموک سے شکست کھا کے رومی بھاگے تو وہ فخل میں رکے۔ فلسطین اور حمص سے لشکر دمشق پہنچنے لگے تھے۔ دمشق کا حکمران نسطاس تھا ہرقل نے اُسے رومی فوجوں کا سربراہ مقرر کیا تھا۔ مسلمانوں کی کمان اب حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم کے ہاتھ میں تھی اور حضرت خالد بن

ولید رضی اللہ عنہم ایک عام فوجی کی حیثیت سے جنگ میں شامل تھے۔ تاہم حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم جنگی معاملات میں اُن سے مشاورت ضرور کرتے تھے۔

رجب 13 ہجری میں مسلمانوں نے دمشق شہر کا محاصرہ کرلیا۔ شہر میں اگرچہ رومیوں کی کافی فوج موجود تھی مگر اس کے باجود انھیں شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔

محاصرہ طویل ہونے لگا۔ شہر کی فصیل مضبوط تھی اس لیے مسلمانوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ دشمن کا حوصلہ ٹوٹنے تک شہر کے باہر ہی رکیں اور اُس وقت کا انتظار کریں جب دشمن محاصرے سے اکتا جائے اور ہتھیار ڈال دے۔

شہر کی ایک طرف حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم اپنے لشکر کے ساتھ موجود تھے اس جگہ کو باب الجابیہ کہا جاتا تھا۔

شہر کی دوسری طرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اپنے لشکر کے ساتھ موجود تھے اور اس جگہ کو باب توما کہا جاتا تھا۔

حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہم فراویس کی جانب اور یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم بابِ صغیر و باب کیسان کی جانب فروکش تھے۔ اس طرح مسلمانوں کے لشکر نے شہر دمشق کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔

اہل دمشق فصیل شہر سے مسلمانوں پر تیز اندازی اور سنگ باری کرتے رہتے۔ وہ منجنیقوں سے بھی مسلمانوں پہ پتھراؤ کرتے۔

مسلمان بھی اِن حملوں کا جواب دیتے رہے اور اُن کے تیر فصیل شہر تک جاتے رہے مگر جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو رہا تھا۔

دراصل اہل دمشق حمص کی طرف سے آنے والی اُس کمک کے انتظار میں تھا جو ہرقل نے اُن کی مدد کے لیے روانہ کی تھی۔ مگر اہل دمشق نہ جانتے تھے کہ دمشق اور حمص کے درمیان ایک مقام پر حضرت ذوالکلاع رضی اللہ عنہم اسی کمک کے انتظار میں تھے اور جب رومیوں کا یہ لشکر اُن کی زد میں آ

یا تو انھوں نے اس پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔

محاصرے کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔اہل دمشق اکتا چکے تھے اور وہ ہرقل کی طرف سے بھی مایوس ہو چکے تھے۔دوسری طرف مسلمانوں کے حملوں میں انتہائی تیزی آ چکی تھی اور انھوں نے اہل دمشق پہ اپنا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

تب ایک دن قلعے سے کچھ لوگ نکلے اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم کو صلح کرنے کی دعوت دی جسے انھوں نے قبول کر لیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم اور اہل دمشق کے مابین صلح کا معائدہ طے پا گیا تو انھوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم کے لشکر کے لیے قلعے کے دروازے کھول دیئے۔

دوسری طرف حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم کے لشکر نے شدید حملہ کیا اور سیڑھیاں لگا کر قلعے میں داخل ہو گئے۔

دونوں لشکروں کا سامنا شہر کے مرکز میں ہوا۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے طاقت کے زور پر شہر حاصل کیا ہے جب کہ رومیوں کا دعویٰ تھا کہ انھوں نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم سے معاہدے کے بعد دروازے کھولے ہیں اور اُن کے پاس وہ تحریر بھی موجود تھی جس میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے اُن سے معاہدہ کیا تھا۔

سالارِ اعلیٰ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم نے مداخلت کی اور کہا:

یہ معاہدہ تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہم نے کیا ہے جو اپنے دستے کے سالار ہیں بخدا اگر کوئی عام سپاہی بھی اہل دمشق سے عہد کر لیتا تو ہم اس کی بھی تکریم کرتے۔

چنانچہ اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ دمشق شہر معاہدے کی بنا پہ فتح ہوا ہے۔

اس طرح دمشق بھی مسلمانوں کی عملداری میں آ گیا۔

✡✡✡✡✡✡

☜ باجان کی شکست :

پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت سنبھالتے ہی کئی لشکر عراق کی جانب روانہ کیے تاکہ وہاں کے مفتوحہ علاقوں میں اقتدار کو مستحکم کیا جا سکے۔اسی سلسلے میں انھوں نے ایک لشکر حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں عراق کی طرف روانہ کیا۔سعد بن عبید رضی اللہ عنہ اور سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ فوجیوں کا ایک دستہ لے کر اُن کے پیچھے روانہ ہوئے۔اس سے بھی پہلے حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ عراق کی طرف روانہ ہو چکے تھے مگر وہ راستے میں رُک گئے تھے تاکہ لوگوں کو جہاد کی دعوت دیں۔انھوں نے اُن تمام قبائل کو جہاد کے لیے ابھارا جن میں اُن کا اثر ورسوخ پایا جاتا تھا۔چنانچہ وہ اچھا خاصا لشکر تیار کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔تاہم اس تگ ودو میں انھیں ایک مہینہ لگ گیا تھا۔اس لیے جب وہ سواد کے مقام پر پہنچے تو ایرانی حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو جنگ میں الجھا چکے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ شہنشاہ ایران نے اپنے ایک نہایت ہی تیز طرار سالار باجان کو بہت سی فوج دے کر حیرہ کی طرف روانہ کیا جس نے آتے ہی غیر مسلم اور عیسائی عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پہ ابھارا اور وہ تیار ہو گئے۔چونکہ خود باجان کے پاس بھی بہت بڑا لشکر موجود تھا اور اب بہت سے عرب قبائل بھی اُس کے حلیف بن گئے تھے اس لیے حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ اُن کے مقابلے میں خود کو کمزور محسوس کرنے لگے تھے۔چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ فوراً ہی اُن کی مدد کے لیے لپکے۔باجان کا لشکر نمارق میں قیام پذیر تھا۔جب کہ حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ حیرہ سے نکل کر خفان کے مقام پر چھاونی ڈالے بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ مرکز سے انھیں کمک پہنچے تو وہ دشمن پر حملہ کریں۔چنانچہ جب حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے تو انھوں نے فوج کی کمان اپنے

ہاتھ میں لے لی اور اگلے ہی روز دشمن پر چڑھ دوڑے۔ پہلے ہی ہلے میں مسلمانوں نے بہت سے ایرانیوں کو قتل کر دیا۔ پھر ایرانیوں نے ایک بھر پور حملہ کیا چونکہ اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر مسلمانوں کے سالار حضرت ابو عبیدہ ثقفی رضی اللہ عنہم نے ایک زوردار نعرہ بلند کیا اور دشمن کے لشکر میں گھس گئے اپنے سالار کی اس جی داری کو دیکھ مسلمانوں کو جوش آ گیا اور انھوں نے دشمن کی صفوں کو الٹ کر رکھ دیا۔

ایرانی بھاگ اٹھے انھیں شکست ہو چکی تھی۔

ایران کے سالار باجان نے اپنا جنگی لباس اتار دیا تھا اور ایک معمولی سپاہی کا لباس پہن کر فرار ہو رہا تھا کہ اُسے ایک مسلمان شہ شوار نے گرفتار کر لیا مسلمان کا نام مطر بن فضہ ربعی بیان کیا گیا ہے۔

مطر بن فضہ باجان کو نہیں پہچانتا تھا اس اُس نے باجان کو ایک عام قیدی ہی سمجھا۔

باجان نے مطر سے کہا:

تم مجھے گرفتار کر کے کیا حاصل کرو۔ اگر تم کہو تو میں تمھیں دو تو انا غلام دیتا ہوں تم مجھے چھوڑ دو۔

مطر نے باجان کو چھوڑ دیا۔

وہ فرار ہو رہا تھا کہ ایک مسلمان دستے کے ہاتھ لگ گیا جو اِس کو پہچانتے بھی تھے انھوں نے باجان کو مسلمانوں کے سالار حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

باجان نے حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم سے کہا:

ہم نے تو سنا ہے آپ لوگ عہد کی آخری حد تک پابندی کرتے ہو۔

حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم نے پوچھا؟

تم کس عہد کی بات کر رہے ہو۔

تب باجان نے انھیں بتایا کہ انھوں نے اپنی آزادی کی قیمت ایک مسلمان کو ادا کر دی ہے۔

چنانچہ مطر بن فضہ کو طلب کیا گیا۔

انھوں نے باجان کے دعوے کی تصدیق کردی۔

تب مسلمانوں کے سالار نے باجان کو جانے کی اجازت دے دی۔

باجان نے حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم سے سواری کی درخوست کی جسے منظور کرلیا گیااوروہ پوری شان کے ساتھ مسلمانوں کے لشکر سے روانہ ہوا۔

اور یہ منظرعمومی جنگی روایات کے برخلاف اور مسلمانوں کے اعلیٰ اخلاقی نصب العین کی دلیل تھا ۔اورآج کے اُس مغربی دانشور کی خباثت کوعیاں کرتی ہے جومسلمان فاتحین کوملک گیر قرار دیتا ہے۔

حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ملک گیری کس کو کہا جا تا ہے۔عیسائی جب مسلمانوں کا کوئی علاقہ فتح کرتے تو وہاں انسانیت سوز مظالم کا بازار گرم کر دیتے عورتوں کی عزت لوٹ لیتے بچوں اورعورتوں کوقتل کرتے ،املاک کوآگ لگا دیتے کھیتوں کواجاڑ دیتے ۔درختوں کوکاٹ دیتے،بوڑھوں کواذیت دیتے۔جب انھوں نے مسلمانوں سے بیت المقدس واپس لیاتوایک دن میں انھوں نے نوے ہزار مسلمانوں کوقتل کیا تھا۔

✡✡✡✡✡✡

☜ معرکہ کسکر :

ایرانیوں کا ایک اورسالارنرسی تیس ہزارفوجیوں کے ساتھ کسکر کے مقام پرخیمہ زن تھا جابان اُس کے پاس پہنچ گیا۔اُدھرایرانیوں کے دارالحکومت مدائن میں باجان کی شکست کی اطلاع پہنچی تو رستم نے جالینوس کی قیادت میں ایک عظیم لشکر کسکر کی طرف روانہ کیااوراُسے ہدایت کی کہ وہ نرسی سے جاملے اوراس متحدہ لشکرکوساتھ لے کرمسلمانوں پرحملہ کردے۔تاہم مسلمانوں کوبھی ایرانیوں کے ارادوں اورمنصوبوں کی خبرہوتی رہتی تھی اس لیےاس سے قبل کہ جالینوس

نرسی کی مدد کو پہنچے حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم نے کسکر کے مقام پر موجود نرسی کے ایرانی لشکر پر حملہ کر دیا۔

نرسی کے ساتھ دو شہزادے بھی تھے۔ جنھوں نے ایرانی لشکر کے میمنہ اور میسرہ کی قیادت سنبھال رکھی تھی۔

مسلمانوں کے میمنہ پر حضرت ابوعبید بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم کے بیٹے سعد بن عبیدہ تھے اور میسرہ پر حضرت سلیط بن قیس رضی اللہ عنہم تھے۔

جنگ شروع ہو چکی تھی۔ خوب قتال ہو رہا تھا ایرانی اپنی عددی قوت کی بنا پر مسلمانوں پہ بھاری پڑ رہے تھے کہ اچانک ہی قلب سے حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور پھر وہ غائب ہو گئے۔

چار کلو میٹر کا چکر کاٹ کر وہ ایرانی لشکر کی پشت سے نمودار ہوئے تو ایرانیوں نے جانا کہ مسلمانوں کو کمک پہنچ گئی ہے اُن کے حوصلے ٹوٹ گئے صفیں منتشر ہو گئیں اور وہ بے دریغ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے لگے۔

مسلمانوں کی نظر اب اُس ایرانی لشکر پر تھی جو مدائن سے آ رہا تھا۔ جس کی قیادت جالینوس کر تھا۔ مسلمانوں نے باقیشیا کے مقام پر جالینوس کا انتظار کیا جب وہ مسلمانوں کی زد میں آیا تو مسلمانوں نے اُس پر حملہ کر دیا۔

وہ اس جنگ کے لیے تیار نہ تھا اس لیے اُسے شکست ہو گئی اُس کے بیشمار فوجی مارے گئے جالینوس فرار ہو گیا۔

✡✡✡✡✡✡

☜ مسلمانوں کو شکست ہوئی :

جالینوس نے مدائن جا کر ہی سانس لیا۔جالینوس کی شکست سے ایرانی دربار میں تہلکہ مچ گیا رستم نے اعلیٰ سطحی اجلاس طلب کیا اور لوگوں سے کہا:

مجھے بتاؤ وہ کون سا ایرانی بہادر ہے جو عربوں کی اس یلغار کے سامنے بند باندھ سکے۔لوگوں نے بلا تامل جواب دیا بہمن جادویہ۔

بہمن جادویہ کو تیس ہزار کا لشکر اور تین ہزار ہاتھیوں سے مزین کر کے مدائن سے رخصت کیا گیا ۔اُسے ''درنش کادیانی'' مقدس جھنڈا بھی فراہم کر دیا گیا جس کے متعلق اہل ایران کا خیال تھا کہ اس جھنڈے کی موجودگی میں انھیں شکست نہیں ہو سکتی۔

بہمن جادویہ مدائن سے روانہ ہوا اور ساتھ ساتھ راستے سے اُن عیسائی سرداروں کو بھی جنگ کے لیے ابھارتا رہا جو عربوں سے تنگ آئے ہوئے تھے۔چنانچہ بہت سے عرب قبیلے بھی بہمن جادویہ کی سربراہی میں مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے نکل آئے۔بہمن جادویہ نے اس عظیم لشکر کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے قس ناطف کے مقام پر قیام کیا۔

مسلمانوں کو بہمن جادویہ کی آمد کی خبر مل چکی تھی۔چنانچہ حضرت ابو عبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم اپنے لشکر کے ساتھ کسکر سے روانہ ہوئے اور دریا کی دوسری جانب مروحہ کے مقام پر خیمہ زن ہو گئے۔

دونوں لشکروں نے درمیان دریائے فرات تھا۔

ایرانیوں نے دریا پر پل بنانا شروع کیا کئی دن کی کوششوں سے وہ پل بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

جب پل مکمل ہو گیا تو بہمن جادویہ کا قاصد مسلمانوں کے ہاں اترا اور کہا:

ہمارے سالار نے پوچھا ہے کہ آپ اِس پار آئیں گے یا ہم آ جائیں۔

حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم نے کہا:

اپنے سالار کہو ہمارا انتظار کرے ہم اُس پار آئیں گے۔

اگلے روز مسلمانوں کا لشکر پل پر سے گذر کر دریائے فرات کے اُس پار اترا۔

جگہ کم تھی اس لیے مسلمانوں کے لشکر سے بھر گئی۔

اُن کے پیچھے دریا تھا اور آگے دشمن کا مہیب لشکر۔

جنگ شروع ہوئی ایرانیوں نے بے پناہ تیز اندازی کی۔ مسلمان گھڑ سوار دستوں نے دشمن پر حملہ کیا تو اُن کے گھوڑوں نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا کہ انھوں نے اس سے پہلے ہاتھی جیسا جانور کبھی نہ دیکھا تھا اس لیے جب وہ ہاتھیوں کی چنگاڑ سنتے تو اپنے مالک کا حکم بھول جاتے اور جدھر کو چاہتے نکل جاتے۔

حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم نے جنگ کا یہ منظر دیکھا تو انھوں نے لوگوں سے کہا اپنے گھوڑوں کو چھوڑ دو اور پیدل ہی دشمن کے لشکر میں گھس جاؤ۔

مسلمانوں نے ایسا ہی کیا۔

وہ ہاتھیوں کے لشکر میں گھس گئے اور اُن کی سونڈیں کاٹنے لگے۔ تاہم انسان اور ہاتھی کا کوئی مقابلہ نہیں ہوتا اس لیے بہت سے مسلمانوں کو ایرانی ہاتھیوں نے اپنے پاؤں سے کچل کر ہلاک کر دیا۔ خود حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم نے ایک ہاتھی کے سونڈ پر حملہ کیا ہاتھی کی سونڈ کٹ کر دور جا گری۔

ہاتھی نے غصے سے حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم کو دیکھا اور اسی حالت میں آگے بڑھا اور اُس نے حضرت ابوعبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم کو اپنے پاؤں سے کچل ڈالا۔ حضرت ابو عبیدہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے تو اُن کے بھائی حکم بن مسعود ثقفی آگے بڑھے اور پرچم اٹھالیا۔

پھر وہ بھی شہید ہوگئے تو قبیلہ بنوثقیف سے کسی اور نے مسلمانوں کا علم اٹھایا تاہم ایرانیوں کا دباؤ بے پناہ تھا۔آج اُن کی عددی برتری بھی اپنا جادو دکھا رہی تھی مسلمان علم برادر یکے بعد دیگرے قتل ہورہے تھے حتیٰ کہ بنوثقیف کے چھ علم بردار مسلمانوں کے علم کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ پھر پرچم حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم نے اٹھایا۔جنگ کی چکی چل رہی تھی ایرانی فتح کے قریب تھے مسلمان پسپا ہوئے تو پیچھے دریا تھا سینکڑوں دریا میں ڈوب گئے۔حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم بہ مشکل تین ہزار مسلمانوں کو بچا سکے۔ چھ ہزار مسلمان شہید ہوگئے اگر چہ مسلمانوں نے چھ ہزار ایرانیوں کو بھی قتل کیا تھا تاہم مسلمانوں کے لیے یہ نقصان بہت زیادہ تھا۔

ایرانیوں کے ہاتھوں یہ مسلمانوں کو پہلی شکست تھی۔اسی جنگ میں کئی مسلمان جنگ سے منہ موڑ کر فرار ہوئے تھے۔اگر چہ بعد کی جنگوں میں اِن لوگوں نے اپنی کوتاہی کے اس داغ کو دھو دیا تھا تاہم چونکہ مسلمانوں کے ہاں اس سے قبل ایسی کوئی روایت نہ تھی اس لیے مسلمانوں نے اس بات کو بہت برا جانا۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے جب اس جنگ کا حال سنا تو وہ بہت سے مسلمانوں کی شہادت سے آزردہ ہوگئے۔

✡✡✡✡✡✡

☜ معرکہ بویب:

خلیفۃ المسلین کو دریائے فرات کے کنارے مسلمانوں کی شکست اور بڑی تعداد میں اُن کی شہادت نے بے حد متحرک کر دیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے قاصد عرب کی وسعتوں میں رواں تھے۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے ہر اُس قبیلے کے سردار کو مدینہ بھلا بھیجا تھا

جس کے پاس مردانِ جنگی تھے یا جوفن حرب میں ماہر جانے جاتے تھے۔عرب قبائل مدینہ میں جمع ہونے لگے تھے۔شہر مدینہ میں عربوں کا ایک ہجوم در آیا تھا۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے انھیں دریائے فرات کے کنارے مسلمانوں کی شکست سے آگاہ کیا اور انھیں جہاد پہ ابھارا۔ تمام عربوں نے اُن کی صدا پہ لبیک کہا اور خود کو جنگ کے لیے پیش کیا۔چنانچہ زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ جنگ آزما مدینہ میں جمع ہونے لگے۔تھوڑے ہی دِنوں میں عربوں کے کئی قافلے عراق کی طرف روانہ ہوئے جن کے دلوں میں انتقام کی چنگاریاں تھیں اور وہ شوق شہادت سے لبریز تھے۔دوسری طرف حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے طور پہ اُن عراقی عرب قبائل کو مجتمع کرلیا تھا جنھوں نے اسلام قبول کیا ہوا تھا۔اِس طرح وہ بھی ایک لشکر تیار کرنے میں کامیاب رہے تھے۔اہل ایران مسلمانوں کی اِن جنگی تیاریوں سے غافل نہ تھے چنانچہ ایران کے وزیر اعظم اور سپہ سالار جنگ رستم نے مہران ہمدانی کو لشکر کثیر کے ساتھ مسلمانوں سے جنگ کے لیے روانہ کردیا تھا۔

حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم کو بھی مہران ہمدانی کی روانگی کی اطلاع مل چکی تھی چنانچہ انھوں نے کوچ کیا اور دریائے فرات کے کنارے بویب نامی مقام پہ لشکر کو اتارا اور ایرانی لشکر کا انتظار کرنے لگے۔مہران ہمدانی جو عرب النسل تھا اور عربوں کے طریقہ جنگ سے خوب آگاہ تھا اپنی منزل کو پہنچ گیا اور بویب کے مقام پہ ہی اترا اگرچہ وہ دریا کے اُس پار تھا۔

چند دن تک دونوں لشکر ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے، اپنی فوجوں کو آرام اور تیاری کا موقع فراہم کرتے رہے۔پھر مہران ہمدانی نے اپنا قاصد حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم کی طرف بھیجا اور انھیں پوچھا تم اس طرف آتے ہو یا ہم دریا کو عبور کر کے اُس طرف آجائیں۔

حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم چونکہ دریا پار کر کے جنگ میں نقصان اٹھانے کا ایک تلخ تجربہ کر چکے تھے اس لیے انھوں نے ایرانیوں سے کہا تم ہی آجاؤ۔

وہ رمضان تیرہ ہجری کی ایک سنہری صبح تھی جب ایرانی پورے کروفر اور نخوت کے ساتھ دریائے

فرات پہ بنائے عارضی پل کو عبور کر رہے تھے تاکہ مسلمانوں کا سامنا کر سکیں۔ اُن کے ساتھ ہاتھیوں کی کثیر تعداد تھی۔ جنگ کا آغاز ہوا مسلمانوں نے ایرانی ہاتھیوں سے نمٹنے کی تدبیر کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے گھوڑوں کے چہروں پہ سیاہ چادریں ڈال تھیں اِن سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ اُن کے گھوڑوں نے نہ ہاتھیوں کو دیکھا اور نہ بدکے اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ ہاتھیوں کے لیے یہ سیاہ جانور اجنبی سا تھا اس لیے وہ ڈر گئے اور منہ موڑ کر اپنے ہی لشکر کو روندنے لگے۔ مسلمانوں نے خوب دادِ شجاعت دی۔ ایرانیوں نے پہلے پہل جم کر مقابلہ کیا مگر پھر پسپا ہوئے اُن کی کثیر تعداد ہی اُن کے لیے مصیبت بنی ہوئی تھی۔ اُن کو وہی مشکلات پیش آ رہی تھیں جو اس سے پہلے والی جنگ میں مسلمانوں کو پیش آئی تھیں وہ پیچھے ہٹنا چاہتے تھے مگر اُن کے پیچھے دریا تھا۔

حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہم نے ایرانیوں کو پسپا ہوتے دیکھا تو اپنی فوج کے ایک دستے کو اشارہ کیا جو اسی مقصد کے لیے وہاں متعین تھا اپنے سالار کا اشارہ پاتے ہی وہ آناً فاناً پل پر ٹوٹ پڑے اور اسے توڑ دیا۔

اب ایرانی افواج تھک چکیں تھیں عرب جنگ آزماؤں نے اُن کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ وہ پیچھے ہٹنا چاہتے تھے فرار ہونا چاہتے تھے مگر دریائے منہ پھاڑے اُن کو نگلنے کے تیار تھا۔ چنانچہ وہی ہوا جو گذشتہ جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ ہوا تھا۔

ایرانیوں کے لیے ہر دو طرف موت تھی ایک طرف مسلمانوں کے حملے کا بے پناہ دباؤ تھا تو دوسری طرف دریائے فرات۔ اُن میں سے بہت سوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے دریائے فرات میں کودنے کو ترجیح دی جس کے نتیجے میں ایرانی لشکر کی ایک بڑی تعداد دریائے فرات میں ڈوب کر ہلاک ہوئی۔ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کے ایک سو شہدا کے بالمقابل ایرانیوں کے ایک لاکھ سپاہی مارے گئے اور یہ بہت بڑی شکست تھی جسے ایرانی کسی صورت برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ چنانچہ اس جنگ کے بعد انھوں نے اپنا شہنشاہ تک بدل لیا تھا۔ یاد رہے کہ تب ایران پر ایک عورت شہنشاہ تھی

جس کا نام فرخ زاد تھا اور وہ رستم کی بہن تھی۔مگر بویب کے مقام پر بدترین شکست کے بعد ایرانیوں نے نوعمر یزدجرد کو ایران کا شہنشاہ بنالیا تھا۔

✡✡✡✡✡✡

☜ خاک فارس :

بویب کی جنگ کے بعد ایران کے حالات تبدیل ہو گئے تھے۔ایران کا نیا شہنشاہ یزدجرد ایک متحرک نوجوان تھا جس نے چند ماہ میں ہی سلطنت کو سنبھالا دے دیا تھا۔اُس نے عربوں کو چنداں اہمیت نہ تھی اس لیے کہ وہ حقیقت نا آشنا تھا۔اُس کا خیال تھا جس طرح ماضی میں عربوں کو دبا لیا جاتا تھا اور اُن کے معمولی سالار ہی عربوں کو دور صحراؤں تک چھوڑ آتے تھے اب بھی وہ اس مسئلے کو حل کر لے گا۔اُس نے مملکت کے رؤسا اور اشراف کو اکٹھا کیا اور انھیں باہمی اختلافات ختم کر کے عظیم پارسی ریاست کی تجدید کی طرف بلایا۔لوگوں نے اُس کی بات توجہ سے سنی اور سلطنت ایران کے استحکام کی طرف متوجہ ہوئے۔یزدجرد نے رستم اور فیروز کو افواج ایران کی تنظیم نو کے احکامات جاری کیے۔

جلد ہی مملکت ایران میں نیا جوش و جذبہ پیدا ہو گیا وہ ایک نئے ولولے کے ساتھ مسلمانوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔یزدجرد نے ایران کے چار سو پھیلے صوبے داروں کو طلب کیا اور اُن کی بدانتظامی پر انھیں سرزنش کی اور ساتھ ہی انھیں ہدایات جاری کرتے ہوئے کہا میں عنقریب ایک بڑا لشکر عربوں سے مقابلے کے لیے روانہ کرنے والا ہوں تم میں سے ہر صوبیدار اپنا لشکر لے کر اس میں شامل جائے تاکہ عربوں کی طرف پیدا کردہ مصیبت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے جو تم کو اپنا آبائی مذہب چھوڑنے پر مجبور کرتے ہیں۔چنانچہ سلطنت

ایران میں ایک تازہ روح کو محسوس کرتے ہوئے عراق میں مسلمان مقبوضہ جات میں بغاوت پھیلنے لگی اور کئی مقامات پر یہ بغاوت کامیاب ہوگئی اور لوگ ایران کی حمایت کا دم بھرنے لگے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ میں تھے اور اُن کے جاسوس انھیں ایران میں ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اُن کے قاصد متحرک تھے اور صحرائے عرب کی وسعتوں میں اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مسلمان افواج کے سپہ سالار حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹ آئیں اور ایرانیوں کو وقت دیں تا آنکہ مدینہ سے انھیں بڑا لشکر فراہم کر دیا جائے۔ یاد رہے کہ مسلمانوں کی بہت سی افواج حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے ساتھ انھی ایام میں رومیوں کے ساتھ نبرد آزما تھیں۔ یعنی مسلمان ایک ہی وقت میں دو عالمی طاقتوں کے ساتھ جنگ میں مصروف عمل تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قاصدوں نے عرب بھر میں آگ لگا رکھی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قاصدوں میں عمدہ شاعر اور فصیح البیان خطیب شامل تھے جو عرب قبائل میں جاتے انھیں اسلام کی خاطر جہاد کے لیے ابھارتے۔ جنگجو قبائل کو میدان جنگ کی طرف متوجہ کرتے انھیں شہادت کے درجات اور مال غنیمت کی کثرت کی طرف بلاتے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پہ حلال کیا تھا۔ چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ حج کر کے مدینہ پہنچے تو عرب کے مسلمان قبائل سے ہزاروں لوگ اُن کے منتظر تھے تاکہ انھیں جہاد پہ بھیجا جا سکے۔ مسلمانوں میں لڑائی کے لیے جوش و خروش پایا جاتا تھا وہ ایران کے آتش پرستوں سے نمٹنا چاہتے تھے جو اسلام کے لیے خطرہ بنا ہوئے تھے۔ مدینہ میں ہر گذرتے دن جہاد کے لیے قافلے اترتے رہے حتیٰ کہ مدینہ میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ بچی تھی۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی لشکر کی روانگی کا اعلان کر دیا۔ وہ خود اس لشکر کی قیادت کے خواہش مند تھے اس لیے انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا میں مدینہ میں تم کو اپنا نائب مقرر کرتا ہوں۔ اس کے بعد لشکر روانہ ہو گیا

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہم کو ہراول دستے کا سربراہ بنایا اور انھیں رخصت کی اجازت دی۔ باقی لشکر کو آپ نے اس طرح ترتیب دیا کہ قلب کی قیادت اپنے ہاتھ میں رکھی، میمنہ کی سالاری حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کے سپرد کی۔ میسرہ پر حضرت عبدالرحمان ابن عوف رضی اللہ عنہم کو مقرر کیا اور لشکر روانہ ہو گیا۔ لشکر نے اپنا پہلا پڑاؤ ضرار نامی چشمے پر کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم لشکر اسلام کے ساتھ یہیں مقیم تھے کہ اکابر صحابہ کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جس کی سربراہی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم کر رہے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے عرض کی:

اے امیر المومنین رضی اللہ عنہم، آپ کا اس طرح مدینہ کو خالی چھوڑ دینا مناسب نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہم نے بھی یہی فرمایا:

حضرت عبدالرحمان ابن عوف رضی اللہ عنہم نے اِن صحابہ کی رائے کی تائید کی۔

حضرت عبدالرحمان ابن عوف رضی اللہ عنہم نے کھڑا ہو کے کہا:

اے امیر المومنین رضی اللہ عنہم: جنگ دھوپ چھاؤں کی طرح ہے کبھی ہم غالب رہتے ہیں کبھی دشمن ہم پہ بھاری پڑتا ہے۔ اگر مرکز موجود ہو تو ہاری ہوئی جنگ اگلے روز ہی لوٹائی جا سکتی ہے اور کئی بار ایسا ہوا بھی ہے کہ ہم مغلوب ہونے والے تھے کہ مرکز کی تازہ کمک پہنچنے سے ہم میں نئی روح دوڑ گئی اور ہم نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔

اے امیر المومنین رضی اللہ عنہم:

آپ کو لوگوں کے مسائل کا نگہبان بنایا گیا ہے۔ اگر آپ مدینہ میں نہ ہوں گے تو کئی مسائل سر اٹھائیں گے۔ آپ نے دوسرے محاذوں پر مصروف جنگ لشکروں کی دیکھ بھال بھی کرنی ہوتی ہے۔ پھر اگر جنگ میں ہم میں کوئی شہید ہو جائے تو خیر ہے مگر جنگ میں آپ کی ذات کو کوئی نقصان پہنچا تو مسلمانوں کا مرکز بکھر جائے گا اور ایسی آوازیں بلند ہوں گی جن میں فتنہ ہو گا اس لیے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ مدینہ میں ہی رہیں اور ہمارے لیے دُعا اور

تدبیر کریں کہ اللہ ہم کو اُن مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے جنھیں لے کر ہم اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔

چنانچہ صحابہ کے پیہم اصرار پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رُک گئے اور حضرت عبدالرحمان ابن عوف رضی اللہ عنہ کے کہنے پر رسول اللہ ﷺ کے ماموں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا سالار بنادیا گیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کو لے کر مملکت ایران کی طرف روانہ ہو گئے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ لوٹ آئے۔

✡✡✡✡✡✡

دوسری طرف شہنشاہ ایران تو فوراً عربوں سے جنگ پہ آمادہ تھا تاہم اُس کا سپہ سالار رستم اس جنگ کو جتنا بھی ممکن ہو ٹالنا چاہتا تھا اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ عرب اب بدل چکے ہیں وہ پہلے کی طرح منتشر نہیں کہ ایک عرب قبیلے کی مدد سے دوسرے عرب قبیلے کو مطیع کیا جا سکے۔ وہ جانتا تھا کہ اسلام نے عربوں کو متحد کر دیا ہے اور اب وہ صحرا کے بھوکے عقابوں کی طرح ہیں جو حملے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ چنانچہ جتنا ممکن تھا رستم نے اتنا اس جنگ کو ٹالا۔

تاہم ایک دن یزدجرد نے اُسے طلب کیا اور اُس سے کہا:

یا عربوں سے جنگ کے لیے نکلو یا پھر ایرانی افواج کی سپہ سالاری کا عہدہ چھوڑ دو تا کہ میں کسی اور کو روانہ کر سکوں۔

رستم نے جنگ پر نکلنے کے لیے آمادگی ظاہر کر دی۔

اس طرح ایک عظیم لشکر جس کی تعداد ڈیڑھ لاکھ بتائی جاتی ہے مسلمانوں سے مقابلے کے لیے مدائن سے روانہ ہوا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اُس ایرانی لشکر کا تمام احوال خلیفۃ المسلمین کو لکھ دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مختلف جگہوں سے اسلامی لشکروں کو قادسیہ کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے دو ہزار یمانی اور دو ہزار نجدی بہادروں کا لشکر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف روانہ کیا اور ساتھ ہی لکھا کہ ایرانیوں کی کثرت سے تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہم نے ہمیشہ کثیر لشکروں کا مقابلہ قلیل لشکروں سے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اکثر فتح کی نعمت سے ہمیں ہی نوازا ہے۔

حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ ذی قار نامی مقام پر فروکش تھے اور اُن کے پاس آٹھ ہزار مردان جنگ تھے۔انھیں بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی طرف روانہ ہونے کا حکم دیا۔جسر کی لڑائی میں حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ شدید زخمی ہوئے تھے اور اُن کے زخم مندمل نہ ہو رہے تھے۔اس دوران انھیں کسکر کا معرکہ بھی لڑنا پڑا جس سے اُن کے زخموں کے منہ کھل گئے۔چنانچہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قاصد اُن تک پہنچا تو وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ انھوں نے بشیر بن حصامہ رضی اللہ عنہ کو فوج کا سربراہ بنایا اور انھیں حکم دیا امیر المومنین کے حکم پر روانہ ہو جاؤ۔تاہم حضرت بشیر بن حصامہ رضی اللہ عنہ نے قدرے تامل کیا اور انتظار کیا کہ اللہ تعالیٰ حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے متعلق اپنا فیصلہ سنا دیں چنانچہ اگلے روز حضرت مثنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے تاج شہادت شہادت پہنا اور سرخرو ہوئے۔اُن کا لشکر بھی سرخرو ہوا کہ وہ اپنے سالار کو یوں بے یارومددگار چھوڑ کے جانے کے لیے آمادہ نہ تھا۔انھوں نے اپنے سالار کو مٹی کے سپرد کیا اور اگلی منزل کے لیے کوچ کر گئے۔اُن کی اگلی منزل قادسیہ تھی۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

آگ پرستوں کا عظیم لشکر مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا عزم لے کر منزلوں پہ منزلیں مار رہا تھا۔رستم نے راستے سے بہت لشکر اکٹھا کیا تھا اُس کے ساتھ ہاتھیوں کی بھی کثیر تعداد تھی اور اسے اپنے شہنشاہ کی بھی مکمل پشت پناہی حاصل تھی چنانچہ اہل ایران سمجھتے تھے کہ قادسیہ کے

میدان میں مسلمانوں سے فیصلہ کن معرکہ ہوگا۔اس حد تک تو اُن کا خیال درست ثابت ہوا کہ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ تھا تاہم فیصلہ اُن کے خلاف ہوا یہ بات اُن کی سمجھ سے بالاتھی۔

✡✡✡✡✡✡

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم جب مدینہ سے رخصت ہوئے تو اُن کے ساتھ صرف چار ہزار جنگ آزما سپاہی تھے۔تاہم امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ چار ہزار کی سپاہ کے ساتھ عظیم مجوسی ریاست کے ساتھ جنگ نہیں کی جاسکتی اس لیے وہ کم سوتے تھے کم کھاتے تھے اور زیادہ سوچتے تھے کہ کن کن محاذوں سے فوج ہٹا کر حضرت سعد رضی اللہ عنہم کے پاس بھیجی جائے۔چنانچہ یہ امیر المومنین رضی اللہ عنہم ہی کا اہتمام تھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم جب سیراف کے مقام پر پہنچے تو قبیلہ بنی اسد نے چار ہزار مردانِ جنگی اسلامی لشکر میں شامل کر دیئے۔پھر ثعلبہ کے مقام پر حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہم دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ اسلامی لشکر میں شامل ہوگئے۔چنانچہ جب قادسیہ کے میدان میں ایرانی سپاہ اتریں تب حضرت سعد رضی اللہ عنہم کے پاس تیس ہزار سپاہ کا لشکر تیار ہو چکا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو لکھا کہ اُن بزرگوں کا خیال رکھنا اور اُن سے رہنمائی لینا جو میں نے تیرے لشکر میں رکھے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے صدقے تجھے عزت عطا فرمائے اور اُن کی مراد اُن صحابہ سے تھی جو عمر رسیدہ تھے مضمحل تھے مگر شوق جہاد سے معمور تھے اُن میں ستر ایسے صحابہ تھے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ غزوہ بدر میں دادِ شجاعت دی تھی اور تین سو صحابہ وہ تھے جنھوں نے بیت رضوان میں حصہ لیا تھا۔

قاصد نے امیر المومنین کی طرف مزید ہدایات پہنچاتے ہوئے کہا:

سنو! قادسیہ کی طرف بڑھو اور ایسے مقام پر مورچہ بناؤ جہاں تمھارے آگے وسیع میدان ہو اور پیچھے پہاڑ ہو۔

اگر اللہ تمھیں آسانی عطا فرمائے تو جہاں تک تمہارا جی چاہے ایرانی ریاست میں گھس جاؤ اور اگر اللہ تعالیٰ تمھیں آزمائش میں ڈالیں یعنی تمھیں شکست نظر آئے تو واپس پہاڑ کی طرف چلے آؤ خود محفوظ کر لو پھر سوچ سمجھ کر دوبارہ حملہ کرو۔

دشمن پر حملہ کرنے سے پہلے اُن کو دین کی دعوت ضرور دینا تا کہ اہتمام حجت ہو جائے۔

چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم نے شرفائے عرب کا ایک وفد ترتیب دیا اور انھیں اسلام کی دعوت دینے کے لیے اہل ایران کی طرف بھیجا۔اس وفد میں جن سفارت کاروں نے اہل ایران کو اسلام کی دعوت دی اُن کے نام مورخین نے تحریر کیے ہیں۔

اُن میں حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہم ،حضرت قیس بن زرارہ رضی اللہ عنہم ،اشعث بن قیس رضی اللہ عنہم ،فرات بن حبان رضی اللہ عنہم ،عاصم بن عمر رضی اللہ عنہم ،عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہم ،حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم ،معنی بن حارثہ رضی اللہ عنہم ،حضرت عطارد بن حاجب رضی اللہ عنہم ،بشیر بن ابی رہم رضی اللہ عنہم ،حنظلہ بن الربیع رضی اللہ عنہم اور حضرت عدی بن سہیل رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل تھے۔

رستم نے مسلمان سفرا کی آمد کا سنا تو محل کو خوب آراستہ کیا۔

مسلمان رستم کے دربار میں پہنچے اور اسے اسلام کی دعوت دی۔

رستم نے اسلام کی دعوت کو نظرانداز کیا اور کہا:

کیا تم لوگ اس بات کو بھول گئے ہو کہ تم لوگ دنیا کی ذلیل ترین قوم ہو۔

حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہم نے جواب دیا:

حقیقت یہ ہے کہ ہم اُس سے بھی زیادہ ذلیل تھے جتنا کہ تم نے بیان کیا ہے مگر شاید تم نہیں جانتے کہ پھر اللہ نے ہم پہ رحم کیا اور ہمیں ہدایت سے نوازا جس سے ہماری زندگیاں بدل گئیں ۔ہم تمھیں بھی اسی ہدایت کی طرف بلانے آئے ہیں۔تم اطاعت قبول کر لو تو قتل ہونے سے بچ جاؤ گے اگر تم اطاعت نہ کرو تب بھی ہم تمھارے ملک پر قبضہ کر لیں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ ہمیں اس امر کی بشارت دے چکے ہیں۔

رستم غصے میں آ گیا اُس نے اپنے پاؤں سے دو ہاتھ مٹی اٹھائی اور مسلمانوں سے کہا یہ لو کہ تم اس کے سوا ہم سے اور لے بھی کیا سکتے ہو۔

حضرت عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہم نے دامن پھیلا دیا رستم نے خاک اس میں ڈال دی مسلمان سفارت لوٹ آئی انھوں نے ملک ایران کی خاک اپنے سپہ سالار کو پیش کی اور کہا دراصل تو یہ ملک ایران ہی ہے۔

مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان ایک نہر تھی جسے پار کر کے ایرانی مسلمانوں سے جنگ کے لیے اتر آئے۔ایرانی لشکر کی تعداد دو لاکھ کے قریب تھی مسلمان تیس ہزار کے قریب تھے۔ جنگ کا میدان سجنے کو تھا۔حضرت عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہم ،حضرت عاصم بن عمرو رضی اللہ عنہم ، حضرت حضرت ربعی رضی اللہ عنہم ،حضرت عامر رضی اللہ عنہم لوگوں کو جہاد کے لیے ابھار رہے تھے۔عرب شعرا رزمیہ اشعار سے لوگوں کے جذبات کو مہمیز فراہم کر رہے تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم علیل تھے اس لیے وہ میدان جنگ کے قریب ایک پرانی عمارت کی چھت پر موجود تھے جہاں سے میدان جنگ کا سارا منظر نظر آتا تھا اگرچہ انھوں نے اپنی جگہ حضرت خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہم کو سالار جنگ بنا دیا تھا تاہم میدان جنگ کے اہم فیصلے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم نے خود ہی کیے۔

عرب کے معروف دستور جنگ کے مطابق پہلے انفرادی مقابلے ہوئے۔

ایرانی لشکر سے ایک شہزادہ نکلا جس کا نام ہرمز تھا وہ ایک طاقتور پہلوان تھا مسلمانوں کی طرف اُس کے مقابلے کے لیے حضرت غالب بن عبداللہ اسدی رضی اللہ عنہم نکلے۔حضرت غالب رضی اللہ عنہم نے میدان جنگ میں جاتے ہی دشمن کے ہتھیار چھین لیے اُسے زمین پر گرا دیا اس کے بعد گرفتار کر کے اپنے لشکر میں لے آئے۔

اس کے بعد ایرانی لشکر کی طرف سے ایک اور شہ سوار نکلا مسلمانوں کی طرف سے حضرت عاصم رضی اللہ عنہم اُس کے مقابلے کے لیے نکلے۔دونوں سواروں کے مابین مقابلہ ہوا۔ایرانی شہ سوار

جان گیا کہ وہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ پہ غلبہ نہیں پا سکے گا ایک خوف نے اسے گھیر لیا اُسے محسوس ہوا کہ وہ قتل ہو جائے گا وہ میدان جنگ چھوڑ کے بھاگ اٹھا۔حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اُس کے پیچھے لپکے۔وہ اپنی فوج کے قریب پہنچنے کو تھا کہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اُس کے گھوڑے کی پونچھ تھام لی اور اُسے گھسیٹتے ہوئے میدان کے بیچ لے آئے۔پھر انھوں نے دشمن کو نیچے گرا دیا اور تلوار نکال لی ایرانی شہ سوار زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے اُسے قتل نہ کیا بلکہ صرف گرفتار کرنے پر اکتفاء کیا۔

ایرانی لشکر سے ایک اور بہادر نکلا جس نے چاندی کا بڑ گرز اٹھایا ہوا تھا،مسلمانوں سے حضرت عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہ نکلے اور اس کو گرفتار کر کے اپنے لشکر میں لے آئے۔رستم اس صورت حال سے بہت پریشان تھا اُس کے تین اہم بہادر مسلمانوں نے گرفتار کر لیے تھے اور اس لیے اُس نے فوراً ہی بڑے حملے کا حکم دے دیا جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی۔

جنگ کی کمان براہ راست حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی اور حضرت خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ اُن کے احکامات لشکر اسلام کو منتقل کر رہے تھے۔چنانچہ انھوں نے بجیلہ قبیلے کو حکم دیا کہ وہ آگے بڑھیں اور اس حملے کو روکیں۔جب انھوں نے دیکھا کہ حملے کا دباؤ زیادہ ہے اور بجیلہ اسے نہیں سہار رہے تو انھوں نے بنی اسد کو پکارا کہ وہ بجیلہ کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔بجیلہ کا مقابلہ فیل سواروں سے تھا اس لیے اُن کا بہت کا نقصان ہو رہا تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا کہ حملے کا دباؤ اس قدر زیادہ ہے کہ بجیلہ اور بنو اسد کٹ کے رہ گئے ہیں تو انھوں نے بنو کندہ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔قبیلہ کندہ کے بہادر ایک شان سے آگے بڑھے اور ایرانی لشکر پر اس قدر شدید حملہ کیا کہ ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔رستم نے اپنے لشکر کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو پورے ایرانی لشکر کو جنگ میں جھونک دیا۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بھی تکبیر کہی اور مسلمان بھی پورے طور پر جنگ میں کود پڑے۔گویا دو پہاڑ تھے جو آپس میں ٹکرا گئے ہوں یا دو سمندر تھے جو ایک دوسرے میں جا ملے تھے۔دونوں فوجیں ایک

دوسرے میں غلط ملط ہوگئیں۔ ایرانی ہاتھی مسلمانوں کو سخت نقصان پہچان رہے تھے مسلمانوں نے اپنے گھوڑوں پہ جھولیں ڈال لیں تب ہاتھی ڈر کے بھاگے اور اپنے ہی لشکر کو نقصان پہنچانے لگے۔ ہاتھیوں کا سردار ایک سفید ہاتھی تھا۔ حضرت عمرو بن معدیکرب رضی اللہ عنہم نے اس کی سونڈ کاٹ دی تو وہ ایک طرف بھاگ اٹھا۔ دوسرے ہاتھی اس کے پیچھے بھاگے۔ تب مسلمانوں کو کھل کر شمشیر زنی کا موقع ملا۔ تاہم شام کا اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے جنگ کو کل تک ملتوی کر دیا گیا۔ یہ پیر محرم ۱۴ھ کا واقعہ ہے۔ دوسرے روز صبح کی نماز کے بعد اپنے شہدا کو قادسیہ کے میدان میں مشرقی سمت دفن کیا۔ شہدا کی تعداد پانچ سو سے زائد تھی۔ قبل ازیں زخمیوں کو مرہم پٹی کے لیے عورتوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

لڑائی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم کا قاصد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کے پاس اترا اور انھیں اطلاع کی کہ حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم اپنے لشکر کو لیے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ تب مسلمانوں نے اپنی صفیں سیدھی کیں اسی اثنا میں حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم کے مقدمہ الجیش کے ہمراہ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم میدان میں اترے۔ اُن کے ایک ساتھ ایک ہزار سوار تھے۔ انھوں نے سپہ سالار حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم سے اجازت لی اور میدان جنگ میں اتر کے ایرانی لشکر سے مبازر طلب کیا۔

ایران کی طرف سے بہمن جادویہ میدان میں اترا جس نے دریائے فرات کے کنارے مسلمانوں کو شکست دی تھی۔ طرفین کے ایک دوسرے پر حملہ کیا کئی وار ہوئے لوگوں کی سانسیں رکیں ہوئی تھیں۔ تاہم نتیجہ مسلمانوں کے حق میں نکلا اور حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم اس ایرانی سالار کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے جو ایرانی لشکر کا فخر تھا۔ بہمن جادویہ کے بعد بھی کئی ایرانی شجاع نکلے مگر ہر ایک مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

اس صورت حال سے پریشان رستم نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ زور شور سے لڑائی ہونے لگی اسی دوران حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم کے لشکر کا ایک اور حصہ آ پہنچا جس کی سربراہی حضرت ہاشم

بن عتبہ رضی اللہ عنہم کے ہاتھ میں تھی ۔ انھوں نے جنگ کا حال دیکھا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور اپنے لشکر کو پیچھے ہی روک لیا۔انھوں نے اپنے لشکر کو چھ حصوں میں تقسیم کیا اور ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد وہ ایک دستے کو میدان جنگ میں اتار دیتے جس سے ایرانی سراسیمہ ہو گئے۔

ہر دو گھنٹے بعد جنگ میں شامل ہونے والے تازہ دم دستوں نے ایرانی افواج کو زچ کر رکھا تھا۔ وہ مسلمانوں کو حاصل ہونے والی اس تازہ کمک سے پریشان تھے تاہم اُن کی مہیب عددی قوت انھیں سہارا دیئے ہوئی تھی اس لیے جنگ بغیر کسی وقفے سے سارا دن جاری رہی ۔حتیٰ کہ شام کا اندھیرا پھیل گیا مگر جنگ نہ رکی۔ جب اندھیرا اچھی طرح پھیل گیا تب دونوں لشکر ایک دوسرے سے جدا ہوئے ۔آج ایک ہزار مسلمان شہید ہوئے تھے جبکہ ایرانی مقتولوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ تھی ۔اگلے صبح ہی جنگ شروع ہو گئی یہ جنگ کا تیسرا روز تھا یہ بہت خونی جنگ تھی جس میں اس بات کا فیصلہ ہو جانا تھا کہ ایران کی پارسی ریاست رہتی ہے یا مسلمانوں کی اسلامی ریاست ۔جنگ زور شور سے جاری تھی ۔اس روز بھی ایرانیوں نے مسلمانوں پر پہلے ہاتھیوں سے حملہ کیا جنھوں نے مسلمانوں کو خاصا نقصان پہنچایا۔مسلمانوں نے اِس روز قدرے لمبے نیزے تھام رکھے تھے جن سے ہاتھیوں کی آنکھوں پر حملہ کرتے اور اندھے ہاتھی اپنے لشکر کو روندنے لگتے۔مسلمانوں نے درجنوں ہاتھیوں کو زخمی کیا جو ایرانی لشکر کے لیے وبال جان گئے تھے ۔چنانچہ ایرانیوں نے خود ہی ہاتھیوں کو پیچھے ہٹا لیا اس لیے کہ اُن کے بہت سے ہاتھی اندھے ہو چکے تھے۔

جنگ سارا دن جاری رہی خون سارا دن بہتا رہا۔کفر اور توحید کے نعرے سارا دن گونجتے رہے مگر جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہوا۔شام ہوئی تو دونوں لشکر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے مگر دو گھنٹوں بعد اچانک ہی مسلمانوں نے ایرانی لشکر پر حملہ کر دیا۔ایرانی اس بات کی توقع نہیں کر رہے تھے ۔تاہم اُن کی عددی برتری اُن کو ابھی تک سہارا دیئے ہوئی تھی۔اُن دِنوں رات کو جنگ نہیں ہوا

کرتی تھی مگر مسلمان آج ہی اس جنگ کا کوئی نتیجہ حاصل کرنا چاہتے تھے یا پھر شہید ہو جانا چاہتے تھے۔ ہر طرف تلواروں کی جھنکار تھی، نیزوں کی بوچھاڑ تھی، نعروں کی پکار تھی، شجاعوں کی للکار تھی الغرض کانوں میں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ صرف ایک احساس باقی تھا کہ جنگ ہو رہی ہے اور خون بہہ رہا ہے۔

یہ عجیب رات تھی اور عجیب جنگ تھی۔ جس میں نہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم کو پتا تھا کہ اب کیا ہو رہا ہے اور نہ ہی رستم جانتا تھا کہ میدان جنگ کی صورت حال کیا ہے۔ پھر شاید وہ رات کا تیسرا پہر تھا جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اپنے رب کے حضور سجدے میں گرے تھے کہ انھوں نے سنا کوئی کہہ رہا تھا ایرانیوں کے قلب پہ حملہ کرو اور رستم کو قتل کر دو مسلمان ایرانیوں پہ چھا چکے تھے وہ اِن کے قلب کے قریب تھے۔ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم کا دستہ لڑتے لڑتے رستم کے تخت کے قریب پہنچ چکا تھا۔ رستم چیخ چیخ کر اپنے لشکریوں کو احکامات جاری کر رہا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے سے دھوکا کھا گیا تھا اُس نے حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم کے دستے کو اپنا لشکر سمجھ لیا تھا۔ حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا اس بد بخت کو پکڑ واور قتل کر دو مسلمانوں نے رستم کے تخت کو گھیر لیا تھا رستم تخت سے اتر آیا اور مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ ایک دو زخم کھا کر فرار ہونے لگا تو ایک مسلمان مجاہد بلال بن علقمہ رضی اللہ عنہم نے اپنا نیزہ اس کی طرف پھینکا جو رستم کی کمر میں لگا۔ رستم نیزے سمیت نہر میں جا گرا۔ حضرت بلال بن علقمہ رضی اللہ عنہم اُس کے تعاقب میں تھے انھوں نے اسے گھسیٹ کر نہر سے نکالا اور اُس کا سر کاٹ کر اپنے نیزے کی انی پر رکھ کے بلند کیا اور رستم ہی کے تخت پر چڑھ کر با آواز بلند اعلان کیا۔ رب کعبہ کی قسم میں نے رستم کو قتل کر دیا ہے۔

ایرانیوں نے حضرت علقمہ بن بلال رضی اللہ عنہم کے نیزے کو ایک نظر دیکھا اور سر پہ پاؤں رکھ کر میدان جنگ سے بھاگ نکلے ایرانیوں کا مقدس جھنڈا مسلمانوں کے پاؤں میں پڑا تھا جس کو وہ درفش کاویانی کہا کرتے۔ اگلی صبح میدان جنگ میں کوئی ایرانی نہیں تھا جنگ کا فیصلہ ہو گیا تھا

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی تھی اور آگ پرستوں کو اُن کے سامنے سرنگوں کر دیا تھا۔

حضرت قعقاع رضی اللہ عنہم اور حضرت شرجیل رضی اللہ عنہم ایرانیوں کے تعاقب میں تھے انھوں نے بہت سے ایرانیوں کو بھاگتے ہوئے قتل کیا تھا۔ مدینہ میں خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کی بے چینی عروج پہ تھی۔ ہر روز وہ صبح سویرے ہی مدینے سے باہر نکل جاتے اور شہر سے باہر ایک جگہ ٹھہر کر قادسیہ کی طرف سے آنے والے قاصد کا انتظار کرتے۔ آخر ایک دن اُن کی مراد پوری ہوئی اور انھیں ایک شتر سوار دکھائی دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم فوراً ہی اُس کی طرف لپکے اور پوچھا؟

سوار کہاں سے آتے ہو۔

قادسیہ سے۔

سوار نے جواب دیا۔

کیا ہوا:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم کے لہجے میں بلا کی بے چینی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم سے نوازا ہے۔

شتر سوار نے جواب دیا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم اُس شتر سوار کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے اور اُس سے جنگ کی تفصیلات دریافت کر رہے تھے۔

اسی طرح وہ شہر مدینہ میں داخل ہو گئے تب شتر سوار کو معلوم ہوا کہ اُن کی سواری کے ساتھ بھاگنے والا شخص امیر المومنین ہیں تو وہ گھبرا گیا اور کہا:

آپ کو مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔

اُس نے اپنا اونٹ بٹھانے کا ارادہ کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے منع کر دیا اور کہا اسی طرح چلتے رہو مگر مجھے جنگ کی پوری تفصیلات فراہم کرو۔

اور وہ اسی طرح مسجد نبوی تک پہنچے۔

مسجد نبوی میں لوگ جمع ہو چکے تھے کہ لوگوں قادسیہ کے حالات جاننے کے لیے بے چین تھے۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مسلمانوں کی عظیم الشان فتح کی خوشخبری سنائی۔

لوگوں نے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

رستم نے خود ہی تو خاک فارس مسلمانوں کی جھولی میں ڈالی تھی چنانچہ قادسیہ میں جو میدان سجا اس کے بعد ایرانی کبھی ایسا میدان نہ سجا سکے بلکہ اب وہ اپنے شہنشاہ یزدجرد سمیت آ گے آ گے تھے اور مسلمان اُن کے تعاقب میں۔

دربار خلافت سے جونہی نئے احکامات جاری ہوئے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کے میدان سے کوچ کیا۔انھوں نے پہلے تاریخی شہر بابل کو زیروزبر کیا اس کے بعد کوثی فتح کیا اُن کی منزل ایران کا دارالحکومت مدائن تھی۔دریائے دجلہ کی بپھرتی لہریں بھی مسلمانوں کا راستہ نہ روک سکیں مسلمانوں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔دوسرے کنارے پر ایرانی سپاہ اس منظر کو حیرانی سے دیکھ رہی تھیں۔یزدجرد نے مسلمانوں کے دریا پار اترنے کی خبر سنی تو اپنے خزانوں سمیت شہر کو چھوڑ کر بھاگ نکلا مسلمان شہر میں داخل ہو گئے۔

نماز جمعہ کا وقت تھا جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یزدجرد کے محل قصر ابیض میں داخل ہوئے۔حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حکم سے یزدجرد کے تخت کو ہٹا دیا گیا اور مسلمان اپنے رب کے حضور عاجزی کے لیے جھک گئے۔حقیقت میں اُسی کا نام سب سے بڑا ہے۔

ایران کی فتح تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔

✡✡✡✡✡✡

دوسری طرف سلطنت رومہ بھی اپنے آخری آیام دیکھ رہی تھی۔انھی گذرے ایام میں جن کا تذکرہ فتح ایران کے ضمن میں کیا گیا مسلمانوں کے دیگر لشکر سلطنت رومہ کو نیچا دکھانے میں مصروف تھے۔چنانچہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم نے حمص کی فتح کے بعد قنسرین فتح کیا۔مسلمانوں کے لشکر مملکت روم کے مختلف صوبوں کو اسلامی حکومت کے زیر اثر لا رہے تھے۔ اہل روم بھی ایران ہی کی طرح مہیب عسکری قوت کے حامل تھے تاہم وہ اس عزم راسخ کا سامنا کرنے سے قاصر رہے تھے جو مسلمانوں کا سرمایہ تھا۔چنانچہ مسلمانوں نے حمص کے بعد حلب ،انطاکیہ،قیساریہ اور اجنادین جیسے اہم صوبے روم سے چھین لیے تھے۔یرموک کی جنگ کا تذکرہ پیچھے گزر چکا ہے مسلمانوں نے یرموک کے بعد اہل روم کو سکون کا سانس نہیں لینے دیا۔ وہ برابر سلطنت رومہ کے اندر اپنی فتوحات کے سلسلہ کو جاری رکھے ہوئے تھے۔مسلمانوں نے غزہ،سبط،نابلس،لد،عمواس،جبرین اور یافہ کے علاقے فتح کر لیے تھے اور اُن کی اگلی منزل بیت المقدس تھی رومیوں کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ انھوں نے بیت المقدس بغیر کسی جنگ کے مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا۔

چنانچہ ۱۸ھ تک حقیقت میں روم و ایران کی سلطنتیں خاک میں مل چکی تھیں اگر چہ اِن کے کچھ علاقے بعد میں بھی فتح ہوئے تاہم حقیقت یہی ہے کہ تاریخ روم و ایران کو بھلا چکی تھی اور اب صرف اسلام تھا جس کا تذکرہ اُس وقت تک باقی رہنا ہے جب اللہ تعالیٰ اس دنیا کو ختم کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔اس بیان کا مقصد مسلمانوں کی عسکری رفعت کو بیان کرنا تھا جب مسلمان قرآن کا پیغام لے کر دنیا کی طرف نکلے ہیں تو انھوں نے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ وہ جس پیغام کے حامل ہیں اُسے دنیا تک منتقل کرنا ہی سب سے افضل فعل ہے۔مسلمانوں میں جہاد کی روایت روز اول ہی سے قائم ہوگئی تھی اس لیے مسلمانوں نے اسلام کا پیغام لوگوں تک منتقل کرنے میں بے حد صبر و استقلال سے کام لیا بے حد قربانی دی اس کے بعد ہی دنیا اسلام کے نام سے روشناس ہوئی۔مغرب کے مستشرق نے مسلمان

مجاہدین کی جو گھناؤنی تصویر اپنے معاشروں کے سامنے پیش کی ہے اُس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان تو دنیا کی بھلائی اور دنیا کی خیر خواہی کے داعی تھے اور آج بھی ہیں۔ مسلمانوں کا مقصد ملک گیری ہرگز نہ تھا وہ اِن ممالک کے لوگوں کو اُن مصائب سے نجات دلانا چاہتے تھے جن میں عام آدمی مبتلا تھا۔ روم میں مذہبی تشدد نے لوگوں کا جینا دوبھر رکھا تھا تو ایران میں عوام شاہی ٹیکسوں کے اُس بوجھ تلے سسک رہے تھے جن کا بیان مشکل ہے یہی وجہ ہے جب انھوں نے مسلمانوں کے عدل اخلاق اور عمدہ اصولوں کو دیکھا تو آبادیوں کی آبادیاں اسلام قبول کرنے لگیں۔ اور اب انھیں اس سعادت سے روکنے والا بھی کوئی نہ تھا کہ اُن کے حکمران تو بھاگ چکے تھے۔ اُن حکمرانوں کی موجودگی میں یہ ممکن نہ تھا کہ اسلام کا پیغام عام آدمی تک منتقل کیا جائے اس لیے لازم تھا کہ سب سے پہلے روم و ایران کی عسکری قوت کا خاتمہ کیا جائے۔ روم اور ایران میں وہ نظام جبر تھا انسانیت جس کے نیچے سسک رہی تھی وہ نظام استحصال تھا جس نے شرف انسانیت کو یرغمال بنا رکھا تھا یہی وجہ ہے کہ اِن نظاموں کو نافذ کرنے والے حکمران بھاگ گئے تو انھی آگ پرستوں نے خود اپنی مقدس آگ پہ پانی ڈالا جو اس کو ہزار سال تک مقدس جانتے آئے تھے۔ روم کے کلیسے اور گرجے ویران ہو گئے تھے اور وہاں مسجدیں بننے لگی تھیں۔ یہی جہاد کا مقصد تھا اور یہی جہاد کا ثمر۔

✡ ✡ ✡

آج کے کالج و یونیورسٹی کے کسی بھی طالب علم سے پوچھ لیں کہ کیا وہ مسلمانوں کی سیاسی رفعت سے آگاہ ہے، کیا وہ جانتا ہے کہ وہ اس قوم اس امت کا فرد ہے جس نے ہزار سال تک دنیا پر حکومت کی ہے، کیا وہ جانتا ہے کہ بغداد اور غرناطہ میں سرشام سڑکوں پر عرق گلاب کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا تاکہ وہاں سے گزرنے والا شہری راحت محسوس کر سکے کیا وہ جانتا ہے کہ بغداد غرناطہ، اشبیلیہ قرطبہ اور بخارا میں کس قدر کتابیں اور کس قدر عالم تھے تو اُس کو کسی بھی بات علم نہیں ہوگا اس لیے اُس کو یہ سب پڑھایا نہیں گیا۔

مسلمانوں کی سیاسی رفعت

پہلی وحی کو اترے ابھی صرف نوے سال ہوئے تھے جب مسلمان روم وایران کی مہیب قوتوں کو روندتے ہوئے مغرب میں ہرکولیز کے ستونوں تک پہنچتے ہیں اور بحیرہ اسود اور سمرقند کے ساحل اطلس سے ہوتے ہوئے وسطی فرانس تک چھا جاتے ہیں۔ مشرق میں وہ سندھ کے ساحلوں پر اترتے ہیں اور مکران سے ہوتے ہوئے ملتان تک ہر حکمران کو روندتے چلے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پردہ فرماتے ہی اسلامی لشکروں نے اسلام کا ابدی پیغام دنیا تک منتقل کرنے کا ارادہ کیا اور وہ بڑی حد تک اس میں کامیاب رہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اصلاً ایرانیوں اور رومیوں کو شکست ہو چکی تھی اردن فتح ہو چکا تھا، شام فلسطین مصر اور طرابلس پر مسلمانوں کی یلغار جاری تھی۔ مغربی دانشوروں نے اس خدشے کا اظہار کیا اور بجا طور پہ کیا ہے کہ اگر مسلمانوں میں ایک اور عمر رضی اللہ عنہ پیدا ہو جاتا تو خطہ زمین پہ اسلام کے سوا اور کوئی مذہب موجود نہ ہوتا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں عراق، آرمینیا، آزربائیجان، کرمان، سیستان، خراسان ہرات، ہمدان

،دیلم ،رے،طبرستان،فارس اور مکران تک کے علاقے اسلامی قلم رو کے تحت آ چکے تھے اور یہ سب ایک مختصر عرصے میں وقوع پذیر ہوا تھا۔

مسلمانوں کو اہل کفر کے خلاف تلوار اٹھائے یعنی روزِ بدر کو گزرے ابھی بیس سال بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ مسلمانوں کی ریاست بائیس لاکھ مربع میل پہ محیط ہو چکی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت بمطابق (۲۴ھ ۔ 654ء) کے بعد بھی مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ تیزی سے جاری رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آخر میں مسلمان افواج چین پر حملے کر رہی تھیں اور یہ نہایت حیرت انگیز امر تھا کہ مسلمانوں کی افواج اپنے مرکز سے اس قدر دور پہنچ کر دشمنوں پر حملے کر رہی تھیں۔قبل ازیں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے لشکر قبرص،تونس، لیبیا،خوارزم، افغانستان،غزنی ،بلخ سمرقند، بخارا اور تخارستان فتح کر چکے تھے۔

اس کے بعد بنو امیہ کا دور شروع ہوتا ہے۔جس میں حضرت عقبہ بن نافع نے 683ء میں الجزائر اور مراکش فتح کیے۔خلیفہ ولید اول کے عہد میں قتیبہ بن مسلم نے وسط ایشیا کو کاشغر (چین) تک فتح کر لیا تھا۔اسی دور میں محمد بن قاسم 711ء کو ہندوستان کی سرزمین پہ اترے اور مکران کے ساحلوں سے ہوتے ہوئے دیبل سے ملتان تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا۔783ء ہشام کے دور میں مسلمانوں نے براعظم یورپ کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔اسپین اور پرتگال کو فتح کیا۔اشیا میں بھی مسلمان مصروف جنگ تھے اور انھوں نے سینا کے صحراؤں سے منگولیا کے جنگجوؤں کو نکال باہر کیا اور وہاں اسلامی پرچم لہرا دیا۔چنانچہ سنہ ۷۰۰ء سے ۱۲۰۰ء تک پانچ سو سال تک مسلمانوں نے طاقت،نظام حکومت،انداز و اطوار کی شائستگی ، معیار زندگی ، انسانیت پسندانہ قانون سازی،مذہبی بردباری،ادب،علم وفضل،سائنس،طب اور فلسفہ میں دنیا کی قیادت کی۔مسلمانوں نے جب مختلف ممالک فتح کیے تب وہ مفتوحین کے ساتھ عمدہ سلوک کرتے تھے۔وہ رحم دل تھے اور شاذ ہی کبھی انھوں نے ایسی سنگ دلی کا مظاہرہ کیا ہو جس کا مظاہرہ عیسائیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم پر قبضہ کے وقت کیا تھا۔جب مسلمانوں نے ایک ترقی یافتہ فقہ اور روشن خیال عدلیہ کو دنیا سے متعارف کرایا تب عیسائی

ابھی جہالت کے اندھیرے میں تھے اور وہ بدستور اُن قدیم اور جاہلی تصورات پہ قائم تھے جو کلیسا نے اُن کے لیے وضع کیے تھے۔ لوگوں کے درمیان عدل کرنے کے سلسلے میں اُن کے ہاں عجیب وغریب روایات پائی جاتی تھیں۔ کبھی وہ دونوں فریقوں کو شمشیر زنی کی دعوت دیتے کہ جو حق پہ ہوگا اُسے غلبہ حاصل ہو جائے گا، کبھی وہ لوگوں کو پانی میں پھینک دیتے کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو نہیں ڈوبے گا اگرچہ تیراکی نہ جاننے والا ڈوب ہی جاتا چاہے وہ چاہے وہ گنہگار ہوتا یا بے گناہ۔ اسی طرح اگر کسی پہ کوئی الزام لگ جاتا تو اُسے اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے دہکتے ہوئے کوئلوں سے گزرنا پڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کلیسا کے پجاریوں کے ایسے ڈرامائی انداز سے اکتائی ہوئی تھی اور جب مسلمانوں نے قرآن کا سیدھا سادھا اور دل کو موہ لینے والا پیغام دنیا کے سامنے رکھا تو دنیا کی اکثریت نے اسے قبول کیا۔

مسلمانوں کی فتوحات کا ذکر چل رہا تھا تو پہلی صدی ہجری میں اسلام کا پیغام پہنچانے والے مسلمان سالاروں نے ہندوستان کا رخ بھی کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہی اسلامی فوجیں مکران کے ساحلوں تک پہنچ چکی تھیں اور مسلمانوں نے ہندوستان کے کئی علاقوں کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا تھا۔ تاہم چالیس پچاس سال بعد محمد بن قاسم سندھ کے ساحلوں پہ اترے پہلے ارمن بیلا پھر دیبل کو فتح کیا اور وہاں کے ہندو راجہ راجہ داہر کو مسلمانوں کے خلاف عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ سندھ کے بعد محمد بن قاسم نے کئی اور شہر فتح کیے حتیٰ کہ ملتان تک کا علاقہ اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ آ گیا۔ مسلمان اِن علاقوں میں حکومت کرتے رہے تاہم ملک کا اکثر علاقہ اب بھی کافروں کے قبضے میں تھا۔ تب شمال سے مسلمان فاتحین کے حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور سلطان محمود غزنوی (971-1030ء) کے درمیان ہندوستان پہ سترہ حملے کیے اور ہر حملے میں فاتح رہا۔ (1021ء) تک اُس نے پنجاب پہ اپنا قبضہ مستحکم کر لیا تھا۔ ازاں بعد شہاب الدین غوری نے (1129ء) میں دہلی پر بھی قبضہ کر لیا اور ہندوستان میں ایک مضبوط مسلم ریاست کی بنیاد رکھی جسے قطب الدین ایبک التمش، غیاث الدین بلبن، علاوالدین خلجی، ابراہیم لودھی اور شیر شاہ سوری نے استحکام فراہم کیا۔ تاہم

مسلمانوں میں سے مغلوں نے سب سے زیادہ (331) سال حکومت کی۔ بابر نے (1526ء) میں شاندار مسلم اقتدار کی بنیاد رکھی جو (1857ء) کو انگریزوں کے دہلی پر قبضے کے بعد ختم ہوئی۔ اور یوں (711-1857ء) مسلمان پوری شان وشوکت کے ساتھ ہندوستان پر (1146) سال تک حکومت کرتے رہے۔(22*)

✡ ✡ ✡

مسلمان یورپ میں

عام طور پہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلم افواج نے زیادہ تر مشرقی علاقوں پہ یلغار کی اور انھیں ہی فتح کیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کی بیشتر اقوام اور خطوں پہ اپنی حکمرانی کو مستحکم کیا اور صدیوں حکومت کرتے رہے۔ مغرب میں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد سے ہی اسلامی فتوحات کا آغاز ہو گیا تھا۔ اُن کی فوجوں نے (672ء) میں روڈس فتح کیا جس سے یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات کا آغاز ہو گیا اموی خلفاء نے یورپ پر خصوصی توجہ دی اور اس کے بیشتر حصے کو فتح کیا۔ چنانچہ مسلم افواج نے (825ء) میں کریٹ فتح کیا اور وہ اُس ملک میں داخل ہو گئیں جسے ہم یوگوسلاویہ کے نام سے جانتے ہیں، کریٹ کے بعد (827ء) میں مسلمانوں نے سسلی کو بھی فتح کر لیا۔ (869ء) میں صقلیہ فتح ہوا اور مسلمانوں کی افواج مالٹا میں داخل ہو گئیں۔ (902ء) میں جزائر بلیارک اور (1015ء) میں مسلمانوں نے سارڈینیا بھی فتح کر لیا۔ قبل ازیں مسلمان پورے اسپین پر اپنا اقتدار مستحکم کر چکے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کے دیگر لشکر یورپ بھر میں کسی آسیب کی طرح چھا رہے تھے آٹھویں صدی ہجری میں کوئی مسلمانوں سے مقابلے کا خیال تک نہ کر سکتا تھا وہ جدھر کا رخ کرتے زمین اپنی وسعت کے باوجود اسلام کے دشمنوں پہ تنگ ہو جاتی اور مسلمان اسلام کا ابدی پیغام لوگوں تک منتقل کرتے رہے۔ چنانچہ مسلمان اسپین پہ آٹھ سو سال تک

قابض رہے، اسی دوران مسلمان پرتگال کو بھی فتح کر چکے تھے۔ مسلمان اپنے اقتدار کو مستحکم کرتے رہے، وہ سسلی پر 264 سال تک حکمران رہے، مسلمانوں نے یوگوسلاویہ پر 485 سال تک حکومت کی اور وہ دوسو سال سے زائد تک جنوبی فرانس پر بھی قابض رہے۔ سسلی صدیوں تک اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا۔ اس دوران مسلمان لشکروں نے اپنا رخ اٹلی کی طرف کیا انھوں نے (842ء) میں اٹلی کے پہلے شہر مسینا کو فتح کیا۔ (877ء) میں اٹلی کا دارالحکومت سیراکوز بھی فتح ہو گیا۔ اٹلی پر مسلمانوں کے حملے جاری رہے اور جلد ہی سارا اٹلی فتح ہو گیا اس کے بعد 170 سال تک مسلمان ہی اٹلی پر قابض رہے۔

تیرھویں صدی میں اناطولیہ میں سلطنت عثمانیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ایک صدی کے اندر اندر ہی عثمانی فوجوں نے ایشیا اور افریقہ کی طرح جنوب مشرقی اور وسطی یورپ میں دور دور تک مسیحی ممالک روند ڈالے۔ (1360ء) میں سلطان مراد اول نے یورپ کے بڑے حصے کو پھر سے اسلامی قلم رو میں شامل کر دیا۔ سلطان مراد اول کی فوجوں نے بلغاریہ، مقدونیہ، کوسوا اور سربیا کے علاقوں کو سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنا دیا۔ قدیم تہذیب وتمدن وعلم وفلسفہ کا گہوارہ یونان (1402ء) میں اسلامی فوجوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ پھر (1912ء) تک یونان کے اس سارے علاقے پر مسلمان ہی حکومت کرتے رہے۔ (1412ء) تک قسطنطنیہ رومی سلطنت کا دارالحکومت تھا مسلمانوں نے اگرچہ اس شہر پر کئی بار حملے کیے تھے مگر اپنے مضبوط دفاع اور قدرتی سمندری حصار کی وجہ سے وہ ابھی تک قسطنطنیہ کو فتح نہ کر سکے تھے۔

قسطنطنیہ کی وجہ سے عیسائیت ابھی تک مسلمانوں سے نبرد آزما تھی کہ یہ شہر عیسائیت کا گہوارہ تھا۔ تاہم یہ اعزاز سلطان محمد فاتح کے حصے میں آیا اور انھوں نے (1453ء) میں قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔ یہ شہر اب استنبول کہلاتا ہے اور ترکی کا قدیمی شہر ہے۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی فتح کے بعد یورپ کا رخ کیا اور (1451ء) میں جارجیا کو سلطنت عثمانیہ کے حصہ بنا دیا۔ اس سے پہلے ہی یونان اور البانیہ فتح کیے جا چکے تھے۔ سلطان محمد فاتح کے دور میں مسلمان افواج نے اہل وینس پر حملہ کیا۔ اہل

وینس نے صلہ کی درخواست کی جسے قبول کرلیا گیا اور سالانہ جزیے کی ادائیگی پر مسلمانوں نے اُن کے تاریخی شہر کو مسمار نہ کیا۔ اس کے بعد عثمانی فوجوں نے ہنگری آسٹریا، کو تاراج کیا۔ کریمیا (یوکرائین) اس علاقے کی اہم ترین ریاست تھی اُنھوں نے بھی مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور جزیہ دینے پر صلہ کرلی۔ سلطان محمد فاتح کی وفات کے بعد سلیمان القانونی جسے مورخ سلیمان عالی شان یا سلیمان ذیشان کے نام سے یاد کرتے ہیں نے عثمانی خلافت کے لیے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ سلطان سلیمان ذی شان نے (1521ء) کو بلغراد فتح کیا۔ (1530ء) میں ترک افواج آسٹریا میں داخل ہوگئیں۔ (1571ء) میں اسلامی فوجیں ماسکو میں داخل ہو گئیں۔ چنانچہ سلطان محمد فاتح کے دور میں عثمانی خلافت یورپ کے سترہ لاکھ مربع میل پر حکمران بن چکے تھے اور یہ محض آغاز تھا۔ اس لیے کہ سلیمان ذیشان کی فتوحات کے بعد مسلمان یورپ کے پینتیس لاکھ مربع میل پر قابض ہوگئے تھے۔ چنانچہ تب مسلمان تقریباً سارے یورپ پہ ہی قابض تھے اور پولینڈ، ہنگری، مشرقی آسٹریا، سربیا، بلغاریہ رومانیہ، یوگوسلاویہ، روس میں یوکرائن، ماسکو، مالڈووا، چیچنیا، جارجیا، داغستان، آرمینیا یونان، مونٹی نیگرو، کروشیا، البانیہ، کوسوا، سلاوینیا، مقدونیہ، ٹرانسلونیا اور بوسینیا ہرزی گووینا جیسے علاقے مسلمانوں ہی کے قبضے میں تھے۔

مشرق میں مسلمان ہندوستان، ایران، عراق، شام، مصر، افغانستان، ترکی، سمرقند تاشقند اور بخارا حکمران تھے۔ افریقہ میں الجزائر، طرابلس، نیوگنی، اور وہ علاقے جنھیں آج کل انڈونیشیا، ملاشیا اور تھائی لینڈ وغیرہ کہا جاتا ہے مسلمانوں ہی کے قبضے میں تھے۔ چنانچہ مسلمان کبھی عمر فاروقؓ کی قیادت میں تو کبھی بنی امیہ کی سیادت میں تو کبھی بنی عباس کی حکومتوں کی شکل میں دنیا پہ حکمران رہے تو کبھی امیر تیمور نے اہل کفر کو سرنگوں کیا اور کبھی صلاح الدین ایوبی کی صورت میں اہل نصاریٰ پہ غالب رہے۔ کبھی مغلوں اور کبھی ترکوں نے اسلام مخالف قوتوں کو زیرنگیں کیا۔ (23*)

✡ ✡ ✡

میراث علم

علم مسلمانوں کی میراث ہے۔علم خدا تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔علم شعورِ ذات حاصل کرنے کی واحد صورت ہے۔علم مقصد تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔علم تعمیر ذات کا پہلا پتھر ہے۔علم اقلیم عالم کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔علم پہچان کا پہلا زینہ ہے۔علم فراست کی بنیاد ہے۔علم کے بغیر منزل کا کوئی تصور نہیں۔علم اللہ کا فضل ہے۔علم تشنگی کو مٹا دیتا ہے۔علم سوالوں کو کھا جاتا ہے۔علم انسان پہ حیرت طاری کر دیتا ہے۔علم انسان کے دل کو خالق کے خوف سے بھر دیتا ہے۔علم جہل کی ضد ہے۔علم روشنی ہے۔علم دانش ہے۔علم دلیل ہے۔علم یقین ہے۔اور اسلام وہ واحد مذہب ہے کا جس کا آغاز بھی علم سے ہوتا ہے اور اختتام بھی علم پہ ہوتا ہے۔اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے علم کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیا ہے۔علم کے راستے روشنیوں سے مزین ہیں، اکتشافات اور انکشافات راہ علم کے سنگ میل ہیں۔جستجو اور تحقیق کا داعیہ انسان کی فطرت میں موجود ہے۔وہ ہمیشہ سے نہ جاننے سے جاننے کی طرف محو سفر رہا ہے۔اسرارِ کائنات پردہ علم میں مستور ہیں۔علم کی آخری منزل

تک کوئی نہیں پہنچا۔انسان کوجس شرف سے نوازا گیا ہے اسے عام فہم لفظوں میں عقل کہا گیا ہے۔ عقل جہاں ٹھہر جائے ،ششدر رہ جائے ،اسے فیصلہ کرنے میں دقت محسوس ہونے لگے تب علم وحی اُس کی رہنمائی کرتی ہے۔چنانچہ اگر کوئی شخص کوئی قوم اپنے علم اور تحقیق وجستجو کے بعد بھی خدا تک نہ پہنچے تو اُسے لازم ہے کہ وہ پلٹ کر دیکھے کہ اُس کی تحقیق کہاں ناقص رہی ہے۔

علم کا مالک تو دراصل اللہ ہی ہے اور اُس نے انسان کو پہچان ومعرفت کے لیے محدود علم سے نوازا ہے ۔یہی محدود علم انسان کو کبھی حقیقت کی وادیوں میں لیے پھرتا ہے کبھی انکار اور گمراہی کے لیے حجت بن جاتا ہے کہ دلوں کی کجی انسان کو منزل سے دور کر دیتی ہے پہچان کی راہوں سے روک دیتی ہے معرفت کی منزلوں پہ پردہ ڈال دیتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ علم بھی تو ایک آزمائش ہے۔نظم کائنات وہ حیرت گاہ ہے جس پہ نگاہ عمیق ڈالنے سے یا تو انسان خدا کی قدرت قاہرہ سے لرز جاتا ہے یا پھر باغی ہو جاتا ہے۔ہم جس دور میں زیست کر رہے ہیں وہاں علم کی زمام کار باغیوں کے ہاتھ میں ہے ۔وہ نظم کائنات کو بغور دیکھتے ہیں مگر اس نظم کے پس پردہ پوشیدہ حکمت کو نظر انداز کرتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے علم کی مسند پہ اترنے سے پہلے ہی اُن کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو چکا ہوتا ہے کہ یہ کائنات محض ایک مادی وجود ہے اور اس کے پیچھے کسی مدبر کی کوئی تدبیر کام نہیں کر رہی بلکہ یہ نظم کائنات اُس سلسلہ اسباب وعلل کا کرشمہ ہے جو ہزاروں لاکھوں سال سے ایک دوسرے کو جواز فراہم کر رہے ہیں۔

اگر چہ خالق کی ہدایت سے عاری مادر پدر آزاد زندگی کا تصور اہل مغرب نے اُس وقت اپنایا جب ستر ہویں اور اٹھارویں صدی میں انھوں نے کلیسا کے جبر سے نجات حاصل کی تاہم خالق کے وجود سے انکار پہ مبنی یہ نظریہ علم اور طریق زیست کوئی نیا نہیں ہے بلکہ ہزاروں سال سے انسان کے ہمراہ ہے ۔چنانچہ یونانی رومی یا مصری دیومالائیت ہو یا وادی فرات کے کنارے قائم بابلی یا سیمری روایات ہوں اُن کی فکر کا ماحاصل شعور ذات ہی رہا ہے۔تاہم اسلام کے آنے کے بعد مسلمانوں کی ہزار سالہ علمی رفعت نے انسان کو اس علمی نظریے سے متعارف کرایا کہ علم کی آخری منزل شعور ذات نہیں بلکہ

خالق کی معرفت ہے۔خدا کا جاننا ہے گویا دو متوازی نظریہ ہائے علم انسان کی تعمیر ذات اور شعوری پختگی کے لیے دستیاب ہیں۔علم کے راستے میں گامزن مسافروں پہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اِن دونوں نظریہ ہائے علم کا تقابلی جائزہ لے کر حقائق بنی نوع انسان کے سامنے رکھیں۔مسلمان علماء نے اس سلسلے میں جہد و سعی کی انتہا کر دی ہے اور اُن کی کاوشوں سے منظر بالکل واضح ہو گیا ہے۔اب اگر کوئی آنکھوں والا اندھا ہو تو اس کا مقدر ہے۔ورنہ قرآن کی موجودگی میں منظر کا دھندلا ہونا ممکن ہی نہیں۔آج کا مغرب آنکھوں والا اندھا ہے اس لیے وہ حقیقت کی جستجو سے گریزاں ہے۔اُن کی اس بدقسمتی کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُن کے نزدیک علم سے مراد یہ ہے کہ پہلے انھوں نے ایک نظام زیست وضع کیا جس کی بنیاد لادینیت پہ رکھی اُس کے بعد عقل کو پکارا کہ اس کے لیے دلیل فراہم کرے اور عقل نے اُن کو جیسی کیسی بھی تھی بہر حال دلیل فراہم کر دی اور اُس دور کے فلاسفہ نے اُس پہ علمی ملمع کاری بھی کر دی جس کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔

چنانچہ اُن کے نزدیک جس علمی نظریہ علم کو دلیل حاصل ہو گئی وہ صحیح ہے، چاہے اصلاً اور فی الحقیقت وہ اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی ہو علمی نوعیت کا ہو یا عمومی نوعیت کا ہو اس امر سے بحث نہیں کہ وہ نظریہ علم فی نفسہ ثقاہت یا صحت کے معیار پہ پورا بھی اترتا ہے یا نہیں انھیں بس دلیل سے مطلب ہے۔اُن کے مقابل اسلام کا نظریہ علم نہایت ارفع ہے۔اسلامی تصور زیست میں جس عمل کو خالق کی طرف سے دلیل فراہم کر دی گئی وہی فعل افضل ہے اور جس عمل سے خالق نے رک جانے کا حکم دیا اُس سے رک جانا ہی افضل ہے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسلامی نظام زیست اور اسلامی نظریہ علم کے ماتحت ہے۔اسلام میں بحث نہیں، خالق نے کہا سور نہیں کھانا تو چاہے ہمیں اس کے لیے کوئی بھی دلیل دستیاب نہ ہو ہم سور نہیں کھائیں گے۔شراب کے متعلق ہزار دلیلیں بھی اُس ایک دلیل کے عوض رد کر دی جائیں گی جس میں شراب نہ پینے کا حکم دیا گیا ہے۔اسلام انسان کو عقل استعمال کرنے کا حکم دیتا ہے مگر وہ عقل کی منزل کا تعین بھی کرتا ہے کہ عقل کے ذریعے کائنات میں پھیلی خالق کی انگنت نشانیوں پہ غور کرے اور خالق کائنات کی معرفت حاصل کرے۔اللہ تعالیٰ نے جہل کو شدید ناپسند

فرمایا ہے اور جو لوگ عقل کو استعمال نہیں کرتے انھیں جانور قرار دیا ہے۔

قرآن حکیم میں انسان کو جابجا تدبر و تفکر کی نصیحت کی گئی ہے مثال کے طور پہ فرمایا کہ:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانفال 22/8)

ترجمہ؛

”یقیناً خدا کے نزدیک بدترین قسم کے جانور وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے“۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوا کہ!

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ الحج 46/22)

ترجمہ؛

”کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں، جس سے اِن کے دل ایسے ہو جائیں کہ وہ اِن سے سمجھ کا کام لینے لگیں یا اِن کے کان ایسے ہو جائیں کہ وہ اِن سے سننے کا کام لینے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ یہ دل ہیں جو سینے کے اندر اندھے ہو جاتے ہیں“۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

''اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤا ط اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ○

القرآن الحکیم (سورۃ فاطر 28/35)

ترجمہ؛

''اللہ کے بندوں میں سے وہی اس سے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں، بے شک اللہ غالب اور ڈرنے والا ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

آگے ارشاد ہوا:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ○ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ آل عمران 190-191/3)

ترجمہ:

''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور دن اور رات کے باری باری آنے میں اُن ہوش مند لوگوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور کرتے ہیں (تو وہ بے اختیار پکار اٹھتے

ہیں) کہ پروردگار تو نے یہ سب کچھ (کائنات) فضول اور بے مقصد نہیں بنایا اور تو پاک ہے اس سے کہ تُو کوئی عبث کام کرے پس اے رب تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے''۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات میں اسلام کے ذوقِ تجسس کو نمایاں کیا گیا ہے جاہلیت کی مذمت کی گئی ہے اور اہل علم کے درجات بیان کیے گئے ہیں۔ انسان کو کائنات کی ماہیت سمجھنے اور اس پر غور فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اُس کو سفر کرنے کی تلقین کی گئی ہے تا کہ وہ تختہ ارض پہ پھیلے آثار کے مشاہدے سے سابقہ اقوام کی اِن غلطیوں کا ادراک حاصل کر سکے جس کی بنا پہ انھیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب نہیں جس کی ابتدا اس دعوت سے ہوئی ہو۔

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الَّذِىۡ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۝ اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ ۝ الَّذِىۡ عَلَّمَ الۡاِنۡسَانَ مَالَمۡ يَعۡلَمۡ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ العلق 1-5/96)

ترجمہ؛

''پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمھارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

✡✡✡✡✡✡

قرآن حکیم کی اِن آیات کے مطالعہ کے بعد دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو علم کی طرف راغب کرنے میں کتنے مستعد ہیں۔صحابہ نے بیان کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی کسی چیز پر اتنا تفاخر نہیں کیا تھا جتنا اس بات پہ کیا کرتے کہ انھیں علم منتقل کرنے والا بنا کر پیدا کیا گیا ہے وہ علم جو انسانی معرفت کے لیے ضروری تھا۔چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ:

- نبی اکرم ﷺ نے فرمایا مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے"۔
- نبی اکرم ﷺ نے فرمایا علم حاصل کرو مہد سے لے کر لحد تک۔
- نبی اکرم ﷺ نے فرمایا عالم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے افضل ہے۔
- نبی اکرم ﷺ نے فرمایا علم عبادت سے افضل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے یہ فرامین علم سے محبت کی مہک لیے ہوئے ہیں۔جس سے رسول اللہ ﷺ کی علم سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔چنانچہ غزوہ بدر میں جب مسلمانوں نے ستر قریشیوں کو گرفتار کیا تو نبی اکرم ﷺ نے اُن سے کہا تم میں سے جو پڑھے لکھے ہیں وہ ہمارے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں تو انھیں رہا کر دیا جائے گا۔اور ایسا ہی ہوا کہ انھوں نے اہل مدینہ کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا تو اُن کو رہا کر دیا گیا جبکہ دیگر قریشیوں کو فدیہ لے کر چھوڑا گیا۔ چنانچہ قرآنی احکامات اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات کی روشنی میں مسلمانوں نے علم دوستی کو اپنا لیا۔علم کا ذوق شوق ہر طرف چھا گیا اور مسلمان دینی فریضہ سمجھ کر علم حاصل کرنے لگے۔حقیقت یہی ہے کہ مسلمانوں اور اسلام ہی نے دنیا کو علم کی دولت کی طرف راغب کیا۔ورنہ دنیا تو جہالت کے اندھیروں میں ڈوبی پڑی تھی۔اسلام نے علم حاصل کرنا مسلمانوں پر فرض کر دیا۔اسلام نے دنیا کو وہ تہذیب وتمدن عطا کیا جس کی بنیاد میں علم کی روشنی تھی۔دنیا میں اور کوئی دین ایسا نہیں

جس نے علم کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔ چنانچہ احکامات قرآن کی روشنی میں عہد رسالت میں ہی مسلمان علم کی طرف رغبت اختیار کر چکے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں علم کو دور دور تک پھیلانے کا اہتمام کیا گیا اور بدوی عربوں تک کے لیے قرآن حکیم کی تعلیمات کو لازمی قرار دے دیا گیا۔ تب مسلمان اُس عسکری قوت کے حامل تھے جس نے دنیا کے جغرافیہ کو زیروزبر کر کے رکھ دیا تھا۔ روم اور یران کی مستحکم تہذیبیں خاک میں مل چکیں تھیں اُن کے بادشاہ بھاگ گئے اُن کی افواج مسلمان مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہو گئیں اور عام لوگوں نے اسلام کی طرف رغبت اختیار کر لی۔

چنانچہ کل جس کو ملک عجم کہاں جاتا تھا وہاں جب اسلام کی روشنی سے اجالا ہوا تو انھی ممالک میں اسلام کے اُن مشاہیر نے جنم لیا جنھوں نے علم کے نئے نئے در وا کیے۔ مسلمان حصول علم کے لیے دور دراز کا سفر کرتے اور اس راہ میں آنے والی ہر مشکل کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ۔ بیان کیا گیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک تابعی شام سے مدینہ کو عازم سفر ہوئے اور اُن کا مقصد صحابہ کرام سے تشہد سیکھنا تھا۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ مدنی نے سنا کہ مصر کے ایک شخص حضرت عبداللہ جہانی مصری نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث سنی ہے جسے وہ روایت کرتے ہیں تو انھوں نے ایک فربہ اونٹ خریدا اور مدینے سے مصر کی طرف رخت سفر باندھا۔ ایک ماہ کے پر صعوبت صحرائی سفر کے بعد وہ مصر پہنچے اور حضرت عبداللہ جہانی مصری سے حدیث سنی۔

مسلمان اسلام کا پیغام لے کر مدینہ سے نکلے اور انھوں نے اس راہ میں آنے والی ہر مشکل کو دور کیا۔ انھوں نے جہاد کیا اور اپنے خون کی روشنائی سے اُسلام کے ابدی پیغام فلاح کو جہان عالم کے ہر افق پہ لکھ دیا۔ مسلمان سیاسی طور مستحکم ہو گئے تو انھوں نے دنیا کو علم کی روشنی سے نوازنے کا تہیہ کیا ۔ ہمارے عہد کے ایک مشہور مغربی مفکر رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) نے مسلمانوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب ''تعمیر انسانیت'' (

(The Making of Humanity) میں لکھا ہے کہ!

''مسلمان بادشاہ علم پرست تھے۔ وہ علم کے کسی پہلو کو نظرانداز کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے اشیاء کی ماہیت کو جاننے کا عزم کیا اور علم کے نئے ابواب رقم ہونا شروع ہوئے۔ انھوں نے ہر چیز کو تحقیق و تفتیش کی کسوٹی پر پرکھا علمی سطح پر اسی سائنسی طرز فکر نے بعد میں اہل یورپ کو متاثر کیا اور یوں اس دور کا آغاز ہوا جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے مسلمان بادشاہوں کی علم سے دلچسپی کی بنا پہ اسلامی علوم اور سائنس کی حیرت انگیز نشو نما ہوئی۔ مسلمان فرمانروا تہذیب کو فروغ دینے کی دلی آرزو سے مغلوب ہوکر بڑی لگن سے اس میں منہمک رہتے۔ نہ کبھی اس سے پہلے نہ کبھی اس عہد کے بعد دنیا نے وہ حیرت انگیز منظر دیکھے کہ عظیم ترین مسلم مملکت کے حکمرانوں کا پورا کا پورا نظم علم سے والہانہ محبت کرتا ہو۔ تحصیل علم کے لیے وہ کوئی بھی قربانی دینے کے لیے تیار تھے وہ اپنے محلوں اور دیوان خانوں کو چھوڑ کر کتب خانوں اور رصد گاہوں میں وقت گزارنے کو ترجیح دیتے۔ حکمران علمی مجالس کو پسند کرتے۔ دور دور سے اہل علم کو اپنے ہاں مدعو کرتے اُن کی تعظیم کرتے۔ یہ مسلمان حکمرانوں کی علم دوستی ہی تھی کہ کتابوں کے قلمی نسخوں سے لدے کارواں بخارا سے دجلہ اور مصر سے اندلس کی طرف رواں رہا کرتے۔ بادشاہوں کے وفد زر کثیر ہمراہ لیے قسطنطنیہ سے ہندوستان تک محو سفر رہتے اور اگر انھیں کوئی کتاب دستیاب ہو جاتی تو وہ اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے۔ کئی بار مسلمانوں نے مفتوحین سے جزیہ کے بجائے عالم طلب کیے اُن سے کہا اپنی کتابیں ہمیں دے دو تمھارا جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ مسلمان بادشاہ معروف ریاضی دانوں لسانیات کے ماہروں اور علم طب کے جاننے والوں کو سونے میں تول کر حاصل کر لیا کرتے تھے''۔

✡✡✡✡✡✡

بریفالٹ (Robert Briffault) مزید لکھتا ہے کہ!

"ہماری سائنس اس بات کے لیے عربوں کی مرہون منت نہیں کہ انھوں نے چونکا دینے والے اکتشافات یا انقلابی نظریے پیش کیے۔ ہماری سائنس اس سے کہیں زیادہ عربوں کی زیر بار احسان ہے کہ اس کا وجود ہی اِن کی بدولت ہے۔ یہ قریب قریب یقینی بات ہے کہ یورپ کی سرزمین پر عربوں کی سیادت اور اُن کے اثر ونفوذ کے بغیر یورپ کی جدید تہذیب رونما نہ ہوسکتی تھی"۔

✡✡✡✡✡✡

یہ ایک مغربی مورخ کا بیانیہ ہے جس سے اُس عظمت کا احساس جنم لے رہا ہے جو علم کی دنیا میں مسلمانوں کا مقدر بنی۔ مسلمانوں کی علم سے دلچسپی اور شوق کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ بہت سے علماء کی مجالس میں ہزاروں لوگ شرکت کرتے اور علم کی باتیں سیکھتے۔ اس طرح کی مجالس شہر شہر منعقد کی جاتی تھیں۔ دور تک پھیلی وسیع اسلامی ریاست کا علم کے معاملے میں ایک ہی مزاج تھا۔ چنانچہ بغداد ہو یا کوفہ، بصرہ ہو یا موصل، واسط ہو یا سامرہ، دمشق ہو یا حمص، سقلان ہو یا رے۔ اصفہان ہو یا ہمدان، کرمان ہو یا شیشان، نیشا پور ہو یا ہرات، بلخ ہو یا بخارا، طبرستان ہو یا بجستان قزوین ہو یا خوارزم، جرجان ہو یا بحرین، بلادِ یمن ہو یا مصر، تیونس ہو یا مراکش، قرطبہ ہو یا غرناطہ اشبیلہ ہو یا طلیطلہ علم ہی کا بول بالا تھا۔

مسلمان فاتحین نے جہاں جہاں اپنے قدم رکھے ہزاروں سال بعد بھی ان کی خوشبو وہاں محسوس کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے ہر ملک میں خوبصورت عمارتوں، رنگا رنگ پارکوں، سڑکوں، باغات، پلوں تالابوں کی تعمیر کی، اور مسافروں کے لیے سراؤں اور راستوں میں تازہ پانی کے کنوؤں کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا اور اپنی علم دوستی کی وجہ سے ہر جگہ مدرسوں اور کتب خانوں کے جال بچھا دیئے۔ دنیا بھر

سے علمی اثاثوں کی کھوج کی اور ہر موضوع پہ علمی شاہپارے جمع کیے۔انھیں جہاں بھی علم کی روشنی نظر آ ئی یا کسی عالم کا پتہ چلا اسے دربارِ خلافت میں بلا کراس کی تحسین اوراعانت کی اوراسے انسانی فلاح کے لیے علم کی خدمت پہ لگا دیا۔مسلمان علماء نے دنیا بھر کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا۔یونان کے جامد فلسفے کی تشریح کچھ اس طرح کی کہ وہ انسانی فلاح اور ترقی میں کام آیا۔اور یہ اسی کا ثمر تھا کہ لوگ تمام تہذیبوں اور مذاہب کے تقابلی جائزے کے قابل ہوئے اوران پراسلام کی حقانیت روز روشن کی طرح عیاں ہونے لگی۔اسلام علم وعمل کا دین ہے اوراس کی الہامی کتاب کا بنیادی موضوع انسان ہے۔وہ انسانی زندگی میں علم کی افادیت پہ زور دیتا ہے کہ جب تک کسی امر پہ مستحکم یقین نہ ہواس پہ عمل میں وہ رنگ وہ جذبہ وہ خود فراموشی وہ والہانہ پن مفقود ہوتا ہے جو مطلوب ومقصود ہے اور کسی امر پہ مستحکم یقین کی دلیل صرف راہ علم ہی سے مہیا ہوسکتی ہے۔چنانچہ قرآن کریم نے بار بار علم کی عظمت کو بیان کیا ہے اور خود نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات سے مسلمانوں کے دلوں میں علم کی محبت کا وہ جذبہ بیدار فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے اپنی زندگیاں علم کے لیے وقف کر دیں اورانھوں نے اپنی مادی ضروریات سے بے نیاز ہوکر علم کے اس رستے کو چنا جس کے دوسرے سرے پہ یقینی فلاح کا کامل یقین ان کو حاصل تھا۔

انھوں نے الہامی نور کے علم سے اپنے سینوں کو منور کیا۔قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ کو یاد بھی کیا،تحریر بھی کیا اور آنے والوں تک حفاظت سے اسے منتقل بھی کیا گیا۔چنانچہ قرون وسطیٰ میں جب اہل مغرب سرتاپا جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے تواس وقت امت مسلمہ اپنے علمی سیاسی اور تہذیبی عروج کو چھورہی تھی۔ان کے ہاں ہر قسم کے علوم وفنون ترقی کی راہ پہ گامزن تھے۔وہ جہاں علمی رفعتوں کی بلندیوں پر تھے وہیں سماجی اور معاشی میدانوں میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔کہتے ہیں کہ جب مامون الرشید کا عہد خلافت تھا تو صرف بغداد میں مساجد کی تعداد تیس ہزار تھی۔اس سے مسلمانوں کا اپنی تہذیب اوراساس کے ساتھ والہانہ لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔انہوں نے شہر بغداد میں ایک دارالحکمت بنوایا جہاں دنیا بھر کے اہل علم موجود رہتے۔جن کا تعلق ایران،عراق،شام،مصراور

ہندوستان سے ہوتا۔ وہ دنیا بھر کے علوم کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے اور اسے مفید عملی علوم میں منتقل کرتے تا کہ اس سے انسانیت کی فلاح کا کام لیا جا سکے۔ اس دور میں عوام بہت خوشحال تھے اور ان کے عمومی مسائل کے تدراک کے لیے حکومتی سطح پر نہایت اعلیٰ انتظامات کیے جاتے۔ اور ان کو ہر قسم کی سہولیات فراہم کی جاتیں معروف مغربی تاریخ دان ''Well deurant'' کے مطابق بغداد کے مسلمانوں کی شہری سہولیات کا یہ عالم تھا کہ ہر سہ پہر کو شہر بھر کی سڑکوں پہ گلاب اور کیوڑے کے عرق کا چھڑکاؤ کیا جاتا تا کہ گذرنے والے راحت محسوس کریں اور عبدالرحمان سوم کے قرطبہ کا یہ حال تھا کہ شہر میں صرف لائبریریوں کی تعداد سو سے زیادہ تھی پانچ لاکھ کی آبادی والے اس شہر میں سات سو مساجد، تین سو لائبریریاں، تین سو حمام، ایک لاکھ تیرہ ہزار مکانات تھے اور اکیس مضافاتی بستیاں تھیں جن میں عموماً امراء کی رہائش گاہیں ہوا کرتیں اس کے علاوہ شہر میں سینکڑوں باغات تھے۔ یہ مسلمانوں کی علم دوستی ہی تھی جس کی وجہ سے خطہ ارض پہ مسلمان ہی وہ واحد قوم تھے جن کو متمدن قرار دیا جا سکے۔ جن کے پاس نہ صرف ایک آفاقی دین کی تعلیمات تھیں بلکہ ان کی سماجی ،معاشی، سیاسی اور علمی برتری بھی روز روشن کی طرح عیاں تھی۔

اہل مغرب کی جہالت کے برعکس جہاں غسل کرنے تک کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا جاتا تھا مسلمان ہر طرح کے علوم سے بہرہ ور تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ یزید اول کے بیٹے خالد نے دمشق میں ایک بہت بڑا دارالترجمہ قائم کیا جس کی نگرانی پر ایک پادری مامون تھا جہاں دن رات تصنیف و تالیف کا کام جاری رہتا۔ خود خالدؒ کا شمار بھی اہل علم میں کیا جاتا ہے کہ ابن الندیم نے اپنی کتاب " **الفہرست** " میں اس کی چار کتابوں کے حوالے دیئے ہیں۔ عباسی خلفاء نے کتابوں کی دنیا بھر میں تلاش کے لیے بھاری خرچ پر ایک مہم بھیجی جو اپنے ساتھ کتابوں کے انبار لے کر لوٹی۔ ان کے ہاں ہر طرح کے اہلِ علم کی بہت قدر و منزلت تھی سو اہل علم بھی دربار خلافت کا ہی رخ کرتے۔ چنانچہ ان کے ہاں دن رات علمی مباحث اور ان کی عملی تفسیر کی روایت پائی جاتی ہے اور اہل علم کا گروہ ہر لحظہ نامعلوم سے معلوم کی سمت گامزن رہتا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے (Thalees 640 ق م) سے لے کر

بطلمیوس 151ء) تک کے علوم عربی زبان میں منتقل کر دیئے۔ جالینوس اور ارسطو کے بنیادی افکار پہ شرحیں لکھیں اوران کی کمزوریاں بیان کیں اور تنقید کے نئے اسلوب وضع کیے۔انھوں نے سائنس کے میدان میں انمول خدمات سرانجام دیں۔نہایت دقت نظراور تحقیق سے ستاروں کے مقامات اور ان کی نقل وحمل کی تفصیلات مرتب کیں۔اول اول زمین کی جسامت اور ہیت کا درست تصور پیش کیا ۔ستاروں سیاروں اور کہکشاؤں کے اس انبار کی طرف توجہ کی جس کی ایک ایک حرکت کسی خالقِ مطلق کی فرمانروائی پہ دلیل کی طرح ہے۔کئی قسم کے اصطرلاب بنائے اور رصد گاہوں کو ترتیب دیا گیا تاکہ نظام شمسی پہ علمی نگاہ ڈالی جا سکے۔انہوں نے بارود ایجاد کیا اگرچہ آج اہل مغرب اس کو اپنے کھاتے میں ڈالنے پہ مُصر نظر آتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ راجر بیکن کے دعوے سے سو سال قبل ہی مسلمان بارود کے استعمال سے واقف تھے اور انھی لوگوں نے بنی نوع انسان کی اس مادی ترقی کی بنیادیں استوار کیں جس پہ آج مغرب اپنی اجارہ داری تصور کرتا ہے۔یہی وہ علم دوستی تھی جس کا احوال''Well durant'' یوں بیان کرتا ہے کہ قرطبہ سے سمرقند تک ہر طرف علم ہی علم تھا, روشنی ہی روشنی تھی۔

ہر جگہ ہزاروں درس گاہیں تھیں جس کی بنا پر شہر کی سڑکوں پر ہر وقت جغرافیہ دانوں مورخوں،منجموں، فقیہوں، محدثوں اور طبیبوں کا ہجوم لگا رہتا۔گیارہویں صدی میں اٹلی کا ایک پادری(Peter) اپنی علمی پیاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب قرطبہ گیا تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ حکمران بھی راہ علم ہی کے مسافر ہیں۔ چنانچہ وہ بتاتا ہے کہ خلیفہ کے محل میں اس کی ذاتی لائبریری میں چار لاکھ سے زائد کتابوں نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر کے رکھ دیا۔اس نے دیکھا کہ محل کا ایک حصہ اُن لوگوں کے قبضے میں ہے جو کتابوں کی جلد سازی کرتے تھے،ان میں نقاش بھی تھے اور کاتب بھی ان میں مترجم بھی تھے اور مولف بھی غرض ایک پورا محکمہ قائم تھا جو دنیا بھر سے قیمتی کتابیں لا کر خلیفہ کی خدمت میں پیش کرتا اور انعام و اکرام سے نوازا جاتا۔جامعہ قرطبہ جو عربوں کی قدیم ترین یونیورسٹی تھی جس کی بنیاد عبدالرحمان سوم نے رکھی اس میں ہر ملک ہر نسل اور ہر مذہب

سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنی علم کی پیاس کو بجھاتے۔ یونیورسٹی میں جدید طرز تعلیم کی طرح مختلف شعبہ جات کے انتظامات الگ الگ تھے اوران میں قرآن حکیم، حدیث فقہ، فلسفہ، ریاضی، علم ہیت اور دیگر علوم کے شعبہ جات شامل تھے۔ ایک اور شعبہ اجنبی زبانوں کا بھی تھا جہاں یونانی، عبرانی، لاطینی، سنسکرت اور فارسی کی تعلیم دی جاتی۔ تیراندازی گھڑسواری اور تیغ بازی کے علیحدہ شعبہ جات تھے۔ یونیورسٹی میں یورپ ایشیا اور افریقہ سے تعلق رکھنے والے کثیر تعداد طلبا ہمیشہ موجود رہتے۔ جامع کی لائبریری میں چھ لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود تھیں جن کی فہرست ہی چوالیس جلدوں پر مشتمل تھی۔ مامون الرشید کی زندگی علمی حوالے سے بہت روشن ہے اور تاریخ کے صفحات اس کی علم دوستی پہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار مامون الرشید نے قیصر روم کے دربار کے کسی عالم کی شہرت سنی تو انہوں نے قیصر روم کو لکھ بھیجا کہ اس عالم کی دربارِ خلافت میں تم سے بہتر پذیرائی کی جائے گی اس لیے تم اسے ہمارے ہاں بھیج دو۔ قیصر روم نے مامون الرشید سے اس کی قیمت طلب کی تو مامون الرشید کے قاصد نے کہا کہ وہ منہ مانگی قیمت پر بھی اس عالم کو حاصل کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ چالیس من سونے کے عوض سودا طے پا گیا اور قیمت ادا کر کے اس عالم کے علم کو وہ پذیرائی بخشی گئی کہ تاریخ کے صفحات اس واقعہ کا ذکر کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔

ایک اور مسلمان سالار سلطان محمود غزنوی کی علم دوستی بھی بہت شہرت کی حامل ہے کہتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کو جب علم ہوا کہ خوارزم شاہ کے دربار میں البیرونی اور ابن سینا جیسے علماء موجود ہیں تو اس نے اپنے قاصد خوارزم شاہ کی طرف روانہ کیے اور اسے کہلا بھیجا کہ ان دونوں علماء کو میرے حوالے کر دو ورنہ میں تم پہ حملہ کردوں گا اور تم جانتے ہو کہ تم مجھ سے مقابلے کی سکت نہیں رکھتے۔ محمود کے دربار میں چار سو سے زائد علماء محقق اور شعرا موجود تھے۔ ایک مغربی مورخ پروفیسر" Brown "تو مبالغے کی حد بھی پھلانگ گیا وہ کہتا ہے کہ محمود غزنوی علماء کو طاقت کے زور پہ اغوا کیا کرتا تھا۔ اپنے اسی ذوق جنوں کی وجہ سے مسلمانوں نے تمام عالم کے انسانوں کے لیے علم کے وہ اثاثے چھوڑے جن پر بجا طور پہ فخر کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں نے جدید سائنس کو بنیاد فراہم کی۔ مذہب کو فلسفے کے

الجھاوے سے الگ کیا۔لوگوں کو نہ صرف حق کی راہ دکھائی بلکہ انھیں وہ صاف ستھری تہذیب عطا فرمائی جس میں عورت کی قدر تھی ،مرد کا وقار تھا، ایمانداری تھی ، اطمینانِ قلب تھا، امن تھا، سچ تھا، عدل تھا، اور یہ سب انھوں نے اس بنا پہ دنیا کو منتقل کیا کہ وہ وقت کے تمام علوم پر حاوی تھے ۔ مسلمانوں نے اگرچہ اپنے دینی علوم کو بھی بہت وسعت عطا کی تاہم ساتھ ہی وہ سماجی اور فطری علوم میں بھی پوری طرح مشغول رہے ۔ چنانچہ مسلمانوں نے نہ صرف دینی علوم میں فقہ حدیث ، تفسیر ، سیرت ، علم الرجال ، تاریخ ، لغت نگاری اور صرف ونحو میں کمال حاصل کیا بلکہ انھوں نے فطری علوم جیسے کیمیا ،طبعیات ، حیاتیات ، ارضیات ریاضی ، فلکیات ، طب اور جغرافیہ میں بھی میں علم کے نئے نئے دروا کیے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جب مسلمانوں نے دنیا پر قبضہ کرلیا تو وہ علم کی طرف متوجہ ہوئے ۔ ہزاروں لوگ علماء کی محفل کے مشتاق ہوتے ۔

اہل علم کو وہ عزت وتکریم عطا کی جاتی جو حکمرانوں کو بھی حاصل نہ تھی ۔ بلکہ خود حکمران آگے بڑھ کے اہل علم کو اپنے ساتھ بٹھاتے ۔ پورے عالم اسلام میں یہ بات رواج پا گئی تھی کہ ہر مسجد کے ساتھ مدرسہ ہوا کرتا جہاں ہزاروں کی تعداد میں طلبا علم حاصل کرنے میں مصروف رہا کرتے اور یہ سلسلہ قرطبہ سے ثمرقند تک قائم تھا۔ خلیفہ الحکم ثانی کے حکم سے قرطبہ میں ستائیس سکول کھولے گئے جن میں مفت تعلیم دی جاتی تھی ۔ معاشرے کے اُن بچوں کو جو نادار تھے یا یتیم تھے اُن کی تعلیم کے لیے حکمران خود اہتمام کرتے ۔اس طرح مسلم معاشروں میں عام طور پہ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد سو فیصد تھی ۔اسلامی دنیا کا کوئی گاؤں ایسا نہ تھا جہاں نونہال قوم سے غفلت برتی جاتی ہو۔

ایک انگریز مورخ(MAX MOLLER) کا بیان ہے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں صرف بنگال میں 80 ہزار مدرسے تھے یعنی آبادی کے تناسب سے ہر چالیس طالب علموں کے لیے ایک مدرسہ تھا۔ بڑے شہروں میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم تھیں ۔ جامعہ قرطبہ وہ یونیورسٹی ہے جسے دنیا کی قدیم جامع قرار دیا جاتا ہے ۔ جامع قرطبہ کی بنیاد عبدالرحمان سوم (912-961) میں رکھی ۔جس میں پروفیسر مشرق کے اسلامی ممالک سے لائے جاتے تھے ۔ قاہرہ کی جامع الازہر یونیورسٹی 970ء میں قائم ہوئی اور ہزار سال سے لوگوں میں علم بانٹ رہی ہے ۔ 988ء میں یہ دنیا کی سب

سے بڑی یونیورسٹی تھی جس میں طلبا کی تعداد 35 ہزار سے زائد تھی اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ طلبا کو کتابیں اور کھانا مفت دیا جاتا تھا۔ آج کی جدید دنیا میں بھی کوئی یونیورسٹی نہیں جہاں تعلیم اور قیام و طعام مفت ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مفت تعلیم کا تصور بھی دنیا کو مسلمانوں ہی نے دیا۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے مطابق دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی بھی مسلمانوں ہی نے قائم کی۔ 855ء میں یہ یونیورسٹی مراکش کے شہر فیض میں قائم کی گئی۔ بعض مورخین نے کہا کہ دنیا کی پہلی یونیورسٹی بغداد میں 457ء میں قائم کی گئی جس کا نام نظامیہ تھا اس یونیورسٹی کا بانی حکمران الپ ارسلان تھا جس کے حکم سے اس کے وزیر اعظم نظام الملک نے اسے تعمیر کرایا تھا۔ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ نیشاپور، دمشق، یروشلم، قاہرہ اسکندریہ اور دوسرے کئی مسلمان شہروں میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہوگئیں۔ تب مغربی دنیا میں اس معیار کی ایک بھی جامعہ نہ تھی۔ اہل مغرب نے اپنی پہلی یونیورسٹی بارہویں صدی میں قائم کی جن کو آج مہذب ہونے کا دعویٰ ہے اور اُن کو شاید یاد بھی نہیں کہ انھیں غسل تک کرنا مسلمانوں نے سکھایا تھا پڑھنا لکھنا تو بہت بعد کی بات ہے ۔ وسطیٰ زمانہ کے اہل علم اس بات کے شاہد ہیں کہ اہل یورپ نے فطری علوم کی جو بلند و بالا عمارت تعمیر کی اُس کی بنیادیں مسلمان اہل علم نے فراہم کی تھیں ۔ خصوصاً علم کا بہاؤ اندلس سے مغرب کی طرف تھا کہ مغرب کے لوگ انھی یونیورسٹیوں میں علم حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ مسلمان علم پہ متصرف تھے اور دنیا بھر کے لوگ علم حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں ہی کے دست نگر تھے۔ اہل مغرب اندلس میں آتے پہلے مسلمانوں کی زبان سیکھتے اس کے بعد علم کا حصول اُن کے لیے ممکن ہوتا۔

وہ اہل عرب کا ادب غور سے پڑھتے ۔ عربوں کی کتابیں مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور انھیں کتابوں نے اہل مغرب کو علم کی طرف راغب کیا۔ مسلمان حکمرانوں نے لوگوں کی علمی تشنگی دور کرنے کے لیے جگہ جگہ کتب خانے بنوا رکھے تھے جہاں سے لوگ علم حاصل کرتے ۔ جرمنی، فرانس اٹلی اور برطانیہ کے طالب علموں کے لیے مسلم ہسپانیہ کے سوا اور کوئی جائے پناہ تھی اس لیے وہ ہسپانیہ ہی کا رخ کرتے ۔ ایک مغربی مورخ لکھتا ہے کہ تب مسلمانوں کو پڑھنے لکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور ہر سو پڑھے لکھے لوگوں میں پانچ صاحب کتاب تھے یعنی اہل قلم تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے

لے کر بارہویں صدی عیسوی تک مسلمان علم کی اُس مسند پر متمکن تھے جہاں دور دور تک اُن کا کوئی ثانی نہ تھا۔ انھوں نے علم کی میراث کو سینے سے لگا رکھا تھا جس کی بنا پر نہ صرف علمی سطح پر بلکہ اخلاقی، سماجی، عقائدی، معاشی، معاشرتی اور عسکری حوالے سے بھی پوری دنیا میں اُن کا کوئی مقابل نہ تھا عالم اسلام کی شاہراہوں کا منظر بھی عجیب تھا ہر طرف گھومتے لوگوں میں اہل علم کی اکثریت تھی۔ بڑے بڑے شہروں کے چوکوں پر لوگ موسم یا سیاست پر گفتگو نہ کرتے بلکہ اُن کے مباحث عمیق علمی موضوعات ہوتے۔ یہ وہ علمی مباحث ہوتے جن کا اہل مغرب کو کوئی شعور نہ تھا۔ اور وہ کلیسا کے اندھے بہرے احکامات ہی کو علم تصور کرتے۔ انگریز مورخ (MAX MOLLER) لکھتا ہے کہ مسلمان علم کی خاطر بہت سفر کیا کرتے اور سیاحوں کا روپ دھار کر علم کی تلاش میں منہمک رہتے۔ اسلامی ممالک میں مساجد کے ساتھ جہاں مدرسے ہوتے وہیں کتب خانے بھی ہوتے۔ جہاں سے لوگ کتابیں حاصل کرتے اور علم کی پیاس بجھاتے۔ چنانچہ میکس میرہاف کے مطابق صرف قسطنطنیہ میں 80 مسجدی کتب خانے موجود تھے۔

معروف مغربی مورخ ''Well Deurant'' کے مطابق آٹھویں، نویں یا دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے سوا اور کوئی قوم نہ تھی جس کو کتاب سے دلچسپی ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے ہاں ہی کتاب لکھی جاتی تھی اور مسلمانوں کے ہاں ہی پڑھی جاتی تھی۔ اور اِن صدیوں میں شاید اہل چین کے سوا اور کوئی قوم نہ تھی جس میں کتابوں کی اس قدر مانگ ہو جتنی کہ مسلمانوں کے ہاں تھی۔ مسلمانوں نے عربی زبان کو اس قدر رواج دیا کہ عربی ہی دنیا کی سب سے بڑی زبان تھی دنیا کا سارا علم و ادب عربی ہی میں مدون ہوتا تھا۔

عالمی شہرت یافتہ فرانسیسی دانشور ڈاکٹر گستاولی بان لکھتے ہیں کہ!

جس زمانے میں کتاب اور لائبریری کا اہل یورپ نام تک نہ جانتے تھے۔ تب مسلمان اُن علمی رفعتوں پہ فائز تھے جن کا بیان بھی مشکل ہے۔ اہل مغرب کے پاس تب صرف اُن کے کلیساؤں اور گرجوں میں چند سو کتابیں تھیں اُن کا بھی علم سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ صرف مذہبی اقوال تھے جن کو

وہ الہامی کتابیں کہتے تھے۔تب بلا شک وشبہ مسلمانوں کے ہاں ہزاروں لائبریریاں تھیں اور لاکھوں کتابیں تھیں۔بغداد کی لائبریری ''**بیت الحکمت**'' میں چالیس لاکھ کتابیں تھیں۔طرابلس کی لائبریری میں تیس لاکھ کتابیں تھیں۔قاہرہ کی لائبریری میں دس لاکھ کتابیں تھیں۔صرف مسلم ہسپانیہ میں سالانہ ستر سے اسی ہزار کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔ایک اور مغربی مورخ جارج سارٹن (Jaorge Sarton) نے لکھا ہے کہ تب دنیا میں صرف دو ہی لائبریاں تھیں۔ایک بغداد میں اور ایک قاہرہ میں۔وہ لکھتے ہیں کہ سب سے زیادہ گراں قدر سب سے زیادہ پر مغز اور سب سے زیادہ علمی کتابیں عربی زبان میں ہی لکھی گئیں۔ دنیا کا پہلا کتب خانہ بھی مسلمانوں ہی نے قائم کیا۔ جب اسلامی حکمرانوں کی سیاسی حیثیت مستحکم ہوگئی اور انھوں نے دنیا کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھالیا تو لازم تھا کہ وہ علم کے ہر ہر پہلو کو اُس گہرائی تک جانچیں جس سے اکتشافات اور انکشافات جنم لیں اور یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ اُنھوں نے علم سے محبت کی کتاب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا علم سے اُن کی محبت افسانوی حد تک جا پہنچی تھی۔

اسلامی دنیا کی لائبریریوں کا ذکر ہو رہا تھا تو مصر کے خلیفہ الحکم باللہ نے قاہرہ میں کتابوں سے متعلق ایک اکیڈمی قائم کی جس کا نام دار احکمہ تھا۔ دار الحکمہ میں سولہ لاکھ کتابیں تھیں۔لوگوں کو عام اجازت تھی کہ وہ چاہے تو وہاں بیٹھ کر مطالعہ کریں چاہیں تو کتابیں گھر لے جائیں۔جامعہ قرطبہ کی صرف ایک لائبریری میں چھ لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔حالانکہ قرطبہ شہر میں لائبریریوں کی تعداد سو سے زائد تھی۔خلیفہ الحکم الثانی کو مطالعے کا اس قدر شوق تھا کہ اس کے ذاتی کتب خانے میں چار لاکھ سے زائد کتب تھیں۔اُس نے اپنے محل میں یہ ذاتی کتب خانہ نہایت محبت سے تعمیر کرایا تھا جن الماریوں میں کتابیں محفوظ کی جاتیں وہ سندل کی خوشبودار لکڑی سے تیار کی گئی تھیں کمروں کی چھتیں نہایت دیدہ زیب تھیں جن پہ ماہر کاریگروں نے نقاشی کے عمدہ نمونے تیار کئے تھے۔ساتھ اُن لوگوں کے لیے کمرے تیار کیے گئے جو علم کی دیگر سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے۔کاتب جلد ساز اور نقاش دن رات اپنے کام میں مصروف رہتے تھے۔مسلم ہسپانیہ کے ہر شہر میں کتابوں کے بازار سجا

کرتے جہاں لوگ ذوق وشوق کے ساتھ کتابیں خریدنے کے لیے آیا کرتے تھے۔مورخین نے یہ حیرت انگیز منظر بھی بیان کیا ہے کہ تب مسلمان عورتوں میں بھی علم کی اس حد تک لگن پائی جاتی تھی کہ کتابوں کی دوکانوں پر عورتوں کا رش سنار کی دوکانوں سے زیادہ ہوا کرتا تھا۔جس کی وجہ یہ تھی کہ تب علم ہی وجہ اعزاز تھا ثروت اور نمائش کی کوئی روایت نہ تھی۔لوگوں کو جنون کی حد تک کتابیں پڑھنے کا شوق تھا چنانچہ معمولی ملازم، غلام بلکہ ہیجڑے تک مطالعہ کا شوق رکھتے تھے اور علم کی جستجو کرتے تھے۔ ہر پڑھا لکھا فرد کتابیں جمع کرنے کا شوقین تھا اور اس شوق میں وہ اپنے ساتھیوں سے بڑھ جانا چاہتا تھا۔چنانچہ عوامی کتب خانے جو حکومت وقت قائم کرتی تھی وہ تو ایک طرف رہے لوگوں کے ذاتی کتب خانوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔قرطبہ اشبیلہ اور غرناطہ بغداد دمشق اور دیگر مسلم شہروں میں امارت اور ثروت کی نشانی اُن کے عالی شان محل ہی تھے تاہم ضروری تھا محل سے متصل کتب خانہ بھی عظیم ہو۔ اس لیے ہر محل کے ساتھ کتب خانہ ضروری تھا اور اس بات کا تصور ہی نہ تھا کہ محل تو بن جائے مگر اُس میں کتب خانہ نہ ہو۔

علما، وزرا، امرا اور سلاطین اپنی شان وشوکت کے مطابق ذاتی کتب خانے تعمیر کراتے جس سے اُن کی علم سے محبت کا اظہار ہوتا۔اندلس کے ایک وزیر ابو جعفر احمد بن عباس کے پاس ذاتی کتب کی تعداد اتنی تھی کہ پورے یورپ کی کتابوں کو اگر جمع کیا جاتا تو اُس سے کم ہوتیں۔اُن کے پاس چار لاکھ کتابیں تھیں تب پورے یورپ میں صرف چند ہزار کتابیں تھیں اور علما کی تعداد انگلیوں کی پوروں سے بھی کم تھی۔بغداد کی فاطمی لائبریری میں بھی چار لاکھ کتب تھیں۔اسی طرح عباسی خلفا بھی علم سے بہت محبت کرنے والے تھے انھوں نے بھی اپنے گھروں میں لاکھوں کتابیں جمع کی ہوئی تھیں۔1258ء میں جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تو اگرچہ اُس نے اپنی جاہلیت کی بنا پر مسلمانوں کے سارے علمی اثاثوں کو یا تو آگ لگادی تھی یا دریائے نیل میں پھینک دیا تھا۔بیان کیا گیا ہے کہ ہلاکو خان نے مسلمانوں کی تین کروڑ سے زائد کتابیں جلادی تھیں اس کے باوجود لوگوں کے وہ بہت سے نجی کتب خانے اُس کے ہاتھوں سے بچ گئے کہ وہ جانتا ہی نہ تھا کہ لوگ گھروں میں

بھی کتابیں رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں علم دوستی کے اس تذکرے میں علم سے محبت ہی مرکزی نقطہ قرار پاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیں کہ مسلمانوں کے ہاں علم دوستی کی ایسی ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں جن کے تذکرے سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے کہ شہر موصل کے حاکم نے یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ شہر کی لائبریری میں کوئی شخص مطالعہ کے لیے جاتا تو اُس کی تکریم کی انتہا کر دی جاتی۔ اُسے کاغذ اور قلم فراہم کی جاتی تاکہ اگر وہ کوئی نوٹ لینا چاہے تو اسے دقت نہ ہو۔ اس کے بعد اُسے پسندیدہ مشروب کا پوچھا جاتا اور موسم کے حوالے سے اُس کی تواضع کی جاتی۔ اس کے بعد اگر مطالعہ کرنے والا شخص زیادہ تک وہیں بیٹھا پڑھتا رہتا اور کھانے کا وقت ہو جاتا تو اُس سے درخواست کی جاتی کہ وہ کھانا کھالے اس کے بعد دوبارہ مطالعے میں مشغول ہو جائے۔

اسی طرح بصرہ میں یہ روایت تھی کہ لائبریری کا منتظم دیکھتا کہ فلاح شخص ایک ہی موضوع پہ مطالعہ کر رہا ہے تو کچھ دن بعد وہ مطالعہ کرنے والے اس شخص کو بلاتا اور پیش کش کرتا کہ اگر وہ اپنے مطالعے میں روزگار کی وجہ سے کوئی دقت محسوس کرتا ہے تو اُس کو چاہیے کہ وہ روزگار سے بے پرواہ ہو جائے۔ جس قدر پیسہ وہ اپنے روزگار سے کماتا تھا اُس سے زیادہ پیسہ اُسے حکومت وقت دینے کو تیار تھی تاکہ وہ یکسوئی سے اپنے تحقیقی مطالعے کو جاری رکھ سکے۔ یہ علم سے محبت کے وہ تذکرے ہیں جن کا کوئی نام ونشان آج کی جدید اور مہذب دنیا میں بھی نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ اُن کا تہذیب یافتہ ہونا ایک مضحکہ خیز خیال ہے۔ پوری دنیا میں آج کوئی ایسی لائبریری نہیں جو مطالعے کے لیے آنے والوں کو کھانا پیش کرے یا کسی محقق کو زرکثیر کی پیش کش کرے۔

یہ صرف مسلمانوں کا خاصا تھا جنھوں نے علم سے اس قدر محبت کی کہ علم ایک ایک کر کے اپنے اسرار اِن کے سامنے کھولتا رہا اور مسلمان اپنے اِن اکتشافات کو تعمیر انسانیت کے لیے وقف کرتے رہے۔

عباسی خلفا کے ذکر کے بیان میں ابھی علم سے اُن کی محبت کا ذکر ہو رہا تھا تو مجھے یاد آیا کہ مامون الرشید نے قیصر مائیکل روم کی ریاست پر حملہ کیا تو قیصر مائیکل نے جزیہ کے عوض صلہ کی درخواست کی تو مامون الرشید نے اُس سے کہا اگر تم قسطنطنیہ کا فلاں کتب خانہ پورے کا پورا بغداد منتقل کر دو تو نہ تم

سے جزیہ لیا جائے گا اور نہ آئندہ تم پر حملہ کیا جائے گا۔ قیصر مائیکل نے بخوشی وہ کتب خانہ مامون الرشید کو بھجوا دیا۔ جب مسلمانوں نے علم کی دنیا میں تگ و دو شروع کی تو خطہ ارض میں صرف یونان تھا جن کی تاریخ میں علمی ہلچل کے نشان ملتے ہیں ورنہ دنیا کی باقی اکثر اقوام علم سے بے بہرہ تھیں اور جاہلیت کے اندھیرے میں راستہ تلاش کرنے کی سعی عبث میں مشغول تھیں۔ رہے اہل یونان تو اگرچہ انھوں نے ایک علمی روایت قائم ضرور کی مگر اُس کی شان و شوکت بہت محدود اور اُن کے موضوعات بہت فروعی تھے۔ انھوں نے سیدھی سادھے انسانی مسائل کو بھی فلسفے کے الجھاوں کی نظر کر رکھا تھا۔ اہل یونان کا علمی سفر بھی اگرچہ کئی صدیوں پہ محیط ہے مگر وہ اس قدر ہمہ جہت اور ہمہ گیر کبھی بھی نہ تھا جس قدر مسلمانوں کا علم تھا۔ یونان کے صرف چند شہروں میں علم کی روایت نے استحکام حاصل کیا مگر مسلمانوں کی عظیم الشان دور حکومت میں علم و تحقیق کا سلسلہ دنیا کے سو بڑے شہروں میں ایک ساتھ جاری تھا یعنی وسط ایشیا سے لے کر ہسپانیہ تک کہ مسلمان دنیا کے تین چوتھائی علاقے پہ متصرف تھے۔ اب اہل یونان کے علماء کو لیں تو انھوں نے آٹھ صدیوں میں صرف دو سو عالم پیدا کیے جبکہ مسلمانوں نے صرف تین سو سال میں سولہ سو عالم دنیا کو دیئے۔ یاد رہے کہ عالم سے مراد یہاں صرف مذہبی عالم نہیں ہیں بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تھے۔ چنانچہ اہل یونان اپنی طویل جہد و سعی کے باوجود بھی آنے والی نسلوں کے لیے کوئی علمی منزل وضع نہ کر سکے اس کے برعکس مسلمانوں کی علمی جہد و سعی نے اس عالم کے انسانوں کو کیا کیا دیا اس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں ضرور کیا جائے گا۔

تب عیسائی دنیا کی جہالت کا یہ عالم تھا کہ 1300ء میں اُن کے پاس جو سب سے بڑی لائبریری تھی وہ انگلستان میں تھی جس میں صرف پانچ ہزار کتابیں تھیں۔ کلیسا کی دنیا میں دوسری بڑی لائبریری فرانس میں تھی جس میں صرف 750 کتابیں تھیں تب صرف قرطبہ شہر کی لائبریریوں میں 35 لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں جو سو سے زائد لائبریریوں کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ کلیسا کے پجاریوں نے بارہ سو سال میں صرف دو سو کتابیں لکھیں اور اس دوران انھوں نے مسلمانوں کی لکھی ہوئی ساٹھ لاکھ

کے قریب کتابیں جلائیں۔ جس سے اُن کی علم دوستی کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔ جب کہ اس دوران مسلمان علماء نے کتابیں لکھ لکھ کر اُن کے انبار لگا دیئے۔ ہمارے اسلاف میں سے کتنے ہی تھے جنھوں نے ذاتی طور پہ سو سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ اُن میں امام غزالی (1111ء) نے دو سو کتابیں لکھیں۔

ابن عربی (1240ء) نے 250 کتابیں لکھیں۔

امام ابن تیمیہ نے 500 کتابیں لکھیں۔

جلال الدین سیوطی (1506) نے 550 کتابیں لکھیں۔

ابن طولون دمشقی (1546ء) نے 750 کتابیں لکھیں۔ (24*)

یاد رہے کہ گذشتہ صفحات میں پیش کیے گئے اکثر حقائق مغربی مورخین کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔ اہل مغرب خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہو اُس کے نزدیک امانت اور دیانت کا کوئی واضح تصور موجود نہیں۔ حتیٰ کہ اُن کے اہل قلم بھی اسی عادتِ بد کا شکار ہیں۔ سترہویں اٹھارویں صدی کے ہر مغربی محقق کی ایک ہی کوشش رہی کہ کسی طرح وہ لوگوں سے مسلمانوں کی اُس عظمت رفتہ کو پوشیدہ رکھ سکے جس نے دنیا کو علم و معرفت سے آشنا کیا۔ دراصل اُس کے دل میں تعصب کا زہر تھا جو اسے علم کی راہوں میں بھی اذیت پہنچاتا رہا جس کے ردعمل میں وہ سچ سے پھر جاتا اور اُس کے قلم سے علم کی بجائے جاہلیت برآمد ہوتی۔ مسلمان جب زوال پذیر ہوا تو اپنے علمی اثاثے بچانے کی بجائے اول اس نے اقتدار بچانے کی کوشش کی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ بچا سکا۔

آج ہم کو اپنی ہی تاریخ جاننے کے لیے مغرب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے اور ہمارے ہاتھ وہی دستاویز آتی ہے جو تعصب کے زہر میں بھیگی ہوئی ہوتی ہے۔ چنانچہ تین صدیوں تک اہل مغرب نے جو تاریخ رقم کی اُس میں تعصب کا رنگ نمایاں تھا۔ لیکن سچ آخر سچ ہوتا ہے وہ ظاہر ہو کے رہتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کئی مغربی مورخین کو ہدایت بخشی اور انھوں نے قدرے سچ اُگلا۔ اگر چہ اُس کو کبھی بھی مکمل سچ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ بیسویں صدی میں (Jaorge Sarton) اور

(MAX MOLLER)اور(Robert Briffault) نے جو کچھ لکھا اُس میں تعصب تو موجود ہی تھا مگر قدرے کم تھا۔اب بریفو ہی کو دیکھیں تو وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے جو ترقی کی وہ عیاش مسلمان حکمرانوں کے دور میں ہوئی۔انھوں نے مذہب کو پس پشت ڈالا اور ترقی کی۔مذہب سے بے اعتنائی کے نتیجے میں مسلمانوں کو جو ذہنی آزادی حاصل ہوئی اُسی کے بطن کے فروغ علم کی مہم نے جنم لیا۔بریفو نے اور بھی کئی جاہلانہ باتیں کی ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام کے ساتھ ہی مسلمانوں کی حکومت بنی امیہ کے ہاتھ آئی جو اسلام کے دشمن تھے۔بنی امیہ پہ اسلام دشمنی کا الزام ایک ایسا لطیفہ ہے جسے کوئی مغربی مولف ہی ایجاد کرسکتا ہے۔اگرچہ ابوسفیان بنو امیہ کا سردار تھا اور وہ قریش کے لشکروں کی قیادت بھی کرتا رہا تھا مگر بریفو کو شاید یاد نہیں کہ اسی ابو سفیان کی بیٹی رسول اللہ ﷺ کی بیوی تھی اور ابوسفیان کے بیٹے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم نے فتح مکہ سے پہلے ہی اسلام قبول کرلیا تھا اور فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان بھی مسلمان ہوگیا جس کے نتیجے میں بنوامیہ کے تقریباً تمام لوگ ہی اسلام لے آئے۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہم کے اپنے ایمان کا یہ حال تھا کہ سن رسیدہ ہونے کے باوجود رومیوں سے لڑنے کے لیے نکلے اور یرموک کے میدان میں تاج شہادت پہنا۔اور اُن کے بیٹے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم تو قرآن کے کاتب تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ ہی میں رہا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم کی خلافت میں ہی انھیں دمشق کا عامل مقرر کردیا گیا تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہم نے انھیں تمام ملک شام کا حکمران بنادیا تھا۔حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم نے اپنے دور حکومت میں نہ صرف اندرونی فتنوں کی بھرپور بیخ کنی کی بلکہ سلطنت اسلامیہ کی وسعت میں بھی مصروف عمل رہے۔اور یہ بنوامیہ ہی تھے جنھوں نے اپنے نوے سالہ دورِ اقتدار میں مسلمانوں کی اس قدر وسیع وعریض ریاست قائم کی کہ اس سے قبل تختۂ ارض پر کسی ایک نظریہ کے حامل لوگوں نے کبھی اس قدر عظیم اور شان وشوکت والی ریاست نہ دیکھی ہوگی۔ہم کو اس بات سے انکار نہیں کہ بنو امیہ میں اچھے برے ہر طرح کے حکمران گزرے ہیں تاہم حقیقت یہ ہے کہ بنوامیہ کو اسلام دشمن قرار دینا مضحکہ خیز ہے۔بنوامیہ ہی سے خلیفہ الحکم الثانی نے اسپین میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومت کی

بنیاد رکھی اور مسلمان آٹھ صدیوں تک اسپین پر حکومت کرتے رہے۔خلیفہ الحکم الثانی کے بارے میں (Jaorge Sarton) نے لکھا ہے کہ خلیفہ الحکم الثانی اپنے وقت کے تمام حکمرانوں سے زیادہ عالم وفاضل حکمران تھا۔اس نے علم کو اتنا فروغ دیا کہ جلد ہی جامع قرطبہ دنیا کے علوم کا مرکز بن گئی ۔جارج سارٹن (Jaorge Sarton) ایک معتدل مستشرق ہے جس نے بہر حال کسی حد تک سچ بولا ہے مگر وہ بھی اپنے اُس تعصب کو نہ دبا سکا جو مغربی مؤلفین کا خاصہ رہا ہے چنانچہ (Robert Briffault) نے بنوامیہ کی ہجو کی تو (Jaorge Sarton) نے بنوعباس کو برا بھلا کہا۔ اُس نے اپنی کتاب (Introduction to the History of Science) میں لکھا ہے کہ بنوعباس کا اسلام نمائشی تھا اور وہ دل سے اسلام کی عظمت کے قائل نہ تھے۔(Jaorge Sarton) کا یہ بھی خیال بھی سفید جھوٹ ہے۔تاریخی حقائق کو جھٹلانا مغربی مورخین کی عادت رہی ہے۔

اگرچہ یہاں میں بنی عباس کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتا ہوں اور (Jaorge Sarton) سارٹن کے اس دعوے کو آسانی جھٹلا سکتا ہوں مگر یہ ہمارے موضوع سے متعلق نہیں ہے۔تاہم (Jaorge Sarton) کے اس دعوے کو جھٹلانے کے لیے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی ملکہ زبیدہ کا ایک کارنامہ ہی بیان کردینا کافی ہوگا کہ اُس نے حج کے لیے حاضر ہونے والے حاجیوں کی مشکلات حل کرنے کے لیے نہر زبید تعمیر کرائی تاکہ حاجی پانی کی کمی کی شکایت نہ کریں۔دراصل یہ ایک مخصوص ذہنیت ہے جس نے مغربی علماء کا احاطہ کیا ہوا ہے۔وہ خاص تعصب ہے جس سے کوئی مغربی مورخ خود کو آزاد نہ کرسکا۔وہ کلیسا کے اس جبر کو کبھی نہیں بھولا جس سے اُس نے جبراً آزادی حاصل کی تھی۔اُن لوگوں کو مذہب کا بڑا ہی تلخ تجربہ ہوا تھا جس سے وہ کبھی اپنے ذہنوں کو آزاد نہ کرا سکے۔چونکہ کلیسا نے اُن کی فکر کو دبا رکھا تھا اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب سے آزادی حاصل کیے بغیر فکری پختگی حاصل ہی نہیں کی جاسکتی۔اِن کے دل ودماغ اس گہرے احساس کا شکار تھے مذہب چند پابندیوں اور شدید شکنجوں کا نام ہے۔اوراس شکنجے سے آزاد ہوئے بغیر انسان زندگی کے کسی بھی پہلو

میں ترقی نہیں کرسکتا اور اُن کا یہ خیال کسی حد تک درست بھی تھا اس لیے کہ کلیسا خودسر تھا خودغرض تھا۔ کلیسا نے سائنس دانوں اور فلسفیوں پر بہت مظالم ڈھائے تھے ۔جب کوپر نیکس (Copernicus) نے یہ نظریہ پیش کرنا چاہا کہ سورج دنیا کے گرد نہیں گھومتا بلکہ دنیا سورج کے گرد گھومتی ہے تو اُسے رُک جانا پڑا اُس نے ایک کتاب لکھی مگر وہ اسے شائع کرنے کی جرأت نہ کرسکا حتیٰ کہ وہ مرگیا اس کی موت کے بعد یہ کتاب شائع کی گئی تو کلیسا کے پجاری اُس کی قبر کی بے حرمتی کرنے سے بھی نہ چوکے۔ مگر علم کی دنیا میں اس کے نظریے کو پذیرائی حاصل ہوئی کہ اُس کا نظریہ سچ تھا۔ تاہم کئی دوسرے سائنس دان اور فلسفی کوپر نیکس کی طرح خوش قسمت ثابت نہ ہوئے اور کلیسا کے پجاریوں نے مشہور سائنس دان ڈینو برونو کو سترہویں صدی کے پہلے سال آگ میں زندہ جلا دیا تھا۔ گلیلیو کو بھی زندہ جلانے کی کوشش کی گئی مگر وہ بچ نکلا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کلیسا کا جبر کس حد تک بسیط تھا۔ مغربی مورخین کی بدقسمتی رہی کہ انھوں نے اسلام کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور وہ اسلام کو بھی عیسائیت کی طرح جبر کا مذہب سمجھتے رہے۔

ہر چند کہ اسلام کی بنیاد قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی سنت پہ رکھی ہے اس کے برعکس عیسائیت میں قانون سازی کا اختیار پوپ کو سونپ دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ جو قانون انسانوں کے محدود علم، ناقص عقل اور خواہش نفس پر مبنی ہو وہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے احکامات کے مقابلہ میں کس قدر حقیر اور لغزشوں سے بھرا ہوا ہوگا۔ پھر جب تاریخ سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ کچھ پوپ نہایت خودغرض ،نفس پرست اور زمانہ ساز تھے تو اُن کے احکامات مفاد عامہ کے بجائے خودغرضی پہ مبنی رہے ہوں گے ۔پوپ کے جبر اور خودغرضی کو سمجھنے کے لیے پوپ الگزینڈر ششم کی بیسیوں بدعنوانیوں میں سے صرف ایک پر غور کریں کہ اُس نے اپنے ناجائز بیٹے سیزر بورجیا کو اٹھارہ سال کی عمر میں ہی کارڈینل بنا دیا جو پوپ کے بعد سب سے اعلیٰ منصب تھا۔(25*) جبکہ خود پوپ ہی کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق کوئی ایسا شخص کارڈینل نہیں بن سکتا جو ازدواجی رشتے کے باہر پیدا ہوا ہو۔ تاہم اپنے بیٹے کو کارڈینل بنانے کے لیے پوپ نے باقاعدہ ایک فرمان جاری کیا جس کو ماننا ہر عیسائی کے لیے

ضروری تھا۔کسی کو اجازت نہ تھی کہ وہ پوپ کی اس بے عدلی پہ آواز اٹھا سکتا۔کیونکہ پوپ کا فرمان نہ ماننے والوں کو عیسائی برادری سے خارج کر دیا جاتا اور کلیسا کے غنڈے لوگوں کا جینا حرام کر دیتے۔ ایسے شخص کو قتل کر دینا بھی جائز تھا۔پوپ کی بداعمالیاں اور کلیسا کا جبر ہمارا موضوع نہیں مگر اس سے عیسائیت کی بنیاد ضرور سمجھ آتی ہے کہ غرض کے کچھ بندوں نے کس طرح ایک الہامی دین کو اپنی حقیر خواہش نفس پہ قربان کر دیا اور آج کا عیسائی خود کو مہذب کہتا ہے حالانکہ اُس کو تہذیب سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے۔آخر کلیسا کے جبر تلے سسکتے لوگ عاجز آ گئے اور انھوں نے بغاوت کر دی مگر یہ بغاوت اتنی آسان نہ تھی ہزاروں لوگوں نے اپنے خون سے اُس تحریک کی آبیاری کی جس کا مقصد اول اول صرف کلیسا کے جبر کو روکنا تھا۔

کلیسا کے اختیارات کو محدود کرنا تھا مگر چودھویں پندرھویں اور سولھویں صدی میں طویل عوامی جدو جہد آخر بار آور ثابت ہوئی، جب اس تحریک کو جان وکلف اور جان ہس جیسے راہبر ملے اور مارٹن لوتھر جیسا شاعر ملا۔آخر کلیسا کا نظام زمین بود ہو گیا مگر وہ تحریک جو کلیسا کے اختیارات کو کم کرنے کے لیے شروع کی گئی تھی وہ عیسائیت کو بھی لے ڈوبی اور مذہب اُن سے رخصت ہو گیا اور یہی وہ تعصب یہی وہ احساس کمتری ہے جس کا شکار سترہویں اٹھاریں اور انیسویں صدی کا مغربی مورخ رہا ہے۔وہ سورج کی روشنی کو روک دینا چاہتے تھے اُن کا خیال تھا کہ لوگ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بھول جائیں گے اور مسلمان بھی رفتہ رفتہ اسی طرح بے دین ہو جائیں گے جس طرح کہ وہ ہو گئے ہیں۔مگر وہ بھول گئے کہ انھوں نے اپنی کتاب کھو دی تھی مگر مسلمانوں نے اپنی کتاب کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا۔انھوں نے اپنے رسول کو خدا کا بیٹا خدا کا سایہ خدا کا اوتار قرار دے دیا مگر مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کو رسول اللہ ﷺ ہی سمجھا مسلمانوں نے اپنے رسول کو کبھی خدا بنانے کی کوشش نہیں کی اس لیے کہ انھیں اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ مسلمانوں کے پاس تو اُن کا خدا بھی موجود تھا اور رسول بھی موجود تھا قرآن بھی موجود تھا اور سنت بھی موجود تھی مسلمانوں نے دیگر لوگوں کی طرح اپنی تاریخ کو وقت کی راکھ میں گم نہیں کیا بلکہ اپنی تاریخ رسول اللہ ﷺ کی مبارک زیست کا ایک ایک لمحہ محفوظ کیا

اس لیے چاہے جبر کا دور ہو، زوال کا دور ہو مسلمان اپنی تہذیب کو سینے سے لگائے رہا۔ برطانیہ کا غاصبانہ تسلط ہو یا روس کا ظالمانہ رویہ مسلمان حیّ للفلاح کو کبھی نہ بھولا اور اُس کی اسی والہانہ وابستگی نے مضبوط مسلم تہذیب کو جنم دیا جس سے مغربی دانشور خوفزدہ ہے وہ سمجھتا ہے کہ مسلمان آخر اُس سے زمین کی حکمرانی چھین لیں گے اور یہ ایک دن ہو کے رہنا ہے اس لیے کہ یہ اصول قدرت ہے کہ جب مسلمانوں نے اپنے دین کو پس پشت ڈالا اقتدار کی ہوس میں ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور اس قدر کمزور ہو گئے کہ اقتدار مغرب نے چھین لیا۔ اب مغرب فطرت سے انحراف کی راہ پہ ہے انھوں نے جنسی آزادی اور مادیت کے جس سماج کو جنم دیا ہے وہ جلد ہی اپنی موت آپ مر جائے گا اور مغربی تہذیب کے زوال کے بعد خطہ ارض پہ اور کوئی ایسی قوم موجود نہیں جو اس عالم کی زمام کار تھامنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

چنانچہ اسلام کی عظمت رفتہ پھر سے بحال ہوگی کہ نفسیات کا بنیادی قانون ہے کہ انسان جو کام ایک بار کر لیتا ہے وہ اسے دوسری بار بھی کر لیتا ہے۔ اور مسلمان تقریباً تمام دنیا پہ ایک بار حکومت کر چکے ہیں اس لیے دوسری بار بھی دنیا پہ حکومت کرنا مشکل نہ ہوگا۔ مسلمانوں نے ایام گم گشتہ میں علم کی جس طرح خدمت کی اب وہ بات کسی سے بھولی ہوئی نہیں ہے خود مغربی دانشور اب اعتراف کر رہا ہے کہ اُن کے جدید سائنسی نظریات کو بنیاد مسلمانوں ہی نے فراہم کی تھی۔ بغداد، شیراز، قرطبہ، دمشق، اشبیلیہ، ہرات غزنی، کابل، بلخ، بخارا، سمرقند اور تاشقند کو لوگ کبھی نہیں بھولے۔ یہی وہ شہر تھے جنھوں نے اقوام عالم کو وہ عالم فراہم کیے جنھوں نے دنیا کو علم سے آشنا کیا انھیں تہذیب وتمدن کے ابتدائی اسباق پڑھائے۔ مغرب کے دانشور نے کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ عظیم اسلامی ریاست نے دنیا پر علمی اور تہذیبی احسان کیا ہے۔ وہ پر فریب دروغ گوئی سے کام لیتے رہے حتیٰ کہ اپنے لوگوں کے اذہان میں انھوں نے نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے تصور کو مسخ کیا بلکہ مسلمانوں کی تاریخ کو بھی ہضم کرنے کی کوشش کی۔ دیکھیں کہ گبن (Gibbon) جیسا روشن خیال مفکر بھی مغرب کی علمی روایت سے انحراف نہ کر سکا اور اسلام کا ذکر تحقیر آمیز لہجے میں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

اسلام تلوار کے زور پہ پھیلا۔ چنانچہ گذشتہ صدی تک تمام مغربی مورخین کا ایک ہی اسلوب رہا ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کیا جائے اور پچھلی صدی تک مسلمانوں کی تاریخ پہ اس قدر اندھیرے تھے کہ مغرب کا عام شہری مسلمانوں کو جنگلی اور وحشی سمجھتا تھا بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان عیسائیوں ہی کا ایک منحرف فرقہ ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی تک آنحضرت محمد ﷺ اور اسلام کے بارے میں جو کچھ مغربی مورخ نے لکھا اُس کو اب خود اہل مغرب ایک عجوبہ قرار دیتے ہیں اور اپنے آباء کی اس بدیانتی پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ دورِ جہالت کے بعد یورپ کے مفکرین نے یورپ کی جو تاریخ لکھی ہے اُس میں وہ مسلمانوں کے سنہری دور سے اغماز برتا ہے۔ اُس کے ذکر سے گریزاں ہے۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت کے زریں علمی کارناموں کو حذف کرنا چاہتا ہے۔ مگر خود اہل مغرب ہی کے بعض مورخین اس علمی بددیانتی پر چیخ اٹھتے ہیں اور حقیقت سے تہ در تہ پردے اترتے چلے جاتے ہیں۔ یورپ کی تاریخ مسلمانوں کے تذکرے کے بغیر لکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ڈنمارک کی تاریخ لکھی جائے اور شہزادے ہیلمٹ کا ذکر نہ کیا جائے۔ چنانچہ جن بعض مورخین نے یورپ کی تاریخ لکھتے ہوئے مسلمانوں کا ذکر کیا ہے وہ اِن کی بددیانتی کا منہ بولا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کا ذکر صرف اُس وقت کرتے جب انھوں نے ہلال پہ صلیب کی کسی فتح کو بیان کرنا ہو۔ یا پھر وہ اُن سازشوں کا ذکر کرتے ہیں جن کی بنا پر وہ مسلمانوں کو ہسپانیہ سے نکالنے میں کامیاب رہے تھے۔

چنانچہ ایک مغربی مورخ (Dr Osbron taylor) قرون وسطیٰ کی ذہنیت پہ دو جلدوں پر مشتمل ایک کتاب (The Mediaeval Mind) لکھتا ہے مگر اُس کا کمال یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی کسی تہذیب کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ امر صریحاً غیر فطری ہے کہ ایک تابناک اور فعال تہذیب جو تخلیقی عمل میں مصروف ہو اُس کا اثر ہمسایہ آبادیوں کی نشو ونما پر نہ ہو۔ خاص طور پہ تب جب وہ جہالت کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہوں گہرا اور حیات آفریں اثر نہ ڈالے۔ چنانچہ اسلام اور یورپ کے باہمی ربط وضبط کی تاریخی شہادت کی ہر تفصیل دبانے اور مسخ

کرنے کے باوجود یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا کہ یہ فطری قانون معطل نہیں ہوسکتا اور اہل یورپ مسلمانوں کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ اثرات تمام تر مثبت اور علمی تھے جن پہ اہل یورپ نے ایک نئی عمارت تعمیر کی اور دنیا سے یہ جھوٹ بولا کہ یہ عمارت ہماری ہے۔ حالانکہ اس عمارت کے تمام تر خدوخال مسلمانوں ہی کے وضع کردہ تھے۔

چنانچہ یہ امر قریب قریب یقینی ہے کہ عربوں کے بغیر یورپ کی جدید تہذیب رونما نہیں ہوسکتی تھی۔ اور یہ بات تو قطعی طور پہ یقینی ہے کہ مسلمانوں کے بغیر اُن کی اس جدید تہذیب کو وہ منصب حاصل نہ ہوتا جس نے اسے ارتقاء کے پچھلے تمام مدارج سے بلند کر دیا۔ یوں تو یورپی نشو و نما کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں جس سے اسلامی تہذیب کی مہک نہ آتی ہو مگر نیچرل سائنس اور سائنسی مزاج پیدا کرنے میں جو نئی دنیا کی سب سے بڑی امتیازی قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا ماخذ اسلام ہی کی وہ مہتم بالشان تہذیب ہے جس کی بیخ کنی پہ مغربی مورخ مصر ہے۔ چنانچہ (Robert Briffault) نے اپنی کتاب (The Making of Humanity) میں لکھا ہے کہ ہماری سائنس اس بات کے لیے عربوں کی رہین منت نہیں کہ انھوں نے چونکا دینے والے اکتشافات یا انقلابی نظریے پیش کیے۔ سائنس اس سے کہیں زیادہ عربوں کی زیر بار احسان ہے کہ اس کا وجود ہی اِن کی بدولت ہے۔ بیان کیا گیا کہ دنیا کا قدیم دور سائنس سے پہلے کا دور ہے۔ یونانی علم ہیت اور علم ریاضی سے آشنا نہ تھے یہ علوم باہر سے اُن کے ہاں آئے جس کی وجہ سے وہ یونان میں صحیح طور پہ رچ بس نہ سکے۔

یونانیوں نے اگرچہ اِن علوم میں نظم و ضبط اور ترتیب و تزہین پیدا کرنے کی کوشش کی اِن کی تعمیم کی اور اِن علوم سے نظریے اخذ کیے مگر لیکن چھان بین کے صبر آزما طریقے مثبت معلومات کی فراہمی سائنس کی دقیقہ سنجی، تفصیلی اور طویل مشاہدے اور تجرباتی تحقیقات یونانیوں کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی۔ پرانی دنیا میں صرف اسکندریہ کی سائنس میں اس کی کچھ جھلک پائی جاتی تھی جس کو ہم سائنس کہہ سکتے ہیں۔ یورپ میں تحقیقات کی نئی روح، دریافت کے نئے انداز فکر، تجربہ، مشاہدہ اور پیمائش

کے نئے طریق کار اور ریاضی کو درجہ تکمیل تک پہنچانے کا ایسا ضابطہ اختیار کرنے سے نمودار ہوئی جن سے یونانی بالکل ناواقف تھے۔ اس روح اور اِن طریقوں سے اہل یورپ کو عربوں ہی نے متعارف کرایا۔ خیالی نظریوں اور **تعمیمی** کلیوں کی طرف عربوں کا رجحان ہی نہ تھا وہ معلومات کے قدر دان اس لیے تھے کہ اس سے اِن کے علم میں اضافہ ہوتا تھا۔ نہ کہ اس لیے کہ انھیں **تعمیمی** استقراء (Generalizing Introduction) کا ذریعہ بنایا جائے۔ انھوں نے یونانیوں کے اخذ کردہ نتائج کو سائنسی تحقیقات کے دوران عارضی نظریوں کے طور پر استعمال کیا اور جوں جوں اُن کے علم میں اضافہ ہوتا گیا انھوں نے اِن نتائج کو واقعات کی کسوٹی پر پرکھا اور اُن میں مناسب ترمیم و تنسیخ کر کے مناسب تصرف کیا مگر اہل مغرب نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ انھوں نے سائنس کو ادعائی مزاج (Dogmatic Spirit) دے کر یورپ کے سر تھوپ دیا۔ حالانکہ خود مسیحی یورپ ادعائیت میں سب سے بڑا ہوا تھا۔ انھوں نے یہ بات دراصل اس بنیاد پر کی کہ مسلمانوں نے بعض یونانی نظریات کی قلب ماہیت کی جیسے کہ آب و ہوا کا جغرافیائی نظریہ یا کیمیا گری کے چند اصول، جو دراصل تو بطلیموس وغیرہ کے ذہنی فتور تھے مگر اہل یورپ نے انھیں مسلمانوں کے سر تھوپ دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ آب و ہوا کا جغرافیائی نظریہ اور کیمیا گری کے ذریعہ قلب ماہیت جیسے نظریات اگرچہ عربوں کے ذریعہ ہی سے یورپ کو منتقل ہوئے لیکن یہ نظریات عربوں کے نہ تھے بلکہ خود یونانیوں کے وضع کیے ہوئے تھے۔ جس انداز سے عرب اس مواد کو جو موجود ہوتا استعمال کرتے تھے وہ یونانیوں کے طریق کار کے بالکل برعکس تھا۔ بلکہ عربوں نے تو اُس خامی اور کمی کو پورا کیا جو یونانیوں کی فطری ذہانت میں پائی جاتی تھی کہ یونانیوں کو تو صرف نظریات و تعمیم سے دلچسپی تھی اور وہ امر واقع سے غفلت اور بے اعتنائی برتتے تھے۔ اس کے برعکس مسلمان یعنی عرب محققین نظریوں سے بے اعتناء رہتے مگر ٹھوس حقائق کو سمیٹتے رہتے اور اپنے علم کو صحیح اور اوزانی (Quantitative) ترتیب دینے میں سرگرمی دکھاتے۔ بار آور اور دیرپا سائنس اور

سائنس کے غیر واضح شوق جستجو میں جو نمایاں فرق ہے وہ خاصیتی توضیع (Quantitative) کا فرق ہے۔ جس کی بدولت ناپ تول میں جتنی صحت ممکن ہو حاصل کی جاتی۔ تحقیق کے اس معروضی (Objective) تخیل اور اوزانی صحت کے تحت عربوں نے وسیع پیانے پر سائنسی تجربات کیے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کے لیے نہایت دیدہ ریزی سے آلات بنائے۔ جو یونانیوں کے آلات سے بہتر اور اِن آلات سے جو نورمبرگ کے مشہور کارخانے میں پندرہویں صدی میں تیار کیے جاتے تھے زیادہ صحیح اور درست تھے۔ مشاہدہ کرنے والے اپنے اپنے کام کو علیحدہ علیحدہ انجام دیتے اور اپنے ذاتی انجام کو دخل انداز نہ ہونے دیتے چنانچہ دمشق بغداد اور قاہرہ کی رصد گاہوں میں مشاہدات میں تسلسل قائم رکھنے کے لیے قاعدے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔ چنانچہ کچھ مشاہدے بارہ بارہ سال تک جاری رہتے۔

عرب محقق اپنے مشاہدوں کے اندراجات کی صحت پر اس قدر زور دیتے کہ اِن میں جو غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوتے اُن کے اندراج سے پہلے باقاعدہ حلف کی تقریب ہوتی۔ اِن تمام سرگرمیوں میں یہی معروضی اور اوزانی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جب المامون نے اپنے صاحب البرید (Postmaster) ابن حزذبہ کو حکم دیا کہ اسلامی جغرافیہ لکھے اور نقشہ تیار کرے تو مامون نے اُس کو حکم دیا کہ نقشے میں تمام بری اور بحری راستوں کو واضح کیا جائے اور طول بلد اور عرض بلد کو نظر میں رکھتے ہوئے ہر جگہ کا مقام اور محل وقوع بالکل درست طور پہ متعین کیا جائے۔ یہ جغرافیہ عربوں کی اِن تمام جغرافی دستاویزات و تصانیف میں سب سے پہلا نقشہ تھا جس کی بدولت دنیا کا صحیح روپ معلوم ہوا اور دنیا کا رجحان علم جغرافیہ کی طرف ہوا۔

اسی طرح البیرونی کو دیکھیں تو ذوق جستجو اُسے چالیس سال تک سفر میں رکھتا ہے مگر وہ شخص ذرا بھی تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا کہ علم کی راہ میں جو سکون ہے اُسے کوئی محقق ہی جان سکتا ہے۔ البیرونی دنیا بھر سے معدنی نمونے اکٹھے کرتا رہا۔ اُس نے مختلف اجزائے بسیط (Elements) کے ثقل نوعی (Specific Gravity) کی جدول تیار کی۔ محققین کے نزدیک وہ جدول آج بھی صحیح مانی

جاتی ہے۔ایک اور عالم ابن بیطار نے پوری اسلامی دنیا سے نباتاتی نمونے جمع کیے۔اُس نے ہندوستان اور ایران کی نباتات کا مصری نباتات سے موازنہ کیا اور جو نتائج اخذ کیے اُن پر ایک مسبوط کتاب لکھی۔اس کتاب میں ایک ہزار چار سو سے زائد پودوں کے احوال درج کیے گئے ہیں۔ایک مغربی مورخ (Mayer) نے ابن بیطار کے اس علمی کارنامے کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب محنت اور تندہی کا عظیم نمونہ ہے۔

چنانچہ اسی ژرف نگاہی اور مشاہدوں میں دل و جان سے لگے رہنے کے جذبہ کے مقابلہ میں قدیم حکماء کا طریق کار بالکل قیاسی تھا اور وہ تجربات طریق کار کو حقیر جانتے تھے۔ارسطو نے حیوانات طبعیات اور نباتات پہ کتابیں لکھیں مگر اُسے کبھی ایک تجربہ کرنے کی بھی توفیق نہ ہوئی اور جن امور کا صحیح یا غلط ہونا آسانی سے معلوم کیا جا سکتا تھا انھوں نے اس کی تصدیق کرنے کی بھی سعی نہ کی۔ چنانچہ وہ بڑے اطمینان سے دعویٰ کرتا ہے کہ مرد کے دانتوں کی تعداد عورت کے دانتوں سے زیادہ ہوتی ہے اُسے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ اپنی بیوی کے دانت ہی گن لیتا۔اسی طرح جالینوس جس کو علم تشریح کا مسلّمہ ماہر تصور کیا جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ جبڑے کے نیچے دو ہڈیاں ہوتی ہیں۔چنانچہ لوگ کئی صدیوں تک اس بات کو صحیح مانتے رہے حتیٰ کہ ایک مسلمان سائنس دان عبدالطیف نے انسانی کھوپڑی کے مشاہدے کے بعد جالینوس کے تخیل کو غلط ثابت کیا اور لوگوں کو اصل حقیقت سے آشنا کیا ۔اہل عرب کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اُن ماخذوں سے علم حاصل کرتے جو آسانی سے دستیاب ہوتے ۔علم ہیت کا بیشتر اور علم ریاضی کا کچھ مواد انھوں نے یونانی آخذوں سے لیا۔

یونانیوں نے ابتدأ یہ علوم اہل بابل سے حاصل کیے جو عرب سے عراق منتقل ہو گئے تھے۔اس طرح وہ علوم جو عربوں نے یونانیوں سے لیے اور پھر یورپ تک پہنچائے انھی کے اسلاف کے حاصل کردہ تھے جو یونانیوں نے اُن سے مستعار لیے تھے۔خوش قسمتی سے سائنسی علوم کا ایک اور ماخذ بھی عربوں کے ہاتھ آ گیا تھا۔کہ پانچویں صدی میں ہندوستان میں ایک قابل توجہ ذہنی تحریک نمودار ہوئی جو عہد گپتا کا نشاط ثانیہ کہلاتی ہے۔چنانچہ اس عہد میں کئی ہندوستانیوں نے علوم و معارف میں معرکے کی

کتابیں لکھیں۔اِن میں آریہ بھٹ اور برہم گپتا تھے جنھوں نے علم ریاضی میں کئی اہم جدتیں پیدا کیں۔عربوں نے اُن کو یونانی ریاضی دانوں کے گراں بار اور نا قابل عمل طریقوں کی اصلاح کے لیے استعمال کیا اور خود بھی بہت سی جدتوں کا اضافہ کیا۔عیسائیوں کی ریاضی کا علم اربعہ متناسب کے صبر آزما استعمال تک محدود تھا۔وہ علم حساب کے آسان ترین سوال بھی تاروں میں جڑے ہوئے موتیوں سے حل کرتے جیسا کہ اپنے بچپن میں پہلی دوسری جماعت میں ہم بھی کرتے رہے ہیں۔چنانچہ عربوں نے قاعدہ ترمیم اور اعداد جس میں اشاریہ اور صفر سے کام لیا جاتا ہے رائج کیا۔مسلمان جب زوال کی راہوں پہ چلا اور مسلم حکمرانوں نے ایک دوسرے پر حملے شروع کر دیئے تو علم اِن کے ہاں سے رخصت ہونے لگا اور اُن کی اجارہ داری ختم ہوئی تو انھی کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے والے مغربی صاحب علم نے میدان کو خالی پا کر اس میں قدم جمانے شروع کر دیئے۔ہسپانیہ کی مسلم حکومت یہودیوں کے ساتھ کامل مذہبی رواداری کا سلوک کرتی تھی اور انھیں خلافت اسلامیہ کے تہذیبی ارتقاء میں بھرپور شرکت کی عام اجازت تھی۔مسلمان حکومت کمزور ہوئی تو یہودی یورپ میں منتشر ہو گئے۔وہ اپنے ساتھ اُس علمی روایت کو بھی لے گئے جسے انھوں نے مسلمانوں سے حاصل کیا تھا۔انھوں نے اس پیغام علم کو دور افتادہ اور وحشی خطوں تک منتقل کر دیا کہ یورپ ابھی بدستور جہالت کے اندھیروں میں تھا۔

یہودی اور عیسائی علماء نے علم کی اس روشنی کو دور ویرانوں میں مقیم الگ تھلگ خانقاہوں تک منتقل کر دیا ۔رفتہ رفتہ عیسائیوں کا ذوق جستجو اُن کے تعصب پر غالب آتا گیا اور وہ اِن علوم کو پہلے تعجب کی نگاہ سے دیکھتے اس کے بعد اس کی جستجو میں لگ جاتے۔حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اب صرف اپنے اقتدار کی جنگ لڑ رہا تھا اور اپنوں ہی سے لڑ رہا تھا کہ ابھی تک اہل نصاریٰ اس قابل نہ ہوئے تھے کہ مسلمانوں پر حملہ کرتے۔مسلمان ایک دوسرے ہی پر حملہ آور ہوتے تھے۔اہل نصاریٰ علم حاصل کرنے کو کسر شان سمجھتے تھے مگر یہودیوں کے ابھارنے پر انھوں نے تحصیل علم کی ٹھانی اور اُن کے شہروں میں مدرسے قائم ہونے لگے۔خانقاہوں تک میں علمی موضوعات پہ بحث ہونے لگی اگرچہ کلیسا ابھی تک مزاحم تھا مگر لوگ بدستور علم کی طرف کوشاں رہے۔اب روایت بدل رہی تھی۔سو سال

قبل تمام علوم کے تراجم عربی میں کیے جاتے تھے اب عربوں کے وضع کردہ علوم کو یورپی زبانوں خاص طور پہ انگریزی میں منتقل کیا جانے لگا۔ مسلم ہسپانیہ کی ریاست بکھر رہی تھی اگرچہ ابھی تک بیشتر علاقوں پہ مسلمان ہی قابض تھے مگر وہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے عیسائی حکمرانوں سے مدد کے طالب ہوئے۔ یہ بحران صرف اندلس کی حد تک تھا مگر باقی اسلامی دنیا بدستور نہ صرف محکم تھی بلکہ وہاں علمی سرگرمیاں بھی بدستور جاری تھیں کہ ہلاکو خان کسی عفریت کی طرح نمودار ہوا اور کیا مسلم کیا غیر مسلم بہت سی ریاستوں کو ملیا میٹ کر دیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا تو بظاہر عباسی خلافت کی پوزیشن مستحکم نظر آتی تھی مگر حقیقت میں وہ اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ آپس کی لڑائیوں خاص کر فرقہ ورانہ تعصب نے خلافت عباسیہ کی جڑوں تک کو ہلا کر رکھ دیا تھا ۔مورخین نے اُس وقت کی سلطنت عباسیہ کی جو تصویر پیش کی ہے وہ بہت ہی خوفناک ہے اور اُس کے نتیجے میں زوال یقینی تھا اگرچہ یہ زوال شاید چند برس ٹل جاتا مگر ہلاکو خان کی یلغار سے اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔ مورخین میں سے شاہ معین الدین احمد، سیّد امیر علی نے خلافت عباسیہ کے زوال کی وجوہات پہ تفصیلی مباحث چھوڑے ہیں۔ متاخرین میں سے ابوالفداء، ابن خلدون، المقریزی اور امام سیوطی نے زوال خلافت عباسیہ سے بحث کی ہے۔ معین الدین احمد ندوی نے " **تاریخ اسلام** " میں لکھا ہے کہ جب آخری عباسی خلیفہ معتصم باللہ تخت نشین ہوا تو خلافت عباسیہ اپنے آخری دموں پہ تھی اُس پہ مستزاد یہ کہ خود معتصم باللہ ایک نااہل حکمران تھا جو اپنی ڈوبتی کشتی کو بچانے کی صلاحیت سے عاری تھا (26*)۔

مستعصم باللہ کا سارا انحصار اپنے وزیر ابن عقلمی پر تھا جو دراصل تو شیعہ تھا مگر اہل سنت ہونے کا دعویدار تھا۔ چنانچہ بغداد میں آئے روز شیعہ سنی فساد ہوتے رہتے تھے۔ کہیں کہیں حنفی اور حنبلی آپس میں ٹکراتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بیرونی دشمنوں کا خطرہ بھی موجود تھا جو اس بات کا اندازہ لگانے کوشش کر رہے تھے کہ کیا واقعی عباسی خلافت اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ اس پر حملہ کر دیا جائے اگرچہ ابھی اُن کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی مگر ریاست کا اندرونی ڈھانچہ انتہائی کمزور

ہو چکا تھا اس پہ مستعصم باللہ کی نااہلی تھی کہ اُس نے اپنے باپ کی بنائی ہوئی شاندار فوج کا شیرازہ بھی بکھیر دیا تھا۔ جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب ریاست میں خانہ جنگی کا چلن تھا اور لوگ مذہبی منافرت کی بنا پر ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے تب ریاست کی آمدنی اس قدر کم ہو چکی تھی کہ مستعصم باللہ کے وزیر نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ آدھی فوج فارغ کر دی جائے اور انھیں حکم دیا جائے کہ وہ کھیتی باڑی کریں تب حالات سنبھل جائیں گے چنانچہ فوج کا ایک بڑا حصہ سبکدوش کر دیا گیا۔

ابن عقلمیٰ ایک طرف تو شیعوں کو اکساتا کہ وہ سنیوں پر حملہ کریں دوسری طرف خلیفہ سے کہتا کہ مجھے حکم دیں میں اِن مٹھی بھر شیعوں کو کچل دوں۔ چنانچہ ایک دن جب شیعہ سنی شورش عروج پر تھی تو خلیفہ نے نشے کی حالت میں اپنے بیٹے ابوبکر اور معتمد امیر رکن الدین کو حکم دیا کہ شیعوں کو کچل دیا جائے۔ انھوں نے فوج کے ایک دستے کے ساتھ شیعوں کے محلے کرخ پر حملہ کر دیا جنھوں نے شیعوں کو قتل کیا اور اُن کی املاک لوٹ لیں جس سے شورش میں اضافہ ہو گیا۔

ابن عقلمیٰ کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ عباسی خلافت کی جگہ علوی خلافت قائم کرے۔ اسی لیے اُس نے اندر خانے ہلاکو خان کو بغداد پر حملے کا پیغام بھجوایا۔ دوسری طرف اُس نے مستعصم باللہ کو خوفزدہ کیا اور کہا کہ وہ باقی ماندہ فوج کو بھی فارغ کر دے اس سے جو پیسہ بچے گا وہ تاتاریوں سے مقابلے کے کام آئے گا۔ اور مستعصم باللہ کو اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ دشمن کو فوجیں روکا کرتی ہیں پیسہ نہیں۔ ہلاکو خان جانتا تھا کہ بغداد پر حملہ دراصل ساری اسلامی دنیا پر حملہ کرنا ہے اس لیے وہ قدرے گریزاں تھا مگر مشہور شیعہ فلسفی اور علم ریاضی کے ماہر خواجہ نصیر الدین طوسی نے ہلاکو سے کہا مستعصم باللہ کا سر حضرت زکریا بن یحییٰ علیہ السلام اور حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہم کے سر سے زیادہ قیمتی تو نہیں جو گردن سے جدا نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ نصیر الدین طوسی کے ابھارنے پر ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کر دیا۔ خلافت عباسیہ کی بچی کھچی فوجوں نے بددلی سے ہلاکو خان کی فوجوں کا مقابلہ کیا مگر اپنے امیر دیودار کی پکار پر اُن کا جوش پلٹ آیا اور وہ جم کر تاتاریوں کا مقابلہ کرنے لگے ایک بار تو انھوں نے تاتاریوں کا منہ پھیر دیا مگر تاتاریوں کی یلغار انتہائی زیادہ تھی دونوں طرف طاقت کا کوئی توازن نہ تھا۔ چنانچہ مسلمان سالار

دیودار کے قتل کے بعد بغداد کے دروازے ہلاکو خان کے لیے کھل گئے۔اس لیے کہ جب ہلاکو خاں نے بغداد پہ حملہ کیا تو کوئی نہ تھا جو حملہ آور کا مقابلہ کرتا۔جو دستے ابن علقمی کے پاس تھے انھوں نے آگے بڑھ کر ہلاکو کا استقبال کیا۔مستعصم ابھی تک ابن علقمی کی چال بازی کو نہ سمجھ سکا تھا اس لیے کہ وہ پرلے درجے کا نا اہل حکمران تھا۔بغداد پر ہلاکو خان کے قبضے کے بعد بھی مستعصم ابن علقمی کے سوا کسی کی بات سننے کا روادار نہ تھا۔چنانچہ ابن علقمی دھوکے سے مستعصم کو ہلاکو خان کے پاس لے گیا ۔جہاں مستعصم کو دوسرے بہت سے اعمائدین حکومت علمائے شہر اور روساء سمیت قتل کر دیا گیا ۔مسلمان خلیفہ کی جان بوجھ کر تحقیر کی گئی اور مستعصم کو چٹائی میں لپیٹ کر ڈنڈوں سے مار مار کر ہلاک کیا گیا۔خلیفہ وقت کو قتل کرنے کے بعد ایک ماہ سے زیادہ قتل عام کیا گیا۔بغداد کی تقریباً تمام آبادی کو قتل کر دیا گیا۔بغداد کی آبادی اُس وقت بیس لاکھ تھی ۔علامہ ابن خلدون کے مطابق مقتولین کی تعداد سولہ لاکھ سے زیادہ تھی جس سے اُس غارت گری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو ہلاکو خان کے لشکر نے خلافت عباسیہ کے دارالحکومت بغداد میں کی۔

مسلمانوں کا تمام علمی اثاثہ ہلاکو خان کے لشکر کی جاہلیت کی نظر ہو گیا۔بغداد میں سینکڑوں لائبریاں تھیں جن میں موجود تمام کتابوں کو یا تو آگ لگا دی گئی یا انھیں دریائے فرات میں ڈال دیا گیا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ دریائے فرات میں اتنی کتابیں ڈالیں گئیں کہ کئی روز تک اُس کا پانی کتابوں سے اترنے والی روشنائی کی وجہ سے سیاہ رہا۔بعض نے لکھا ہے کہ مسلمان لائبریریوں کو آگ لگا دی گئی اُن کے شعلے اس قدر بلند تھے کہ کئی میل سے نظر آتے تھے آٹھ روز تک کتابیں جلتی رہیں ۔مورخین نے لکھا ہے کہ بغداد سمیت جن دوسرے شہروں میں ہلاکو خان نے غارت مچائی اُن میں مسلمانوں کی تین کروڑ کتابیں ضائع ہوئیں۔

دوسری طرف مسلم ہسپانیہ میں اب صرف غرناطہ کی ریاست تھی جو عیسائیوں کے سیلاب کے سامنے ڈٹی ہوئی تھی۔دوسری تمام ریاستوں پہ عیسائی قبضہ کر چکے تھے۔ہلاکو خان کے برعکس ہسپانیہ پر حملہ کرنے والے عیسائیوں نے مسلمانوں کے علمی ذخیرے کو آگ نہیں لگائی بلکہ وہ اس علمی اثاثے کو

اپنے قبضے میں کرتے رہے اور اپنے ملک منتقل کرتے رہے۔ بعد کے مورخین نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اہل نصاریٰ نے مسلمانوں کے اس علمی اثاثے کو بڑی حفاظت سے رکھا اُس کو اپنی زبان میں منتقل کیا اور اس سے اپنی سائنسی تہذیب کی تعمیر کی۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی آنے والی نسلیں اُس بے انت اور انمول وراثت کا ادراک نہ کر سکیں اور اپنے مسائل کے حل کے لیے مغرب کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ مغرب کی محکوم تھیں اس لیے مغرب نے اس بات کا احساس بھی نہ ہونے دیا کہ وہ کس بیش بہا وراثت کے وارث ہیں۔ اسی غفلت میں کئی صدیاں بیت گئیں۔ آخر بیسویں صدی میں مسلمانوں نے اپنے احیا کی طرف قدم اٹھایا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلمانوں نے اس محکومی سے قدرے نجات حاصل کی اور مسلمان کم از کم سیاسی محکومی سے آزادی حاصل کرنے لگے۔ بہت سے مسلم ممالک نے اطالوی فرانسیسی اور برطانوی سامراج سے نجات حاصل کی اور مسلمانوں کی جابجا حکومتیں قائم ہو گئیں کیمونزم کے زوال سے وسط ایشیا میں بھی بہت سی مسلم ریاستوں کا وجود دنیا کے نقشے پر ظاہر ہوا۔ مسلمانوں نے سیاسی طور پہ تو آزادی حاصل کر لی مگر علم کے میدان میں بدستور مغرب کی اجارہ داری قائم ہے۔ معاشی میدان میں بھی مغرب کے استحصالی نظام کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ دوسری طرف فکرمندی کی بات یہ ہے کہ مسلمان سیاسی طور پہ بھی کوئی مشترکہ سیاسی نظام وضع کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

مسلمان ابھی ذہنی طور پہ بھی مکمل آزادی حاصل نہیں کر سکے۔ وہ اپنے مسائل کے حل کے لیے لامحالہ مغرب کی طرف دیکھتے ہیں کہ مغرب زندگی کے بہت سے پہلوؤں پہ غالب ہے۔ اسلام کی تعلیمات سے انحراف اور فکری ناپختگی کی وجہ سے مسلمان اپنی منزل کا تعین نہیں کر سکا مگر قوموں کی زندگی میں ایک دو صدیاں ایک دو کروٹوں کے برابر ہی ہوا کرتی ہیں اس لیے مایوسی کی کوئی بات نہیں کہ سب سے خوش آئند امر یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی بنیاد کو نہیں کھویا اُن کے پاس قرآن وسنت کی وہ انمول نعمت ہے جسے بروئے کار لا کر وہ کسی بھی وقت مغرب کی کھوکھلی تہذیب کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور مغرب کو بھی اس بات کا مکمل ادراک حاصل ہے اس لیے وہ بھی مسلمانوں

کے آپس کے اختلافات کو ہوا دیتا رہتا ہے۔ چنانچہ مسلمان اگرچہ ابھی کئی حوالوں سے کمزور ہیں مگر پھر بھی وہ سحراب زیادہ دور نہیں جب مسلمان بھی علمی میدان میں دوسری قوموں کی ہمسر ہو جائیں گے۔ آج مسلمانوں نے عسکری اور سائنسی میدان میں کئی قدم اٹھا لیے ہیں۔ مملکت پاکستان نے ایٹم بم بنا کے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ مسلمان اپنی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرنے میں اب تساہل سے کام نہیں لیں گے ترکی اور ملائیشیا کی بے پناہ معاشی ترقی نے بھی مغرب کے لیے کئی سوال پیدا کر دیئے ہیں۔ پاکستان اور ایران کا بلیسٹک میزائل سسٹم اس بات کو بھی ظاہر کر رہا ہے کہ مسلمانوں کو اب دوبارہ محکوم نہ بنایا جا سکے گا۔ علم کی وارثت کو حاصل کرنے میں مسلمان نوجوانوں کا ذوق رفتہ رفتہ نکھر رہا ہے جو کسی نوید صبح کی طرح ہے۔

✡ ✡ ✡

مسلمان اور سائنس

ہم وہ غافل وارث ہیں جنھیں اپنی بے انت وراثت کا کوئی ادراک نہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے اسلاف نے تاریخ عالم کے ہر ہر ورق پر کیسے کیسے نشانِ عظمت چھوڑے ہیں۔ یہ مہتم بالشان داستان دلنواز بھی ہے اور دلدوز بھی۔ اسی داستان سے اُن لاتعداد داستانوں کا سراغ ملتا ہے جو آج مغرب کی علمی، ثقافتی اور فنی ترقی کے ثبوت کے طور پہ پیش کی جاتی ہیں۔ اسی داستان میں وہ عظمتِ پارینہ چمکتی اور دمکتی ہے جس کی آب وتاب سے کسب نور کر کے مغرب اس مرتبے اور منزل کو پہنچا ہے۔ چنانچہ سمجھنا چاہیے کہ مغرب آج سیادت عالم کے جس ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہے وہ اس کو صرف اس لیے حاصل ہوا کہ اس نے عالم اسلام کی تقریباً ایک ہزار سالہ علمی ترقیوں اور تحقیقی کاوشوں سے کسب فیض کیا۔ مگر قوم بنی اسرائیل کی روایتی کج روی نے اہل مغرب کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں کی اس علمی عظمت کو عیسائیت کی نشاۃ ثانیہ کا نام دیں اور مسلمانوں کو چار دانگ عالم میں اس قدر رسوا اور مطعون کیا جائے کہ جہالت و تعصب، تنگ نظری اور دون فطری اور مسلمان مترادف اور ہم معنی

سمجھیں جائیں۔اُن کی اس احسان ناشناسی پر کامل تین صدیوں تک پردہ پڑا رہا اور محکوم مسلمان یہ سمجھتا رہا کہ اہل مغرب زندگی کے ہر پہلو میں اُن سے برتر ہیں اور اُن کی فنی مہارت جدید دنیا کا ایک عجوبہ ہے۔حالانکہ اُن کی تمام تر سائنسی ترقی میں قرونِ وسطیٰ کے مسلمان کی عظیم جہد وسعی کارفرما ہے۔جب مسلمان آپس میں لڑلڑ کر کمزور ہو گئے تو مغرب نے نہ صرف سیاسی محاذ پہ فتوحات حاصل کیں بلکہ علمی میدان میں بھی مسلمانوں ہی کے علمی سرمایہ کو استعمال کرتے ہوئے جدید سائنسی اور متمدن تہذیب کی بنیاد رکھی۔

حقیقت یہ ہے کہ سترہویں اور اٹھاوریں صدی کے اکثر مفکرین اور سائنس دانوں نے مسلم ہسپانیہ سے حاصل کیے ہوئے علمی ذخائر سے فائدہ اٹھایا اور اِن سے نہ صرف معروضی ترقی بلکہ موضوعی اعتبار سے بھی انھوں نے اپنے آپ کو دیگر دنیا سے فائق ظاہر کیا۔انھوں نے رازی، ابن سینا، امام غزالی، ابن رشد، ابن الہیثم کی کتابوں کا پہلے تو اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اس بیش بہا علمی خزانے کو عملی صورت دی اس کے بعد انھوں نے دوسری بددیانتی یہ کی کہ اِن مسلمان علماء کی گراں قدر تصنیفات کو اپنے ناموں سے شائع کیا اور دنیا کے لوگوں پہ اپنی علمی دھاک بٹھائی۔مسلمان چونکہ اکثر وبیشتر یا تو اِن اقوام کے غلام تھے یا اُن کی علمی حیثیت اس قدر پست تھی کہ وہ اس بددیانتی کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھا سکے۔

پھر خود اہل مغرب سے ہی بعض راست خیال مصنفین نے اِن پردوں کو چاک کیا۔جن سے مسلمان قدرے نا آشنا تھے۔قرن اول میں تو یہ صورت حال تھی کہ سیاسی استحکام حاصل کرنے بعد مسلمان آگے ہی بڑھتے رہے۔جوں جوں اسلام پھیلتا رہا جہل کی ظلمت اور اوہام پرستی کی تاریکی چھٹتی گئی۔مدینہ سے نکلنے والی علم کی مہیب روشنی سے دمشق بغداد، کوفہ وحلب، بصرہ وحلوان، قرطبہ و غرناطہ کے علمی مراکز یکے بعد دیگرے حریت فکر ونظر، تہذیب وتمدن، اخلاق واعمال اور عقائد و معاشرت کی تربیت وامامت کرتے رہے۔اس سے اگلے مرحلے میں مسلمانوں نے کل عالم کے لوگوں کی علمی رہنمائی کرنے کے لیے خوارزم، فرغانہ، غزنی، ہرات، ثمرقند، بخارا، خیوا، مراکش اور

طونس میں علمی مراکز قائم کیے جنھوں نے مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ فطری علوم پر بھی اپنی توجہ مرکوز کی اور علم کی راہیں فروزاں ہونے لگیں۔ اس وقت دنیائے یورپ ہنوز جہالت وتعصب کی تاریکی میں غرق تھی۔ گو مسلم ہسپانیہ اور صقیلہ کے مسلمان حکمرانوں کی معارف پروری اور علم دوستی کا ابرِ کرم یہودیوں اور عیسائیوں پر بھی اسی طرح سایہ فگن تھا جس طرح کہ مسلمانوں پر۔ مگر یہ اقوام احسان ناشناس اقوام ہیں اس لیے عیسوی دنیا کے مذہبی پیشواؤں نے اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے برطانیہ فرانس، اطالیہ اور المانیہ کے عیسائیوں کو ٹھیک اُس وقت مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی پہ اکسایا جب مشرق میں مسلمان ہلاکو اور چنگیز خان کا سامنا کر رہے تھے۔

چنانچہ جس طرح مشرق میں منگولوں کے حملوں سے علم کی ترویج وترقی رُک گئی تھی اسی طرح جب عیسائی پیشواؤں نے مغرب میں مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز کیا تو ارتقائے علوم عمرانی یعنی سائنس معاشرت ومعیشت کے اُس زریں دور کا خاتمہ ہو گیا کہ جب اقلیم علم وحکمت میں صرف مسلمانوں ہی کا سکہ رائج تھا۔ پھر جب مسلمان فکری پستی کا شکار ہو گئے تو جانے کب اور کیسے اس خیال نے جنم لیا کہ اسلام اور سائنس باہم متصادم ہیں۔ یہ صدا کئی صدیوں تک موجود رہی ہے اور مغربی دانشور اس ضمن میں مسلمانوں کو مطعون بھی کرتا رہا۔ یہ فکری مغالطہ اصل میں تو مغرب ہی کی پیداوار ہے اور انھوں نے ہی اول اول یہ بہتان تراشا۔ مگر قرآن سے ناآشنا آزاد فکری کے دعویدار چند مسلمان علماء اور جاہل ملاؤں نے بھی اس ضمن میں مغربی ایجنڈے کو مواد فراہم کیا جس کی وجہ سے یہ خیال گردش میں رہا کہ سائنس اور قرآن باہم متصادم ہیں یہ دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی جس میں اہل مغرب نے اپنے اس تصور کو اجاگر کیا کہ جدید سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میں اُن کے نوبل پرائز جیتنے والوں کے علم پہ نگاہ ڈالتا ہوں تو مسکرا دیتا ہوں کہ اگر یہ نوبل پرائز چند صدیاں قبل وقوع پذیر ہوتا تو مسلمانوں کے عظیم علما کو نوبل پرائز دیتے دیتے اُن کے ہاتھ تھک جاتے مگر مسلمانوں کے علمی کارنامے ختم ہونے میں نہ آتے۔ آج جن لوگوں کو علمی معرکہ آرائی پہ نوبل پرائز سے نوازا جاتا ہے اُن سے زیادہ علمی سوجھ بوجھ تو مسلمان علماء

کے اُن منشیوں کو حاصل تھی جو مسلمان علماء کی دریافتوں کی فہرستیں مرتب کیا کرتے تھے۔آج کا مغربی دانشور بھول جاتا ہے کہ اُس کے آباءعلم حاصل کرنے کے لیے اشبیلیہ،قرطبہ،غرناطہ اور بغداد کا رخ کرتے تھے کہ اُن کے ہاں تو علم کی کوئی روایت ہی موجود نہ تھی تو انھوں نے علم کیا حاصل کرنا تھا۔آج بلا شبہ سائنسی علوم میں اہل مغرب نے بہت مہارت حاصل کر لی ہے اور طرح طرح کی ایجادات سے انسانی زندگی کو سہل بنا دیا ہے مگر اُن کا یہ کہنا کہ اُن کی سائنسی ترقی میں امت مسلمہ کا کوئی حصہ ہی نہیں ایک بڑی علمی بد دیانتی ہے۔جس پہ آج کے بہت سے مغربی مفکر بھی شرمندہ ہیں۔

چنانچہ مشہور مغربی محقق (Jaorge Sarton) نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب(Interoduction to the History of sciense) میں برملا اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مغرب کی اس جدید تہذیب کے پیچھے مسلمانوں کی بہت سی علمی کاوشوں کو دخل ہے۔اور آج کا جدید مغربی معاشرہ سائنس کی جس نہج کو جانتا ہے اُس کی بنیادوں میں مسلمان علما کی صدیوں کی محنت شامل ہے۔(Jaorge Sarton) لکھتا ہے کہ جس چیز کو آج ہم سائنس کے نام سے جانتے ہیں وہ یورپ میں تحقیقات کی نئی روح دریافت کرنے کے نئے انداز فکر،تجربہ مشاہدہ،پیمائش کے نئے طریقے کار اور ریاضی کو درجہ تکمیل تک پہچانے اور وہ ضابطہ اختیار کرنے سے نمودار ہوئی جس سے یونانی بالکل نا آشنا تھے اس روح اور ان طریقوں سے اہل یورپ کو عربوں نے متعارف کرایا۔

اگرچہ اس ضمن میں اب کافی کام ہو چکا ہے اور بہت سے مسلمان محققین نے بھی مسلمانوں کی علمی وراثت کا کھل کر تذکرہ کیا ہے اِن میں بہت سے نام لیے جا سکتے ہیں جیسا کہ حبیب احمد صدیقی نے اس موضوع پہ ایک بہت عمدہ کتاب لکھی ہے جس کا نام **"مسلمان اور سائنس کی تحقیق"** ہے۔جس میں مسلمانوں کے سائنسی اور علمی عروج کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اُن علمی رفعتوں کو کھول کر بیان کیا گیا ہے جن کو مسلمان حاصل کرتے رہے ہیں۔اسی طرح پروفیسر ارشد جاوید کی کتاب **"مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج"** بھی اس موضوع پہ ایک منفرد کتاب ہے جس

میں مسلمانوں کی سیاسی، فکری، عسکری، سماجی، عقائدی، اخلاقی اور معاشی برتری پہ سیر حاصل مباحث موجود ہیں۔اہل مغرب میں سے(Jaorge Sarton) اور(Robert Briffault) نے مسلمانوں کی علمی اور سائنسی رفعت کو اجاگر کیا ہے۔ دیگر بہت سے نام ہیں جنھوں نے انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلمانوں کے سائنس دانوں کی تحسین کی ہے اور اُن کی ایجادات اور اکتشافات کو جدید مغربی سائنسی تحقیق کی بنیاد قرار دیا ہے۔(Jaorge Sarton) لکھتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے یونانیوں نے سائنس کے میدان میں جو تحقیق کی اسے کسی بھی حالت میں قابل قدر قرار نہیں دیا جا سکتا۔اس لیے کہ اُن کی سائنس محض ایک مغلوبہ تھی جس میں کھرے کھوٹے کی کوئی تمیز نہ تھی۔سائنس کو کثافتوں سے مسلمانوں نے پاک کیا۔مسلمانوں نے ریاضی، فلکیات، کیمیا، طبیعات، صنعت وحرفت، جغرافیہ اور طب غرض زندگی کے ہر شعبے میں گراں قدر علمی سنگ میل وضع کیے جن کا تذکرہ رہتی دنیا تک کیا جاتا رہے گا۔

تب اہل یورپ مسلمانوں کی زبان سیکھتے اور اس کے بعد اُن علوم کی طرف متوجہ ہوتے جو مسلمانوں کی میراث تھے۔ چنانچہ عیسائیوں نے بھی عربی پڑھی اور یہودیوں نے بھی عربی پڑھی اور اس میں کوئی شرم محسوس نہیں کی کہ جس زبان میں مسلمان جدید انکشافات اور اکتشافات کر رہے تھے اُن تک پہنچنے کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہ عربی زبان کا دروازہ تھا جس سے گذرے بغیر علم کی روشنی تک رسائی ممکن ہی نہ تھی۔عیسائیوں اور یہودیوں نے عربی زبان سیکھی تو اس قابل ہوئے کہ مسلمانوں کے زوال کے بعد اُن کے علمی اثاثہ جات سے مستفیض ہو سکیں۔ چنانچہ جب بارہویں اور تیرہویں صدی میں عظیم اسلامی ریاست زوال کی راہوں پہ چل نکلی تو عربی زبان سے شناسائی کی وجہ سے یہودیوں اور عیسائیوں کو مسلمانوں کی علمی میراث سنبھالنے میں کوئی دقت نہ ہوئی اور اُنھوں نے جب مسلمانوں کی اس بسیط علمی بساط کو اپنی زبانوں میں منتقل کیا اور اپنے طالب علموں کو اُن علوم کی تعلیم دی جو مسلمانوں کے وضع کردہ تھے تو اُن میں گلیلیو اور نیوٹن پیدا ہوئے ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سائنس کے اِن بڑے سپوتوں کو پیدا کر سکتے۔خود مغربی مفکر بھی اسی نتیجہ تک پہنچے ہیں کہ یہ مسلمان علماء ہی

تھے جنھوں نے زندگی اور سائنس کے ہر میدان میں دوسروں کی رہنمائی کی۔ چنانچہ (Jaorge Sarton) کہتا ہے کہ:

یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے پانچ صدیوں تک دنیا پہ ایسی حکومت کہ زندگی کے کسی بھی پہلو سے کوئی اور قوم اُن سے ہمسری کا دعویٰ نہ کرسکتی تھی۔

(Robert Briffault) کہتا ہے کہ!

عربوں نے وسیع پیمانے پر سائنسی تجربات کیے۔انھوں نے مشاہدات و تجربات کے لیے نہایت عرق ریزی سے آلات بنائے جو یونانیوں کے آلات سے بہتر اور عمدہ کارکردگی کے حامل تھے۔

(Rojer Bacon) کہتا ہے کہ!

مسلمانوں نے تجرباتی سائنس کو رواج دیا۔جبکہ یونانی تجرباتی سائنس سے دور تھے۔مسلمانوں نے علم کے جن میدانوں میں جہد وسعی کی وہ دنیا کے لیے سراسر نئے تھے۔

مشہور مغربی مورخ (Max Myerof) لکھتا ہے کہ!

جب یونان کے علم کا سورج ڈوب گیا تو مسلمانوں کا آفتاب علم طلوع ہوا جو صدیوں تک انسان کو روشنی فراہم کرتا رہا۔حتیٰ کہ آج کی جدید دنیا میں بھی علم کے جو نشان ہیں ممکن ہی نہیں کہ اُن کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ نہ ہو۔

مشہور مغربی محقق (Mosheen) نے اپنی کتاب (Ecciesiastical History) میں لکھا ہے کہ!

اس امر کا اعتراف کرنا چاہیے کہ طبیعات، نجومیات، فلسفہ، ریاضی، کیمیا اور وہ تمام علوم جو مسلمانوں نے اہل مغرب کو منتقل کیے وہ اہل عرب ہی کا کارنامہ ہیں۔

(Ducton Taonas) کہتا ہے کہ!

یورپ نے اپنی بیداری کی اولین صدیوں میں مسلمانوں کی علمی مساعی ہی سے استفادہ کیا ہے

۔تمام جدید علوم کی بنیاد میں مسلمانوں کی مساعی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(Philip K Hitti) کہتا ہے کہ!

مسلمانوں کی علمی مساعی اور تصنیفی و تدریسی سرگرمیوں کے بغیر ریاضی اور سائنس کے میدان میں سرزمین میں یورپ میں گلیلیو اور نیوٹن کا پیدا ہونا مشکل تھا۔

ریاضی کا مشہور مغربی ماہر(E.Wiedemann) کا کہنا ہے کہ!

اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں نے بعض نظریات یونانیوں سے لیے تھے لیکن انھوں نے اِن نظریات کو اچھی طرح سمجھ کر اور پرکھ کر اِن کا انطباق مختلف دور کے حالات پر کیا ہے نتیجے میں عمدہ نظریات اور اچھوتے مباحث پیش کیے ہیں۔

(Dr, Draper) لکھتے ہیں کہ!

مسلمانوں کے دورِ عروج میں علوم عالم نے بے پناہ ترقی کی ۔مسلمانوں نے قدیم علوم میں خاطر خواہ اضافے کیے اور بہت سے نئے علوم کی بنیاد رکھی۔

اہل مغرب کی طرف سے مسلمانوں کی علمی مساعی کے اِس حرفِ اعتراف کے بعد بیان کرنا مقصود ہے کہ درحقیقت کے علم کے جہانوں میں جس قدر روشنی ہے اُن کی بنیاد میں مسلمانوں کی عظیم جدوجہد کی وہ لازوال داستان ہے جس کو دنیا سے چھپانے کی اہل مغرب کی مساعی کا میاب نہ ہوسکی اور خود اہل مغرب کی ایک قلیل تعداد نے مسلمانوں کی اِن خدمات کا اعتراف کیا اور اُسے دنیا کے سامنے لائے۔اگرچہ کامل تین صدیوں تک اہل مغرب کے دانشور نے یہی کوشش کی کہ کسی طرح مسلمانوں کے عظیم علمی ماضی پہ پردہ پڑا رہے۔

دنیائے اسلام میں سائنس کا آغاز پہلی صدی ہجری میں اس وقت ہوا جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم نے 60 ہجری میں مسلمان علماء کو یونانی طب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔اُن کے پوتے خالد بن یزید نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ بعدازاں عباسی خلیفہ مامون الرشید(813-833ء) نے بڑے پیانے پر دنیا کے علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا۔اُس نے

"**بیت الحکمت**" نامی ایک ادارے کی بنیاد رکھی جو بغداد میں قائم کیا گیا۔جلد ہی علوم سائنس کے حوالے سے یہ ادارہ مرکزی حیثیت حاصل کر گیا۔مورخین نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں مترجمین کا بہت درجہ تھا۔چنانچہ غیر عربی زبانوں سے علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کے عوض حاکم وقت مترجمین کو بہت بھاری معاوضہ دیا کرتے تھے۔بعض نے لکھا ہے کہ مترجم کو ترجمہ کی گئی کتاب کو تول کر اس کے برابر سونا دیا جاتا تھا جس سے مسلمانوں کی علم سے دوستی کا اظہار ہوتا ہے۔

تاہم ذہن میں رہے کہ مسلمانوں نے یونانی علوم کا صرف ترجمہ نہیں کیا۔بلکہ ترجموں کے بعد انھوں نے یونانی علوم کو سمجھا اُن کی غلطیوں کو درست کیا۔اُن کا تنقیدی جائزہ لیا اور اِن علوم کی اصلاح کے بعد علم کے نئے جہانوں کی تلاش میں مشغول ہو گئے۔چنانچہ مسلمانوں نے علم کیمیا،طبیعات، ریاضیات، میکانات، نباتات، حیوانات فلکیات اور علم طب کے نئے اُفق وضع کیے۔جب علم کے میدان میں مسلمانوں کی خوئے جستجو پختہ ہوگئی اور وہ تجربات اور تحقیقات کے میدان میں راسخ ہو گئے تو علم کے اِن پہلوؤں کی وہ تاریخ وضع ہونے لگی جس نے انسان کو جدید تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ سائنس کی اُن ایجادات تک پہنچایا جن سے انسان کی زندگی میں سہولت اور آسانی در آئی۔

چنانچہ یہ حقیقت اب محتاج بیان نہیں کہ زمانہ وسطیٰ میں مسلمان سائنس دانوں نے علم کو بہت ترقی دی اور وہ سائنس اور دیگر فطری علوم میں ماعصر اقوام سے بہت آگے نکل گئے۔جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ آٹھویں صدی میں مسلمانوں نے جس علمی روایت کی بنیاد رکھی وہ ایک ہی صدی میں پختہ ہوگئی اور سولہویں صدی تک علم کے میدانوں میں مسلمانوں کا کوئی ہم سر نہ تھا۔مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں پر ہزار سال تک حکمرانی کی۔علم کی دنیا میں مسلمان کامل چھ صدیوں تک حکمران رہے۔اگر آج کے علمی معیار کا موازنہ مسلمانوں کے علمی معیار سے کیا جائے تو مسلمان علماء کے لیے چار ہزار نوبل پرائز بھی کم پڑتے۔چنانچہ نویں صدی

عیسوی سے لے کر سولہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کے دور کو سیاسی اور علمی رفعتوں کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اِن میں تین چار صدیاں ایسی ہیں جن میں مسلمانوں کے سوا کوئی قوم نہ تھی جن کے پاس متاع علم کا قلیل حصہ بھی پایا جاتا ہو بلکہ مسلمان علم کے میدانوں پہ اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ دوسری اقوام اُن پہ صرف رشک کر سکتی تھیں اس لیے کہ اُن کے پاس وہ وسائل بھی نہ تھے جن کی بنا پہ مسلمانوں نے علوم عالم پہ دسترس حاصل کی۔تب مسلمان سائنس کی سپر پاور تھے کوئی اور قوم علم کے میدانوں میں اُن رفعتوں کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی جو مسلمانوں کو حاصل ہو چکی تھیں۔مسلمانوں کے ہاں ہزاروں سائنس دان ایک ہی وقت میں تحقیق و مشاہدے کی اُس دنیا میں مگن تھے جس نے علم کے نئے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

(Jaorge Sarton) نے اِن صدیوں کی ہر نصف صدی کو کسی سائنس دان کے نام کیا ہے اور قابل فخر بات یہ ہے کہ اِن تین صدیوں کی ہر نصف صدی کا ہیرو کوئی مسلمان صاحب علم ہی قرار پایا۔

نویں صدی عیسوی کے بعد ساڑھے تین سو سال تک ہر نصف صدی کو (Jaorge Sarton) سارٹن نے جن مسلمانوں سائنس دانوں کے نام کیا اُن کے نام ذیل میں تحریر کیے جاتے ہیں۔امت مسلمہ کے فخر یہ تیرہ نام اُس عظیم فکری تسلسل کی محض ایک علامت ہیں اِس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ یہی تیرہ سائنس دان مسلمانوں نے پیدا کیے ہیں۔

1۔ ابوموسیٰ جابر ابن حیان۔

2۔ ابوعبداللہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی

3۔ ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی

4۔ ابوالحسن علی ابن حسین المسعودی

5۔ ابوالوفا محمد ابن یحیٰ البزجانی

6۔ ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی

7۔ ابوالفتح عمر بن ابراہیم المعروف عمر خیام

8۔ ابومروان بن زہر

9۔ ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد

10۔ ابومحمد عبداللہ ابن احمد البیطار

11۔ محمد ابن مسعود قطب الدین شیرازی

12۔ ابوالفداء اسماعیل ابن علی عماد الدین الایوبی

13۔ عبدالرحمان ابن خلدون (27*)

✡✡✡✡✡✡

مسلمانوں نے فلکیات طب اور ریاضی میں جو جدتیں فراہم کیں انھی کی بنیاد پہ آج کی جدید دنیا اپنی سائنسی بنیاد استوار کر رہی ہے۔ ریاضی میں الجبرا، جیومیٹری اور ٹریگنومیٹری کی بنیادیں مسلمان ماہر ریاضیات نے ہی وضع کیں۔(Jaorge Sarton) کہتے ہیں کہ اِن صدیوں میں مسلمانوں کی رصد گاہوں میں مشاہدے اور اُن کے اندراج کا کام چوبیس گھنٹے جاری رہا کرتا۔ چنانچہ اسی دور میں علم فلکیات کی مبادیات وضع کی گئیں۔ مسلمانوں نے ستاروں کی حرکات چاند اور سورج کی گردش اور بدلتے موسموں کا نہایت عرق ریزی سے جائزہ لیا اور اپنے اِن مشاہدات کو کتابی شکل عطا کی۔ انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں علم فلکیات کے بارے میں نئے نئے انکشافات کیے گئے۔

مغرب کے بہت سے جدید سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اقوام عالم میں مسلمان پہلی قوم ہیں جنھوں نے مظاہر کائنات کے مطالعے اور مشاہدے کو اس قدر وسعت عطا کی۔ مسلمانوں نے اپنی علمی جہد وسعی کی بنیاد مطالعے مشاہدے اور تحقیق پر رکھی۔ مسلمانوں کو اقوام عالم سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ قرآن حکیم ہے جس میں خالق کائنات نے مسلمانوں کو مظاہر کائنات کا تحقیقی

مطالعہ کرنے کی طرف متوجہ کیا ہے اس لیے خطہ ارض کی دیگر اقوام تو علم کی وادی میں ذاتی منفعت یا مادیت کی ترویج و اشاعت کے لیے اترتی ہیں جبکہ مطالعہ کائنات مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے اور مسلمانوں نے علم کو ہمیشہ ایک مذہبی فریضے ہی کے طور پر لیا ہے۔ صاحب علم لوگوں نے بتایا ہے کہ قرآن حکیم کی سات سو سے زائد آیات میں عالم فطرت کو تحقیق کا موضوع بنانے کی دعوت دی گئی ہے۔ دوسری طرف یورپ کا کلیسا تھا جس نے پوری عیسائی دنیا پر فکری بندشیں لگا رکھی تھیں اس لیے کہ طاقتور کلیسا ہر اُس علمی کاوش کو رد کر دیتا جو تورات و انجیل میں نہ پائی جاتی ہو اہل کلیسا نے اپنے بہت سے اہل علم کی کتابوں کو آگ میں جلا دیا تھا کہ سائنس کی ترقی کو وہ مذہبی تنزل خیال کرتے تھے اور جب تک اہل مغرب نے کلیسا کے استحصالی نظام کو منہدم نہیں کر لیا اُن کے ہاں کسی فکری روایت نے جنم نہیں لیا۔ اس سے بعض لوگوں کو اشتباہ پیدا ہوا کہ سائنسی یا مادی میدان میں صرف اُسی وقت ترقی کی جا سکتی ہے جب انسان خود کو مذہب کے دائرے سے آزاد کر لے۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں نے سات سو سال تک علم کے جو ہزاروں نئے افق وضع کیے وہ انھوں نے مسلمان رہتے ہوئے ہی کیے تھے۔

سیاسی اور فکری ترقی کی وہ رفعت جس پہ مسلمان فائز رہے آج تک کسی اور قوم کو حاصل نہیں ہو سکی۔ دنیا میں اور کوئی ایسی قوم نہیں ہے جو کسی ایک نظریے کسی ایک کتاب اور کسی ایک رسول کی پیروکار ہو اور وہ یہ دعویٰ کرے کہ انھوں نے اقوام عالم پہ ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے جس پہلو سے بھی رفعت حاصل کی وہ اسلام سے منحرف ہو کے نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول آنحضرت محمد ﷺ کے احکامات کی پیروی کر کے ہی حاصل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو بھی علمی رفعت عطا کی وہ اس لیے تھی کہ اسلام کا مزاج علمی ہے۔ اسلام انسان کو علم کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ انبیاء مال و دولت کی نہیں علم کی میراث چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ صحابہ نے علم کی اس میراث کو عجمیوں تک منتقل کیا۔ مسلمانوں نے جو علاقے فتح کیے اُن علاقوں کی کثیر آبادیوں نے اسلام

قبول کرلیا۔تب علم کی یہ میراث دنیا تک منتقل ہوتی رہی۔مسلمانوں نے ہمیشہ علم سے محبت کی اورعلم کواپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔مسلمانوں میں علم کی بڑے پیمانے پر ترویج واشاعت اس لیے وقوع پذیر ہوئی کہ مسلمان کا حکمران طبقہ بھی علم دوست تھا۔چنانچہ جب حکومت ہی علم دوست ہواور ریاست کے تمام وسائل علم کی ترویج واشاعت کے لیے استعمال ہونے لگیں تو وہ سماج پیدا ہوتا ہے جو نویں دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کے بغداد،خوارزم ،فرغانہ ،غزنی، ہرات،ثمرقند، بخارا، خیوامراکش،طونس، اشبیلیہ،غرناطہ اور طلیطہ کا تھا۔مسلمانوں کا علوم عالم میں جو حصہ ہے اُس کا حقیقی عکس پیش نہیں کیا جاسکتا۔اس لیے کہ عیسائیوں کے مغربی پیشواؤں نے مسلم ہسپانیہ کے بہت سے علمی اثاثوں کونظر آتش کر دیا تھا تو دوسری طرف منگولوں نے بغداد میں مسلمانوں کا تقریباً تمام ہی علمی اثاثہ برباد کر دیا تھا۔

(Well Deurant) نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے علمی اثاثوں میں سے ہزار میں سے ایک کتاب جدید دنیا تک پہنچی سکی۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے علم کی کس حد تک خدمت کی۔یادرہے کہ مسلمانوں کی ایک ہزار میں ایک کتاب جو مسلمانوں تک پہنچی اُس نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کا علمی درجہ کس حد تک ارفع تھا۔مسلمانوں کی علمی رفعت کو جدید دنیا سے روکنے کے لیے اہل مغرب کے صاحب دانش نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔وہ لوگوں کو بتاتے رہے کہ مسلمان تو ایک وحشی اور اجڈ قوم ہیں۔مسلمانوں نے اگرچہ اپنے علم کو اقوام عالم میں تقسیم کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا تاہم عیسائیوں اور یہودیوں نے مسلمانوں کے اس ایثار کا نہایت ہی پست جواب دیا کہ اُن کی سرشت میں کجی ہے۔

اگرچہ مغرب نے کامل تین صدیوں تک لوگوں کو مسلمانوں کی علمی رفعت سے آشنا نہ ہونے دیا مگر اس کے باوجود مسلمانوں کی فطری علوم میں برتری کے کچھ نظائر جدید دنیا کو منتقل ہو ہی گئے ۔اگرچہ وہ مسلمانوں کا کل اثاثہ نہ تھے مگر اِن قلیل علمی اثاثہ جات سے بھی یہ بات کھل کے سامنے آگئی کہ قرونِ وسطیٰ صرف مسلمانوں کا عہد تھا کوئی قوم اس عہد میں کسی پہلو سے بھی اُن

کی شریک نہ تھی۔ مسلمانوں کی ایجادات اور انکشافات کو مغربی اہل علم کے نام کے ساتھ منسلک کرنے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ تاہم جب مسلمانوں کے اس علمی تسلسل کی تہوں کو کھولا گیا تو اس میں اس قدر وسعت تھی کہ اہل مغرب کا جھوٹ اُن کے لیے ہضم کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ ذیل کے صفحات میں فطری علوم میں مسلمانوں کی دسترس کو زیر بحث لایا جا رہا ہے جس سے یہ بات ایک بار پھر کھل کے سامنے آ جاتی ہے کہ جدید فطری و سائنسی علوم کی تمام تر بنیادیں اسی اثاثہ علم پہ استوار ہیں جو مسلمانوں نے میراث میں چھوڑا تھا یہ الگ بات ہے کہ اُس کے اصل وارث اپنی انمول رواثت کا ادراک نہ کر سکے۔ (28*)

✡ ✡ ✡

وراثت علم کے نشان

اس بات کا بہت نوحہ ہو چکا کہ مسلمانوں نے اپنی وراثت سے غفلت برتی۔ دراصل اس غفلت میں بھی بہت سے تاریخی عوامل کا عمل دخل تھا۔ مسلمان حکمرانوں نے جب علم کی دنیا سے خود کو دور کرلیا اور ہوائے نفس کے قیدی ہو گئے تو انھیں اپنوں اور غیروں کی پہچان تک نہ رہی۔ اور مسلمان حکمران ایک دوسرے کے خلاف صیہونیوں سے مدد کے طالب ہوئے۔ مسلم ہسپانیہ جب بکھرنے لگا تو کچھ لوگوں نے اپنے علم کی میراث کو سنبھالنے کی کوشش بھی کی مگر عیسائیوں کے حملے سے زیادہ ریاست کے اندرونی انتشار نے ان کی راہ روکی۔ مسلم ہسپانیہ سے حاصل ہونے والے علمی سرمایے کو مغرب نے اپنی جدید ریاستوں کی تعمیر کے لیے استعمال کیا۔ مسلمان جب سیاسی محاذ پہ مغلوب ہو گئے تو اس کا لازمی نتیجہ علم کے محاذوں سے پسپائی صورت برآمد ہوا۔ چنانچہ اہل مغرب نے مسلمانوں کی علم کے میدانوں میں حکمرانی کو بھی چیلنج کر دیا۔ جب علم کے وارث تبدیل ہوئے تو علم کے مراکز نے بھی بدلنا ہی تھا اس لیے جلد ہی لوگ قرطبہ اور اشبیلیہ کی بجائے آکسفورڈ اور لیڈز کی طرف متوجہ ہو گئے۔ علم

کے محاذوں پر اس پسپائی کے باجود مسلمانوں کے علمی اثاثہ جات کی مقدار بے انت تھی جس کا کثیر حصہ اہل مغرب نے اپنے نام پہ منتقل کرلیا۔پھر جو کچھ مغربی مورخین نے ہی مسلمانوں کے نام کے لیے چھوڑ دیا وہ بھی اس قدر کثیر ہے کہ مسلمانوں کی علمی رفعت سے آگاہی کے لیے کافی ہو جائے ۔اِن صدیوں میں مسلمانوں نے علم کے جو جہان وضع کیے ایجادات، انکشافات اور اکتشافات کے جو علمی نظائر چھوڑے اُن کا تفصیلی تذکرہ تو اس لیے ممکن نہیں کہ مسلمانوں کی میراث تو غیروں نے بانٹی تھی اس لیے اس بندر بانٹ میں جو کچھ مسلمانوں کے نام سے تاریخ کے صفحات میں محفوظ چلا آیا ہے اُس کا کچھ تذکرہ یہاں مقصود ہے۔

✡ ✡ ✡

علم کیمیا

مسلمانوں نے جو علوم وضع کیے اُن کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔علم کا ایک بہت بڑا حصہ وہ ہے جو دین اسلام کے متعلق ہے۔ مسلمانوں نے قرآن حکیم اور سنت رسول کو سمجھنے کے لیے جو علوم وضع کیے اُن کا تذکرہ یہاں اس موضوع سے متعلق نہیں۔ یہاں ہم اُن امور کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جن کو ہم فطری یا سائنسی علوم کہتے ہیں۔ مسلمانوں ہی نے سب سے پہلے فطری علوم کی جہتیں وضع کیں اور انھیں مختلف شعبوں میں منقسم کیا۔ انھوں نے علم کو کیمیا، طبیعات، حوانیات، نباتات، جمادات فلکیات اور طب کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کیا جس سے اِن علوم میں تخصص کا رجحان پیدا ہوا اور لوگوں کے لیے اِن علوم کی گہرائی تک اترنے کے مواقع پیدا ہوئے۔ مغرب کے محققین کا طریقہ کار یہ رہا ہے کہ وہ علم کے کسی بھی شعبے اور مسلمانوں کی کسی بھی دریافت کو ماضی کے کسی بھی غیر مسلم سائنس دان کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں اور انھیں اس امر میں ذرا بھی شرم محسوس نہ ہوتی۔ یہی معاملہ انھوں نے علم کیمیا کے ساتھ کیا اور علم کیمیا جو روزِ اول سے ہی مسلمانوں کا علم رہا ہے جس کی ابتدا جابر

بن حیان سے ہوتی ہے اسے بھی کسی فرانسیسی انٹوینے لارواں لوائی زیر کے نام کے ساتھ منسلک کر دیا۔

تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے مغربی اہل علم نے مسلمانوں کی علم کیمیا میں برتری کو تسلیم بھی کیا اوراس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

چنانچہ(Well Durant)نے لکھا ہے کہ!

علم کیمسٹری مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔ اِن سے پہلے یونانی مبہم سے مفروضوں کو لیے بیٹھے تھے۔ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے پیہم مشاہدات و تجربات سے کام لے کر اشیا کی ماہیت کا صحیح ریکارڈ مرتب کیا۔انھوں نے ''الانبیق'' ایجاد کیا۔اس عربی لفظ کو یورپی زبانوں نے قبول کرلیا۔

علم کیمیا دراصل پہلے الکیمی (Alchemy) تھا جس کے بطن سے علم کیمیا برآمد ہوا۔ یہ ایک پراسرار علم تھا۔کچھ لوگ آبادیوں سے دور ویرانوں میں نباتات اور جمادات کا مشاہدہ کرتے رہتے۔اُن کی خواہش یہ تھی کہ وہ لوہے کو سونے میں تبدیل کردیں۔ بعد میں جب یہ علم ہمہ گیر ہوگیا تو اس کو علم کیمیا کہا جانے لگا اوراس کی تعریف یہ کی گئی کہ یہ وہ علم ہے جو مختلف اجسام کے طبائع وخوائص سے بحث کرتا ہے۔قدیم یونانیوں کے ہاں یہ خیال راسخ تھا کہ کیمیائی عمل کے ذریعے دھاتوں کی خاصیت تبدیل کی جاسکتی ہے اور نہایت کم قیمت دھاتوں کو سونے جیسی قیمتی دھات میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جابر بن حیان کے مطلق لکھا ہے کہ وہ دھاتوں کو ذی روح (Animistic) سمجھتا تھا۔اُس کے خیال میں دیگر جاندار اجسام کی طرح دھاتوں کا بھی نشو ونما ہوتا ہے مگر یہ نشو ونما انتہائی سست رفتار ہوتا ہے اور ہزاروں سال میں مکمل ہوتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ سیسہ سونے کی نابالیدہ شکل ہے۔ جواپنے ارتقاء کا سفر طے کرتے ہوئے آخر ہزاروں سال بعد سونے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ علم کیمیا

کی اولین بنیاد اس تصور پہ رکھی ہے کہ کیمیائی عمل دھاتوں کے نشوونما کے عمل کو ہزاروں سال سے گھٹا کر سینکڑوں سال کر دیتا ہے۔ جارج سارٹن نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس یونانی حکیم نے کیمیا گری پہ کتاب لکھی اس کا نام (Democritos) تھا۔ اس کے بارے میں یقینی طور پہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس عہد میں ہوا محض ایک گمان ہے کہ اُس نے علم کیمیا پر یہ کتاب پہلی صدی عیسوی میں لکھی تھی۔ بعض نے کہا کہ تیسری صدی عیسوی میں لکھی تھی۔ جو کتابیں ڈیموکریٹس کے نام سے منسلک کی جاتی ہیں وہ یونانی زبان میں نہیں ملتیں تاہم سریانی میں موجود ہیں۔ تیسری صدی عیسوی کے آخر یا چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں زوسیموس (Zosimos) نے کیمیا گری پہ کئی کتابیں لکھیں۔ وہ پینو پولس (Panopols) کا باشندہ تھا۔ جو شمالی مصر کا ایک شہر تھا۔ قریب قریب اسی زمانے میں مصر کے شہر تھیبس (Thebes) میں اولم پیڈورس (Olympiodoros) گزرا ہے وہ اگرچہ مورخ تھا مگر اس نے علم کیمیا گری سے بھی بحث کی ہے۔

مسلمانوں کو کیمیا سازی یونانیوں اور مصریوں سے ملی تھی۔ بریفو کہتا ہے کہ عربوں نے یونانیوں سے اخذ کردہ نتائج کو اپنی تحقیق کے دوران عارضی نظریوں کے طور پر استعمال کیا۔ یہ علم ابتدا میں مصریوں کے ملمع سازوں اور خام دھاتوں کو صاف کرنے والوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ملمع ساز مختلف دھاتوں کی آمیزش سے مختلف مرکبات بناتے تھے اور اِن پر ایسا رنگ وروغن چڑھاتے کہ وہ سونا معلوم ہونے لگتا۔ اِن مرکبات کی ملمع سازی کی ترکیبوں کا راز کلیسا کے ملازموں تک محدود رہتا اور اسے عام لوگوں کی دسترس سے محفوظ رکھا جاتا۔ یہی پراسرار علم جب مسلمانوں تک پہنچا تو انھوں نے اِن ترکیبوں کو تجربات کی کسوٹی پر پرکھا اور تجربات کے ذریعے کے مختلف طریقے ایجاد کیے جن میں تقطیر (Distillation) تصعید (Sublimation) تسبیع (Fusion) اور تردیق (Filtration) کے طریقے شامل ہیں۔ مسلمانوں نے علم کیمیا کے متعلق اپنی تحقیقات کو راز بنانے کے بجائے

انھیں دنیا کے سامنے پیش کیا۔اسی لیے انھیں علم کیمیا کا بانی کہا جاتا ہے۔اور مسلمانوں کی اسی عادت کی بدولت یہ علم پھیلا اور اس کے تضمنات میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ علم کیمیا کے ضمن میں مسلمانوں کی اسی جہد وسعی کا اعتراف کرتے ہوئے (Well Deurant) نے اپنی کتاب ''مذہب کے عہد'' میں لکھا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی سائنس نے کیمیا گری کو وہ تجرباتی طریقہ تحقیق عطا کیا جو زمانہ حال کی ترقی کا سب سے عظیم اور قابل فخر آلہ کار ہے۔جابر بن حیان کے پانچ سو سال بعد جب راجر بیکن نے اسی طریقہ تحقیق سے یورپ کو روشناس کر کے علم کی روشنی پھیلائی تو دراصل یہ روشنی مسلم ہسپانیہ ہی کی رہین منت تھی۔خود اسلام میں یہ روشنی مشرقی اسلام سے آئی تھی۔اسی ضمن میں یہاں کچھ مسلمان کیمیا گروں کا ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

جابر بن حیان۔

پورا نام جابر ابن حیان الازوی الطرطوسی الحرانی ہے۔جارج سارٹن نے اِن کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات نہیں لکھی۔تاہم انھوں نے کہا کہ 776ء میں اِن کا کوفہ میں پایا جانا معلوم ہے۔البتہ (Well Deurant) نے اِن کی تاریخ پیدائش (702-765) لکھی ہے۔ تاہم دونوں بیانات میں تطابق ممکن نہیں۔جابر بن حیان کو علم کیمیا کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ایک مسلمان مورخ سیّد امیر علی نے اپنی کتاب ''اسپرٹ آف اسلام'' میں لکھا ہے کہ جابر بن حیان دراصل امام جعفر صادق کا شاگرد تھا۔سیّد امیر علی نے لکھا ہے کہ امام جعفر صادق خود بھی سائنس دان تھے اور انھی کے فراہم کردہ مواد پر جابر نے اپنے تحقیقی کام کی بنیاد رکھی تھی۔

جابر بن حیان نے دو ہزار صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس میں کیمیا گری کے مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ جارج سارٹن نے جابر بن حیان کے متعلق بہت سی تفصیلات فراہم کی ہیں وہ کہتا ہے کہ وہ بہت سی کتابیں جن کو جابر بن حیان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اُن میں دو طرح کے علمی تصورات پائے جاتے ہیں۔ اول یہ کہ بے جان اشیاء جیسے کہ دھاتیں بھی ذی روح ہوتی ہیں۔ تاہم یہ خیال چونکہ جدید سائنس سے ہم آہنگ نہیں اس لیے اسے کوئی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ جابر بن حیان کا دوسرا علمی تصور یہ تھا جس میں اُس نے کیمیاوی تحقیق کے نہایت معقول و معتبر طریقے بیان کیے ہیں۔

اُس نے دھاتوں کی بناوٹ اور تشکیل کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ علم طبقات الارض کی رو سے بالکل صحیح ہے۔ یہ طریقہ بھی صحیح ہے کہ چھ دھاتیں گندھک اور پارے کے اختلاف کے باعث ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جابر بن حیان نے کیمیاوی عمل سے مختلف چیزیں تیار کرنے کے جو اصول وضع کیے اُن کو آج کی جدید دنیا میں بھی درست قرار دیا جاتا ہے۔ جابر بن حیان کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اُن کی عربی تصانیف کا جائزہ لیا جائے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جابر بن حیان اپنے وقت کا کس قدر بڑا عالم تھا۔ یہاں موقع نہیں کہ ہم اُن کی کتابوں میں دیئے گئے علمی معاملات سے بحث کریں اس لیے یہاں صرف اُن کی کتابوں کے نام تحریر کریں گے۔ یورپ نے جابر بن حیان کے سارے سرمایے کو انگریزی زبان میں منتقل کر دیا اس لیے اب صرف اُن کی یہی کتابیں دستیاب ہیں۔

1- The book of the kingdom.

2- The little book of the balances.

3- The book of Mercury.

4- The book of concentration.

5 The book of Eastern Mercury.

جابر کی جو کتابیں لاطینی زبان میں مرتب کی گئیں اُن کو(Sumpa Perfectinoise) کہا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

(Well Deurant) نے جابر بن حیان کے بارے میں لکھا ہے کہ اُس کا پیشہ طبابت تھا مگر وہ اپنا بیشتر وقت الانبیق اور کھٹالی (Crucible) کی مدد سے تجربات میں گزارتا تھا۔ جابر کے والد کوفہ میں عطاری کا پیشہ کرتے تھے۔ تاہم جابر نے علم کیمیا میں مقام پیدا کیا۔ اُس نے تحقیق کے جو طریقے اختیار کیے وہ آٹھویں، نویں اور دسویں صدی تک بھی رائج رہے۔ ایک اور مغربی محقق (M,Berthelot) نے جابر بن حیان کے نام کے ساتھ کچھ اور کتابوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اُس نے کہا میں جابر کی ایک ایسی کتاب کو جانتا ہوں جو تین جلدوں پہ مشتمل تھی اور جسے 1893ء میں پیرس سے شائع کیا گیا تھا ایک مغربی مترجم (Octave Hondas) نے کہا کہ اُس نے جابر بن حیان کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا جو 1922ء میں برلن سے شائع کی گئیں۔ جابر بن حیان سے منسوب کچھ اکتشافات، انکشافت اور دریافتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۔ جابر بن حیان سے ہی علم کیمیا کا آغاز ہوتا ہے۔ جابر بن حیان 850ء میں پیدا ہوا۔ نویں صدی کو مسلمانوں کی علمی رفعت کی صدی قرار دیا جاتا ہے چنانچہ اس صدی میں مسلمان کیمیا دانوں نے بہت سے انکشافات کیے اور علم کیمیا کو ترقی کی انتہاؤں تک پہنچایا۔

✡✡✡✡✡✡

۔ علم کیمیا کو مسلمانوں نے ایک بہت زبردست اطلاقی اور تجرباتی علم بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کے تجربات اور مشاہدات کے بعد ہی انسان اس قابل ہو کہ اس علم سے وہ زرگری، رنگائی، زنگ ربائی اور دواسازی جیسے کام لے سکے۔

✡✡✡✡✡✡

۔ مسلمانوں نے علم کیمیا کی تقطیر (Distillation) تصعید (Sublimation) تسیخ (Fusion) اور تردیق (Filtration) کے لیے تمام قسم کے آلات ایجاد کر لیے تھے۔

✡✡✡✡✡✡

۔ جابر بن حیان نے ہی سب سے پہلے تحلیل (Solution) تقطیر، تبخیر، کشید، تبلیر تکلیس اور تصعید کے اصولوں کو فروغ دیا۔ اِن میں سے بعض تجرباتی اعمال مثلاً تکلیس (Callcination) اور تحلیل (OXidatino) جابر بن حیان ہی کی دریافتیں ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

۔ جابر بن حیان نے بہت سے مرکبات ایجاد کیے جن کا تذکرہ انھوں نے اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ چنانچہ شورے کا تیزاب، ملح القلی، نوشادر، چاندی کا شورہ، زیبق سلمانی اور راسب الاحمر وغیرہ جابر بن حیان ہی کی دریافتیں ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

۞۔ جابر بن حیان ہی نے نمکیات کی کئی قسموں کو دریافت کیا۔

✡✡✡✡✡✡

۞۔ جابر بن حیان ہی نے کئی قسم کے تیزاب بنائے۔جن میں نائٹرک ایسڈ ہائیڈروکلورک ایسڈ،سلورنائٹریٹ اور ایمونیا کلورائیڈ شامل ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

۞۔ جابر بن حیان ہی نے کاغذ اور کپڑے کو رنگنے کا فن دنیا تک پہنچایا۔بالوں کو سیاہ کرنے کے لیے خضاب تیار کیا۔موم جامہ بنایا،گریس بنانے کا فارمولا ایجاد کیا۔

✡✡✡✡✡✡

۞۔ جابر بن حیان کے کارناموں میں یہ بھی شامل ہے کہ انھوں نے ایسا کاغذ ایجاد کیا جسے آگ جلا نہ سکتی تھی،ایسی روشنائی تیار کی جس سے لکھی ہوئی تحریر کو تاریکی میں بھی پڑھا جا سکتا تھا ،جابر بن حیان نے ہی ایسا لباس تیار کیا تھا جسے پہن کر انسان آگ میں کود جائے تب بھی آگ اسے نہ جلاتی تھی۔جابر بن حیان نے ایسا کیمیکل تیار کیا تھا جسے اگر لکڑی پر لگا دیا جائے تو وہ جلنے سے محفوظ رہتی تھی انھوں نے ہی ایک ایسا پتھر تیار کیا تھا جس سے زخموں کو مندمل کیا جاتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے ایک ایسا تیزاب تیار کیا تھا جو سونا پگلا دیتا تھا۔اس کا نام ماء الملوک تھا۔

✡✡✡✡✡✡

۞۔ جابر بن حیان کے بیان سے کسی کو یہ اشتباہ نہ ہو کہ عربوں میں صرف جابر بن حیان ہی

واحد کیمیا دان تھا۔حقیقت یہ ہے کہ عربوں میں سینکڑوں کیمیادان تھے جنھوں نے نائٹرک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ، نائٹروہائڈروکلورک ایسڈ ،لائیکر ایمونیا، مرکری، کلورائڈ ، مرکری آکسائیڈ، پوٹاشیم نائٹریٹ،فرائی سلفاس اورالکحل وغیرہ سے دنیا کوآشنا کیا۔

✡✡✡✡✡✡

عطارد ابن محمد الحاسب۔

نویں صدی کا مسلمان کیمیادان تھا۔اُس نے جواہرات کی ماہیت پر ایک کتاب لکھی۔جس کا نام (lapidary) بیان کیا گیا ہے۔جوہرات کے موضوع پر اسی کتاب کوانسانی تاریخ کی سب سے پہلی کتاب تصور کیا جا تا ہے۔الرازی نے عطارد ابن محمد الحاسب کا ذکر تکریم کے ساتھ کیاہےاوراُن کی علمی خدمات کااعتراف کیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوبکر محمد بن زکریاالرازی۔

ابوبکر محمد بن زکریاالرازی کا ذکر عام طور پہ اطبامیں کیاجا تا ہےاورانھیں مسلمانوں کا سب سے بڑااطبیب قرار دیا جا تا ہے۔مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ کیمیادان بھی تھےاورعلم طبیعات (فزکس) میں بھی دسترس رکھتے تھے۔مورخین نے لکھا ہے کہ ابوبکر محمد بن زکریا الرازی صحیح معنوں میں کیمیادان تھا۔انھوں نے علم کیمیا پر کئی کتابیں لکھیں۔رزای نے ایک کتاب خاص اُن آلات

پہ لکھی ہے جو کیمیائی تجربات میں استعمال ہو تے تھے۔جمادات وغیرہ کا اصطفاف (Classification) کیا اور اپنی کیمیائی معلومات کوطب میں استعمال کیا ۔اُس کی مشہور کتاب ''الحادی ''کا 1486ء میں لاطینی ترجمہ کیا۔رازی نے اپنی کیمیائی معلومات کوعلم طب میں استعمال کیا۔اُس کی دوسری مشہور کتاب کا نام ''کتاب المنصوری ''ہے۔جس کا 1481ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔یہ وہ کتاب ہے جس کوبکثرت شائع کیا گیا۔رازی کی نویں کتاب نے بھی بہت مقبولیت حاصل کی۔اسے الگ کر کے بہت دفعہ شائع کیا گیا۔رازی نے 184 کتابیں لکھیں جن میں بیس کیمسٹری پہ تھیں ۔رازی کی کتابیں سترہویں صدی تک یوپ کے نصاب میں شامل تھیں۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالفیض ثوبان ابراہیم الاخمیمی۔

وہ اپنے نام کے بجائے اپنے لقب سے زیادہ مشہور تھا۔اُس کا لقب ذوالنون تھا اُس کی تاریخ ولادت تو معلوم نہیں ہوسکی تاہم جارج سارٹن نے اُس کی تاریخ وفات ضرور لکھی ہے۔اُس کا انتقال 859ء میں ہوا۔ذولنون وہ شخص تھا جس نے اول اول اسلامی عقائد میں صوفیانہ طرز عمل کوشامل کیا۔صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کیمیادان بھی تھا۔اُس نے کیمیاسازی پر ایک جامع کتاب لکھی جس کا نام ''مجربات'' بیان کیا گیا ہے۔ابن ندیم نے اس کا نام کیمیا سازوں میں شامل کیا ہے۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ جابر بن حیان کا ہم عصر تھا۔وہ بالائی مصر کا رہنے والا تھا اور ایک مقام اخمیم کا باشندہ تھا۔بعض نے کہا کہ اُس کا وطن ثوبیہ تھا۔ذولنون نے ہی اول اول تصوف کے اوصول وقواعد وضع کیے۔ دراصل اُس کی کوشش یہ تھی کہ وہ مختلف

مذاہب کو ملا کر نیا مذہب ایجاد کرے مگر اُس کی مہربانی سے اسلام میں بدعقیدگی در آئی۔ جارج سارٹن لکھتا ہے کہ اس نے عیسائیت غناسطیت اور بدھ مت سے اخذ ہونے والے نظریات کو اسلامی ڈھانچے میں سمو کر اسلامی تصوف کی تشکیل کی۔ دراصل یہ مختلف ادیان کے عقائد کا مغلوبہ تھا جس نے اسلام کو نقصان پہنچانے کے علاوہ انسانیت کی اور کوئی خدمت نہیں کی۔

✡✡✡✡✡✡

✍ ابو علی الحسین ابن عبداللہ ابن سینا۔

ہم انھیں ابن سینا ہی کے نام سے جانتے ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی سے ہم انھیں مسلمانوں کے بہت قابل عزت حکیم کے طور پہ جانتے ہیں۔ ابن سینا نے لوگوں کو اس جاہلیت سے روکا جس میں بعض نے اپنی پوری زندگی برباد کر لی تھی انھوں نے تجربات اور دلائل سے اس بات کو ثابت کیا کہ لوہا کبھی سونا نہیں بن سکتا اس لیے کہ ہر دھات کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اگرچہ دھاتیں کیمیاوی عمل سے اپنی ہیت تبدیل کرتی ہیں مگر وہ اپنی فطری بنیاد کو برقرار رکھتی ہیں۔ ابن سینا کا تفصیلی ذکر اُن کے اصل میدان یعنی علم طب کے ضمن میں کیا جائے گا۔

✡✡✡✡✡✡

✍ ابو منصور موفق ابن علی النہری۔

بنیادی طور پہ وہ ایک ہیت دان تھا۔ تاہم علم کیمیا سازی پر بھی اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ اس کی

کتابوں کے تراجم لاطینی زبان میں کیے گئے ۔ اُس کی ایک کتاب ”رتبۃ الحکم“ (Sages Step) کا 1252ء میں ترجمہ کیا گیا۔
ابومنصور ابن علی نے دواسازی کے ضمن میں بہت سے کیمیائی تجربات کیے۔اس لیے اس کا نام دواسازوں اور اطباء میں بھی لیا جاتا ہے ۔ابومنصور ابن علی نے سوڈیم کاربونیٹ اور پوٹاشیم کاربونیٹ کا فرق نمایاں کیا۔وہ علم کیمیا میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا۔چنانچہ اُس نے بہت سے جمادات اور دیگر اشیاء کی خاصیتیں دریافت کیں اور مرکبات بنانے کے طریقے دریافت کیے۔وہ سنکھیا اور تانبے کے آکسائیڈ،سلیکا کے تیزاب اور سرمے کی خاصیتوں سے واقف تھا ۔ابومنصور ابن علی نے تانبے اور سیسے کے مرکبات کے زہریلے اثرات کی نشاندہی بھی کی۔اُسی نے ان بجھے چونے کی اس خاصیت کو واضح کیا کہ اس سے انسانی بال اُڑ جاتے ہیں۔ابومنصور علی پلاسٹک آف پیرس کے استعمال اور اس کے اجزائے ترکیبی سے آگاہ تھا۔چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ ابومنصور بن علی النہری نے علم کیمیا کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور اس کا شمار بھی مسلمان کیمیاسازوں میں کیا جاسکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوبکر محمد ابن یحییٰ ابن الصائغ۔

ابوبکر محمد کا شمار علم کے کس شعبے میں کیا جائے مورخین اس بات میں متفرق ہیں کیونکہ ابوبکر محمد نے صرف بتیس سال میں علم کی تمام جہتوں کو چھولیا تھا۔وہ کیمیادان بھی تھا،دواساز بھی تھا طبیب بھی تھا،ریاضی دان بھی تھا،فلسفی بھی تھا،ہیئت دان بھی تھا اور اعلیٰ پائے کا شاعر بھی تھا۔ابوبکر محمد 1106ء میں پیدا ہوا۔ابن باجہ کے نام سے شہرت حاصل کی۔اُس کا باپ سنار تھا۔ابن

باجہ نے عملی زندگی کا آغاز اپنے باپ کی زیورات کی دکان سے کیا۔مگر علم کی پیاس اُسے چین نہ لینے دیتی تھی۔چنانچہ اُس نے اپنے باپ کی دوکان چھوڑ دی اور علم کی راہ میں منہمک ہو گیا۔ اس علمی سفر میں پہلے وہ ایک فلسفی کے طور پہ جانا گیا کہ فلسفے پہ اُس کی دو کتابوں ''**کتاب المتوحد اور رسالہ الوداع**'' نے بہت شہرت حاصل کی۔اس نے بطلیموس کے اُن نظریات کو رد کر دیا جو اُن نے علم ہیت کے سلسلے میں وضع کیے تھے۔اُس نے بطلیموس کے نظریات کی صرف تنقیص ہی نہیں کی بلکہ اُس کی جگہ نئے نظریات پیش کیے۔ابن باجہ کے اِن نظریات کو پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کے اتباع میں ابن الطفیل اور البطر وجی نے بھی بطلیموس کے ہیتی نظریات پہ تنقید کی۔انھوں نے ابن باجہ کے نظریات کو بطلیموس کے تاریخی نظریات پہ ترجیح دی۔ ابن باجہ نے علم ریاضی میں بھی خاطر خوہ اضافہ کیا اور علم ہندسہ(Geometry) پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔اور وہ اعلیٰ پائے کا شاعر بھی تھا۔سراقطہ کا گورنر اس کی شاعری کا دلدادہ تھا۔اپنے باغیانہ اور فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے حکومت وقت اس کی شدید مخالف تھی۔چنانچہ اُسے کئی بار جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی تھی۔کہتے کہ لوگ اس کے علم سے جلتے تھے اس سے حسد کرتے تھے اس لیے کہ کسی دشمن نے اسے زہر دے کر مار دیا تھا وہ محض 32 سال زندہ رہا۔

✡✡✡✡✡✡

عزالدین علی ابن ابدمر ابن الجلا۔

مورخین نے عزالدین کی تاریخ ولادت و وفات نہیں لکھی۔صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ 1339 سے 1342ء کا عرصہ اُس نے دمشق و قاہرہ میں گزارا۔عزالدین کو مسلمانوں کا بہت

بڑا کیمیادان قرار دیا جاتا ہے۔عزالدین نے علم کیمیا پر بیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ جارج سارٹن نے اُس کی پندرہ کتابوں کے نام لکھے ہیں۔عزالدین کی ساری کتابوں کے نام معلوم نہیں ہوسکے۔مورخین نے عزالدین کی جن کتابوں کا تذکرہ کیا اُن میں سے کچھ کے نام ذیل میں تحریر کیے جاتے ہیں۔

1- البدر المنیر فی اسرار اکبیر
2- بغیۃ الخبیر فی قانون طلب الاکثیر
3- البربان فی اسرار علم المیزان (4 جلدین)
4- الدر المنشور
5- الدر المکنون فی شرح قصیت ذی النون
6- المصباح فی اسرار رعلم المفتاح
7- نتائج الفکر افی احوال الحجر
8- نہایۃ الطب فی شرح مکتب
9- شذو ر الذھب

اپنی اِن کتابوں میں عزاالدین نے علم کیمیا کے متعلق بہت سے انکشافات کیے ہیں جن سے آنے والی نسلوں نے علمی استفادہ کیا۔عزہ الدین نے دیگر امور کے علاوہ دھاتوں کی ماہیت پہ بھی بہت روشنی ڈالی ہے۔چنانچہ اُس نے سونے اور چاندی کے مخلوط مرکب سے چاندی علیحدہ کرنے کی غرض سے شورے کا تیزاب استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے۔انیسویں صدی میں عز الدین کی بعض کتابیں ممبئی اور قاہرہ میں دوبارہ شائع کی گئی ہیں جو اب بھی دستیاب ہیں۔ مورخین نے اُس کی تاریخ وفات 1361ء لکھی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالقاسم عبداللہ ابن علی الکاشانی۔

ابوالقاسم تیرہویں صدی کا کیمیا دان تھا۔ابولقاسم کی کتابوں اور اُس کے علم کیمیا کی مہارت کے بارے میں مورخین نے زیادہ نہیں لکھا۔تاہم حال ہی میں ترکی میں اُس کی ایک کتاب دریافت ہوئی ہے جس سے اُس کی علم کیمیا میں مہارت کے بارے میں شواہد ملے ہیں۔اس کتاب میں ابولقاسم نے مٹی کے برتنوں کو شیشے کے پانی سے چمکانے کی وہ ترکیب لکھی ہے جو اُس زمانے میں مسلمانوں کے ہاں رائج تھی ۔ یہ کتاب تبریز میں لکھی گئی تھی اور اس کا نام جارج سارٹن کے حوالے سے ہم تک پہنچا ہے " **کتاب الجواھر العرانس و اطائب النفائس**" اس کتاب میں قیمتی پتھروں سے بھی بحث کی گئی ہے اور خوشبو بنانے کے کیمیائی طریقے بھی درج کیے گئے ہیں۔جارج سارٹن لکھا ہے کہ شاید یہ کتاب عثمانی سلطان اول کے عہد میں ترکی پہنچی ہوگی۔

✡✡✡✡✡✡

ابواسماعیل الحسن ابن علی الطغرائی۔

گیارہویں صدی کا مسلمان سائنس دان تھا۔1061ء میں اصفہان میں پیدا ہوا۔موصل کے سلجوقی حکمران سلطان مسعود ابن احمد کا وزیر تھا۔ابواسماعیل ابوالحسن نے علم کیمیا پر کئی کتابیں لکھیں اور بہت سے انکشافات کیے۔وہ ایک عمدہ شاعر بھی تھا پھر جب اُس کی شاعری میں الحاد کا رنگ درآیا تو بغداد کی اسلامی خلافت نے اسے طلب کیا۔تب شاید اُس کا علم ہی اُس کے لیے حجاب بن چکا تھا اُس نے ملحد ہونے کا اقرار کرلیا۔بغداد کی اسلامی ریاست نے اس کے

لیے سزائے موت تجویز کی۔ ساٹھ سال کی عمر میں 1121ء میں اسے تختہ دار پہ چڑھا دیا گیا۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالحسن علی ابن موسیٰ ابن ارفع النجیانی۔

گیارہویں صدی کا مسلمان کیمیا ساز تھا۔ ابوالحسن دھاتوں کا ماہر تھا۔ اُس نے پارس پتھر پہ تحقیق کی۔ اُس نے اپنی تحقیق کے نتائج کو منظوم کیا۔ ابوالحسن کی نظموں کے مجموعے کا نام " **شذور الذهب فی من السلامات** " تھا۔ 1196ء میں فاس کے شہر میں اُس کا انتقال ہوا۔

✡✡✡✡✡✡

شمس الدین ابوعبداللہ محمد۔

تیرہویں صدی کا مسلمان کیمیا دان تھا۔ اصل میں تو وہ ایک جغرافیہ دان تھا اور اُس کی وجہ شہرت جغرافیہ ہی ہے۔ تاہم (Jaorge Sarton) کا خیال ہے کہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد بہت عمدہ کیمیا ساز بھی تھا۔ جارج سارٹن کا خیال درست ہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ شمس الدین ابوعبداللہ محمد نے اپنی موقر کتاب " **کتاب نجب الدهر فی عجائب البر و البحر** " میں مختلف دھاتوں کے خصائص سے تفصیلی بحث کی ہے۔ انھوں نے لوہے، تانبے، سونے چاندی، جست، ٹین سیسے اور جواہرات کے خصائص پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس سے اُن کی علم کیمیا میں دسترس کا اظہار ہوتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

عبداللہ ابن علی کاشانی۔

عبداللہ کاشانی اصل میں تو فن غضارہ میں کمال رکھتا تھا۔فن غضارہ اُس فن کو کہتے ہیں جس کے ذریعے برتنوں پر دیدہ زیب نقش نگاری کی جاتی ہے۔اور انھیں مختلف رنگوں سے مزین کیا جاتا ہے۔ بعد میں اسی فن کو استعمال کرتے ہوئے مسلمان نقش نگاروں نے مساجد اور بادشاہ کے محلات کے دیوار و در کو وہ حسن دیا جس کی نظیر دنیا کی کسی اور قوم میں کم ہی ملتی ہے۔عبداللہ ابن علی کاشانی کا سارا خاندان اسی فن سے وابستہ تھا۔چنانچہ اُس کے بھائی یوسف ابن علی محمد نے 1306ء میں امام یحیٰ کے مقبرے کی وہ خوبصورت اور تاباں محراب بنائی جس کو آج لینن گراڈ کے عجائب گھر میں دیکھا جاسکتا ہے۔فن غضارہ دراصل تو علم کیمیا ہی کی ایک شاخ ہے کہ برتنوں یا دیواروں پر جو کام کیا جاتا ہے اُسے کیمیائی عمل کے ذریعے ہی وہ پختگی حاصل ہوتی ہے کہ اُن کے رنگ صدیوں تک قائم رہتے ہیں اور موسموں کی شدت کو برداشت کے باوجود ماند نہیں پڑتے۔اس فن میں جو کیمیکل استعمال ہوتے ہیں انھیں مسالہ کہا جاتا ہے۔اول اول یہ فن صرف ایک محدود علاقے تک محدود تھا اور اسے صرف کاشان اور اصفہان کے لوگ جانتے تھے۔تاہم بعد میں یہ فن بغداد اور تبریز تک پھیل گیا۔اہل کاشان کے بنائے ہوئے دیدہ زیب برتن کرمان، خراسان، یزد، اصفہان، تبریز، ایشیائے کوچک یعنی چین اور اس کے بعد فرانس تک پسند کیے جاتے تھے۔اُن کی ہفت رنگ مینائی اور آرائش کی دنیا بھر میں دھوم تھی۔فن غضارۃ پہ حال ہی میں ایک کتاب دریافت ہوئی ہے۔جارج سارٹن کے دعویٰ ہے کہ یہ کتاب عبداللہ ابن علی کاشانی کی لکھی ہوئی ہے۔اس کتاب میں اُن طریقوں سے بحث کی گئی ہے جو فن غضارۃ کی بنیاد ہیں۔اسی کتاب سے معلوم ہوا ہے کہ برتنوں پر مسالے کے استعمال کے کئی طریقے ہیں۔یہ صنعت کاشان، بغداد اور تبریز کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی تھی کہ انھی علاقوں

میں وہ اجزا آسانی سے دستیاب تھے جو فن غصارۃ کی ضرورت ہیں۔ دیواروں کو مزین کرنے کے لیے جو رنگین ٹائلیں لگائی جاتی تھیں وہ اِسی صنعت کا کمال ہے۔ مغل جب ہندوستان پر قابض ہوگئے تو اُن کے ساتھ بہت سے کاری گر بھی آئے جو فن کاشی گری میں ماہر تصور کیے جاتے تھے۔ چنانچہ مغلوں کی تعمیر کی گئی عمارات میں فن کاشی گری کی جھلک کو نمایاں طور پہ دیکھا جاسکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوزیدولی الدین عبدالرحمان ابن محمد ابن خلدون۔

کچھ صدیاں قبل علم میں تخصص کا رجحان نہ تھا۔ ایک ہی شخص علم کی مختلف جہتوں کا مطالعہ کرتا اور اپنی تحقیق سے لوگوں کو آگاہ کرتا۔ تب اس بات کو علم کی کمی خیال کیا جاتا کہ کوئی شخص خود کو علم کی کسی ایک شاخ تک محدود کرلے۔ ابن خلدون ہی کو لے لیں۔ ہم نے ایک مورخ اور علم عمرانیات کے ماہر کے طور پہ جانتے ہیں مگر جارج سارٹن کا کہنا ہے کہ ابن خلدون اعلیٰ درجے کا کیمیادان بھی تھا۔ علامہ ابن خلدون نے علم کیمیا پر جو کچھ لکھا ہے نہایت ہی ماہرانہ انداز میں لکھا ہے۔ جارج سارٹن کہتا ہے کہ جس روشن دماغی سے ابن خلدون نے علم کیمیا کا احاطہ کیا ہے ویسا کسی اور نے نہیں کیا۔ خالد بن یزید بن امیر معاویہ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ بنوامیہ کا واحد کیمیادان تھا۔ اگرچہ وہ علم طب میں بھی ماہر تھا۔ سید امیر علی نے " **مسلمانوں کی مختصر تاریخ** " میں یزید بن معاویہ کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں وقت کے کیمیا دانوں پر جو سیر حاصل مباحث کیے ہیں انھیں عمدہ قرار دیا جاتا ہے ابن خلدون دراصل ایک روشن خیال شخص تھا جس نے لوہے کو سونا بنانے کی کیمیا گری کی نفی کی ہے اور بعض کیمیا گروں کی دھاتوں کی ماہیت میں تبدیلی کے

نظریے پر شدید تنقید کی ہے۔علامہ ابن خلدون نے کہا کہ خالد بن یزید سے منسوب کتابیں اُس کی نہیں ہوسکتیں۔اُس کے علم کا درجہ اس قدر نہ تھا کہ وہ اتنی بسیط کتابیں لکھ سکتا۔اس کے علاوہ ابن خلدون نے امام غزالی کے نظریات پہ بھی شدید تنقید کی ہےاور کہا کہ امام غزالی نے علم کیمیا سے انکار کیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ امام غزالی تصوف کے سوا دیگر علوم کو لغو محض جانتے تھے۔علامہ ابن خلدون نے علم عمرانیات کی بنیاد رکھی۔اپنی تاریخ کے مقدمے میں علامہ ابن خلدون نے تاریخ،سماجیات،معاشیات ارضیات،عمرانیات اور جغرافیہ سمیت کتنے ہی علوم کو سمو دیا ہے۔(29*)

✡ ✡ ✡

علم طبعیات

قرونِ وسطیٰ میں طبعیات کا میدان بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔اس علم میں مسلمانوں کی دسترس مسلّمہ تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ علوم کا تخصص نہ ہونے کی وجہ سے لوگ علوم کو متفرق نہ کرتے تھے اور ایک ہی شخص ماہر کیمیا، ماہر طبعیات، ماہر ریاضیات، ماہر فلکیات اور ماہر طبیب ہوسکتا تھا۔جیسا کہ ابن الہیثم اور رازی اِن تمام علوم کے ماہر تھے۔علم طبعیات کی ترقی میں مسلمانوں کے کردار کے بارے میں زیادہ معلومات اگلے زمانے تک منتقل نہ ہوسکیں جس کی کئی وجوہات ہیں۔ایک تو یہ کہ مسلمانوں کی بہت سی دریافتیں اور انکشافات عیسائیوں نے اپنے نام پہ منتقل کر لیے کہ علمی بددیانتی میں کوئی اور قوم اُن کی برابری نہیں کرسکتی تھی۔ڈینو برونو جواُن کا سب سے بڑا ماہر نفسیات جانا جاتا ہے اُس کے سارے علم کی اساس امام غزالی کے نظریات کی چوری پہ رکھی تھی۔اہل مغرب جب مسلمانوں کی کتابوں کا ترجمہ کرتے تو کتاب کے مصنف کا نام بگاڑ دیتے۔ چنانچہ انھوں نے الرازی کو Rhazes، ابن سینا کو Avicenna، ابن رشد کو Averroes، البستانی کو

Albatinius اور ابن الہیثم کو Alhazem بنا دیا جس سے اُن کی پہچان مخفی ہوگئی۔

دوسری وجہ اس سے قبل بیان ہو چکی ہے کہ علم میں تخصص نہ ہونے کی وجہ سے مختلف علوم باہم مربوط رہے۔ تخصص کا عہد تو بعد میں آیا۔ تاہم محققین نے علم طبیعات کے ضمن میں مسلمانوں کے کردار کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں اُس کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے علم طبیعات یعنی فزکس میں بھی قابل فخر علمی سرمایہ پیچھے چھوڑا ہے۔

زمانہ وسطی کے نامور مسلمان طبیعات دانوں میں الکندی، الرازی، ابن سینا، الخازنی البیرونی، ابن الہیثم، الطّوسی، شیرازی، الفارسی، ابن یونس اور ابن ماجہ شامل ہیں جنھوں نے مادہ حرکت، زمان و مکان، مناظر و مرایا، بصریات، سکون، حرکت، قوت رفتار، روشنی، روشنی کی رفتار، حرارت، خلا، آواز، میکانیات، مادے کی کثافت، کشش ثقل، زمین کی گردش، زمین کا گول ہونا، پینڈولم کی ایجاد، فلکیاتی گلوب، ہوا کا لچیلا پن، مقناطیسی کمپاس کی ایجاد، بندوق منجنیق کا استعمال، علم المناظر، مکینیکل کیلنڈر اور قوس قزح جیسے علمی موضوعات پہ تحقیق کی اور اپنی تحقیق سے حاصل ہونے والے نتائج سے ایجادات کے سلسلہ کو آگے بڑھایا۔ سائنس جب اہل مغرب کے ہاتھ آئی تو وہ کافر ہوگئی اگرچہ یہی سائنس ہزار سال تک مسلمان تھی کہ مسلمان جب تک سیاسی اور عسکری طور پہ غالب رہے۔ وہ علم کے میدان میں بھی غالب رہے۔ مسلمانوں کے کسی علمی نظریے میں خالق سے بغاوت کی بو نہیں آتی جب کہ جدید سائنس کے بانیوں نے اس علم کو بغاوت کی آخری حد تک پہنچا دیا۔ انھوں نے انسان کی جو تعریف کی، اُس کے مقصد زیست کو جس طرح متعین کیا وہ اِن کی علمی اور عقلی پستی پہ روشن دلیل پیش کرتی ہے۔ مغرب نے انسان کو ڈالر پیدا کرنے والی مشین بنا دیا ہے۔ انھوں نے انسان کو جنسی حیوان بنا دیا ہے۔ انھوں نے انسان کو جانور سے پست اخلاقی رویوں کی طرف مائل کر دیا ہے۔ انھوں نے انسان کو خلا میں تو پہنچا دیا ہے مگر زمین پہ رہنا نہ سکھا سکے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ علم چاہے طبیعات کا ہو چاہے کیمیا کا، علم چاہے طب کا ہو یا جغرافیے کا، علم چاہے موسیقی کا ہو یا

ادب کا، علم کا ہر پہلو جو انسان پہ منکشف ہوتا ہے وہ خالق کا ایک راز ہوتا ہے جس تک انسان اپنی جہد و سعی سے پہنچتا ہے۔اب خالق کے کسی راز تک جب کوئی ایسا شخص رسائی حاصل کرتا ہے جس کے ذہن میں پہلے ہی یہ خیال راسخ ہو کہ کوئی خالق ہے ہی نہیں۔تب علم کے اُس راز سے مثبت نتائج کی امید کرنا عبث ہے۔تب علم کا ہر راز انسانیت کا چہرہ لہو سے سرخ کرتا ہے ۔انسان بارود بناتا ہے، ایٹم بم بناتا ہے، ہائیڈروجن بم بناتا ہے نیپام بم بناتا ہے اور اپنے ہی جیسے انسانوں پر آگ اور لوہے کی اس قیامت کو بپا کر دیتا ہے۔ذرا غور کریں یہی سائنس جب مسلمان تھی تو تب وہ لوگوں کے لیے سہولت کا باعث تھی۔لوگوں کے لیے آسانی فراہم کرنے والا علم تھی مگر یہی سائنس جب کافر ہوئی تو پہلی جنگ عظیم میں ایک کروڑ اور دوسری جنگ عظیم میں دو کروڑ انسان سائنسی کفر کی نذر ہو گئے۔

دیکھیں کہ ایک مغربی ماہر فزکس جب نظام شمسی سے کسی سیارے کا محور (Orbit) دریافت کرتا ہے تو اُس کی یہ دریافت اُس پہ اس سیارے کے صرف مادی پہلو کو اجاگر کرے گی۔تاہم یہی انکشاف کسی مسلمان سائنس دان کے سامنے ہو تو وہ اس کے مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر غور کرے گا۔شاید بعض لوگوں کے لیے روحانیت اور فزکس کا ملاپ کچھ اجنبی سا ہو تو اُن کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ قرآن پڑھیں کیونکہ قرآن میں فرمایا گیا کہ زمین و آسمان کے بیچ جو کچھ ہے چاہے وہ لوہا ہو، چاہے وہ پہاڑ ہوں چاہے وہ ہوائیں ہوں، چاہے وہ سورج اور چاند جیسے پر ہیبت سیارے ہوں، چاہے وہ زمین ہو، چاہے وہ آسمان ہو چاہے وہ بادل ہوں، چاہے وہ رعد و برق ہو خالق کی تسبیح بیان کرنے میں محو ہیں۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ!

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيۡمًا غَفُوۡرًا○

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل 17/ 44)

ترجمہ:

اس کی پاکی تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں بیان کر رہی ہیں جو آسمان اور زمین کے مابین ہیں۔کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ہی بردبار اور درگذر کرنے والا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ!

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ○ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ○ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ○ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ○

القرآن الحکیم (سورۃ نور 24/ 40-44)

ترجمہ:

’’کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں ،اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں، (اُن میں سے) ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے۔اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے، پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر انھیں سمیٹ کر ایک کثیف بادل بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آ رہے ہیں۔اور وہ آسمان سے اُن پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے پھر جسے چاہتا ہے اِن سے نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے اِن سے بچالیتا ہے۔اُس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے، رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے‘‘۔

✡✡✡✡✡✡

آگے مزید ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَ اٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ○ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ○ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ○ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ○

القرآن الحکیم (سورۃ یس 36 /36-40)

ترجمہ:

''اِن کے لیے ایک اور نشانی رات ہے، ہم اس کے اوپر سے دن کو ہٹا لیتے ہیں تو اِن پر اندھیرا چھا جاتا ہے، اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جاتا ہے۔ یہ ایک زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔ اور چاند، اُس کے لیے بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ اِن سے گذرتا ہوا کھجور کی سوکھی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں''۔

✡✡✡✡✡✡

اِن آیات کے مطالعے سے جمادات، نباتات، حیوانات، پہاڑوں، پرندوں اور ہواؤں کے اُس روحانی احساس سے بحث کی گئی جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح بیان کرتے ہیں اور اس کی اطاعت میں مگن رہتے ہیں۔ ہم نے اس بحث کے آغاز میں بیان کیا تھا کہ جب سائنس کافر ہو گئی تو علم کے ہر انکشاف نے انسانیت کو منزل سے مزید دور کیا۔ کیونکہ جب انسان کے ذہن سے یہ بات محو ہو جائے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی صرف اللہ ہی کے لیے ہے تو وہ علم جو اس تصور کے بغیر پیدا ہوگا انسانیت کے لیے کبھی افادیت کا باعث نہیں بن سکتا۔ علم طبیعات دراصل اللہ تعالیٰ کی اس بادشاہی کو اجاگر کرتا ہے جو زمین و آسمان کے مابین ہر چیز کو محیط ہے۔ غور کریں کہ علم طبیعات مادے سے بحث کرتا ہے۔ وہ ذرے اُس کے مالیکیول، اُس مالیکیول کے مرکز یعنی نیوکلس یا اُس قوت کو بیان کرتا ہے جو ذرے کے نیوٹران اور پروٹان کو اس بات پہ مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے مرکز سے انحراف نہ کرے یعنی اپنے نیوکلس کو یاد رکھے اپنے محور کو نہ بھولے یہی وہ طاقت ہے جس نے تمام کائنات کو آپس میں باندھ رکھا ہے۔ اہل مغرب کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اس طاقت کو تو جان گئے ہیں جو کسی بھی مالیکیول کو اُس کے نیوکلس سے جدا نہیں ہونے دیتی مگر وہ اس قوت کو پیدا کرنے والے

اصل محرک سے انکاری ہیں اس لیے اُن کا علم انسان کو منزل نہیں صرف منزل کا آزار فراہم کرتا ہے۔
بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن سائنس کی کتاب نہیں چلو اُن کی بات مان لیتے ہیں مگر کیا وہ اس بات سے بھی انکار کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں انسان کو عقل استعمال کرنے کی دعوت دی گئی ہے، کائنات کو تسخیر کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، زمین میں پھیلی جابجا نشانیوں سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ آنکھ اور کان کے درست استعمال کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، زمین و آسمان کی ساخت میں غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

یہی سب تو سائنس ہے۔ قرآن کے اشارات کو سمجھنے کی ضرورت ہے علم کے اسرار خود بخود کھلتے چلے جائیں گے۔ جب انسان کائنات کو قرآنی نگاہ سے دیکھے گا تو جس طرف بھی اُس کی نظر جائے گی اُسے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اُس کی یکتائی کے بے حد و حساب دلائل نظر آئیں گے۔ کائنات کے کسی بھی رنگ سے، کسی بھی آہٹ سے، کسی بھی حرکت سے، کسی بھی پہلو سے کہیں بھی کوئی ایک دلیل شرک اور الحاد کی نظر نہیں آئے گی بلکہ کائنات کے تمام تر پہلو انسان کو اللہ تعالیٰ کی وحدنیت کی طرف لے جاتے ہیں۔

اس نظام شمسی پہ غور کریں جس میں ہماری یہ زمین ہے جس پہ انسان اللہ تعالیٰ کے خوف سے عاری ہو کے اکڑ کے چلتا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ یہ ایک عظیم نظم ہے جس میں ہماری یہ زمین محو گردش ہے۔ زمین کا مرکز سورج ہے جو زمین سے 23 لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کے بعید ترین سیارے نیپچون کا سورج سے فاصلہ 2793000000 میل ہے۔ اگر پلوٹو کو بعید ترین سیارہ مان لیا جائے (اگرچہ اب تین اور سیارے بھی دریافت ہو چکے ہیں جو پلوٹو سے بعید ہیں) تو پلوٹو کا سورج سے فاصلہ چار ارب ساٹھ کروڑ میل ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظام شمسی بہت بڑے کہکشاں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے جس کہکشاں میں ہمارا یہ نظام شمسی بھی شامل ہیں۔ اس میں تقریباً تین ارب آفتاب پائے جاتے ہیں اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی زمین تک پہنچنے میں چار سال لگتے ہیں۔ یاد رہے کہ ہماری یہ کہکشاں پوری کائنات نہیں بلکہ

کائنات کا ایک حقیر سا حصہ ہے۔ اب تک کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ یہ تقریباً بیس لاکھ سحابیوں میں سے ایک ہے اور اِن میں قریب ترین سحابئے کا فاصلہ ہماری اس کہکشاں سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی زمین تک پہنچنے میں دس کروڑ سال لگتے ہیں۔ چنانچہ سائنس کے فرعونوں کا یہ کہنا کہ یہ کائنات ایک اتفاق سے وجود میں آ گئی تھی اور اس کائنات کا کوئی خالق نہیں دراصل اُن کی عقلی پستی پہ دلیل ہے۔ انھیں کون بتائے کہ انسان جس کائنات کو جانتا ہے وہ اس کائنات کا قلیل ترین حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔

انسان نے اس کائنات کو جس قدر جانا ہے وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اس کائنات کی ہمہ جہت حرکت اور ہمہ پہلو رنگا رنگی کسی خالق کے اردائے کا پتا دیتی ہے۔ کائنات کا پورا عالم مادے سے بنا ہے جس سے ہماری یہ چھوٹی سی دنیا بنی ہے۔ اس کے اندر بھی وہی قانون کارفرما ہے جو باقی کائنات میں کارفرما ہے۔ یعنی جو نظم، جو حکمت، جو صناعی اور جو مناسبت اُن لاکھوں کہکشاؤں میں پائی جاتی ہے اور اُن کے اندر گھومنے والے ستاروں اور سیاروں میں پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سب آپ سے آپ ہو گیا ہے۔ اور اس پورے نظم کے پیچھے کوئی ناظم، کائنات کی اس حکمت کے پیچھے کوئی حکیم، اس صنعت کے پیچھے کوئی صانع نہیں۔ دراصل عقل کے اندھے کچھ لوگوں نے انسان کو نفس کا قیدی بنا دیا ہے۔ خاص کر اہل مغرب نے شرف انسانیت کی جس قدر تذلیل کی ہے اُن کی پستی کی کوئی انتہا نہیں۔ علم طبیعات بھی دراصل اُن اسراروں کا ایک تسلسل ہے جس سے خالق نے اس کائنات کو مزین کیا ہے۔

مسلمانوں نے اس علم کے بہت سے در وا کیے ہیں جس سے انسانوں کے سماج کو تعمیر کرنے میں خاطر خواہ مدد لی گئی ہے۔ اگرچہ علم طبیعات کے وہ بہت سے اصول جو مسلمانوں نے دریافت کیے تھے اہل مغرب نے انھیں اپنے نام سے منسلک کر لیا۔ مگر اس سے مسلمانوں کی اُس علمی رفعت میں کوئی کمی نہیں آتی جس سے مسلمانوں نے دنیا کو نوازا ہے۔ طبیعات کے علم میں مسلمانوں نے جو انکشافات اور اکتشافات کیے انھیں آج کی جدید دنیا میں بھی تعظیم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مسلمان طبیعات

دانوں نے کئی صدیوں تک علم کے اس پہلو پر دادِ تحقیق دی ہے یہاں انھی مسلمان طبیعات دانوں کے کچھ احوال درج کرنا مقصود ہیں۔

✡ ✡ ✡

✍ ابن الہیثم۔

جارج سارٹن کے مطابق مسلم سائنس کی شان بصریات میں نمایاں ہوتی ہے کہ جب ابن الہیثم (1040-945ء) کے عہد کا آغاز ہوتا ہے تو اقلیدس اور بطلیموس کے نظریات پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور اُن کے علمی نظریات پہ بحث کے نئے دروازے کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ ابن الہیثم ہی سے مسلم طبیعات کا آغاز ہوتا ہے۔ابن الہیثم نے مختلف سائنسی موضوعات پر 200 سے زائد کتابیں لکھیں۔صرف طبیعات پر اُن کی کتابوں کی تعداد 44 ہے۔ابن الہیثم نے جب " **کتاب المناظر** " لکھی تو بصریات کی سائنس میں تہلکہ مچ گیا۔ابن الہیثم کے استقرائی، تجرباتی اور ریاضیاتی طریقہ کار کو جدید سائنس کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے جس سے ایجادات اور انکشافات کا دروازہ کھل گیا۔ابن الہیثم کی شہرت کا اصل سبب اگرچہ اُن کی وہ تحقیقات ہیں جو انھوں نے بصریات کے شعبے میں کیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ذہنی صلاحیتوں کا میدان بہت وسیع ہے انھوں نے شفق ، رنگ ،روشنی اور آئینوں کے بارے میں جو انکشافات کیے ہیں اُن کی ہر دور میں تعریف کی گئی ہے۔ابن الہیثم کی ساری زندگی سائنس کے اسراروں سے کھیلتے ہوئی گزری ہے۔ چنانچہ ابن الہیثم نے لوگوں کو بتایا کہ روشنی کی شعاع فضا میں خمدار راستے پر سفر کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہم چاند اور سورج کو اُن کے طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے اور غروب ہونے کے کچھ دیر بعد تک بھی دیکھ سکتے ہیں۔ابن الہیثم نے کہا کہ روشنی شفاف چیز سے گزر کر ایک طرف کو مڑ جاتی ہے۔

انہوں نے انکشاف کیا کہ شفق یا دھندلکے کی ابتدا اُس وقت ہوتی ہے جب سورج اُفق سے 19 درجے نیچے ہوتا ہے۔اس بنا پر ابن الہیثم نے کرہ باد کا یہ انوکھا خیال پیش کیا کہ زمین سے 52000 قدم کی بلندی تک ہوا موجود ہوتی ہے۔بعد میں اسی خیال کی تائید میں جدید سائنس نے کی۔چنانچہ میر میکس ہاف اور وِل ڈیوروانٹ نے کہا کہ فضا میں دس میل تک ہوا

موجود ہوتی ہے اور یہ تقریباً وہی پیمائش ہے جو ابن الہیثم نے کئی صدیاں قبل پیش کی تھی۔ ابن الہیثم ہی نے پہلی بار یہ انکشاف کیا کہ فضا کی لطافت یا کثافت کی بنیاد پر چیزوں کے وزن میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔

ابن الہیثم نے اس قدرتی منظر کی بھی درست توجیہ کی جب چاند اور سورج اُفق کے قریب ہوتے ہیں تو وہ بڑے کیوں نظر آتے ہیں۔ ابن الہیثم نے روشنی (Light) اور آئینوں کے بارے میں کئی اہم حقائق دریافت کیے۔ ابن الہیثم نے (Inversion of Images) کے بارے میں درست نظریہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے (Magnifying & Focussing) رنگوں کی تشکیل کے بارے میں تجربات کیے اور نتائج میں درست تصورات پیش کیے۔ ابن الہیثم نے معقر اور مکانی آئینوں کے بارے میں جو حقائق دریافت کیے انھیں دنیا آج تک اُن کے شاندار کارناموں میں شمار کرتی ہے۔

ابن الہیثم پہلے سائنس دان ہیں جنھوں نے کیمرہ مظلمہ (Camera Obscura) کا اصول دریافت کیا اور اسے استعمال کر کے دکھایا۔

(Jaorge Sarton) کا کہنا ہے خطہ ارض پہ اول اول ابن الہیثم ہی نے (Camera Obscura) کا استعمال کیا۔

(Max Myerof) نے کہا کہ کیمرہ کا موجد ابن الہیثم ہی ہے۔

ابن الہیثم ہی نے اول اول سوئی چھید یعنی (Pin Hole) کیمرے کا اصول دریافت کیا اور اسے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوئی چھید کیمرے کے موجد بھی ابن الہیثم ہی ہیں۔ ابن الہیثم نے روشنی پر خصوصی تحقیق کی۔ روشنی آپ کی توجہ کا محور رہی یہی وجہ ہے کہ بصریات میں بھی انھیں کمال حاصل ہوا کہ آنکھ کا روشنی کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ آنکھ ہی وہ انسانی عضو ہے جو روشنی کو محسوس کرتی ہے۔ ابن الہیثم نے روشنی کو توانائی قرار دیا۔ ہر چند کے ابن الہیثم کے زمانے میں مغرب کے سائنس دان توانائی کے لفظ

تک سے ناآشنا تھے۔ابن الہیثم نے روشنی کی شعاع کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا کہ روشنی کی شعاع ایک واسطے میں ہمیشہ خط مستقیم میں سفر کرتی ہے۔تاہم جب روشنی کی یہی شعاع ایک واسطے سے دوسرے واسطے میں منتقل ہوتی ہے تو وہ اپنے راستے سے ہٹ جاتی ہے اور ترچھی ہوجاتی ہے۔ابن الہیثم کے اس نظریے کوآج کی جدید سائنس درست قرار دیتی ہے۔

ابن الہیثم روشنی کے انعکاس سے بخوبی واقف تھے۔انھوں نے روشنی کے انعکاس پہ متعدد تجربات کیے۔جس سے انھوں نے انعکاس کے دوقانون وضع کیے۔روشنی کے بارے میں اِن قوانین کوآج تک طالب علم پڑھتے ہیں اور اِن میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔روشنی کے انعطاف کے پہلے قانون کا سہرا بھی ابن الہیثم کے سر ہے کہ انھوں نے ہی اول اول کروی آئینوں پہ تحقیق کی اور بیش قیمت نتائج اخذ کیے۔حیران کن بات ہے کہ آج سے ایک ہزار سال پہلے ابن الہیثم نے آنکھ کے بارے میں جو معلومات فراہم کیں وہ آج کے جدید سائنسی دور میں بھی سوفیصد درست قرار دی جاتی ہیں۔

آنکھ کوابن الہیثم نے جن مختلف حصوں میں تقسیم کیا اور جن مختلف ناموں سے اُن کو پکارا آج تک سائنس کی زبان میں آنکھ کے مختلف حصوں کوانھی ناموں سے پکارا جاتا ہے جوابن الہیثم نے ترتیب دیئے تھے۔جب اُن حصوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا تب بھی اُن کے اصل تلفظ کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی اور آج تک فزکس کی کتابوں میں آنکھ کے متعلق استعمال ہونے والے اکثر و بیشتر لفظ وہی ہیں جن کا عربی سے انگریزی یا دیگر زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔یوں تو ابن الہیثم کی ساری زندگی علمی سرگرمیوں میں صرف ہوئی اور انھوں نے بے شمار علمی انکشافات کیے مگر اُن کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ نظریہ بصارت یعنی (Theory of Vision) کوقرار دیا۔ابن الہیثم سے پہلے قدیم یونانی حکماء کا نظریہ بصارت رائج تھا۔ ایک ہزار سے سال سے لوگ اسی قدیم نظریہ بصارت ہی پر یقین رکھتے چلے آئے تھے جو اقلیدس اور بطلیموس نے وضع کیا تھا جس کے مطابق انسان کی آنکھوں سے روشنی کی شعاعیں نکلتی

ہیں اور سامنے نظر آنے والی چیز پر پڑتی ہیں۔ پھر ابن الہیثم کا عہد آیا تو اُس نے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر قدیم یونانی نظریہ بصارت کو مسترد کر دیا اور نیا نظریہ بصارت پیش کیا۔ جس کے مطابق انسان کی آنکھ سے روشنی کی کوئی کرنیں نہیں نکلتیں بلکہ روشنی باہر سے آنکھ کی طرف آتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے علماء نے ابن الہیثم کے نظریہ بصارت کی تائید کی۔ اکثر مغربی محققین و مورخین نے جن میں (Max Myerof)(Dr, Well)(Robert Briffault)(Jaorge Sarton)(Draper Deurant)اور(Philp K Hitte) شامل ہیں نے اپنی کتابوں میں ابن الہیثم کے نظریہ بصارت کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ ابن الہیثم کے نظریہ بصارت پہ تعریفی کلمات تحریر کیے جائیں۔

چنانچہ یہاں بیان کیا گیا کہ ابن الہیثم وہ پہلے سائنس دان تھے جنھوں نے بصارت کی درست توجیہہ پیش کی اور یہ صحیح انکشاف دنیا کے سامنے رکھا کہ روشنی کی کرنیں آنکھ سے نہیں بلکہ روشنی سے آنکھ کی طرف آتی ہیں۔ ازاں بعد ابن الہیثم نے اوپر سے نیچے گرتے اجسام پہ اپنی تحقیق کا آغاز کیا اور کشش ثقل کے بارے میں واضح نظریات پیش کیے۔ انھوں نے پانی میں تیرتے اجسام کے تیرنے اور ڈوبنے کے حوالے سے بھی تحقیق کی اس ضمن میں کئی رسائل تحریر کیے۔ زمانہ وسطیٰ میں ابن الہیثم کی تحریریں اہل مغرب میں بہت مقبول تھیں۔ اُن کی مشہور زمانہ کتاب ”**کتاب المناظر**“ کے وقت کی تمام اہم زبانوں میں ترجمے کیے گئے اور اہل مغرب کی یونیورسٹیوں نے اسے اپنے نصاب میں شامل کیا جہاں سترہویں صدی تک یورپی طالب علم ابن الہیثم ہی کا نظریہ بصارت پڑھا کرتے تھے۔ ایک فرانسیسی محقق (Sasheel) کا خیال ہے کہ اہل مغرب کا نظریہ بصارت آج تک تمام کا تمام ابن الہیثم کے نظریہ بصارت ہی پہ استوار ہے۔ اور (Rogar Backon) جسے اہل مغرب جدید سائنس کا بانی قرار دیتا ہے کا کہنا ہے کہ میں عربوں کا شاگرد ہوں اگر کسی نے علوم سیکھنے ہیں تو اُسے عربی زبان سیکھنی ہو

گی۔ساتھ ہی اُس نے اپنی اسی کتاب(Perspective)میں لکھا ہے کہ جدید سائنس کا آغاز مجھ سے نہیں بلکہ عربوں کے عہد سے ہوتا ہے جنھوں نے انکشافات اور اکتشافات کی نئی دنیائیں وضع کیں۔اپنی اس کتاب میں بیکن نے جگہ جگہ ابن الہیثم کے نظریات کے حوالے دیئے ہیں۔(Well Deurant) کا کہنا ہے کہ جدید سائنس پہ ابن الہیثم کے نظریات کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے اور اس میں جا بجا ابن الہیثم کے نظریات کا اثر نظر آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر ابن الہیثم نہ ہوتا تو راجر بیکن کو کوئی نہ جانتا۔

اسی طرح(Max Myerof)ابن الہیثم کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ راجر بیکن اور تیرہویں صدی عیسوی کے دیگر محققین پر ابن الہیثم کے نظریات کی گہری چھاپ ہے اور اُن کے نظریات اکثر و بیشتر''**کتاب المناظر**''ہی سے ماخوذ نظر آتے ہیں۔چنانچہ لیونارڈو دانسی اور کپلر پر ابن الہیثم کے نظریات کا اثر سب سے نمایاں ہے۔(Jaorge Sarton) کا کہنا ہے کہ''**کتاب المناظر**''کے لاطینی ترجمے نے مغربی سائنس پر گہرا اثر ڈالا ہے۔جس کی وجہ سے راجر بیکن اور کپلر کی تحریروں میں ابن الہیثم کا عکس نمایاں طور پہ محسوس کیا جا سکتا ہے ۔ابن الہیثم نے عدسوں پر جو تحقیق کی اس کو اُن بڑی بڑی دوربینوں کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے جن سے آج انسان دور خلاؤں تک میں جھانکنے کی صلاحیت حاصل کر سکا ہے۔ابن الہیثم نے اپنی زندگی میں مختلف سائنسی تجربات اور مشاہدات پر مشتمل سو سے زائد کتابیں اور رسائل تحریر کیے ۔ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابن الہیثم کی تحریوں اور انکشافات میں سب سے قابل قدر تحقیق بصریات کے ضمن میں ہے جسے انھوں نے''**کتاب المناظر**''میں تحریر کیا ہے۔کتاب المناظر ایک ایسی کتاب ہے جسے سائنس کی بائبل قرار دیا جاتا تھا۔

ابن الہیثم نے اس میں بہت سے موضوعات کو سمویا ہے۔چنانچہ انھوں نے اس کتاب میں فریب نظر،علم تناظر(Perspective)دوچشمی نظارہ(Binocular Vision)، رنگ،سراب،علم مرایا(Catoptrics) اور (Dioptric)انعکاس انعطاف کے

نظریے اور ہالہ (Holes) قوس قزح، پرچھائیاں، جھٹ پٹے کی مدت فضائی بلندی، دم دار ستارے جیسے دقیق موضوعات پر گہرے مطالعے اور تجربات سے اِن کی سائنسی توجیہات پیش کی۔ ابن الہیثم نے اپنے تجربات سے ثابت کیا کہ چاند اور سورج افق کے قریب جا کر بڑے کیوں نظر آتے ہیں۔ سورج اور چاند کیسے طلوع ہوتے ہیں کیسے غروب ہوتے ہیں۔ ستارے رات ہی وقت کیوں چمکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک کی بجائے دو آنکھیں کیوں دی ہیں، چھڑی کو پانی میں کھڑا کیا جائے تو وہ ٹیڑھی کیوں نظر آتی ہے۔ ہم کیسے دیکھتے ہیں اور چیزیں ہمیں کیوں اور کیسے نظر آتی ہیں۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ "**کتاب المناظر**" میں علم کے کئی جہانوں کو سمو دیا گیا اور جدید سائنس نے بلا شبہ اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ چونکہ بصریات میں ابن الہیثم کے نظریات کو آج تک درست تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے ابن الہیثم ہی کو بصریات کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے۔

چنانچہ اس امر میں اب کوشک وشبہ نہیں کہ بصریات کے موضوع پہ دنیا کی سب سے پہلی درست علمی انکشافات کی حامل کتاب صرف "**کتاب المناظر**" ہی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ "**کتاب المناظر**" ہی کو دنیا کی سب سے پہلی ٹیکسٹ بک ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کتاب نے چھ صدیوں تک اہل مغرب کو حیرت میں ڈالے رکھا اور اہل یورپ تقریباً اتنی صدیاں اس سے علمی استفادہ بھی کرتے رہے۔ (Jaorge Sarton) کہتے ہیں کہ سولھویں صدی تک کوئی عالم ایسا نہ تھا جس کو ابن الہیثم کے ہم پلہ قرار دیا جاسکے۔ اہل مغرب میں صدیوں ابن الہیثم کی تعظیم قائم رہی۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ابن الہیثم نے ہی کشش ثقل اور گرتے اجسام کا مطالعہ کیا تھا اور اسے اپنے تجربات میں تحریر کیا تھا۔ ابوبکر رازی نے ابن الہیثم کی تحقیقات میں اضافہ کیا اور حرکت کے قوانین وضع کیے مگر جدید سائنس نے کشش ثقل کے نظریے کی دریافت کا سہرہ نیوٹن کے سر باندھ دیا۔

✡✡✡✡✡✡

الکندی۔

مسلمان طبیعات دانوں میں ابو یوسف یعقوب کندی (801-866ء) بھی ایک بہت بڑا نام ہے۔ الکندی نے بھی نظری طبیعات پہ بہت سی کتابیں تحریر کیں اور اپنے علمی نظریات کی بنیاد تجربات اور مشاہدات پر رکھی۔ انھوں نے چوالیس کتابیں صرف طبیعات پر لکھیں جن میں طبیعات کے مختلف موضوعات پر مباحث کیے گئے۔ اگر چہ 265 کتابوں کو ابو یوسف یعقوب کندی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ابو یوسف الکندی نے موجوں کا مطالعہ کیا اجسام کی رفتار متعین کرنے والے قوانین کا پتا لگایا اور بصریات (Optics) کے موضوع پر مباحث چھوڑے۔ روشنی کے مظاہر پر تحقیق کی۔ راجر بیکن ابو یوسف کندی کی سائنسی تحقیقات سے بہت متاثر تھا۔

(Jaorge Sarton) نے کہا کہ!

کندی پہلے مسلمان سائنس دان تھے جنھوں نے موسیقی پر سائنسی نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی اور کہا کہ نغمہ سروں کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ انھوں نے سروں کی تکرار معلوم کرنے کا طریقہ ایجاد کیا اور خود اس طریقے سے اس کا درجہ متعین کیا۔ انھوں نے ہی موسیقی کی سب سے پہلی زبان کو مرتب کیا اور لے کی پہچان کے لیے حروف ابجد استعمال کیے۔ بعد میں انھی حروف ابجد کی بنا پہ اہل مغرب نے موسیقی کی زبان وضع کی۔ کندی ہی نے موسیقی کو علم کی ایک شاخ قرار دیا۔ ابو یوسف یعقوب کندی نے موسیقی کے موضوع پر نو کتابیں لکھیں۔

(Max Myerof) نے کندی کے بارے لکھا کہ:

کندی نے گرتے ہوئے اجسام پہ تحقیق کی اور اپنے تجربات کی بدولت گرتے اجسام کے متعلق قوانین وضع کیے۔ حالانکہ کے اُس زمانے میں یہ ایک عجیب تصور تھا اور اکثر لوگ علم کے اس

پہلو سے نابلد تھے۔ کندی علم بصریات کے موجد ہیں جسے ابن الہیثم نے اُس کی انتہاؤں تک پہنچایا ۔ کندی نے بصریات کے موضوع پر کئی کتابیں لکھیں ۔ انھوں نے (Geometrical) اور (Physiological) بصریات پر اہم تحقیقات پیش کیں ۔ اس موضوع پر اُن کی کتاب ''علم البصر'' ہے جس کے لاطینی ترجمے نے اہل یورپ کی سائنس پہ بے پناہ مثبت اثرات چھوڑے۔ راجر بیکن کے مطابق بعد کی صدیوں میں یورپ میں ہونے والی کئی دریافتیں اسی کتاب کی مرہون منت ہیں۔

(Jaorge Sarton) کہتا ہے کہ:

فزکس میں سب سے زیادہ جس مسلمان سائنس دان کے حوالے دیئے جاتے ہیں وہ الکندی ہی ہے۔ کندی دراصل تو ایک فلسفی تھا۔ مگر علم کی مختلف جہتوں میں اس کے انکشافات کو نظر انداز کیا جانا ممکن نہیں۔ کندی نے پندرہ کتابیں (Meterorology) کے موضوع پہ تحریر کیں۔ اُس کی متعدد تصانیف میں وزن مخصوصہ (Special Weight)، مدوجزر، بصریات، انعکاس نور، موسیقی، علم طب، علم طبیعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ بدقسمتی سے کندی کی بیشتر کتابیں وقت کی راکھ میں گم ہوگئیں۔ تاہم بصریات کے موضوع پر اُس کی کئی کتابیں لاطینی زبان میں آج تک دستیاب ہیں۔ کندی نے نفسیات اور فلسفہ پہ بھی متعدد کتابیں تحریر کیں۔

✡✡✡✡✡✡

✍ ابوبکر رازی۔

طبیعات کی دنیا میں ایک اور بڑا نام ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی (854-935ء) کا ہے۔ جنھوں نے علم طبیعات کے کئی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اُن کی کتابوں کی تعداد 250 سے

زائد بیان کی جاتی ہے۔وہ پہلے سائنس دان ہیں جنھوں نے کشش ثقل کا مشہور عالم نظریہ پیش کیا۔اسی نظریہ کو آج ہمارے سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نیوٹن کے نام سے پڑھایا جا رہے۔امت کی بد قسمتی تو یہ ہے کہ شاگرد سے کیا گلہ جب استاد کو بھی معلوم نہیں کہ کشش ثقل کی دریافت اور نظریہ غیروں نے نہیں بلکہ اپنوں نے پیش کی تھی۔چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بچوں کو نیوٹن کا نام تو یاد ہے مگر وہ ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی کو نہیں جانتے۔ابوبکر رازی نے ہی سب سے پہلے یہ انکشاف کیا کہ زمین باہمی کشش کے سہارے فضا میں معلق ہے۔انھوں نے کشش نوعی معلوم کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا جسے" **المیزان الطبعیی**" کا نام دیا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابن سینا۔

ہم انھیں ایک حکیم کے طور پر جانتے ہیں۔مگر جارج سارٹن کا کہنا ہے کہ ابن سینا ایک ماہر طبیعات دان تھا۔ابن سینا (980-1039ء) نے طبیعات کے تقریباً ہر پہلو پہ دادِ تحقیق دی ہے۔ابن سینا نے علم طبیعات میں گراں قدر انکشافات کیے۔انھوں نے قوت، رشنی، خلا ،حرارت اور متحرک اجسام کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور بہت سے نئے انکشافات کیے دنیا جن سے نا آشنا تھی۔

(Well Deurant) نے ابن سینا کے بارے میں لکھا کہ:

ابن سینا کی تحقیقات ہمہ جہت تھیں انھوں نے ایک ساتھ کئی موضوعات کو اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہوا تھا۔انھوں نے حرکت کرتے اجسام پہ اپنی تحقیق پیش کی جسے درست قرار دیا

گیا۔خلااور روشنی کے بارے میں بھی اُن کی تحقیق قابل قدر ہے۔

(Jaorge Sarton)نے ابن سینا کے بارے میں لکھا کہ:

سب سے پہلے ابن سینا ہی نے اس بات کو ثابت کیا کہ روشنی کی رفتار خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ محدود ہوتی ہے۔چنانچہ ابن سینا ہی کو پہلا ماہر طبیعات قرار دیا جاتا ہے جنھوں نے روشنی کی رفتار کا نظریہ پیش کیا اس لیے کہ اول اول انھوں نے ہی روشنی اور وقت کے مابین تعلق کی تشریح کی تھی۔ابن سینا ہی نے فاصلوں کی درست پیائش کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا جس میں وہی اصول کارفرما تھے جو ہمارے متمدن عہد میں مستعمل ہیں ابن سینا کی اس ایجاد کو''کسر پیا'' کہا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

البیرونی۔

علم طبیعات کا ایک اور بڑا نام ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی(933-1050ء) کا ہے۔ البیرونی نے علم طبیعات کے بہت سے پہلوؤں کو اپنی تحقیق کا محور بنایا۔تاہم انھوں نے پانی کے بارے میں بہت سے نئے نظریات پیش کیے۔آج ہم خطہ ارض پہ زمین کے دامن سے دور فضا تک اچھلتے بہت سے فواروں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں البیرونی کو یاد کرنا چاہیے کہ فوارہ انھوں نے ہی بنایا تھا۔انھوں نے ہی سب سے پہلے پانی کے دباؤ کا نظریہ پیش کیا۔انھوں نے کہا کہ پانی ایک طاقت ہے جس کا مثبت استعمال کیا جا سکتا ہے۔چنانچہ انھوں نے پانی کے دباؤ کی قوت سے فوارہ ایجاد کیا۔انھوں نے پانی کی سطح ہموار ہونے اور گہرائی کے ساتھ پانی کے دباؤ میں اضافہ ہونے کی سائنسی توجیحات پیش کیں۔چنانچہ کہا جا سکتا ہے جدید دنیا میں جس علم کو ہم

ماسکونیات (Hydrostatistics) کے نام سے جانتے ہیں اُس کی بنیاد البیرونی نے ہی فراہم کی تھی۔ ازاں بعد البیرونی نے ایک مکینیکل کیلنڈر بھی ایجاد کیا۔انھوں نے ایسا اصطرلاب بنایا جس میں گیئر لگے ہوئے تھے۔یہی اصطرلاب بعد میں گھڑی بنانے کے کام آیا ۔البیرونی نے ہی سب سے پہلے ارسطو کے نظریات پہ نقطہ چینی کی اور انھیں دلائل سے رد کیا۔ انھوں نے روشنی کے بارے میں انکشاف کیا کہ روشنی کی رفتار آواز سے تیز ہوتی ہے۔طبیعات کے میدان میں اُن کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قیمتی پتھروں اور دیگر قیمتی دھاتوں کا درست وزن معلوم کرنے کے لیے آلہ تیار کیا۔

✡✡✡✡✡✡

ابو برکات بغدادی۔

علم طبیعات کا ایک اور نام ہبۃ اللہ بن علی المعروف ابو برکات بغدادی (1077-1152ء) ہے۔ابو برکات بغدادی کی تحقیق بھی ہمہ جہت تھی اور انھوں نے علم طبیعات کے کئی نئے پہلو اجاگر کیے۔اہل مغرب نے طبیعات کے ضمن میں اُن کی کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

چنانچہ ایک مغربی محقق (S.Pines) ابو برکات بغدادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

کہ ابو برکات بغدادی ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے متحرک اشیاء کی حرکت پر بحث کرتے ہوئے انسانیت کی رہنمائی اُس قانون حرکت کی طرف کی جسے آج ہم (Dynamics) کے نام سے جانتے ہیں۔چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ (Dynamics) کے اس قانون کی مبادیات ابو برکات بغدای ہی کی فراہم کردہ ہیں۔

(Jaorge Sarton) کہتا ہے کہ:

دستیاب معلومات کی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابو برکات بغدادی کی مشہور زمانہ کتاب "**کتاب المعتبر**" ہی وہ اولین تحریر ہے جس میں زمانہ جدید کے اس بنیادی قانون حرکت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ ایک مسلسل قوت محرکہ سے ایک اضافی حرکت پیدا ہوتی ہے جسے توانائی میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوعبداللہ محمد ابن معاذ الجیانی۔

مسلم ہسپانیہ میں جن ہاتھوں میں علم کے چراغ تھے اُن میں ابوعبداللہ محمد ابن معاذ الجیانی (المتوفی 1079ء) بھی شامل تھے۔ اُن کا اصل میدان تو ریاضی تھا تاہم علم طبیعات میں بھی اُن کے انکشافات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے شام کے دھندلکے اور طلوع سحر کی سپیدی کے متعلق اپنی تحقیقات پہ جو رسالہ لکھا اُس میں کیے گئے انکشافات کو آج تک رد نہیں جا سکا۔

✡✡✡✡✡✡

ابن مسکویہ۔

ابن مسکویہ (1032ء) کا شمار بھی ماہر طبیعات میں کیا جاتا ہے۔ ابن مسکویہ ہی نے سب سے پہلے یہ انکشاف کیا کہ سمندروں میں مدوجزر کا اصل سبب چاند کی کشش ہے۔ ابن مسکویہ نے انکشاف کیا کہ سیارے سورج کی کشش کی بنا پر اُس کے گرد گردش کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ

جدید سائنس نے اب اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ سورج کی مہیب کشش ہی دیگر اجرام فلکی کو اس کے گرد گھومنے پر مجبور کرتی ہے۔ ابن مسکویہ کے عہد میں مسلمان سائنس دان اس بات کو جانتے تھے کہ گرتے ہوئے اجسام کی اسراع کا تعلق اُن کی کمیت سے نہیں ہوا کرتا۔ نیز وہ اس بات سے بھی واقف تھے کہ دو جسموں کے درمیان قوت کشش اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب اُن کا باہمی فاصلہ کم ہو جاتا ہے۔ اُس دور میں بصریات کے شعبے میں مسلمانوں کی سرگرمیاں عروج پہ تھیں۔ کندی، ابن سینا، ابن مسکویہ اور البیرونی نے اس شعبے میں خوب دادِ تحقیق دی مگر اُن کی یہ ساری کاوشیں ابن الہیثم کی کتاب المناظر کے سامنے ہیچ ثابت ہوئیں اس لیے بصریات کے شعبے میں اصل شہرت ابن الہیثم کے حصے میں آئی۔

✡✡✡✡✡✡

✍ ابوبکر ابن باجہ۔

ابن باجہ سے سائنس کے اُس عہد کا آغاز ہوتا ہے جسے مغرب راجر بیکن کا عہد کہتا ہے۔ اس لیے کہ ابوبکر ابن باجہ (المتوفی 1139ء) نے طبیعات میں جو نئے انکشافات کیے وہ ابن رشد کی کتابوں کے ذریعے گلیلیو تک پہنچے۔ گلیلیو ایک نامور سائنس دان تھا مگر اُسے کلیسا کے جبر کا سامنا تھا اس لیے وہ جیل میں ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ ابن باجہ کی بہت سے تھیوریوں میں سے ایک یہ ہے کہ

SPEED OF A MOVING OBJECT IS EQUAL TO THE MOVING FORCE.

اسی طرح ابن باجہ نے کہا کہ وہ قوت جس کی وجہ سے سیب درخت سے نیچے زمین کی طرف گرتا ہے اسی قوت کی وجہ سے اجرام سماوی بھی ایک مخصوص دائرے میں حرکت کرتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ابن رشد۔

ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد (1126-1198ء) کا اصل میدان بصریات تھا تاہم انھوں نے علم طبیعات پہ بھی کافی مباحث چھوڑے ہیں۔ابن رشد وہ پہلے سائنس دان تھے جنھوں نے یہ انکشاف کیا کہ آنکھوں میں دیکھنے کا عمل صرف آنکھ کی پتلی کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ آنکھ کے اندر پردہ (Retina) پر اس کا عکس پڑتا ہے جس سے انسان دیکھتا ہے۔ابن رشد کے حوالے سے اور بھی کئی انکشافات ہم تک پہنچے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم انھیں آج اہل مغرب کے انکشافات کی حیثیت سے جانتے ہیں اس لیے کہ اہل مغرب کا علم کی چوری میں کوئی ثانی نہ تھا۔اس لیے ابن رشد سمیت انھوں نے بہت سے مسلمان سائنس دانوں کے علمی نظریات کو چوری کر لیا اور دنیا کو اِن انکشافات سے اہل مغرب کا نام لے کر روشناس کرایا۔

✡✡✡✡✡✡

عبدالرحمان الخازمی۔

تیرہویں صدی کے مسلمان کیمیا دان تھے۔وہ (1200ء) میں بغداد میں پیدا ہوئے۔علم حاصل کرنے کا جنون انھیں ملک ملک لیے پھرا۔وہ ایک ماہر طبیعات کے طور پہ جانے جاتے ہیں اس لیے کہ اُن کی کئی کتابوں میں وہ بہت سے علمی انکشافات موجود ہیں جنھیں اہل مغرب نے چرا لیا۔راجر بیکن نے عبدالرحمان الخازمی کی بے حد تعریف کی ہے اور انھیں ایک ماہر طبیعات کے طور پہ متعارف کرایا ہے۔حال ہی میں دریافت ہونے والی عبدالرحمان الخازمی کی

ایک کتاب نے اُن کے علمی رتبے کی تصدیق کی ہے۔اِس کتاب میں انھوں نے کشش ثقل اور پانی کے وزن کثافت اور حجم پہ مباحث چھوڑے ہیں۔اہل مغرب نے عبدالرحمان الخازمی کی تصنیفات سے خود استفادہ کیا مگر انھیں لوگوں کے ہاتھ نہ لگنے دیا۔

✡✡✡✡✡✡

قطب الدین شیرازی۔

چودھویں صدی کے ماہر طبیعات ہیں انھوں نے طبیعات پہ کئی کتابیں لکھیں اُن کی چند کتابیں دستیاب ہو چکی ہیں۔طبیعات کے میدان میں اُن کا محور روشنی تھی چنانچہ انھوں نے روشنی کے انعکاس،انعطاف پہ بحث کی ہے۔انھوں نے ہی پہلی بار یہ صحیح انکشاف کیا کہ قوس قزح میں آویزاں چھوٹے چھوٹے پانی کے گول قطروں سے گذرنے والی روشنی کے انعطاف سے مختلف رنگ دکھائی دیتے ہیں یا سائنس کی زبان میں یوں کہہ لیں کہ سورج کی کرنوں کے دو انعطافوں اور دو داخلی انعکاسوں کی وجہ سے قوس قزح ظاہر ہوتی ہے۔جب ہم سائنس پڑھتے تھے تو ہمارے اساتذہ نے ہمیں یہی پڑھایا کہ قوس قزح کی سائنسی توجیہہ راجر بیکن نے کی تھی۔شاید وہ خود بھی نہیں جانتے؟؟؟

✡✡✡✡✡✡

کمال الدین فارسی۔

چودھویں صدی کے ماہر طبیعات ہیں انھوں نے طبیعات پہ کئی کتابیں لکھیں۔انھوں نے

(1320ء) میں وفات پائی۔اُن کی تحقیق کا میدان بھی روشنی ہی تھا انھوں نے پہلی اور دوسری قوس کی وضاحت کی۔قوس قزح کی سائنسی توجیہہ اُن کا اصل کارنامہ تصور کی جاتی ہے ۔اگرچہ انھوں نے کئی دوسرے موضوعات پہ بھی قلم کشائی کی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

یہ ایک طویل تذکرہ ہے جس کے لیے یہ کتاب ناکافی ہے۔ہمیں چونکہ ابھی علم کے کئی دیگر پہلوؤں سے مسلمانوں کی عظمت کے احساس کو اجاگر کرنا ہے اس لیے مسلمان ماہرین طبیعات کے ضمن میں جتنا مقدر میں تھا لکھ دیا حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔(30*)

✡✡✡

گذشتہ صفحات میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ اہل مغرب نے مسلمانوں کی علمی میراث پر قبضہ کرلیا، اُن نظریات کو عملی سائنس میں تبدیل کیا اور دنیا میں اپنی علمی دھاک بٹھا دی حقیقت یہ ہے مسلمانوں کے علمی نظریات اور مسلمانوں کے علمی اثاثے کی جس پیمانے پر چوری ہوئی کسی بھی جگہ کہیں بھی کسی بھی کتاب میں اُس کا تذکرہ موجود نہیں اس لیے کہ جب وارثوں کو معلوم ہی نہ ہو کہ اُن کی میراث سے کیا کیا جارہا ہے تب لوگ جیسے چاہیں اس کی بندر بانٹ کریں۔

علم ریاضی

علم ریاضی کا شمار دنیا کے قدیم ترین علوم میں کیا جاتا ہے۔انسان کی شعوری ترقی کے ساتھ ساتھ علم ریاضی بھی مستحکم ہوتا رہا۔علم ریاضی اُن چند علوم میں شامل ہے جن کی ابتدا مسلمانوں نے نہیں بلکہ انسانوں نے کی۔اس لیے کہ اس علم کی اولین بنیادیں کب ڈالیں گئیں تاریخ اس بارے میں زیادہ واضح نہیں ہے۔تاہم قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پتھر کے دور کے بعد کے انسان نے گننا سیکھ لیا تھا۔اگرچہ وہ علم ریاضی سے ابھی کوسوں دور تھا۔اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ علم ریاضی دراصل مسلمانوں ہی کا علم ہے۔کیونکہ جب مسلمانوں نے اس علم میں دلچسپی لی اس کے بعد ہی اس علم کی بنیادیں وضع ہوئیں ورنہ تو یہ علم کئی صدیوں سے جمود کا شکار چلا آ رہا تھا۔چنانچہ مسلمانوں نے دیگر علوم کی طرح علم ریاضی پہ بھی چھ صدیوں تک حکمرانی کی ہے۔مسلمان ریاضی دانوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔علم ریاضی،طب اور فلکیات ہی وہ علوم ہیں جو مسلمانوں کی دلچسپی میں اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔مغربی مورخین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ نویں صدی عیسوی سے لے کر

پندرہویں صدی عیسوی تک علم ریاضی میں مسلمانوں کا اور کوئی شریک نہ تھا اور اس علم کی تمام تر اساس مسلمانوں ہی نے مرتب کی۔

چنانچہ(Dr, Draper) کہتا ہے کہ:

الجبرا کے لیے ہم عربوں کے ممنون ہیں۔ ریاضی کی اس شاخ کا نام انھوں نے ہی تجویز کیا تھا جسے بعد میں کسی نے تبدیل نہیں کیا۔ الجبرا کا علم مسلمانوں کے حوالے سے ہی تیرہویں صدی عیسوی میں اٹلی پہنچا۔ اطالیہ میں کئی سو سال تک الخوارزمی کی لکھی ہوئی " **الجبر و المقابلہ** " کا لاطینی ترجمہ ہی پڑھایا جاتا رہا۔ یاد رہے کہ الخوازمی نے یہ کتاب مشہور عباسی خلیفہ مامون الرشید کی خواہش پر لکھی تھی۔ اس کتاب میں پہلی بار الجبرا کے مضمون کو ایک مستقل سائنس کی حیثیت سے پیش کیا گیا یہی وجہ ہے کہ الخوارزمی کو ہی الجبرا کا موجد تسلیم کیا جاتا ہے۔ الخوارزمی کی یہ کتاب اب مفقود ہو چکی ہے مگر اُس میں بیان کیے گئے مسائل الجبرا کے مضمون کی صورت اگلی نسلوں تک منتقل ہو گئے تھے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ الخوارزمی کی کتاب " **الجبرا و المقابلہ** " کا لاطینی ترجمہ آج بھی دستیاب ہے۔ ہزار سال تک یہ کتاب اہل مغرب میں پڑھائی جاتی رہی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق اس عہد کی سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی الجبرائی تصنیف الخوارزمی کی "**الجبر و المقابلہ**" تھی جو 825ء میں تحریر کی گئی۔ یاد رہے کہ الجبرا کے علاوہ عربی ہندسے، صفر کے علاوہ الگورزم (Algorism)، (Sine)، (Nadir)، (Zentih)، (Atlas) (Azimuth) جیسے تمام نظم ریاضیات مسلمانوں ہی کی دریافتیں ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ عربی زبان کی بہت سی اصطلاحات یورپ کی زبانوں میں آج تک مروّج ہیں۔ ازاں بعد مسلمانوں نے جیومیٹری کی طرف اپنی توجہ مذکور کی اور اس میدان میں شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔ علم سے مسلمانوں کی محبت کا یہ حال تھا کہ مامون الرشید کے تین بیٹے تھے جن کے نام محمد بن مامون، احمد بن مامون اور حسن

بن مامون ہیں وہ تینوں علم ریاضی کے چوٹی کے ماہر تھے۔حسن بن مامون کا علمی نام بنوموسیٰ تھا۔انھوں نے علم ریاضی پہ کئی کتابیں لکھیں۔اُن کی کتاب "**کتاب المعرفۃ المساحت الاشکال البسیط و الکریہ**" کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔اہل مغرب اس کے لاطینی ترجمے کو صدیوں تک ایک مقدس کتاب کا درجہ دیتے رہے۔ریاضی کی دنیا میں یہ پہلی کتاب تھی جس میں رقبہ اور حجم نکالنے کا یونانی قاعدہ دائرے اور کرے کی پیائش میں استعمال ہوا۔اس کتاب میں بعض ایسے مسائل کو زیر بحث لایا گیا جو یونانیوں کی کتابوں میں موجود نہ تھے۔اس کتاب میں دائرے اور کرے کی پیائش کے لیے جدید ترین نظریات پیش کیے گئے اور یونانی نظریات اس علمی پختگی کے سامنے پانی بھرنے لگے۔پھر وقت کی راکھ میں گم ہو گئے اور دنیا نے مسلمانوں کی دریافتوں کو اپنا لیا۔حسن المعروف بنوموسیٰ نے علم ریاضی کے اُن پہلوؤں کی توجہ کی جن سے دنیا آج تک ناآشنا تھی۔اس سے اگلے دور میں مسلمان ریاضی دانوں نے اس علم کی وسعتوں کو مزید بڑھاوا دیا اور تکونیات (Trignomatry) کی بنیاد رکھی۔چنانچہ ایک مغربی مورخ (Kardood) لکھتا ہے کہ:

مسلمانوں نے سائنس میں جو عظمت حاصل کی اُس کا اعتراف نہ کرنا بدترین بخل ہوگا اس لیے کہ انھوں نے علم کیمیا، طبعیات اور ریاضی میں وہ کامیابیاں حاصل کیں جن کے بغیر جدید دنیا کی تعمیر ممکن ہی نہ تھی۔مسلمان اگر دنیا کو "صفر" سے آشنا نہ کراتے تو آج دنیا مختلف ہوتی۔مسلمان روزمرہ زندگی میں علم الحساب کے بانی بن گئے۔انھوں نے الجبرا کو زیادہ صحیح علم بنا دیا اور اسے بہت ترقی دی۔انھوں نے تحلیلی ہندسہ کی بنیادیں ڈالیں اور بلاشبہ وہی مستوی و کروی تکونیات کے موجد ہیں۔مسلمان ریاضی دانوں کی تعداد یقیناً کئی ہزار رہی ہوگی کہ چھ صدیوں تک دنیا کی کوئی اور قوم اس علم کی طرف متوجہ ہی نہ تھی۔یہاں ہزاروں مسلمان ریاضی دانوں کا تذکرہ ممکن بھی نہیں اور نہ ہی تمام ریاضی دانوں کے احوال ہم تک منتقل ہوئے ہیں تاہم میرے سامنے پڑی کتابوں میں سینکڑوں ریاضی دانوں کے کارناموں سے پر کئی ہزار صفحات موجود

ہیں جن کو یہاں تحریر کرنا عبث ہے اس لیے کہ ہمارا مقصد تو محض اُس عظمت کو اجاگر کرنا ہے جو قرون وسطیٰ میں مسلمان علما کو حاصل تھی نہ کہ اُن تفصیلات میں الجھنا جو قاری کے لیے بارِ محض ہوں اس لیے ہم یہاں صرف چند ممتاز ریاضی دانوں کے احوال پہ ہی اکتفا کریں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔

✡✡✡✡✡✡

✍ احمد بن یوسف بن ابراہیم بن الدایہ المصری۔

احمد بن یوسف بن ابراہیم دسویں صدی کے ماہر ریاضی دان تھے۔ راست باز مغربی مورخین نے اُن کی علمی رفعتوں کا اعتراف کیا ہے۔ احمد بن یوسف ابراہیم نے مماثل قوسین پر ایک شاندار کتاب تحریر کی۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ نسبت و تناسب کے موضوع پر تحقیق ہے۔ اُن کی کتاب کا لاطینی ترجمہ اہل مغرب میں ایک عرصہ تک قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ اُن کا انتقال 902ء میں ہوا۔

✡✡✡✡✡✡

✍ ابن الہیثم۔

علم طبیعات کے ضمن میں اگرچہ ابن الہیثم کا ذکر ہو چکا ہے مگر اُس زمانے میں علم کو مختلف شعبوں میں منقسم نہ کیا گیا تھا اس لیے لوگ محض ایک عالم کے طور پہ جانے جاتے تھے نہ کہ وہ علم ریاضی، علم کیمیا یا علم طبعیات کے عالم کے طور پہ جانے جاتے۔ ابن الہیثم کے علمی کارنامے علم طبیعات

کے ضمن بیان کیے جا چکے ہیں۔ تاہم بیان کیا گیا ہے کہ ابن الہیثم بہت بڑا ریاضی دان بھی تھا۔ ابن الہیثم نے علم ریاضی پر بیس سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ اُن میں سے اکثر کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں کیے جا چکے ہیں۔ خاص طور پہ اُس زمانے کی زبان لاطینی میں اُن کی کتابیں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ انھوں نے ریاضی کے چند ایسے مسائل کو حل کیا جو اُس زمانے تک نا قابل حل تصور کیے جاتے تھے۔

ایک مغربی مورخ J. Verent ابن الہیثم کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

ابن الہیثم نے اپنے علم کی بنا پہ وہ قانون قائم کیا جسے ہم (Theorem of Contangent) نام سے جانتے ہیں۔ ابن الہیثم کو ریاضی میں زیادہ شہرت اسی قانون کی بدولت حاصل ہوئی۔ یہ قانون پانچ صدیوں سے انھی کے نام سے منسوب چلا آ رہا ہے۔

اس قانون کو آج تک مسئلہ ابن الہیثم یا Alhazen'S Problem. کہا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی۔

ریاضی میں البیرونی کی خدمات شاندار ہیں۔ انھوں نے ریاضی کے کئی مسائل حل کیے ہیں اور کئی کلیے دریافت کیے ہیں۔ اہل مغرب البیرونی کے کارناموں کے معترف ہیں چنانچہ پروفیسر Adweds کا بیان ہے کہ:

البیرونی کی تصنیفات میں اُن کی تخلیق کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اُن کے بیان کی حقیقی ماہیت کو جاننے کے لیے کئی نسلوں کی تحقیق کی ضرورت ہوگی۔

البیرونی کا نام علم کے کئی پہلوؤں سے معروف ہے۔ مشہور مغربی محقق جارج سارٹن نے اپنی کتاب (History of Sciences) میں البیرونی کے بارے میں لکھا ہے کہ

البیرونی کا علم ہمیشہ وسعت پذیر رہا۔اُس کی سوچ کا دائرہ ہمہ جہت ہے۔وہ بلاشبہ وقت کا عظیم ترین سائنس دان تھا۔البیرونی کا تنقیدی مزاج،اُس کی رواداری،اُس کی حق پسندی اور اُس کی ذہنی جرأت کی مثال قرون وسطیٰ سے دینا مشکل ہے۔البیرونی نے ہزار سال پہلے دنیا کو بتا دیا تھا کہ آواز کی رفتار روشنی سے زیادہ ہے۔پہلے پہل دنیا کے طول بلد اور عرض بلد بھی البیرونی نے ہی متعین کیے تھے۔البیرونی نے اپنی کتاب" **تاریخ الھند** "میں لکھا ہے کہ جہاں آج دریائے سندھ بہتا ہے وہاں کبھی سمندر ہوا کرتا تھا۔البیرونی نے جب اس بات کا اظہار کیا تھا تب لوگ اسے ماننے کے لیے تیار نہ تھے اگرچہ بعد میں جغرافیہ کے ماہرین نے اپنی تحقیقات سے البیرونی کی رائے کو درست قرار دیا۔ذیل میں البیرونی کی کچھ کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں۔

1- **کتاب الآثار الباقیہ عن القرآن الخالیہ**

2- **تاریخ الھند**

3- **القانون المسعودی فی ھئی والنجوم**

4- **التفہیم لا دائل صناعت التنجیم**

✡✡✡✡✡✡

✍ ابوالفتح عمر بن ابراہیم المعروف عمر خیام۔

مورخین نے بیان کیا ہے کہ عمر خیام بارہویں صدی کا سب سے بڑا ریاضی دان تھا۔عمر خیام نے ریاضی کے بہت سے معاملات حل کیے ہیں۔ (Well Deurant) نے عمر خیام کے بارے میں لکھا ہے:

کہ عمر خیام کی کتاب "الـــــجبـــــرا" قرونِ وسطیٰ کی ریاضیات کی بلندترین چوٹی ہے۔

(Jaorge Sarton) نے کہا کہ:

عمر خیام عظیم ترین ریاضی دان تھا۔ انھوں نے ریاضی کے بہت سے مسائل حل کیے ۔علم ریاضی میں جو رفعتیں مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہیں وہ عمر خیام کے عہد میں اپنے عروج کو پہنچ گئیں ۔عمر خیام نے مساواتوں کو اختلافِ نوعیت کے اعتبار سے تقسیم کرنے کا قابلِ قدر طریقہ ایجاد کیا۔عمر خیام نے صرف ایک مساوات مکعب کی تیرہ قسمیں دریافت کیں۔کئی صدیوں تک عمر خیام کی کتاب' **الجبرا و المقابلہ** " کا مطالعہ کیا جاتا رہا۔نصاب کے طور پہ اُن کی کتاب مغرب کی یونیورسٹیوں میں مروج رہی۔اپنی اسی کتاب میں عمر خیام نے ریاضی کے ایک مسئلے کا حل پیش کیا جس کا نام اب یورپ میں "Passal,s Triangle" ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے (Thedren & Co-efficient) ایجاد کیا۔ نیز جیومیٹری میں انھوں نے (Theory of Parallel lines) پیش کی جس کا استعمال بعد میں (Dacart) نے کیا۔ یاد رہے کہ لیپ ائیر کا آغاز بھی عمر خیام ہی نے کیا ۔"(31*)

✡ ✡ ✡

علم ریاضی اور مسلمان

یہاں مسلمان ماہرین ریاضی کا کچھ مزید تذکرہ کیا جاتا ہے جن کی جہد وسعی نے علم ریاضی میں رنگ بکھیرے۔ مسلمانوں میں علم ریاضی کا تذکرہ الخوارزمی کے نام کے بغیر ادھورا ہے۔ تب علم ریاضی ایک شدید جمود کا شکار تھا جس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یورپ میں رومن ہندسوں کا رواج تھا اور رومن ہندسے ہی علم ریاضی کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ دیکھیں کہ اگر رومن طریقہ ہندسہ میں 38 لکھنا ہو تو XXXVIII لکھا جائے گا۔ اب اگر 3800 لکھنا ہو تو مصیبت بن جاتی تھی۔ چنانچہ ہندی ہندسے جن سے اہل یورپ مسلمانوں کے توسط سے آشنا ہوئے تھے میں الخوارزمی نے صفر کا اضافہ کیا تو علم ریاضی سے وہ جمود ٹوٹ گیا جس کا وہ صدیوں سے شکار تھا۔ مورخین نے صفر کی دریافت کو علم ریاضی کی سب سے بڑی دریافت قرار دیا۔ مسلمانوں نے علم ریاضی میں اپنے قدم آگے بڑھائے اور اشاری نظام وجود میں آیا جس سے لوگوں کو بے پناہ آسانیاں حاصل ہوئیں۔ الخوازمی نے ریاضی میں نصف درجن سے زائد شاہکار کتابیں لکھیں۔ جب اہل مغرب اِن کتابوں سے آشنا ہوئے تو اُن کے اہل علم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اہل مغرب نے الخوازمی کی اِن تصنیفات سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ صفر کی دریافت کے بعد ہی علم ریاضی کے قدم آگے بڑھے اور اس علم سے انسانوں کو آسانیاں حاصل ہوئیں۔

✡✡✡✡✡✡

احمد بن یوسف بن ابراہیم بن الدایہ المصری (المتوفی 912ء) نے مماثل قوسین پر شاندار کتاب تحریر کی جس کا لاطینی ترجمہ بہت مقبول ہوا۔احمد بن یوسف کا شمار عظیم سائنس دانوں میں کیا جاتا ہے۔انھوں نے نسبت تناسب کے موضوع پہ جو تحقیق پیش کی اُسے آج تک قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابومحمود حامد بن الضحر المتوفی (1000ء) وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دنیا کو بتایا کہ دو مکعب عددوں کا مجموعہ مکعب عدد نہیں ہوتا ۔ جارج سارٹن نے اپنی کتاب (History of Sicencs) میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ابومحمود حامد بن النصر ہی کا کارنامہ ہے کہ انھوں نے دنیا کو بتایا کہ دو مکعب عددوں کا مجموعہ مکعب عدد نہیں ہوتا۔تاہم اہل مغرب نے علم ریاضی کی اس اہم دریافت کو سترھویں صدی کے ایک یورپی ماہر ریاضی (Fermat) سے منسوب کر دیا اور اسے (Theorem of Fermat) کے نام سے مشہور کر دیا۔

✡✡✡✡✡✡

ابوبکر محمد بن الحسن الکرجی (المتوفی 1019) نے ایک شاندار کتاب لکھی جس کا نام" **الجبر و المقابلہ** " ہے۔اس کتاب میں انھوں نے کثیر رقمی اعداد پہ بحث کا آغاز کیا جس کی وجہ سے انھیں کثیر رقمی اعداد کے الجبرا کا اولین مصنف کہا جاتا ہے۔(Jaorge Sarton) نے ابوبکر محمد بن الحسن کو عظیم مسلمان ریاضی دانوں میں شمار کیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالحسن علی ابن احمد القلصاری (المتوفی 1486ء) اندلس کے آخری ریاضی دان تھے۔غالبًا وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے غیر کامل مربعوں کے جذر حاصل کرنے کے لیے متواتر تخمینے کا طریقہ استعمال کیا۔ابوالحسن کی اسی علمی خدمت نے الجبرا میں علامتوں کو رواج دیا۔

✡✡✡✡✡✡

ابوزکریا محمد الحصار پہلے مصنف ہیں جنھوں نے کروں کو اُفقی خط کے ساتھ لکھا۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالحسن الاقلیدسی (920-980ء) پہلے ریاضی دان تھے جنھوں نے (Decimal Fraction) ایجاد کیے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوجعفر احمد ابراہیم الدایہ(المتوفی 912ء) نے ریاضی پہ دو کتابیں لکھیں جن کا لاطینی ترجمہ بہت مشہور رہوا۔اِن کتابوں کا شمار علم ریاضی کی اہم کتابوں میں کیا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ایک اور مسلم ریاضی دان ابو کامل شجاع بن اسلم (850-956ء) نے حساب پر بہت سی

کتابیں لکھیں ۔ اُن کی کل کتابوں کا علم نہیں ہو سکا تاہم اُن کی چودہ کتابیں اب بھی محفوظ ہیں۔ابو کامل کی اِن کتب نے یورپ میں جیومیٹری کی اشکال کے بارے میں نئے نظریا وضع کیے۔(W.Hartner) کے مطابق ان کی کتابوں نے یورپ کی جیومیٹری پر گہرے اثرات چھوڑے۔

✡✡✡✡✡✡

معروف ریاضی دان ثابت بن قرہ (836-901ء) نے علم ریاضی پر پچاس کتابیں لکھیں ۔ انھوں نے جیومیٹری کی کچھ اشکال اور اُن کے بارے میں نئے کلیات دریافت کیے۔

✡✡✡✡✡✡

ابراہیم بن سنان (908-946ء) بھی عظیم ریاضی دان تھے ۔ (Jaorge Sarton) کے مطابق ابراہیم نے قطع مکانی کا رقبہ (Area of Apolonios) معلوم کیا جو مسلم ریاضی کے عظیم ترین کارناموں میں سے ایک ہے۔

✡✡✡✡✡✡

جیومیٹری کے فروغ میں ابوسھل ابن رستم المعروف (التوفی 988ء) نے نا قابل فراموش کردار ادا کیا۔ابوسھل نے ریاضی پہ آٹھ کتابیں لکھیں۔اُن کی کتاب " **رسالۃ فی البرکار التام** " ہے۔یہ پہلی کتاب ہے جس میں مخروطی پرکار کا ذکر ہے۔ابوسھل نے جیومیٹری کے ایسے مسائل کو حل کیا ہے جو دو درجی یا اس سے زائد درجوں کی مساوات میں تحویل کیے جا سکتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ابوسعید احمد بن محمد اسجزی (945-1020ء) پہلے سائنس دان ہیں جنھوں نے کروی اور مخروطی پرکاروں کی ساخت اور مساوی الاضلاع ہذلولی شکل کے دائرے کی تقطیع کے ذریعے زاویے کی تثلیث کا طریقہ دریافت کیا جو بہت مقبول ہوا۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالوفا (المتوفی 998ء) نے جیومیٹری میں شاندار اضافے کیے۔ پرکار کے ایک پھیلاؤ سے ہندسی مسائل کو حل کرنا اُن کے شاندار کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُن کی کتابیں آٹھ صدیوں تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ (Jaorge Sarton) نے دسویں صدی کی دوسرے نصف کو اُن کے نام سے معنون کیا ہے۔ ابوالوفا غالباً پہلے ریاضی دان ہیں جنھوں نے کروی مثلثوں (Spherical Triangles) کے بارے میں (Sine Theorem) کی عمومیت آشکار کی۔

✡✡✡✡✡✡

احمد بن عبداللہ المروزی المعروف بہ حبش (المتوفی 827ء) پہلے ریاضی دان تھے جنھوں نے (Sine) یعنی زاویہ کا جدول تیار کر کے شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ احمد بن عبداللہ نے اسے جیب معکوس کا نام دیا۔ انھوں نے الخوارزمی کی پیروی میں مختلف نقشے تیار کیے اور مختلف

مقداروں کے لیے (Tangent) کی جدول تیار کی جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اپنی طرز کی اولین جدول تھی۔احمد بن عبداللہ نے (Secant) کو پہلی مرتبہ معلوم کیا اور اسے ٹرگنومیٹری میں رواج دیا۔ جنابِ احمد بن عبداللہ کا شاندار ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نہایت عرق ریزی سے (Trignometrical Table) مرتب کی جسے آج کے جدید عہد میں بھی انجینئرنگ کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوعبداللہ محمد ابن جابر ابن سنان البتانی (858-929ء) نے بھی ٹرگنومیٹری میں کمال حاصل کیا اور اس میدان میں اُن کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ہزار سال قبل انھوں نے نسبت تناسب کو جاننے کا جو طریقہ وضع کیا تھا آج تک وہی مستعمل ہے۔انھوں نے کروی مثلثوں کی پیائش کا اصلی اور اساسی قاعدہ دریافت کیا اور اسے بہت سی جگہوں پہ کام میں لائے ۔انھوں نے جیبی (Sine) بھی مرتب کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوعبداللہ محمد نے علم ریاضی کے اس پہلو یعنی (Trignomatry) کے ضمن میں اس قدر کام کیا کہ یہ مضمون سینکڑوں سال آگے بڑھ گیا۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالحسن علی ابن سعید عبدالرحمان ابن احمد ابن یونس المصر ی (المتوفی 1009ء) کا میدان بھی ریاضی تھا۔انھوں نے ٹرگنومیٹری کے شعبے میں بھی اہم خدمات سرانجام دیں۔(Jaorge Sarton) نے لکھا ہے کہ ابن یونس اپنے زمانے کا سب سے بڑا ریاضی دان اور علم ہیئت کا

ماہر تھا۔ بیان کیا گیا کہ (Sine Therorem) کی دریافت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ریاضی میں انھوں نے مثلث پہ بہت کام کیا۔ فلکیات میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ وہ زیچ تیار کرنا ہے جو مصر کے خلیفہ الحاکم کے نام پر "الزیچ الکبیر الحاکمی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ ابن یونس نے اس کی تیاری میں اپنے زندگی کے سترہ قیمتی سال صرف کیے اور اس کی تیاری کے صرف دو سال بعد انتقال کر گئے۔ یہ زیچ خسوفوں (Eclipses) نئے اور پرانے قرانوں (Astronomical Constants) پر معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اس میں اُس ارضی پیائش کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جو عباسی خلیفہ المامون کے حکم سے کی گئی تھی۔ جہاں تک مثلث کا تعلق ہے تو اس علم میں بھی ابن یونس نے گراں قدر انکشافات کیے۔ ہمارے عہد کے مسلمان مورخ سیّد امیر علی نے (Spirt of Islam) میں لکھا ہے کہ ابن یونس کی زیچ کی رفعت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ایران میں عمر خیام نے (1009ء) میں اس کی نقلیں تیار کرائیں، نصیر الدین طوسی نے اسے اپنی زیچ میں جو ایل خانی زیچ کہلاتی ہے میں نقل کیا۔ ازاں بعد تیرہویں صدی میں چین کے ہیت دان کوچیو کنگ نے (1280ء) میں اسے چینی علم ہیت کا جز بنایا۔ اسی طرح یونانی ہیت دانوں نے بھی ابن یونس کی اس زیچ سے فائدہ اٹھایا۔ سیّد امیر علی ہی نے انکشاف کیا ہے کہ سب سے پہلی گھڑی جس میں پینڈولم کا استعمال کیا گیا ابن یونس نے ہی ایجاد کی تھی۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالحسن کوشیار ابن لبان باشری الجیلی کا وطن جیلان تھا جہاں کے باشندے جیلی یا جیلانی کہلاتے تھے۔ ابوالحسن نامور ریاضی دان تھا۔ اس کی توجہیہ بالخصوص علم مثلث پہ تھی جس کے فروغ میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔ ابوالحسن نے ابوالوفا کے تحقیقی کام کو آگے بڑھایا جو اُس نے

مماس(Tangents) کے ضمن میں کیا تھا۔ابوالحسن کی مشہورِ زمانہ کتاب" زیج الجامع و المانع" کا بہت سی زبانوں میں ترجمہ کیا تھا۔گیارہویں صدی ختم ہونے سے قبل ہی اس کتاب کا فارسی ترجمہ کرلیا گیا تھا۔ابوالحسن نے اپنی اس کتاب میں مماس پہ سیر حاصل بحث کی ہے۔ابوالحسن نے علم الحساب پہ بھی ایک کتاب لکھی جواب دستیاب نہیں تاہم اُس کا عبرانی ترجمہ اب تک موجود ہے۔ابوالحسن الجیلی نے (1029ء) میں وفات پائی۔

✡✡✡✡✡✡

ابوبکر محمد ابن الحسن الحاسب الکرخی کرخ کا رہنے والا تھا جو بغداد کا ایک نواحی قصبہ تھا۔الکرخی کا شمار بھی بڑے ریاضی دانوں میں کیا جاتا ہے۔اُس نے علم الحساب پہ خصوصی توجہ کی۔وہ ہندی اعداد کو ہندسوں میں لکھا کرتا تھا۔اُس نے علم ریاضی پر جو مشہور کتاب لکھی وہ بھی اعداد کی بجائے ہندسوں پہ مشتمل تھی۔اُس کی کتاب کا نام" **الکامل فی الحساب** " ہے۔اُس نے اپنی کتاب جبروقدر میں اسکندریہ کے ریاضی دان (Diophants) سے اکتساب کیا۔جب یہ کتاب مکمل ہوگئی تو الکرخی نے اس کتاب کو اپنے ایک دوست کے نام معنون کیا جو ملک کا وزیر تھا اور اُس کا نام ابوغالب محمد ابن خلف فخرالملک تھا اپنے اسی دوست کی وجہ سے اُس نے اِس کتاب کا نام" **الفخری** "رکھا۔الکرخی نے دودرجی مساوات(Quadrtic Equation) پر خاص توجہ مبذول کی اور اُس نے کوشش کی کہ وہ چند اور قسم کی مساواتوں کو بھی دودرجی مساوات کے قالب میں ڈھال سکے۔الکرخی نے (1019ء) میں وفات پائی۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالحسن ابن احمد النسوی خراسان کے قصبے کا رہنے والا تھا۔اُس کا شمار اپنے وقت کے چوٹی کے ریاضی دانوں میں کیا جاتا تھا۔اُس نے علم الحساب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس ضمن میں کئی

کتابیں تحریر کیں جو مغرب اور مشرق میں یکساں مقبول رہیں۔اُس نے فارسی زبان میں اپنی کتاب" **المقنع فی الحساب الہندی**" غالبًا(1030ء)میں تحریر کی۔بعد میں ابوالحسن ابن احمد نے خود ہی اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ریاضی میں ابوالحسن کا موضوع کسر اشاریہ تھا۔ابوالحسن نے کسر اشاریہ(Decimal Fractions) کی اس قدر واضح تشریح کی اور جذر مکعب نکالنے کا اس قدر آسان طریقہ متعین کیا کہ آج تک یہی طریقہ مروج چلا آرہا ہے ۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس آسانی سے ساٹھویں حصہ والی کسر (Sexagesimal)کو کسر اشاریہ(Decimal Fractions)میں تبدیل کر دیتا تھا۔

✡✡✡✡✡✡

اُس کا نام تو ابوعبداللہ ابن عمر ابن محمد تھا مگر وہ اپنے لقب ابن بدر کے نام سے مشہور رہا۔وہ ماہر ریاضی داں تھا۔بارہویں صدی میں اشبیلیہ میں پیدا ہوا۔ریاضی میں اس نے جبرو مقابلہ پہ خاص توجہ کی۔خاص اسی موضوع پہ اس کی تین کتابوں کا پتا چلا ہے۔جبرو مقابلہ کے موضوع پر اُس نے جو کتاب لکھی اُس میں درجہ دوم کی مساوات (Quadrtic Equation) ، اصم(Surds)اور(Multiplication of Polynomials)سے بحث کی گئی۔علاوہ ازیں ابن بدر نے نظریہ اربعہ متناسبہ(Arithmetical Theory of Proportions)وغیرہ سے بحث کی اور ریاضی کے بہت سے حل طلب معاملات کی فہرست مرتب کی۔

✡✡✡✡✡✡

ابوطاہر اسماعیل ابن ابراہیم ابن غازی عراق میں پیدا ہوئے۔ وہ بارہویں صدی کے معروف ریاضی دان تھے۔ بعض لوگوں نے اُن کے اصل نام کی جگہ صرف عرفیت کو لکھا ہے جس سے اشتباہ پیدا ہوا۔ ابوطاہر اسماعیل کی عرفیت المادینی فلوس تھی۔ چنانچہ فلوس نے ریاضی میں اپنی توجہ اعداد پہ مرکوز کی۔ اُن کی مشہور کتاب "**کتاب الاعداد و الاسرار فی الاسرار الاعداد**" میں انھوں نے اعداد سے بحث کی ہے۔ ازاں بعد اُن کی کتاب "**کتاب الحساب فی المفتوع من علم الاحساب**" نے انھیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا اور لوگ انھیں ایک ماہر ریاضی دان کی حیثیت سے جاننے لگے۔ اپنے عہد عروج میں فلوس نے علم ریاضی پہ ایک اور معرکہ خیز کتاب لکھی جس کا موضوع جبر و قدر تھا اور اس کا نام "**نصاب الحجر فی حساب الجبر**" ہے۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ تب خلافت بغداد پہ بنو عباس کا آخری خلیفہ مستعصم حکمران تھا جو ایک نالائق حکمران تھا۔ اُس کے وزیر ابن القمی نے ہلاکو خان کو بغداد پہ حملے کی دعوت دی اور ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ منگول جب بغداد میں گھس آئے تب بھی نالائق خلیفہ اپنے غدار وزیر ابن عقلمی کے سوا کسی کی بات نہ سنتا تھا۔ ابن عقلمی نے مستعصم سے کہا کہ وہ اعمائدین شہر اور علما کو ساتھ لے کر اُس کے ہمراہ ہلاکو خان سے ملنے چلے وہ یقیناً تم سے اچھا سلوک کرے گا۔ چنانچہ مستعصم نے بہت سے علماء کو ساتھ لیا اور ہلاکو خان سے ملنے کو چل دیا۔ ہلاکو خان نے اُن کے ساتھ حقارت آمیز رویہ اپنایا اور تھوڑی دیر بعد خلیفہ سمیت تمام لوگوں کو قتل کر دیا انھی قتل ہونے والے لوگوں میں ابوطاہر اسماعیل بھی شامل تھا (32*)۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالعباس احمد ابن محمد ابن عثمان المعروف البناء کے نام سے جانے جاتے تھے۔ وہ علم ریاضی

اور ہیت کے ماہر تھے۔ابن البناء (1256ء) میں مراکش میں پیدا ہوئے۔انھوں نے علم ہندسہ، علم جبر و مقابلہ، علم حساب اور علم ہیت میں نام پیدا کیا۔اِن موضوعات پہ اُن کی کئی کتابیں منظرِ عام پہ آئیں اور دادِ تحسین وصول کی۔علم ریاضی میں اُن کی کتاب " **تلخیص فی اعمال الاحساب** " نے شہرت عام حاصل کی۔بعد میں اُن کی اس کتاب کی تشریح کے لیے کئی شرحیں لکھی گئیں۔ریاضی میں ابن البناء کی ایک اور کتاب "**رسالۃ فی العلم المساحۃ**" ذکر کیے جانے کے قابل ہے جس میں انھوں نے سطح زمین کی پیائش کے اصول اور طریقے بیان کیے ہیں۔اس کتاب کی شہرت عامہ کے بعد ابن البناء نے جبر و قدر کے موضوع پہ جو کتاب لکھی اُس کا تذکرہ آج تک تاریخوں میں کیا جاتا ہے اُس کا نام " **کتاب الاصول و المقدمات فی الجبر و المقابلہ** " بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح علم ہیت پہ بھی اُن کی کئی کتابوں نے عام شہرت حاصل کی اُن میں " **کتاب منہاج الطالب فی عدیل الکواکب**" سرفہرست ہے۔ابن البناء نے ایک خاص کتاب قبلہ کا درست رخ متعین کرنے کے لیے بھی لکھی۔اس کے علاوہ ابن البناء نے علم تقویم کے بنیادی اصول بھی وضع کیے۔اُن کی کتابوں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہوسکی تاہم علم ہیت اور علم ریاضی میں اُن کی مہارت کسی کی نظر سے پوشیدہ نہ تھی اس لیے معاصر علماء میں اُن کو ممتاز مقام حاصل تھا۔اُن کی کئی اور کتابوں کے نام بھی مورخین نے تحریر کیے ہیں۔

1- تخلیص علم الاحساب

2- کتاب المناخ

3- رفع الحجاب

4- المقالات فی الحساب

6- تنبیہ الالباب

7- وفات الاسماء

8- منصلات(33*)

✡✡✡✡✡✡

ابوجعفر محمد ابن محمد ابن الحسن ناصرالدین طوسی بھی علم کے میدان کے شہ سوار تھے۔انھوں نے علم کے کئی شعبوں میں نام پیدا کیا۔وہ (1201ء) میں طوس میں پیدا ہوئے۔وہ کمال الدین ابن یونس کے شاگرد تھے جن کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ناصرالدین طوسی کا شمار چوٹی کے ریاضی دانوں میں کیا جاتا ہے تاہم اُن کی وجہ شہرت علم ریاضی نہ تھی بلکہ وہ ایک منجم کی حیثیت سے مشہور تھے۔فرقہ اسماعیلیہ کے گورنر نے انھیں جیل میں ڈال رکھا تھا تاہم جب وہ جیل سے باہر آئے تو انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔وہ ہلاکو خان کے پاس چلے گئے۔ہلاکو خان اُن کی بہت تعظیم کرتا تھا اس لیے کہ ناصرالدین طوسی کی بہت سی پیش گوئیاں درست ثابت ہوئی تھیں اور ہلاکو خان اپنی فتوحات کو ناصرالدین طوسی کے نام کرتا ہے۔ناصرالدین طوسی نے ہی وہ مشہور فقرہ کہا تھا کہ جب ہلاکو نے اُس سے بغداد پر حملہ کرنے کے متعلق مشورہ کیا تو طوسی نے کہا مستعصم کا سر حسین رضی اللہ عنہم کے سر سے زیادہ قیمتی تو نہیں جو اتارا نہ جا سکے۔بعد میں ہلاکو خان نے ناصرالدین طوسی کو اپنا وزیر بنا لیا تھا اور وہ ہر اہم معاملے میں ناصرالدین طوسی سے مشورہ کرنا ضروری خیال کرتا تھا اس لیے کہ وہ ناصرالدین طوسی کی علمی رفعت سے متاثر تھا۔

ہلاکو خان نے محض ناصرالدین طوسی کی خواہش پر کثیر سرمائے سے ایک رصدگاہ بنوائی جہاں سے ناصرالدین طوسی آسمانوں کا مشاہدہ کیا کرتا تھا۔ناصرالدین نے علم ریاضی اور علم ہیئت پر بہت سی کتابیں لکھیں۔علم ہندسہ یعنی (Geometry) ناصرالدین طوسی کا خاص مضمون تھا اس لیے کہ علم ہندسہ جہاں ریاضی کے مسائل سے بحث کرتا ہے وہیں اس کو علم ہیئت میں بھی بنیادی

مقام حاصل ہے۔قبل ازیں علم ہندسہ علم ہیت کی محض ایک شاخ تصور کی جاتی تھی تاہم ناصر الدین طوسی نے علم ہندسہ کوایک الگ علم کے طور پہ پیش کیا اور اسے مستقل علم کی حیثیت عطا کی ۔اپنے اس نظریہ کے استحکام کے لیے ناصر الدین طوسی نے خاص اسی موضوع پرایک کتاب لکھی جس کا نام " **کتاب شکل النظاع** "رکھا۔مورخین نے بتایا ہے کہ علم ریاضی میں اس کتاب کو بہت اہم تصور کیا جاتا ہے۔بارہویں صدی عیسوی میں اس کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ناصر الدین طوسی نے علم ہیت پر بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔اس ضمن میں اُس کی سب سے معتبر کتاب " **تذکرۃ فی الاعلم الہیۃ** " ہے۔بعض نے اسی کتاب کا نام " **تذکرۃ الناصریہ**" بھی لکھا ہے۔یہ اس کتاب کا علمی پایہ ہی تھا کہ محض اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں۔

ناصر الدین طوسی بلاشبہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑا عالم تھا اُس کی کچھ مزید کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

علم العین پہ اُس نے " **کتاب المناظر** "تحریر کی۔

موسیقی پر اُس نے " **کتاب فی الاعلم الموسیقی** "لکھی۔

علم معدنیات پر اُس نے " **تنسوق نامہ اھل خانہ** "تحریر کی۔

جغرافیہ پر اُس نے " **کتاب صورت الاقلیم** "لکھی۔

مابعد الطبیعات پر اُس نے " **کتاب الفصول** "لکھی۔

فلسفہ پر اُس نے " **اثبات الجواھر المشارق** " نامی کتاب لکھی۔

الٰہیات پر اُس نے " **جواھر الفرائض الناصریہ** " نامی کتاب لکھی۔

علم الکلام پر اُس نے " **تجرید المشابر** "نامی کتاب لکھی۔

اخلاقیات پر اُس نے" **اوصاف الاشراف فی سیر الملوك** "لکھی۔(34*)

✡✡✡✡✡✡

محمود ابن مسعود ابن مصلح المعروف قطب الدین شیرازی (1236ء) میں پیدا ہوئے۔ وہ ناصر الدین طوسی کے شاگرد تھے۔ بیان کیا گیا ہے کہ قطب الدین شیرازی کو اپنے استاد ناصر الدین طوسی کی وفات کے بعد متفقہ طور پہ وقت کا سب سے بڑا سائنس دان قرار دیا گیا تھا۔ ہلاکو خان بغداد پر قابض ہو چکا تھا اس لیے اب تحصیل علم کے لیے مسلمانوں کو مراجعت کی ضرورت پیش آئی۔ قطب الدین شیرازی بھی علم کی تلاش میں محو سفر رہا۔ وہ مدتوں خراسان عراق، ایران اور روم کے علاقوں کی سیر و سیاحت میں مصروف رہا اور ساتھ ہی تحصیل علم کی کوششوں میں بھی خود کو مگن رکھا۔ ازاں بعد شیرازی نے ایل خانی حکومت کی ملازمت اختیار کر لی یاد رہے کہ منگولوں کی حکومت کو ایل خانی حکومت کہا جاتا تھا۔ قطب الدین نو سال تک قاضی کے عہدے پر فائز رہا اور سواس اور ملیتیہ جیسے بڑے شہروں میں اپنے فرائض سر انجام دیتا رہا۔ بعد میں اسے مصر بھیج دیا گیا جہاں سے واپسی پر وہ تبریز میں ہی مقیم ہو گیا۔ قطب الدین شیرازی علم ریاضی، علم ہیت، علم جغرافیہ، علم المناظر، علم فلسفہ علم طب اور علم ہندسہ کا ماہر تھا۔ علم ہیت پر اس کی سب سے بڑی کتاب " **نہایت الادراک فی درایت الافلاک** " ہے۔ اس کتاب میں بہت سے موضوعات سے بحث کی گئی ہے جن میں علم ہندسہ، علم المناظر، علم الا پیمائش اور موسمیات کے علاوہ علم طب شامل ہیں۔

قطب الدین شیرازی نے اگر چہ یہ کتاب اپنے استاد ناصر الدین طوسی کی کتاب " **تذکرۃ فی الاعلم الھیتۃ** " سے متاثر ہو کے لکھی تھی تاہم یہ کتاب ناصر الدین طوسی کی کتاب سے زیادہ مفصل تھی۔ علم طب پہ شیرازی کی کتاب " **کتاب نزھت الحکماء و روضۃ الاطباء** " نے بہت شہرت حاصل کی۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ کتاب دراصل ابن سینا کی مشہور عالم کتاب " **قانون فی الطب** " کی شرح ہے۔ اُس زمانے میں دستور تھا کہ کسی کتاب کی شرح لکھتے ہوئے شارح اُس میں اپنے خیالات بھی داخل کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ قطب الدین شیرازی نے بھی " **کتاب نزھت الحکماء و روضۃ الاطباء** " لکھتے ہوئے

صرف ”**قانون فی الطب**“ کونظر میں نہیں رکھا بلکہ اُس نے اسی کتاب میں امام فخر الدین رازی اور عبدالطیف کے نظریات بھی پیش کر دیئے تھے۔علم ہیت کی طرح علم ریاضی میں بھی قطب الدین شیرازی کی خدمات کونظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔دراصل اُس عہد میں ریاضی اور ہیت ایک ہی علم تھا اس لیے اس کو الگ الگ بیان نہ کیا جاتا تھا بلکہ ایک ساتھ بیان کیا جاتا تھا ۔چونکہ علم ہندسہ کا تعلق ہیت اور ریاضی دونوں سے ایک جیسا تھا اس لیے بعض اوقات اشتباہ گزرتا ہے کہ فلاں عالم علم ہیت کا ماہر تھا یا اُسے علم ریاضی کا ماہر کہا جائے۔علم ریاضی اور ہیت پہ شیرازی نے بہت سی کتابیں لکھیں۔آخری عمر میں اُس کو تصوف کا شوق چرایا اور وہ صوفی ہو گیا ۔دراصل وہ ایک نیا مذہب پیش کرنا چاہتا تھا جس کی بنیاد ایرانی فلسفہ کی نو افلاطونیت ، باطنیت اور یونانی نظریہ مذہب اور اسلامی الہیات پہ رکھی تھیں۔وہ اصلاح الدین ایوبی کا عہد تھا۔لوگ اسلام میں پختہ تھے اس لیے جب اسلامی حکومت کو اُس کے تخیل کا علم ہوا تو انھوں نے اُسے قید کر دیا۔ازاں بعد اصلاح الدین ایوبی کے بیٹے سلطان الظاہر کے حکم سے اسے (1191ء) میں حلب میں قتل کر دیا گیا۔

✡✡✡✡✡✡

محی الملۃ والدین یحیٰ ابن محمد ابن الشکر المغربی الاندلسی کا نام بھی ماہر ریاضی دانوں میں لیا جاتا ہے۔وہ ہیت دان بھی تھا اور مراغہ کی رصدگاہ کے محققین میں شامل تھا۔وہ اپنے استاد ناصر الدین طوسی سے متاثر تھا اس لیے اُس نے علم ریاضی پہ اپنی شاہکار کتاب کا نام اپنے استاد کی کتاب پہ ”**کتاب شکل الانظاع**“ رکھا۔یہ کتاب علم ہندسہ اور مثلث پہ لکھی گئی۔اس کتاب میں اگرچہ اُس نے ناصرالدین سے بہت کچھ لیا تاہم الاندلسی کی اپنی تحقیقات بھی قابل قدر ہیں۔الاندلسی نے چینی اور ترکوں کے لیے علم تقویم پہ بھی ایک جامع کتاب لکھی جس کا نام ”

رسالۃ الحضاء و الایغور ‘‘ تھا۔وہ چین بھی گیا تھااور اُس نے اپنے کئی چینی شاگردوں کو علم ہیت منتقل کیا تھا۔

✡✡✡✡✡✡

الاندلسی کا ایک شاگرد اسماعیل تھا جو چینی الانسل تھا۔وہ ترکستان میں پیدا ہوا تھااور تاتاریوں کی ملازمت تھا۔دراصل وہ انجینئر تھا۔اُس نے تاتاریوں کے لیے علم ہندسہ کے ذریعے ایک بڑی منجنیق تیار کی تھی۔منگولوں کی مسلم علاقوں پہ قبضے کے بعد مسلمانوں اور اہل چین میں میل ملاپ بڑھ گیا تھا اور بہت سے چینی مسلم علوم کی راغب ہو گئے تھے۔انھی میں اسماعیل بھی تھا جس نے الاندلسی سے علم حاصل کیا۔اسی نے سب سے پہلے چین میں علم ہندسہ کو رواج دیا۔ اُس کی قوم مروج علوم سے دور تھی اس لیے لوگ اسماعیل کے علم پہ حیران ہوتے تھے۔اُس نے علم ریاضی پہ کئی کتابیں لکھیں۔اُس نے اپنی قوم کو بتایا کہ علوم تک رسائی کے لیے ضروری ہے مسلمانوں کی زبان سیکھی جائے۔علم ریاضی پہ اُس کی کتاب ’’**کتاب الاشکال تاسئیس**‘‘ نے بہت شہرت حاصل کی۔

✡✡✡

جب سے انسان نے شعوری زندگی میں قدم رکھا ہے تب سے اسے علم طب کی ضرورت پیش آنے لگی۔ بعد کے میں ادوار میں بھی علم طب انسان کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ترقی کرتا رہا ہے۔ یہاں ہم اس علم سے متعلق مسلمانوں کی خدمات کے بارے میں تحریر کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح علم کے دیگر شعبوں میں مسلمان ماہرین کا کوئی جواب نہ تھا اسی طرح گزری چند صدیوں میں مسلمان اطباء بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ علم کے بلند منصب پر فائز انھی لوگوں کا کچھ تذکرہ یہاں مقصود ہے جن پہ آج ہم فخر کرتے ہیں مگر اُن کے طریق کی پیروی نہ کریں گے۔

علم طب اور مسلمان

انسان نے شعور کی آنکھ کھولی تو خود کو بہت سے مصائب میں گھرا پایا۔ تاہم اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقل کی بدولت انسان نے اپنی مشکلات کو جلد ہی کم کرلیا۔ صرف بیماری تھی جو ایک ضدی عفریت کی طرح انسان سے چمٹ گئی اور اُس کا پیچھا چھوڑنے پر تیار نہ ہوئی۔ انسان نے شعوری ارتقاء کے ہر پڑاؤ پہ امراض کی چاپ کو محسوس کیا۔ تب مچھر جیسی حقیر چیز انسان کی بستیوں کی بستیاں اجاڑ کے رکھ دیتی تھی۔ ہیضہ، پلیگ اور تپ دق جیسے کتنے ہی برے سپنے تھے جنھوں نے انسان کا تعاقب کیا اور انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انسان نے بیماری کے خلاف طویل جنگ لڑی مگر وہ یہ جنگ نہ جیت سکا اس لیے کہ یہ جنگ فطرت کے خلاف تھی، خالق کی منشا کے خلاف تھی۔ انسان جب اپنے جسم کی ہیت پہ نگاہ تدبر ڈالتا ہے اور الہامیات کی رو سے اس ہمہ رنگ اور ہمہ جہت کائنات پہ نظر کرتا ہے تو جلد ہی اُس کو محسوس ہو جاتا ہے کہ اُس کا یہ مادی جسم اس لیے ناپائیدار رکھا گیا ہے کہ اُس کی پائیداری کی ضرورت ہی نہ تھی۔ انسان کو اس دنیا میں گنتی کے کچھ روز گزارنے کے لیے اتارا گیا ہے

تاکہ اُس کا امتحان ہو جائے اگر وہ کامیاب ہو تو اُسے ابدی نعمت اور جوانی عطا کی جائے۔ اگر وہ ناکام ہو تب بھی جہنم میں اُس کو ایک پائیدار جسم ہی عطا کیا جائے گا تاکہ وہ خالق سے انکار کی سزا پائے اور ذلت کی جگہ میں پڑا رہے۔ اس امر پہ بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ بیماری آخر ہے کیا بلا ؟ یہ وہ سوال جس کا جواب دنیا کے ہر کونے سے مختلف آئے گا۔ اس لیے کہ مختلف قوموں کے ترجیحی رجحانات، عقائد معاشرت اور سماج کی اساس مختلف نظریات پہ رکھی ہے۔ اس لیے ہر کوئی اپنی بولی بولے گا اور اتنی بولیوں میں حق تلاش کرنا دشوار ہو جائے گا۔ میں یہاں اُن لوگوں کے رجحانات بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا جو خالق کے انکار پہ بضد ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انھوں نے خالق کی منشا کو نہیں سمجھا تو اُن کی سمجھ میں زندگی کا مقصد بھی نہیں آسکتا۔

جب وہ موت کو فنا سمجھتے ہیں تو زندگی اُن کے نزدیک محض حرکت اور تعیش کا نام ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان موت پہ غور کرے۔ موت فنا نہیں، موت تو محض منظر کی تبدیلی کا نام ہے۔ اگر انسانیت اس حقیقت کو سمجھ جائے تو اُس کی زندگی کا ہر پل، اُس کی ترجیح کا ہر مدار، اُس کی آرزو کا ہر مرکز، زندگی کے بارے میں اُس کا نصب العین اُس کے اٹھتے ہر قدم کی منزل، اُس کے نظریات ،اُس کے عقائد، اُس کی سماجیات، اُس کی اخلاقیات، اُس کے معاملات، اُس کے احساسات، اُس کے جذبات، اُس کی محبتوں کے محور، اُس کی جہد و سعی کے ثمرات، اُس کے شب و روز کے لمحات ہر چیز ہی بدل کے رہ جائے گی۔ مگر انسان کی بدقسمتی ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں انسانوں کی اکثریت نے شیطان کی اُس راہ کو ترجیح دی ہے جو اس کے نفس کو عارضی لذتوں سے آشنا کرتا ہے اور اُس کو بدی کی راہ پہ ڈالے رکھتا ہے۔

نفس کی یہ عارضی لذتیں انسان کے اس مادی جسم کو جو پہلے ہی کچھ زیادہ پائیدار نہ تھا مزید کھوکھلا کر دیتا ہے اور انسان موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ دیکھیں کہ بہ حیثیت قوم مسلمانوں کے سوا دنیا میں اور کوئی قوم اور کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں شراب پینے کی ممانعت ہو۔ شراب میں استعمال ہونے والے صریح الاثر کیمیائی اجزا انسان کے جگر کو چاٹ جاتے ہیں اور مغرب میں ہر سال کروڑوں لوگ صرف

شراب نوشی کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔اُن کی جنسی بے راہ روی سے پچھلی کچھ دہائیوں میں ایڈز کے شکار لاکھوں لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔یہ دراصل ایک بحث ہے اُس پیش منظر کے تناظر میں جو آج کے عصر میں نظروں کے سامنے ہے۔اگرچہ تاریخی طور پہ اس میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہے اس لیے کہ قدیم زمانوں سے ہی انسان دو گروہوں میں منقسم چلا آیا ہے ایک وہ جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگی کی راہوں کا تعین کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو انسانی حقوق کے نام پر زنا، شراب، جوئے اور ہم جنسی جیسے قبیح افعال کو انسان کا حق قرار دیتے ہیں اور کسی قسم کی اخلاقی، سماجی، مذہبی اور عقائدی پابندی سے اپنی زندگی کو آزاد تصور کرتے ہیں۔آج کی مستعمل اصطلاح میں پہلے گروہ کو مسلم یعنی اطاعت شعار اور دوسرے گروہ کو غیر مسلم یعنی انکار کرنے والے کے نام سے پکار سکتے ہیں چونکہ زندگی گزارنے کے یہ دونوں نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لیے اِن دونوں گروہوں کی زندگی کے اطوار، ترجیحات اور مشاغل میں بھی بہت فرق ہے۔ اس فرق کی حقیقی ماہیت اُس وقت سمجھ میں آتی ہے جب مغرب میں ہر سال کروڑوں لوگ شراب اور ایڈز کی وجہ سے مر جاتے ہیں جبکہ مشرق میں ہندوستان کو چھوڑ کر اِن وجوہات پہ ہونے والی اموات محض چند سو رہی ہوں گی۔

یہ وہ فرق ہے جو اجلے لباسوں اور چمکتے دمکتے سماجوں کی اصل اور گھناؤنی صورت کو سامنے لاتا ہے کہ انسان کے اعمال میں اخلاق و کردار کی اہمیت کھل کے سامنے آجاتی ہے۔چنانچہ اِن دونوں انسانی گروہوں کے اخلاق و اعمال میں بین فرق کی وجہ سے بیماری اور صحت کے نقطہ نظر میں بھی اتنا ہی فرق ہے۔اہل مغرب کے آباء تو غسل کو گناہ سمجھتے چلے آئے ہیں اس لیے گندگی سے فطری اُنس اُن کی جبلت میں پایا جاتا ہے۔دیکھیں اسلام میں بیوی کے پاس جانے کے بعد غسل فرض ہے جب کہ اہل مغرب مباشرت سے پہلے غسل کر لیتے ہیں اور اُسی نجس حالت میں سو جاتے ہیں۔اسلام میں نماز سے پہلے طہارت ہے جب کہ ہل مغرب سے عبادت کا تصور ہی رخصت ہو چکا۔اسلام میں صفائی کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے جبکہ مغرب میں پانی کے استعمال کو ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہے اور

سارا کام ٹشو پیپر سے لیا جاتا ہے۔ مغرب دراصل ذہنی طور پہ پس ماندہ ہے اس لیے اُس کے نزدیک زندگی کا کوئی واضح تصور نہیں ہے سوائے ہر لمحہ زیست سے لذت کشید کرنا یا پھر مادیت کی انتہاؤں کی تلاش میں بھٹکتے پھرنا۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ بحث موضوع سے ہٹ کر ہے۔ اس لیے کہ زندگی کا تعلق موت کے ساتھ ہے، موت کا تعلق بیماری کے ساتھ ہے۔ زندگی کا تعلق انسان کے اُس تخیل کے ساتھ پیوست ہے جو وہ کائنات اور خالق کائنات کے بارے میں رکھتا ہے۔ زندگی کا تعلق اعمال کے ساتھ ہے، اعمال کا تعلق نظریات کے ساتھ ہے، نظریات کا تعلق عقائد کے ساتھ ہے اور جب کوئی عقیدہ ہی نہ ہو تو وہ عمل سامنے آتا ہے جس کے نتیجے میں ایڈز جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا ہے اور انسانوں کی بہت بڑی آبادی کو چٹ کر جاتا ہے۔

اس لیے انسان کی طبی تاریخ پہ نظر ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ انسان کو اُس وجہ کی طرف متوجہ کیا جائے جس کے باعث اُسے کوئی بیماری گھیر لیتی ہے اور اُس کی زندگی کی مہلت کو ختم کر دیتی ہے۔ جب انسان اس زندگی کو خالق کی امانت کے طور پہ لے گا تو اُس کے نظریات اور رجحانات بالکل مختلف ہوں گے انسانوں کے اُس گروہ سے جو موت کو انسانی فنا قرار دیتا ہے اور دنیا کو جائے تعیش مانتا ہے۔ قرآن اور دیگر الہامی کتابوں کو انسان پہ زندگی کی حقیقت کو کھول کے بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ زندگی مہلت عمل ہے اس لیے اسے خالق کی منشا کے مطابق گزارو۔ دوسری صورت میں انسان کے مقدر میں صرف ذلت ہے اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی۔

آج کے پیش منظر میں انسان زندگی کی تشریح میں ناکامی کا شکار ہے۔ بڑے بڑے کنونشن حالوں میں صاف ستھرے اجلے لباسوں والے انسان جب موت کو شکست دینے کی بات کرتے ہیں اور ایسے ایسے دعوئ کرتے ہیں جو اُن کو زیب نہیں دیتے اور اس کے نتیجے میں انسانوں کے مختلف گروہ مختلف نظریاتِ زیست کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس عہد میں انسان کی بدقسمتی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ طاقت، ٹیکنالوجی اور معاشیات کا منبع وہ معاشرے ہیں جو خالق کی ذات سے انکاری ہیں اس لیے دنیا میں بالعموم الہامیات کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی۔ اسلام کے پیروکار طویل غلامی کا دور گزارنے کے

بعد اب سیاسی بلوغت کا سفر طے کر رہے ہیں۔ انھیں ابھی علم کی اپنی اُس میراث کو حاصل کرنے میں کچھ وقت درکار ہے جو اُن کے آباء نے چھوڑی اور جس پہ اہلِ مغرب نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے۔ علم کے دوسرے بہت سے میدانوں کی طرح علم میں طب میں بھی مسلمانوں نے وہ میراث چھوڑی ہے جس پہ فخر نہ کرنا امت کی نااہلی اور غفلت ہے۔ اس باب میں ہم انھی نشاناتِ میراث کو واضح کرنے کی جستجو میں ہیں جو دراصل ہماری میراث تھے مگر وہ ہم تک غیروں کے حوالے سے پہنچے۔

اسلام کی آمد کے بعد یہود و نصاریٰ نے اسلام کی مخالفت کا عزم تو کر لیا مگر ایک ہزار سال تک انھیں اپنے عزائم کو منزل تک لے جانے کا کوئی موقع نہ ملا کہ مسلمان زندگی کے ہر پہلو سے اُن پہ حاوی رہے۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے علم کیمیا اور علم طبیعات میں مسلمانوں کی دسترس کے احوال سے آشنائی حاصل کی ہے مگر خود اہلِ مغرب اس بات کے معترف ہیں کہ مسلمانوں نے سب سے زیادہ علم طب میں کمال دکھایا اور اس علم میں جو رفعت حاصل کی اُس کو بیان تک کرنا مشکل ہے کہ ابھی کل تک یعنی سترہویں اٹھارویں صدی تک تو مغرب کا ہر طالب علم ابن سینا کی ” **قانون فی الطب** “ پڑھا کرتا تھا۔ اس کے پاس انسانی جسم کو جاننے کا اور کوئی ذریعہ ہی نہ تھا سوائے اُس علم کے جو مسلمان اطباء نے ورثے میں چھوڑا تھا۔

مسلمانوں کے علم کی بنیاد اُن کے اُس تخیل پہ رکھی تھی جو انھیں اسلام سے ملا تھا۔ اسلام نے بیماری کے خلاف جدو جہد اور علاج کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ خود قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو صحت کے حوالے سے ہدایات سے نوازا ہے۔ جیسا کہ شراب سے ممانعت، خون، مردار اور خنزیر سے ممانعت۔ دراصل تو یہ ہدایات انسان کو اسی لیے دی گئی ہیں تا کہ وہ صحت مند رہے اس لیے کہ اگر وہ صحت مند ہو گا تب ہی وہ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے قابل ہو گا۔ انسان کے اعمال بلاشبہ اُس کی زندگی کے ہر شعبے پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ انھی میں صحت بھی ہے۔ صحت کا تعلق صفائی کے ساتھ ہے اور اسلام نے صفائی کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ اسلام نے جہاں انسان کو کچھ نجس و ناپاک چیزیں کھانے سے روکا ہے وہیں اُس نے انسان کو صفائی کی طرف رغبت دلائی ہے کہ

اگر صفائی ہوگی تو بیماری نہ ہوگی۔ چنانچہ مسلمان ہر نماز سے پہلے طہارت حاصل کرتا ہے۔ اپنے جسم کو صاف ستھرا رکھتا ہے، اپنے منہ کو صاف رکھتا ہے، مسواک کرتا ہے، غسل کرتا ہے اور نجاست سے نفرت کرتا ہے کہ اسی میں خالق کی رضا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں صحت و صفائی کا اس قدر بسیط تذکرہ ہے کہ انسان حیران رہ جائے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے یہ روایت اپنی صحیح میں درج کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کی شفا نہ رکھی ہو۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب بیمار ہوتے تو دوائی لیتے اور صحابہ کو بھی بیماری کی حالت میں دوا لینے کی تلقین کرتے۔ چنانچہ حکمائے اسلام نے طب نبوی پہ بہت سی کتابیں لکھیں ہیں اور روایات میں کم و بیش 80 دواؤں کا ذکر رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ ظہور اسلام سے قبل اگرچہ لوگ دواؤں سے علاج کرتے تھے مگر انسان ہنوز ابھی طب کی اُن رفعتوں سے دور تھا جو مسلمانوں نے اگلی چار پانچ صدیوں میں انسان تک منتقل کیں۔ یاد رہے کہ نصاریٰ کے ہاں تو بیماری کو گناہوں کی سزا تصور کیا جاتا تھا اور وہ علاج کو کچھ زیادہ پسند نہ کرتے تھے۔

رہی باقی دنیا تو اُس میں دواؤں سے کم ٹونے ٹوٹکے اور جنتر منتر وغیرہ سے زیادہ علاج کیا جاتا تھا۔ نصاریٰ کے ہاں اگر کسی کو سر میں درد ہوتا اور لوگوں کو اس کی خبر ہو جاتی تو لوگ اسے پکڑ لیتے اور کہتے شیطان اس کے سر میں گھس گیا ہے اور وہ اینٹوں اور دیگر ہتھیاروں سے اُس سر کی ایسی مرمت کرتے کہ اکثر اوقات اُس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جالینوس، ابن سینا اور رازی سے پہلے علم طب محض ایک انسانی خواہش تھی کہ اُسے بیماری سے نجات ملے۔ یہ اعزاز مسلمان اطبا کو حاصل ہوا کہ انھوں نے انسانوں کی اِس خواہش کو عملی جامع پہنایا اور انسان بیماریوں سے نمٹنے کے قابل ہوا۔ اہل مغرب نے ہی بعد میں یہ اعتراف کیا کہ طب مردہ تھی جالینوس نے اسے زندہ کیا، طب پراگندہ تھی رازی نے اسے یکجا کیا۔ طب ناقص تھی ابن سینا نے اسے مکمل کردیا۔ قرون وسطیٰ میں پوری دنیا میں صرف دو ہزار ماہر طبیب تھے اور وہ سارے کے سارے مسلمان

تھے۔ مسلمان اطباء اپنے فن میں اس قدر ماہر تھے کہ دنیا کی کوئی اور قوم اُن کی ہمسری کا سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ مسلمان اطباء نے نہ صرف یہ کہ انسانی جسم کا انتہائی گہرائی میں جا کر مطالعہ کیا بلکہ انھوں نے انسان کو لگنے والی بیماریوں کی وجوہات تک رسائی حاصل کی جس کے بعد اُس کا علاج کرنا دشوار نہ رہا۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے دوا کے استعمال کا حکم دیا تھا اس لیے مسلمانوں نے ادویات کی دریافت اور فراہمی میں سرگرمی دکھائی اور نہایت عرق ریزی سے انسانیت کی فلاح کے اُس عظیم پہلو کی طرف خود کو متوجہ کیا جس کو علم طب کہا گیا ہے۔ مسلمانوں نے بہت سی بیماریوں کا علاج دریافت کیا۔ اس شعبے میں مسلمان حکماء نے اس قدر سنہری کارنامے سرانجام دیئے ہیں کہ اُن کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہوں گے۔ مسلمانوں نے علم طب کے تمام اہم اور بنیادی پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ انھوں نے عمل جراحی میں اس قدر مہارت حاصل کی کہ دنیا آج تک اُس کی مثال پیش کرتی ہے۔ مسلمانوں نے نہ صرف بیماریوں کا علاج دریافت کیا بلکہ انھوں نے طبی آلات کی ایجاد اور موثر ادویات کے متعلق ہزاروں کتابیں لکھیں۔

مسلمانوں کے ہر بڑے شہر میں شفا خانے قائم کیے گئے جہاں طبیب لوگوں کا مفت علاج کرتے تھے۔ اِن شفا خانوں میں مریضوں کی خدمت کو عبادت کا درجہ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ مسلم ہسپانیہ اور بغداد کی عباسی خلافت میں لوگوں کے علاج ومعالجے پر اس قدر روپیہ خرچ کیا جاتا کہ آج کی متمدن ریاستیں بھی شرما جائیں۔ ذہن میں رہے کہ اِن شفا خانوں میں رہائش، کھانا اور علاج مفت تھا۔ بغداد اور مسلم ہسپانیہ کے بہت سے شفا خانوں میں مریض کو صحت مند قرار دینے کے بعد جب رخصت کیا جاتا تو اسے ایک معقول رقم بھی دی جاتی تا کہ اُس کے اُن ایام کی کچھ تلافی ہو سکے جو اُس نے بیماری میں گزارے تھے۔ مسلمانوں نے ہی سب سے پہلے گشتی ہسپتالوں کا خیال پیش کیا چنانچہ یہ متحرک شفا خانے گاؤں گاؤں قریہ قریہ جاتے اور لوگوں کا علاج کرتے۔ اسی طرح سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی نفسیاتی مریضوں کے علاج کی طرف توجہ کی اور اُن کے رہنے اور علاج کے لیے الگ سے شفا خانے تعمیر کیے۔ مسلمانوں نے علم العین میں جو کارنامے سرنجام دیئے وہ حیرت انگیز

ہیں۔مسلمان اطباء آنکھ کی ماہیت سے کلی طور پہ آگاہ تھے۔چنانچہ الزہراوی نے آج سے ایک ہزار سال پہلے کالے موتیے کا آپریشن کرلیا تھا۔مسلمانوں نے آٹھویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک دوسو پچاس ماہر چشم پیدا کیے جبکہ اِنھی صدیوں میں اہل مغرب کا کوئی ایک ماہر چشم دکھائی نہیں دیتا۔مسلمانوں نے اِن چار پانچ صدیوں میں علم طب پہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں لکھیں۔ الغرض آج کی جدید دنیا کی طب بھی انھی علمی انکشافات پہ ٹکی ہے جو اس دور میں مسلمان سائنس دانوں نے کیے تھے۔

(Jaorge Sarton)نے اپنی کتاب (History of Sciences) میں مسلمان اطبا کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> 800-1200ء کے درمیان مسلمانوں نے علم طب کو بام عروج پہ پہنچا دیا۔انھوں نے ہزاروں کتابیں لکھیں جن میں امراض اور ادویات کی تفصیلات فراہم کی گئی تھیں۔ صرف رازی نے علم طب کے موضوع پر 250 کتابیں لکھیں۔علمائے مغرب نے رازی کو اس عہد کا سب سے بڑا اجراح قرار دیا۔اُس کا فن پوری دنیا میں شہرت اختیار کر گیا تھا۔رازی نے علم طب کے موضوع پہ پچیس جلدوں پہ مشتمل جو کتاب لکھی وہ اسے آج تک طب کی بائبل قرار دیا جاتا ہے۔اس کتاب کا نام ''**الحادی**'' تھا۔ ''**المنصوری**'' بھی رازی کی ایک ایسی کتاب تھی جس نے طب کی دنیا میں تہلکہ مچائے رکھا یہ کتاب دس جلدوں پہ مشتمل تھی''۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

(Max Myerof) نے اس عہد کے مسلمان اطبا کی علمی رفعت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''تب مسلمان علم طب پہ چھائے ہوئے تھے اس میدان میں کوئی اُن کا ثانی نہ تھا۔

مسلمان اطبا اور حکماء کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے علم کی خوشبو سے کیا اپنے کیا بیگانے سبھی محفوظ ہو رہے تھے۔ یہ علم کا سنہری عہد تھا یہاں تک کہ آج کی جدید طب بھی رازی کی انھی علمی بنیادوں پہ استوار ہے جو اُس نے ہزار سال قبل اٹھائی تھیں۔ ادویات اور بیماریوں کی تشخیص کے وہ طریقے جو مسلمان اطبا نے اپنائے تھے جدید سائنس اُس میں قابل قدر اضافہ کرنے میں ناکام رہی ہے۔ رازی کی کتابیں دنیا کی اکثر زبانوں میں منتقل کی گئیں۔ سترہویں صدی تک اہل مغرب رازی کی کتابیں ہی پڑھتے رہے۔ کامل چھ صدیوں تک اُن کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں مسلمانوں کی کتابیں ہی پڑھائی جاتی رہیں۔ ابن سینا نے علم طب میں جو کارنامے سر انجام دیئے اہل مغرب اُس کے پوری طرح معترف ہیں۔ ابن سینا نے 18 سال کی عمر سے ہی علم طب پہ لکھنا شروع کر دیا تھا حتیٰ کہ اُس نے طب پہ 250 کتابیں لکھیں۔ اِن میں سب سے مشہور کتاب جسے علم طب کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے وہ "**القانون فی الطب**" ہے جو تیں جلدوں پہ مشتمل تھی۔ ابن سینا نے دو کتابیں بیس بیس جلدوں پہ مشتمل لکھیں۔ ایک کتاب 18 جلدوں میں، ایک 14 جلدوں میں اور ایک 10 جلدوں پہ مشتمل تھی۔ ابن سینا کی کتابیں مشرق و مغرب میں یکساں مقبول ہوئیں"۔

✡✡✡✡✡✡

(Dr, Draper) کہتا ہے کہ:

"تب کوئی شخص ڈاکٹر نہ بن سکتا تھا جب تک کہ اسے عربی زبان نہ آتی ہو۔ تب مسلمانوں کی زبان سمجھے بغیر علم کے کسی بھی پہلو تک رسائی ممکن نہ تھی اور علم طب تو خاص طور پہ مسلمانوں کا علم تھا۔ پیرس کی یونیورسٹی کے شعبہ طب میں ابن سینا اور ابوبکر محمد الرازی کی تصاویر آج تک آویزاں ہیں جو اُن کے علم کو عظیم خراج تحسین ہے۔ یہ

امت کی بد نصیبی ہے کہ انھیں اپنے مشاہیر سے آگاہی نہیں اور انھیں خراج تحسین بھی غیر ہی پیش کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس دنیا کے علوم میں کس قدر اضافہ کیا اس کا حقیقی ادراک آج تک نہیں کیا جا سکا اس لیے کہ مسلمانوں کی تین کروڑ سے زائد کتابیں آب و آتش کی نظر ہو گئیں تھیں۔ تب مسلمانوں نے جو کتابیں لکھیں تھیں آج اُن میں سے فی ہزار ایک کتاب بھی اب نہیں ملتی۔ 987ء میں ابن ندیم نے '' **فہرست العلوم**'' مرتب کی جس میں عربی کی بیشتر کتابوں کا تذکرہ کیا گیا تھا''۔

✡✡✡✡✡✡

(Well Deurant) نے لکھا ہے کہ:

''ابن ندیم کی الفہرست کو سامنے رکھتے ہوئے عربوں کی کتابوں کی جستجو کی جائے تو ہزار میں سے ایک کتاب بھی نہیں ملتی۔ ہر چند کہ سائنس، ادب اور فلسفہ کی ہزاروں کتابیں اسلامی ممالک میں ایسی جگہوں پہ دبی پڑی ہیں جن سے نہ مسلمان خود فائدہ اٹھاتے ہیں اور نہ غیر مسلموں کو اِن دفینوں کے قریب جانے دیتے ہیں''۔

✡✡✡✡✡✡

(Well Deurant) نے مزید ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''مجھے اسپین کے دارالحکومت میڈرڈ کے قریب ایک ویرانے میں مسلمانوں کے ایک کتب خانے کا پتہ چلا ہے جس کی ابھی تک فہرست مرتب نہیں ہو سکی۔ مسلمانوں نے دنیا کے علوم میں جس قدر اضافہ کیا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ زمانہ کی دستبرد سے جو کچھ بچ رہا ہے وہ اس کا نہایت ہی قلیل حصہ ہے جو وجود میں آیا تھا۔ جب اس نیم گمشدہ ورثہ کا جائزہ لینا ممکن ہو گا تب مسلمانوں کی علمی رفعت سے

مزید پردے ہٹ جائیں گے۔علم طب میں میں مسلمانوں کی دسترس کے بارے میں (Jaorge Sarton) ایک جگہ لکھتا ہے کہ گیارہویں صدی تک مسلمانوں کی علمی ترقی نقطہ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ یہ درست ہے کہ گذشتہ صدیوں نے ایسے عالم پیدا کیے جن کا کوئی ثانی نہ تھا اور دنیا الرازی، ابن سینا ابوالقاسم اور علی ابن عیسی جیسے اطبا کو یاد کرتی تھی۔ الزہراوی جیسا عظیم طبیب دنیا نے دیکھا ہی نہ تھا۔ تیرہویں صدی کے آخر بلکہ چودھویں صدی کے پہلے ربع تک علم طب میں مسلمانوں کی پیشوائی قائم تھی اور دوسری کوئی قوم اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی۔فن جراحی کے علاوہ مسلمان علم طب کی تمام شاخوں میں اہل یورپ پر اپنی برتری قائم رکھے ہوئے تھے۔ ابن سینا کی کتاب " **قانون فی الطب** " ابن زہر کی "**تیسیر**" اور ابن رشد کی "**کلیات**" کا عام شہرہ تھا۔ جہاں تک علم العین (Ophthaimology) کا تعلق ہے تو اس میں بھی اہل مغرب سولہویں صدی تک مسلمانوں ہی کے علم سے استفادہ کر رہے تھے۔نویں صدی عیسوی میں مسلمان علم کے اس شعبے میں کئی بڑے قدم اٹھا چکے تھے۔ اگلی چار صدیوں میں مسلمان حکماء نے امراض چشم کے بے پناہ در وا کیے اور یہ مسلمانوں کا عہد زریں تھا۔ مسلمانوں کو کامل چھ صدیوں تک امراض چشم کو سمجھنے میں اہل مغرب پہ برتری حاصل رہی۔ اس طویل مدت میں عیسائیوں نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی مشہور کتابوں کو یورپ میں وسیع پیانے پہ پھیلاتے رہے۔ چنانچہ یونانی لاطینی، جرمن، فرنچ، انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں رازی کی کتابوں کے سو سے زیادہ ایڈیشن شائع کیے گئے۔ اہل مغرب انھی کتابوں کو پڑھتے اور علوم عالم سے آشنا ہوتے رہے۔ اِن صدیوں میں مسلمانوں نے علم العین پر اپنی تخلیقی صلاحیتیں صرف کیں۔ مثال کے طور پہ صدقہ ابن ابراہیم شازلی کی بیش بہا تصنیف " **کتاب العمدۃ الکحلیہ فی الامراض البصریہ** " کو پیش کیا جا سکتا

ہے جو چودہویں صدی کی تصنیف ہے۔اس کتاب میں شازلی نے دنیا کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی آنکھوں کا جائزہ لیا ہے اور اُن میں پائی جانے والی بیماریوں کی جغرافیائی وجوہات پہ بھی بحث کی ہے۔شازلی نے لکھا ہے کہ حبشی ،ترک عرب اور اہل یورپ کی آنکھوں کی بیماریاں ایک جیسی نہیں ہیں بلکہ جغرافیائی بعد کی وجہ سے اِن میں فرق پایا جاتا ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

(Jaorge Sarton)مزید لکھتا ہے کہ:

''بقراط اور جالینوس کے مقابلے میں ابن سینا اور رازی یورپ میں زیادہ مقبول تھے قریب قریب ابن زہر کی بھی یہی قدر و منزلت تھی۔یورپ والے باوجود کوشش اور خواہش کے اِن مسلمان حکماء کے علم پہ کوئی اضافہ نہ کر سکے۔باوجود یہ کہ علم جراحی میں عیسائی مسلمانوں سے زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے مگر وہ ابوالقاسم کی '' **التصریف**'' ایسی وقیع کتاب نہ لکھ سکے۔قرون وسطیٰ میں علم جراحی سے متعلق اس سے زیادہ مستند اور کوئی کتاب نہ تھی اور اسی کتاب نے اہل یورپ کو عمل جراحی میں رہنمائی فراہم کی۔ یادرہے کہ اگرچہ(Jaorge Sarton) جارج سارٹن ایک معتدل مستشرق ہے مگر وہ اپنے آباء کی روایت کسی حد تک ضرور نبھاتا ہے۔عمل جراحی میں اُس نے عیسائیوں کو مسلمانوں پہ جو برتری عطا کی ہے وہ ایک سفید جھوٹ ہے اور ذرا سے غور پہ اس جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔دیکھیں جیسا کہ جارج سارٹن کا کہنا ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی روایات کی وجہ سے انسانی جسم کی چیر پھاڑ سے گریزاں رہا کرتے تھے اس لیے عمل جراحی میں وہ عیسائیوں سے پیچھے رہ گئے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان انسانی جسم کی چیر پھاڑ نہ کرتے تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ انسانی جسم کے ہر ہر حصے کا

اس قدر بسیط علم اگلی نسلوں کو منتقل کر سکتے؟ آخر مسلمانوں نے انسانی جسم کے اندرونی اعضا کے متعلق اس قدر جامع معلومات کہاں سے اکٹھا کر لیں تھیں؟

انھوں نے ہر ہر انسانی عضو اور اس کی بیماریوں سے کس طرح آشنائی حاصل کی؟

انھوں نے ہر انسانی عضو کے مشکل سے مشکل آپریشن کس طرح کیے؟

انھوں نے اِن مشکل آپریشنوں کے لیے جو آلات وضع کیے وہ کس علم کی بنا پہ وضع کیے گئے؟

عیسائی اگر مسلمانوں سے علم جراحی میں بازی لے گئے تھے تو انھوں نے مسلمانوں کی طرح عمل جراحی پہ تفصیلی کتابیں کیوں نہ لکھیں؟

✡✡✡✡✡✡

(Jaorge Sarton) اپنے اس جھوٹ کو زیادہ دیر تک نہ نبھا سکا اور کچھ ہی صفحات بعد لکھتا ہے کہ:

”مواقع دستیاب ہونے کے باوجود اہل مغرب نے اپنے علم تشریحی کی معلومات میں قابل قدر اضافہ کرنے کی سعی نہ کی۔ مغربی سرجنوں نے اپنے دائرہ عمل کو بہت محدود کر لیا تھا۔ اُن کی سرجری بس یہی تھی کہ اتری ہوئی ہڈی کو پھر سے جوڑ دیں یا کسی ناکارہ انسانی عضو کو جسم سے الگ کر دیں۔ پھنسی پھوڑوں یا چھوٹے موٹے زخموں کا علاج کر دیں۔ جب کے اُن کے مقابل مسلمان حکماء آنکھ جیسے نازک عضو کے نہایت ہی حساس اپریشن کرتے تھے۔ وہ حلق کی نالی میں سراخ کرنے سے بھی نہ چوکتے تھے اور آخر میں مریض کو صحت یاب کر دیتے تھے۔ اہل مغرب کی جراحی بس اتنی ہی تھی کہ ساری زندگی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کرتے رہتے جس کی بنا پہ اُن کا طبیب کبھی بھی علم کے اُس مقام کو نہ چھو سکا جو مسلمانوں کی دسترس میں تھا۔ علم

الجنین (Embryology) اور قابلہ گری (Obstetrics) میں بھی اہل یورپ غلط نظریات کے قائل تھے۔ارسطو نے یہ غلط نظریہ پیش کیا تھا کہ تولیدی مواد عورت فراہم کرتی ہے جس میں مرد روح پھونک دیتا ہے۔حالانکہ صحیح نظریہ وہ ہے جو لکریشس نے پیش کیا تھا جس کی حقیقی تشریح رزای، علی ابن عباس اور ابن سینا نے کی تھی کہ حمل عورت اور مرد دونوں کے تخم سے قرار پاتا ہے۔اہل یورپ کی جہالت دیکھیں کہ علم کی اُس مہیب روشنی کے باوجود جو اُن صدیوں میں مسلمانوں کے وضع کیے گئے چراغوں سے جابجا اُٹھ رہی تھی اہل مگر مغرب چودہویں صدی کے آخر تک ارسطو کے نظریہ تولید سے ہی چمٹے رہے۔اہل مغرب کو اس بات کا علم 1930ء میں ہوا کہ عورت کے پیشاب سے اُس کا حمل جانچا جا سکتا ہے جبکہ مسلمان اطبا ہزار سال پہلے ہی اس طریقہ علم سے نہ صرف واقف تھے بلکہ یہ اُن کے ہاں مروج بھی تھا۔ابن سینا پیشاب دیکھ کر بتا دیا کرتا تھا کہ یہ عورت کا پیشاب ہے یا مرد کا پیشاب ہے۔اگر عورت کا پیشاب ہے تو وہ حاملہ ہے یا غیر حاملہ ہے اور اگر وہ حاملہ ہے تو حمل کے ابتدائی ماہ ہیں یا آخری مہینے ہیں۔آج بھی ابن سینا کے دریافت کیے گئے اسی طریقہ سے اس بات کا پتا لگایا جاتا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا کہ نہیں۔اس بات میں شبہ نہیں علم طب کا آغاز یونان کے علمی دور میں ہو چکا تھا مگر اہل یونان کا علم طب ابتدائی نوعیت کا تھا انھوں نے مسلمانوں کی طرح اس علم میں خود کو غرق نہ کیا تھا جس کے نتیجے میں اقوام عالم انسان کے جسم کی صحیح ماہیت سے آشنا ہوئیں‘‘۔

✡✡✡✡✡✡

سیّد امیر علی نے مسلمانوں کی مختصر تاریخ لکھتے ہوئے اپنی کتاب(Spirt of Islam) میں لکھا ہے کہ:

گو یونانیوں نے علم طب میں بڑی ترقی کی تھی لیکن مسلمانوں نے اُس علم طب پہ جو گرانقدر اضافے کیے اُس نے علم طب کو قریب قریب اُس مقام پہ پہنچا دیا تھا جو آج کی جدید طب کا مقام ہے۔ مسلمانوں نے ہر چیز کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھنے کا طریقہ کا ایجاد کیا۔ انھوں نے کیمیاوی طرز پر دوا سازی کی بنیاد رکھی اور وہ ادارے قائم کیے جنھیں ہم (Dispensaries) کہتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے نگران مقرر کیے جاتے کہ ناقص دوائیں فروخت نہ ہوں۔ دوائیں درست ہوں اور اُن کو مہنگا فروخت نہ کیا جا سکے۔ اطبا اور دوا سازوں کی استعداد عملی کا سخت امتحان لیا جاتا اور اس امتحان کو پاس کرنے والا ہی اس بات کا اہل جانا جاتا کہ وہ کسی شفاخانے میں انسانوں کا علاج کر سکے۔ شفاخانوں کے انتظام و انصرام کے لیے نگران اور مہتمم مقرر کیے جاتے جو اِن اداروں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے رہتے۔ یاد رہے کہ تب عورتوں کے پیچیدہ آپریشن عورتیں ہی کیا کرتی تھیں۔ طب کا پیشہ ہمیشہ سے ایک معزز پیشہ رہا ہے اگرچہ آج کے دور میں اس پیشہ کو دولت کے حصول کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے جس سے اس پیشہ کے تقدس میں کسی قدر فرق رونما ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کے عہد زریں میں اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے بہت سے اطباء کے حالات زندگی اور اُن کے علمی کارناموں کو محفوظ کیا۔ اس ضمن میں کئی کتابیں میری نگاہوں سے گزری ہیں جنھوں نے (Well Deurant) کے اس جھوٹ کو کھول دیا کہ مسلمانوں میں نامور حکماء کی تعداد ایک درجن سے زیادہ نہیں ہے۔ چنانچہ اُس عہد کے طبیبوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابن اصیبیہ نے اپنی کتاب "**عیون الانباء فی طبقات الاطباء**" میں چار سو سے زائد مسلمان حکماء کے حالات اور طبی کارنامے درج کیے

ہیں۔ابن القفطی نے " **اخبار احکماء** "میں اورابن خلکان نے " **وفیات الاعیان** "میں بہت سے طبیبوں کے علاوہ دیگر علماء اور حکماء کے حالات قلمبند کیے ہیں"۔

✡✡✡✡✡✡

ازاں بعدابن ایبک الصعدی نے جو چودھویں صدی کا مشہور مسلمان مورخ ہے نے ایک حیرت انگیز کتاب"**وافی بی الوفیات**"لکھی جس میں انھوں نے چودہ ہزار مشاہیر اسلام کے حالات زندگی جمع کیے ہیں۔اس کتاب میں اطباء کے علاوہ زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے مشاہیر کی سوانح عمریاں درج کرنے کی سعی بلیغ کی گئی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ کتاب بہت ضخیم اور کئی جلدوں پہ مشتمل ہوگی۔اگرچہ اس کتاب کے تمام نسخے ابھی دریافت نہیں ہوسکے تاہم استنبول میں اس کتاب کا بڑا حصہ دستیاب ہوگیا ہے۔یہ کتاب آنحضرت محمد ﷺ کی حیات مبارکہ سے شروع کی گئی ہے اور مصنف نے کتاب کے شروع میں ایک پر مغز مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ علم طب میں مسلمانوں کی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی تھی اس لیے مسلمانوں نے اس میدان میں چھ یا سات صدیوں تک بلاشرکت غیر حکومت کی ہے۔دراصل تو یہ اُس علمی رفعت کو بیان کرنے کا ایک تسلسل ہے جس کے نتیجے میں آج کے مسلمان نوجوان کو اُس احساس کمتری سے نجات دلانا مقصود ہے جو وہ مغرب کے مقابل اپنی ذات میں محسوس کرتا ہے۔مسلمانوں نے اپنی علمی وراثت سے پہلو تہی کی جس کے نتیجے میں وہ زوال کا شکار ہوا۔اس زوال کو عروج میں بدلنا ممکن ہے کیونکہ فلسفہ کا معروف کلیہ ہے کہ انسان جو کام ایک مرتبہ کرلیتا ہے وہ اسے دوسری مرتبہ بھی کرسکتا ہے۔مسلمانوں نے اقوام عالم پہ ہزار سال حکومت کی ہے۔بہ حیثیت امت یا قوم کے یہ رفعت ابھی تک کوئی اور قوم حاصل نہیں کرسکی۔مسلمان اگر آج بھی خود کو علم کی طرف مائل کرلے تو اُس کو منزل تک پہنچنے میں کوئی

دشواری نہ ہوگی کہ اُس کے آباء نے اُس کی رہنمائی کے لیے بسیط علمی ورثہ چھوڑا ہے۔ذیل میں ہم کچھ مسلمان اطبا کے حالات سے آگاہی حاصل کریں گے جن کی جہد وسعی نے آج کے متمدن علم طب کو بنیادیں فراہم کی تھیں۔اللہ ہمارا حامی وناصر ہو(35*)۔

✡ ✡ ✡

مسلمان اطباء

تب مسلمان علم طب سمیت علم کے تمام جہانوں پہ متصرف تھے۔ خطہ ارض پہ بسنے والی دیگر تمام اقوام مسلمانوں سے کوسوں دور پیچھے تھیں۔ مسلمان نہ صرف سیاسی، سماجی اخلاقی اور عسکری پہلوؤں سے اپنی برتری کو برقرار رکھے ہوئے تھے۔ بلکہ وہ علم کے ہر پہلو سے بھی دنیا پر غالب تھے۔ طب اور علم ہیت میں تو کوئی اُن کا ثانی ہی نہ تھا۔ ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی، ابن سینا، الزاہروی اور ابن رشد کی علمی رفعت کا ڈنکا چار سو بجتا تھا۔ اہل مغرب چھ صدیوں تک مسلمانوں کے وضع کیے ہوئے علم کو اپنے نصاب میں پڑھتے رہے اس لیے اُن کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی زبان سیکھیں تاکہ وہ علم کے تمام پہلوؤں سے آشنائی حاصل کر سکیں۔ مغرب کلیسا کے جبر میں سسک رہا تھا۔ اول تو اُن کے ہاں علم کی روایت ہی ناپختہ تھی۔ تاہم کہیں اگر کوئی علم کی شمع جلتی بھی تھی تو کلیسا اُسے خلاف مذہب قرار دے کر اُس کا گلہ گھونٹ دیتا تھا۔ کلیسا کا جبر ہمارا موضوع نہیں ہم تو صرف اُس علمی روایت کا تذکرہ کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے ہاں نہ صرف پختہ ہو چکی تھی بلکہ اپنی انتہاؤں کو

چھوڑ رہی تھی۔علم طب میں مسلمانوں کی لازوال دسترس کا ذکر ہمارے پیشِ نظر ہے۔علوم کی کئی دیگر جہتوں میں مسلمانوں کی کامل دسترس کا ذکر ہم چکے ہیں۔یہاں مسلمان اطباء اور اُن کے کارنامے بیان کرنا مقصود ہے۔

ابوبکر محمد بن زکریا الرازی۔

ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی (935-854ء) نے علم کے کئی شعبوں میں معرکہ آراء کام کیا۔ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے کیمیا دان اور طبیعات دان تھے اور حکمت میں تو اُن کا کوئی ثانی ہی نہ تھا۔ازمنہ وسطیٰ میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ کل عالم میں رازی کے پائے کا ایک بھی جراح نہ تھا۔تب پوری دنیا رازی کے کارناموں سے گونج رہی تھی۔ رازی نے مختلف علمی موضوعات پہ 250 سے زائد کتابیں لکھیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ اِن میں سے نصف علم طب سے متعلق تھیں۔رازی کی سب سے بڑی اور مفصل طبی کتاب "**الحادی**" ہے جو پچیس جلدوں پہ مشتمل تھی اور آج تک علم طب پہ پھر دوبارہ کبھی کسی فزیشن نے الحادی جیسی کتاب نہ لکھی۔مغرب اس کتاب کو طب کی بائبل قرار دیتا رہا ہے اور کامل چھ صدیوں تک اہل یورپ اپنے طبی نصاب میں الحادی کو پڑھتے رہے۔رازی کی دوسری بڑی کتاب "**المنصوری**" ہے جو دس جلدوں پہ مشتمل تھی۔اہل مغرب نے بجا طور پہ رازی کی علمی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ(Max Myerof) کہتا ہے کہ:

رازی نہ صرف دنیائے اسلام کا سب سے بڑا فزیشن تھا بلکہ دنیا میں کہیں بھی اُس کے پائے کا اور کوئی حکیم نہ تھا۔اُس کی کتابیں دنیا کے لیے روشنی تھیں تو اُس کا علم طب دنیا کے لیے راحت تھا۔

✡✡✡✡✡✡

(Jaorge Sarton) لکھتا ہے کہ:

رازی علم کے ہر پہلو سے اپنے وقت کا بادشاہ تھا وہ سب سے بڑا کیمیا دان تھا، وہ سب سے بڑا طبعیات دان تھا، وہ سب سے بڑا حکیم تھا، وہ سب سے بڑا جراح بھی تھا، اُس نے سب سے زیادہ کتابیں لکھیں۔

✡✡✡✡✡✡

(Well Deurant) کہتا ہے کہ:

رازی پہلے فزیشن ہیں جنھوں نے چیچک اور خسرہ جیسی وبائی امراض پر توجہ دی اور اس موضوع پر ایک بے مثال کتاب لکھی جس نام "**الجدری والحصبہ**"، تھا جس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔اہل مغرب نے کہا کہ یہ کتاب مسلمانوں کے طبی ادب کا زیور ہے۔رازی نے ہی سب سے پہلے زخموں پہ پارے کے لیپ اور زخموں پر ٹانکا لگانے کے لیے حیوانوں کی آنت کا استعمال کیا۔قارورہ کا معائنہ کرنے کا طریقہ بھی سب سے پہلے رازی نے ہی اختیار کیا۔ رازی ہی وہ پہلا طبیب ہے جس نے امراض نسواں پر خصوصی توجہ دی۔وضع حمل اور زچگی کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کیں۔

✡✡✡✡✡✡

(Philp . K Hitte) نے لکھا کہ:

مغرب کے علم طب کی بنیاد رازی کی کتابیں ہی ہیں۔شکر ہے کہ مغرب نے اِن کتابوں کی علمی حیثیت کو سمجھا اور اُن کو بار بار اور مختلف زبانوں میں شائع کیا۔مغرب نے بلاشبہ رازی کی کتابوں کے سینکڑوں ایڈیشن جاری کیے جس سے مغرب میں علم طب کی روایت پختہ ہوئی۔

✡✡✡✡✡✡

(Dr, Draper) کہتا ہے کہ:

رازی وقت کا سب سے بڑا طبیب تھا۔رازی نے علم طب میں بیش بہا اضافے کیے۔انھوں نے طب کی دنیا میں جدید طریقہ علاج کو رواج دیا۔رازی کی کتاب "**المنصوری**" سات صدیوں تک اہل مغرب کے نصاب میں شامل تھی اور اُس کی چیچک اور وبائی امراض پہ کی گئی تحقیق انیسویں صدی تک دنیا میں رائج رہی۔مغرب کے سائنس دانوں نے رازی کی کتابوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔راجر بیکن تو ہر چار سطروں بعد رازی کا حوالہ دیتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ایک اور مغربی مفکر (Ullmann) نے کہا کہ:

رازی نے ہی سب سے پہلے ادویات میں الکحل کا استعمال شروع کیا۔رازی نے الرجی اور امنالوجی (Immunology) پر دنیا کی سب سے پہلی کتاب لکھی اور رازی نے ہی دمہ (Allergic Asthma) کو دریافت کیا۔انھوں نے الرجی کے بارے میں کہا کہ یہ وہ عارضہ ہے جو موسم بہار میں گلاب کے پھول کو سونگھنے سے لاحق ہوتا ہے۔امریکہ میں اس کو (Hay Fever) کہا جاتا ہے۔ابوبکر رازی اپنے وقت کے نہ صرف سب سے فائق طبیب تھے بلکہ وہ سب سے بڑے جراح بھی تھے۔رازی نے گلاب کی الرجی کے بعد لہسن اور

پیاز کی الرجی سے بھی دنیا کو آشنا کیا۔انھوں نے انکشاف کیا کہ خوشبو بعض لوگوں کو نزلہ وزکام میں مبتلا کر دیتی ہے۔رازی نے تشریح الاعضا(Anatomy)کے بارے میں جو معلومات فراہم کیں انھیں آج کی جدید سائنس میں بھی قریب قریب درست قرار دیا جاتا ہے۔تقریباً ایک ہزار سال قبل تشریح الاعضاء کو اس قدر صحت کے ساتھ بیان کر دینا انتہائی حیرت انگیز ہے ۔اسی طرح ابوبکر رازی نے جسمانی اعضاء کی (Physiology) کے بارے میں جو معلومات فراہم کیں وہ بنیادی طور پہ درست ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ایک اور مغربی مورخ(J.H.Kellogg)لکھتا ہے کہ:
ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی ایک حیرت انگیز شخص تھا جس کے علم کی کوئی انتہا نہ تھی۔وہ جس قدر کیمیا میں راسخ تھا اسی قدر اُس کے نظریات طبیعات کے بارے میں درست تھے اور طب میں تو کوئی اُس کا ثانی ہی نہ تھا۔ابوبکر رازی نے علم طب میں جو انکشافات کیے جدید سائنس اُس پہ قابل قدر اضافہ نہیں کر سکی۔افسوس کہ ایسا یکتائے روزگار اور متبحر عالم 935ء میں بیاسی برس کی عمر میں شدید مفلسی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔اُس کی مفلسی اور عسرت حیرت میں ڈالنے والی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالعلی الحسین ابن سینا۔

طالب علمی کے زمانے میں ہم مسلمانوں کے اس بہت بڑے حکیم کو بوعلی سینا کے طور پہ جانتے تھے۔ابوالعلی الحسین ابن سینا 980ء میں پیدا ہوئے۔ابن سینا بھی ایک حیرت انگیز شخص تھا۔

نصاب کی کتابوں میں عام طور پہ ابن سینا کو ایک فلسفی کے طور پہ بیان کیا جاتا ہے۔حتیٰ کہ بعض صاحب الرائے اہل علم فلسفہ کے میدان میں اسے ابن رشد پہ بھی فوقیت دیتے ہیں۔ابن سینا نے اگرچہ علم فلسفہ میں بھی کمال حاصل کیا تاہم اُن کے علمی سفر کی ابتداء علم طب ہی سے ہوئی تھی۔علم طب نے انھیں بہت سی رفعتوں سے نوازا۔اکثر و بیشتر ہم انھیں وقت کے اہم بادشاہوں کے درباروں میں ہی بیٹھا دیکھتے ہیں۔ابن سینا ابھی بمشکل تیئس سال کے ہوئے تھے جب انھوں نے علم طب پہ اپنی پہلی کتاب مکمل کی۔اپنی زندگی میں انھوں نے کتنی کتابیں لکھیں درست طور پہ کوئی نہیں جانتا کسی نے اُن کی تعداد 300 لکھی ہے تو کسی 250 لکھی ہے۔کتابوں کی تعداد کی بجائے اگر ہم اُن کی کتابوں کی علمی رفعت کی طرف متوجہ ہوں تو اُن کی کتابوں کو اہل مغرب طب کی بائبل قرار دیتے ہیں اور یہ ابن سینا کے علم کو اہل مغرب کا اس قدر شاندار خراج تحسین ہے جو کسی اور کے حصے میں کبھی نہ آیا۔پچیس جلدوں پہ مشتمل اُن کی کتاب "**القانون فی الطب**" ہی کو طب کی بائبل کہا جاتا ہے اور یہ کتاب کامل چھ صدیوں تک اہل مغرب کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ابن سینا کی اکثر کتابیں ضخیم ہوا کرتی تھیں۔جیسے کہ اُن کی ایک کتاب 25 جلدوں پہ مشتمل ہے،ایک کتاب 18 جلدوں پہ مشتمل ہے،ایک کتاب 14 جلدوں پہ مشتمل ہے،ایک کتاب 10 جلدوں پہ مشتمل ہے۔مغربی مورخین اُن کے بارے میں عمدہ رائے رکھتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ (A.M. Shoggon) لکھتے ہیں کہ:

ابن سینا کے عہد میں کوئی شخص طبیب نہ ہوسکتا تھا اگر اسے عربی نہ آتی ہو کیونکہ اگر اسے عربی آئے گی تب ہی وہ ابن سینا کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہوگا۔میں مغرب کے باسیوں میں سے سینکڑوں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنھوں نے صرف ابن سینا کو پڑھنے کے لیے عربی سیکھی

۔ابن سینا کی کتابیں مشرق ومغرب میں یکساں مقبول تھیں۔

✡✡✡✡✡✡

ایک مغربی محقق (M.Gochin) لکھتا ہے کہ:

مغرب میں طب کا انحصار ابن سینا کی " **القانون فی الطب** " پہ ہی تھا۔اہل مغرب تقریباً سات سو سال تک صرف اسی کتاب کو پڑھتے رہے۔اس کتاب میں علم طب کا اس قدر مفصل احاطہ کیا گیا تھا کہ اہل مغرب کوشش اور خواہش کے باوجود علم طب پہ کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

✡✡✡✡✡✡

فرانسیسی مورخ (Gustawlay) کا کہنا ہے کہ:

فرانس اور اطالیہ میں علم طب ابن سینا کی کتاب " **القانون فی الطب** " کی وجہ سے ہی پھیلا ۔یہ کتاب طب کی انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں انسان کے پاؤں کے ناخن سے لے کر سر کے بالوں تک ہر عضو کو مفصل بحث کا موضوع بنایا گیا ہے۔چنانچہ اس کتاب نے طب کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔کئی صدیوں تک فرانس اور اطالیہ کی درس گاہوں میں " **القانون فی الطب** " ہی پڑھائی جاتی رہی اور ابن سینا کے علم پہ کوئی اضافہ نہ کیا جا سکا۔بلکہ فرانس میں تو ابن سینا کی کتابوں کو متورک ہوئے ابھی پچاس سال بھی نہیں گزرے۔

✡✡✡✡✡✡

(Philp . K Hitte) نے لکھا کہ:

ابن سینا کی " **القانون فی الطب** " نامی کتاب کسی بھی دوسری کتاب کے مقابلے میں

زیادہ زمانے تک طب کی بائبل قرار دی جاتی رہی۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

(Jaorge Sarton) نے کہا کہ:

ابن سینا ہی دسویں صدی میں علم طب کا واحد بادشاہ تھا اور اُس کی کتاب "**القانون فی الطب**"، مشرق و مغرب میں طب کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب تھی۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

(Max Myerof) لکھتا ہے کہ:

یورپ کی طب پر ابن سینا نے اس قدر گہرے نقش چھوڑے ہیں جنھیں آج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ابن سینا نے "**القانون فی الطب**" میں اس علم کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا اسی وجہ سے اس کتاب کو علم طب کا بیش بہا خزانہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں پہلے انسان کو لاحق ہونے والے عوارض کا بیان ہے، پھر اُن وجوہات کا بیان ہے جس کی وجہ سے انسان کو یہ عوارض لاحق ہوتے ہیں، اس کے بعد اُن کا علاج متعین کیا گیا ہے۔ اس کے بعد صحت مند انسانوں کے لیے متوازن خوراک کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ انسان بیمار ہی نہ ہو۔ ابن سینا نے مشورہ دیا کہ لوگوں کو لہسن کھانا چاہیے کہ اس سے خون کی نالیوں میں رکاوٹ پیدا ہونے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ کھانے کے بعد پانی نہ پینا چاہیے اور اس طرح کی سینکڑوں ہدایات ہیں جن کے تذکرے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ تاہم اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ ابن سینا کی طرف سے انسان کو پرہیز کی جو ہدایات دی گئی ہیں جدید سائنس انھیں مسترد نہیں کرتی۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

(Well Deurant) لکھتا ہے کہ:

ابن سینا کی کتاب ''**القانون فی الطب**''، ہی وہ واحد کتاب تھی جو سترہویں صدی کے وسط تک مونٹ پلمبری اور لووین کی یونیورسٹیوں میں نصاب طب کی اہم ترین کتاب تھی بیان کیا گیا ہے کہ ''**القانون فی الطب**'' کے دنیا کی 87 مختلف زبانوں میں ترجمے کیے گئے اور اسے سو سے زائد بار شائع کیا گیا۔ چنانچہ ابن سینا کی علم طب میں اس رفعت کی وجہ سے ہی آج تک پیرس کی یونیورسٹی کے شعبہ طب میں ابوبکر رازی کے ساتھ ابن سینا کی تصویر بھی آویزاں ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ایک مغربی محقق (M.Gochin) لکھتا ہے کہ:

تب مغرب میں ابن سینا کی ''**القانون فی الطب**'' علم طب کے لیے لازم تھی۔ ابن سینا نے ہی سب سے پہلے تپ دق کا متعدی ہونا ثابت کیا اور کہا کہ یہ مرض پانی مٹی اور گرد سے پھیلتا ہے۔ خوردبین کی دریافت سے پہلے ہی ابن سینا نے لوگوں پہ اس حقیقت کو آشکار کر دیا تھا کہ پانی کے اندر چھوٹے چھوٹے مہین جانور (جراثیم) ہوتے ہیں جو انسان کی صحت کو متاثر کرتے ہیں۔ ابن سینا نے ہی پھیپھڑوں کی جھلی کے ورم کو دریافت کیا اور اُس کا علاج تجویز کیا۔ ابن سینا کی زندگی عجیب بھاگ دوڑ کا شکار تھی۔ وہ ایک غریب کسان کا بیٹا تھا مگر علم طب میں اُس کی دلچسپی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ تب بغداد میں عباسی خلافت کا دور تھا۔ ابن سینا سفر میں تھا، وہ بخارا میں اترا تو سارے شہر میں بخارا کے حکمران نوح بن منصور کی بیماری کا چرچا تھا۔ ابن سینا نے لوگوں سے کہا وہ اسے بادشاہ تک لے جائیں وہ طبیب ہے اور امید کرتا ہے کہ اُس کے علاج سے بخارا کا حکمران صحت مند ہو جائے گا۔ لوگوں نے اسے محل کا راستہ بتایا۔ ابن سینا کو محل میں طلب کر لیا گیا۔ ابن سینا کا دعویٰ درست نکلا اور اُس کے علاج سے چند دن کے اندر ہی بخارا کا حکمران صحت مند ہو گیا۔ بخارا کا حکمران ابن سینا کے علم سے بہت متاثر ہوا

۔اُس نے ابن سینا کو دربار میں عہدہ عطا کر دیا۔اگرچہ ابن سینا کو اس عہدے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور اُس کا زیادہ وقت بادشاہ کے ذاتی کتب خانے میں ہی گزرتا جس کی لاتعداد کتابیں اُس کی علمی اشتہا کو بڑھا رہی تھیں۔بعد میں وہ خوارزم چلا گیا۔خوارزم کے حکمران نے بھی اس کی تعظیم کی اور وہ خوارزم کے حکمران المامون کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔تب ایران اور پنجاب پہ محمود غزنوی حکمران تھا جو ایک علم دوست بادشاہ تھا اور شاہ خوارزم سے انتہائی طاقتور تھا۔اُس نے الخوارزم کو لکھا کہ اپنے دربار کے دو صاحب علم البیرونی اور ابن سینا کو میرے پاس بھیج دو ورنہ میں تم پہ حملہ کر دوں گا اور تمھیں تہس نہس کر دوں گا۔الخوارزم کا حکمران محمود غزنوی کی طاقت سے آگاہ تھا۔اس لیے اُس نے محمود غزنوی کا پیغام البیرونی اور ابن سینا تک پہنچایا۔البیرونی نے آمادگی ظاہر کر دی مگر ابن سینا نے انکار کر دیا۔چنانچہ محمود غزنوی ابن سینا کا دشمن بن گیا۔الخوارزم کے حکمران المامون نے ابن سینا کو اپنے دربار سے نکال دیا۔اب ابن سینا آگے تھا اور محمود غزنوی کی فوجیں اُس کے پیچھے تھیں۔وہ اُن سے بھاگا پھرتا تھا۔گرگان کے فرمانروا شمس المعالی القابوس نے اُسے پناہ دی تو محمود غزنوی نے اُس پہ حملہ کر دیا۔گرگان کی فوجیں شکست کھا کر بھاگ گئیں اور قابوس کو قتل کر دیا گیا مگر ابن سینا محمود غزنوی کے ہاتھ نہ آیا۔اب وہ ہمدان کے حکمران کے ہاں تھا اور اُس کا وزیر تھا۔محمود غزنوی اس دوران ہندوستان پر حملہ کرنے میں مصروف تھا مگر جونہی وہ واپس ہوا اُس نے ہمدان کے حکمران کو کہا یا تو ابن سینا کو میرے حوالے کر دو یا پھر میرا مقابلہ کرنے کی تیاری کر لو۔ہمدان کے حکمران نے ابن سینا کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا مگر اُس کی فوج کا سربراہ جانتا تھا کہ محمود غزنوی کا مقابلہ کرنا مشکل ہے اس لیے اُس نے بغاوت کر دی اور ہمدان کے حکمران سے حکومت چھین لی گئی اور اُس کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ابن سینا اب بھاگ کر اصفہان میں پناہ گزیں تھا۔اصفہان کے بادشاہ نے بھی اس کی تعظیم کی تھی اور اس کے علم کی وجہ سے ابن سینا کو دربار میں جگہ دے رکھی تھی مگر اصفہان کا بادشاہ کچھ زیادہ علم دوست نہ تھا اس لیے ابن سینا دوبارہ ہمدان آ گیا جہاں

اُسے گرفتار کر لیا گیا تا کہ اُسے محمود غزنوی کے حوالے کیا جا سکے مگر محمود غزنوی ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے گیا ہوا تھا اس لیے ابن سینا کو قید میں رکھا گیا۔ پھر اپنے ایک دوست کی وجہ سے ابن سینا جیل توڑ کر بھاگ نکلا اہل ہمدان اُس کو تلاش کرتے رہے مگر وہ اسی شہر میں اپنے ایک عطار دوست کے گھر روپوش ہو کر بیٹھ رہا حتیٰ کہ وہ کئی سال روپوش رہا۔ مورخین نے بیان کیا ہے کہ اسی عرصہ میں اُس نے اپنی کتاب "**القانون فی الطب**" لکھی۔ ستاون سال کی عمر میں ہمدان ہی میں ابن سینا نے انتقال کیا۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالقاسم بن خلف بن عباس الزہراوی۔

الزہراوی (936-1006ء) کو دنیا کا سب سے پہلا جراح قرار دیا جاتا ہے اگرچہ الزہراوی سے قبل مسلمان حکماء عمل جراحی سے آگاہ تھے مگر عمل جراحی میں جو قدر منزلت الزہراوی کے حصے میں آئی متاخرین اُس سے محروم رہے تھے۔ الزہراوی نے علم طب پر ایک مبسوط کتاب "**التصریف عن عجز عن التالیف**" لکھی جس نے مغرب کی طب کو نہایت متاثر کیا۔ الزہراوی نے سب سے پہلے آنکھ کے نازک آپریشن کیے جس سے دنیا حیران رہ گئی۔ الزہراوی کا فن جراحی ہمہ جہت تھا جہاں وہ آنکھ کا نازک آپریشن کر لیتے تھے وہیں وہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ بھی جوڑ لیتے تھے۔ الزہراوی نے ہی سب سے پہلے دباغت کا طریقہ ایجاد کیا وہ زخموں کو جلا کر اُن کے بڑھنے کے امکان کو مفقود کر دیتے تھے۔ وہ مسانے کی پتھری کو پیسنے یا آپریشن کے بعد نکالنے کا فن بھی جانتے تھے۔ اہل مغرب الزہراوی سے شدید طور پہ متاثر تھے۔ چنانچہ بیان کیا گیا کہ اہل مغرب نے الزہراوی کے بارے میں اس قدر لکھا ہے کہ

اُس کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہوں گے۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ(Dr, Loan) لکھتے ہیں کہ:

الزہراوی نے ہی سب سے پہلے دنیا کو بتایا کہ اگر انسان کے دانت گر جائیں تو اُن کی جگہ مصنوعی دانت بھی استعمال کیے جاسکتے ہیں۔انھوں نے اپنی کتاب "**التصریف عن عجز عن التالیف**" میں طب کے بے شمار پہلوؤں پہ روشنی ڈالی ہے۔الزہراوی نے ہی سب سے پہلے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو کامیابی سے جوڑا، انھوں نے ہڈیوں پہ پلاسٹر چڑھایا اور زخموں کو سینے کے لیے ریشم کے مہین دھاگے کے استعمال کو رواج دیا۔الزہراوی نے ہی سب سے پہلے لوگوں کو اس طریقے سے آگاہی فراہم کی کہ آپریشن سے پہلے مریض کو بیہوش کرلیا جائے تو اس سے مریض کی اذیت بھی کم ہوجاتی ہے اور جراح بھی سہولت سے اپنے کام کو سرانجام دے سکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

(Jaorge Sarton)نے کہا کہ:

الزہراوی عظیم ترین مسلم سرجن تھے جنھوں نے نشاۃ ثانیہ تک یورپ کی سرجری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔الزہراوی نے سرجری کے بنیادی اصول قواعد وضع کیے اور سرجری کے لیے مناسب آلات ایجاد کیے۔الزہروی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے زچگی کے دوران ہونے والی پیچیدگیوں پر گہری نظر ڈالی۔انھوں نے ایسے چمٹے ایجاد کیے جن کے استعمال سے زچگی میں آسانی ہوگئی۔انھوں نے کٹی ہوئی شریانوں سے بہتے خون کو بند کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ انھوں نے آنکھوں اور دانتوں کی سرجری، قطع اعضاء اور پٹی باندھنے کے طریقے وضع کیے۔

انھوں نے ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے اور ٹوٹی ہوئی چپنی کی ہڈی کو آپریشن سے الگ کرنے کے طریقوں کی وضاحت کی۔سب سے پہلے الزہراوی نے ہی ٹوٹی ہوئی ہڈی پر پلاسٹر چڑھانے کی روایت قائم کی اگرچہ تب پلاسٹک آف پیرس ایجاد نہ ہوا تھا جس کی مدد سے آج لوگ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر پلاسٹر چڑھاتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ایک اور مغربی محقق (Guyde Chaulial) نے اپنی کتاب میں الزہراوی کے بارے میں لکھا کہ: الزہراوی بلاشک وشبہ دنیا کے سب سے پہلے جراح تھے۔انھوں نے سرجری کے اصول وقواعد وضع کیے اور سرجری کو باقاعدہ ایک فن کی شکل عطا کی۔اُن کی مشہور عالم کتاب "**التصریف عن عجز عن التالیف**" نے مغرب کی طب پر انتہائی گہرے اثرات چھوڑے ہیں اسی لیے مغرب والے مشرق والوں کی نسبت الزہراوی کی زیادہ تعظیم کرتے ہیں ۔چنانچہ راجر بیکن ، میر میکس ہاف اور دیگر مغربی محققین نے الزہراوی کو خوب خراج تحسین پیش کیا ہے ۔راجر بیکن تو اپنی کتابوں میں جگہ جگہ الزہراوی کے حوالے دیتے ہیں اور ڈاکٹر (Guyde Chaulial) نے اپنی کتاب میں دوسو بار الزہراوی کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

(Max Myerof) نے الزہراوی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

طب میں وہ سینکڑوں امور شامل ہیں جو سب سے پہلے الزہراوی نے وضع کیے دنیا جن سے آشنا نہ تھی۔مثال کے طور پہ دیکھیں کہ پہلی مرتبہ الزہراوی نے ہی زخم خوردہ (Tonsil) کو کاٹ کر نکال باہر کرنے کا طریقہ دریافت کیا اور اس کے لیے انھوں نے ایک خاص آلہ ایجاد کیا۔

سرجری میں قینچی کا استعمال بھی سب سے پہلے الزہراوی نے ہی کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے سرجری میں مدد کرنے والے دوسو فولادی آلات ایجاد کیے۔انھوں نے اپنی کتاب میں اِن آلات کی تصاویر بھی دی ہیں۔اُن کے ایجاد کیے گئے آلات نے علم جراحی میں انقلاب برپا کر دیا۔آج تک کم وبیش انھی نقشوں پہ فولادی آلات ڈھالے جاتے ہیں جو الزہراوی نے وضع کیے تھے۔پچکاری (Syringe) کا ذکر بھی سب سے پہلے الزہراوی کے ہاں ہی ملتا ہے انھوں نے اس آلے کو مثانے کے زخم دھونے کے لیے استعمال کیا۔انھوں نے گردے کی پتھری نکالنے کے لیے بھی ایک آلہ ایجاد کیا۔علاوہ ازیں کوڑھ کی علامات کی تشخیص بھی سب سے پہلے الزہراوی نے ہی کی۔

✡✡✡✡✡✡

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی الزہراوی کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے جہاں بیان کیا گیا ہے کہ:
الزہراوی وقت کے سب سے بڑے جراح تھے۔تاہم اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ علم طب کے دوسرے پہلوؤں سے آگاہ نہ تھے۔بلکہ وہ تو ایک ماہر نفسیات تھے ماہر دواساز تھے،ماہر طبیب تھے بلکہ دایہ گری (Midwifery) اور طباخی (Dietetics) میں بھی کوئی اُن کا ثانی نہ تھا۔الغرض یہ مسلمان طبیب اپنے وقت کا سب سے بڑا جراح تھا اور اپنے فن میں یکتا تھا۔اِن صفحات میں ہم جن لوگوں کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ اپنے علم کی بدولت بلند وارفع لوگ تھے جنھوں نے اپنی زندگیاں نیک اور مثبت مقاصد کے حصول کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔یہ ہمارے آباء تھے جن کا تذکرہ ہم غیروں کے ہاں پاتے ہیں اور خود اُن سے واقف نہیں ہیں۔ وہ ہمارے لیے علم کی بے پناہ میراث چھوڑ کر گئے تھے مگر ہم نے اس میراث سے غفلت برتی جس کی وجہ سے اس انمول نعمت کو اہل مغرب نے اپنی جھولی میں ڈال لیا۔یہی وجہ ہے کہ بعد کی کئی صدیوں تک ہمارے ہاں بڑے لوگ پیدا ہونا بند ہو گئے اور مغرب نے بیشمار عالم پیدا کیے

جس کی بناپہ دنیا کی زمام کاراُن کے ہاتھوں میں چلی گئی ظاہر ہے غافل وارثوں کی میراث لوٹ لی جاتی ہے۔آج طب کا میدان ہو کیمیا وطبیعات وریاضی کا میدان ہو یا فلکیات کے علمی انکشافات ہوں دوردور تک کسی مسلم سائنس دان کا نام سنائی نہیں دیتا۔یہی وہ کمی ہے، امت کی یہی وہ کج روی ہے جس نے اسے علم کی راہ سے روک دیا ہے اور علم کی راہ سے رک جانا ذلت اورزوال کی طرف لے جاتا ہے۔اقوام عالم میں مسلمان امت کا حال دیکھیں تو یہ لفظ بھی حقیر لگتے ہیں۔صرف جاپان جو ایک چھوٹا سا ملک ہے میں دو ہزار سے زائد یونیورسٹیاں ہیں جب کہ پورے عالم اسلام میں جو ساٹھ سے زائد آزاد اور خودمختار مما لک ہیں اور جن میں اکثر معاشی طور پہ آسودہ ہیں میں بھی دو ہزار یونیورسٹیاں نہیں ہیں یہی امت کا نوحہ ہے اور یہی امت کے زوال کی اصل وجہ۔خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا ہم تو اُن سہانے دنوں کے ذکر میں مگن تھے جب ہر طرف مسلمان چھائے ہوئے تھے۔علم کے ہر پہلو پہ اُن کا غلبہ تھا اور اُن کے تذکرے ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔چنانچہ ہم واپس لوٹتے ہیں اور مسلمان اطبا میں الزہراوی کے بعد آنے والے طبیبوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

✍ ابن زہر۔

الزہراوی کے بعد ابن زہر (المتوفی 1162ء) کا درجہ علم طب میں بہت بلند ہے۔ابن زہر نے اُن بہت سے انسانی عوارض کو بیان کیا ہے جو اس سے قبل انسانی علم کے احاطہ سے باہر تھے ۔مثال کے طور پہ دیکھیں کہ ابن زہر نے ہی سب سے پہلے انسانوں کو بتایا کہ شکم کے اوپر اور پھیپھڑوں کے مابین ایک خلا میں رسولی ہو جاتی ہے، یا یہ کہ دل کے بیرونی غلاف پر پھوڑے کا نمودار ہونا، حلق کا فالج ، خارش، کان کے درمیانی حصے کا متورم ہو جانا، انتڑیوں کا گلنا وغیرہ

ایسے مسائل تھے جن کا تذکرہ ابن زہر سے پہلے نہیں ملتا۔ابن زہر نے ایک کتاب بھی لکھی جس کو(Well Deurant) نے طب پہ نہایت عمدہ تصنیف قرار دیا ہے ابن زہر کے بارے میں اُس نے کہا کہ اپنے وہ عہد کا بہت بڑا طبیب تھا۔ابن زہر کو کیمیا سازی میں بھی کمال حاصل تھا۔چنانچہ بیان گیا ہے کہ ابن زہر کے تیار کردہ ایک تریاق میں ستر زہروں کا توڑ موجود تھا۔

✡✡✡✡✡✡

✍ ابن رشد۔

ابن رشد(1126-1198) کو زیادہ شہرت اگرچہ ایک فلسفی ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوئی تاہم وہ ایک شاندار طبیب بھی تھے۔انھوں نے ادویات کے شعبے میں گراں قدر اضافے کیے تھے۔علم بصریات میں بھی ابن رشد کو مہارت حاصل تھی چنانچہ ابن رشد پہلے شخص ہیں جنھوں نے آنکھ کے پردے(Retina) کے عمل کی بالکل درست تشریح کی۔ابن رشد نے لوگوں کو بتایا کہ ایک بار چیچک کا شکار ہونے کے بعد انسان دوبارہ اس کا شکار نہیں ہوتا۔اُن کی تصنیف ''**کتاب الکلیات فی الطب**'' کے لاطینی ترجمے نے یورپی طب پہ گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ابن رشد نے طب کے موضوع پر بیس سے زیادہ کتابیں لکھیں تھیں۔ابن رشد نفسیات دان بھی تھے۔مشہور امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمز نے ابن رشد کے نظریات سے خوب فائدہ اٹھایا۔

✡✡✡✡✡✡

علاؤالدین ابوالحسن علی ابن حزم ابن نفیس۔

ابن نفیس (1189-1288) بھی مسلمانوں کا اثاثہ تھا۔اُس نے دمشق میں تعلیم حاصل کی۔ ابن نفیس طبیب ہونے کے علاوہ محدث بھی تھا۔ابن نفیس نے صحت اور غذا کے حوالے سے بہت سی کتابیں لکھیں۔چنانچہ اس موضوع پہ لکھی گئی بہت سی کتابوں میں ابن نفیس کی کتاب " **کتاب المختار من الاخذیہ** " سب سے بہتر کتاب تصور کی جاتی ہے۔ابن نفیس نے ابن سینا کی " **القانون فی الطب** " پہ شرح بھی لکھی۔ابن نفیس نے ابن سینا کے کئی نظریات سے اختلاف کیا اور اُن معاملات کی نئی تشریحات کیں۔

اُس نے لکھا ہے کہ جو گندہ خون وریدوں کے ذریعے دل کے داہنے جوف میں آتا ہے وہ بائیں جوف میں نظر نہ آنے والے مساموں کے ذریعہ منتقل ہو جاتا ہے۔اس کے برخلاف اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ داہنے جوف سے گندہ خون پھیپڑوں میں جاتا ہے وہاں ہوا اس گندگی کو دور کرتی ہے۔تب وہ دل کے بائیں جوف میں آتا ہے۔اس نظریہ پر ابن نفیس کو اس قدر اعتماد تھا کہ اُس نے ابن سینا کے نظریات رد کر دیئے جو دراصل جالینوس کے عہد سے چلے آ رہے تھے۔ مسلمان اطبا کا تذکرہ طویل ہے اور ہم اس قدر گنجائش نہیں پاتے کہ اُن کی پوری تفصیلات درج کی جائیں۔چنانچہ اب ہم اطبا کے کچھ نام درج کرنے پہ اکتفاء کریں گے تاہم اس سے قبل ہم یہاں مسلمان اطبا کی کچھ معرکہ آرا کتابوں کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔(36*)

✡✡✡✡✡✡

1۔ De Medicinarum compositarum Cardibus

ابو یوسف یعقوب الکندی

2۔ **التصریف** (الزہروای)

3۔ کتاب الحادی ۔ کتاب المنصوری (ابوبکر محمد ابن زکریا الرازی)

4۔ زادالمسافر (ابو جعفر ابن ابراہیم ابن خالد الجزاء)

5۔ القانون فی الطب (ابوعلی الحسین عبداللہ ابن سینا)

6۔ کتاب الملک (علی ابن عباس)

7۔ تذکرۃ الحاکمین (علی ابن عیسیٰ)

8۔ کتاب الادویہ المفردہ (امیہ ابن عبدالعزیز المعروف ابوالصلت)

9۔ تیسیر فی المودات و التدبیر (ابن زہر)

10۔ المنتخب فی علاج العین (عمار ابن علی ابوالقاسم ابن عمار)

11۔ ذخیرۃ الخوارزم شاھی (اسماعیل ابن حسین الجرجانی) (*37)

✡✡✡✡✡✡

اختصار کے نقطہ نظر سے ہم یہاں کچھ اطبا کے صرف نام تحریر کریں گے۔

ابن جزار (984-905ء)

ابو الحسن احمد بن محمد الطبری (المتوفی 996ء)

اوحد الزمان ابو برکات (1070-1164ء)

محمد الشنفرہ (المتوفی 1362)

غریب ابن سعد الکاتب القرطبی

حاجی پاشا (المتوفی 1417)

لسان الدین ابن خطیب (1313- 1374ء)

علی بن عباس (المتوفی 994ء)

حسنین بن اسحق (المتوفی 877ء)

علی ابن عیسیٰ(المتوفی1049ء)

عمار موصلی(المتوفی998ء)

خلیفہ ابن ابی المحاسن الجلبی(المتوفی 1134ء)

یوحنا بن مساویٰ (777-857ء)

ابوبکر ابن باجہ(1106-1186ء)

ابو بکر ابن طفیل(المتوفی 1175ء)

وزیر علی بن عیسی(المتوفی931 ء)

اسماعیل الجزجانی(المتوفی1107 ء)

ابو الحسن احمد ابن محمد الطبری(المتوفی999ء)

علی ابن عباس المجوسی(المتوفی1106ء)

ابو منصور موفق ابن علی (المتوفی1039ء)

احمدبن محمدا بن یعقوب ابن مسکویہ(المتوفی1139ء)

محمد ابن احمد سعید التیمی المقدسی(المتوفی1198ء)(38*)

✡ ✡ ✡

مسلمان اورعلومِ عالم

ارادہ تو یہ تھا کہ اِن صفحات میں علم کے ہراُس پہلو سے بحث کی جائے جس میں مسلمانوں نے عظمت کے سنگ میل آویزاں کیے۔تاکہ آج کا نوجوان جان جائے کہ اُس کا تعلق ایک عظیم قوم سے ہے، عظیم امت سے ہے، علم کے عظیم شیدائیوں سے ہے اور وہ اُس احساس کمتری سے باہر آئے جو اُس کو اہل مغرب کے مقابل محسوس ہوتی ہے۔مگر یہ تذکرہ اس قدر بسیط ہے کہ یہ جلد اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔چنانچہ ہم نے اس تذکرے کو قدرے سمیٹا ہے اور اِن صفحات میں علم کے دیگر پہلوؤں کا مختصر مطالعہ کیا جائے گا جن میں مسلمانوں کو دسترس حاصل رہی۔اس میں کوئی شک نہیں مسلمان دنیا پر ہزار سال تک حکومت کرتے رہے۔مسلمانوں کو علمی طور پہ اہل مغرب پر تقریباً چھ سات صدیاں برتری حاصل رہی۔اس دوران مغرب کا یہ حال تھا کہ وہ زندگی کے بیشتر شعبوں میں تنزل کا شکار تھے۔کلیسا کی طرف سے ہر نئی سوچ اور ہر نئے انکشاف پہ پابندی تھی۔اس لیے اہل کلیسا کہتے جو کچھ بائبل سے باہر ہے وہ مردود ہے۔کلیسا کے اسی جبر نے آخر کار اُس بڑی بغاوت کو جنم دیا جس کا آغاز

تو اس لیے کیا گیا تھا کہ کلیسا کے جابرانہ نظام سے نجات حاصل کی جائے مگر وہ مذہب سے نجات پر پہنچ کر ختم ہوئی۔ دوسری طرف مسلمان اسلام کی واضح اور روشن دلیل پہ نازاں تھے اور علم کے ہر پہلو پر حاوی تھے اس لیے کہ علم انبیاء کی میراث ہے، علم کا حاصل کرنا مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے اور علم سے محبت کی دعوت قرآن حکیم میں دی گئی ہے علماء نے بتایا ہے کہ قرآن کی 750 آیات جو تقریباً چوتھائی قرآن بنتی ہیں میں انسان کو تفکر تدبر اور تسخیر کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں علم کی اُس پختہ روایت نے جنم لیا جس کے نتیجے میں وہ علم کے اُس ارفع منصب پہ فائز ہوئے جن سے انسان پہلی بار آشنا ہوا۔

بعض صاحب دانش (بے دانش) مسلمان اور عیسائی محققین کا خیال ہے کہ مغرب نے اُس وقت ترقی کی کہ جب اُس نے مذہب کو خیر باد کہہ دیا چنانچہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بھی مذہب کی دقیانوسیت سے باہر آئیں اور جدیدیت کو اپنائیں۔ یہ اس قدر غریب اور لاغر خیال ہے کہ اسے پیش کرنے والوں کی عقل پہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے اس لیے کہ مغرب دراصل تو ترقی کی بجائے تنزلی کی طرف گامزن ہے اور یہ بات ہم کہیں یا نہ کہیں خود مغرب کا دانشور اپنے معاشروں کو زندگی کی لایعنیت سے ضرور آگاہ کر رہا ہے۔

مغرب مادیت کی انتہاؤں سے روحانیت کی وادی میں اترنا چاہتا ہے مگر اُسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسلام سے وہ اس لیے گریزاں ہیں کہ صدیوں وہ اسلام کے محکوم رہ چکے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی طبع میں اسلام کے خلاف خودساختہ عناد نے جنم لے لیا ہے حالانکہ مسلمان کسی بھی محاذ پہ اُن سے برسر پیکار نہیں ہیں۔ کلیسا کے بند دروازوں نے اُن کے دل کے دروازے بھی بند کر رکھے ہیں آئندہ کسی باب میں اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ مغرب کو آخر کس نے روحانیت کی وادی سے مادیت کی وادی میں اتر جانے کو کہا؟ یہاں ہم مسلمانوں کے نشانِ رفتہ کے تذکرہ میں محو ہیں اور اُن علوم کا جائزہ لے رہے ہیں جن میں مسلمانوں کی عظمت کے عکس آج تک جھانکتے ہیں۔

فلکیات

شعوری ارتقاء کے ساتھ ہی انسان نے آسمانوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا اُس کی ابتدائی وجہ تو آسمان کا حسن بیان کی جاتی ہے مگر اس کے بعد انسان نے ستاروں کے اس پار جھانکنے کا عزم کیا تو علم ہیئت یعنی فلکیات کے علم کا ظہور ہوا۔ جب علوم عالم میں نئے نئے انکشافات کا عہد شروع ہوا تو دنیا کی زمام کار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور وہی دنیا کو علم کی روشنی سے منور کرنے میں محو تھے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ علم ہیئت کی ابتدا بھی مسلمانوں نے ہی کی (39*) ۔اور یہ کہنے کے پیچھے ہمارے پاس ٹھوس وجوہات موجود ہیں اس لیے کہ مسلمانوں کو اس علم کی ضرورت تھی کہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں انھیں قبلے کی طلب ہوتی کیونکہ نماز کی ادئیگی کے لیے قبلے کا علم ہونا ضروری ہے۔اور نماز کے درست اوقات تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سورج کے زوال پہ نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ازاں بعد مسلمانوں کے بہت سے مقدس ایام چاند کے طلوع ہونے سے شروع ہوتے ہیں جیسے کہ رمضان کا چاند جیسے کہ عید کا چاند اور ایام حج کے درست تعین کے لیے بھی مسلمانوں کو چاند کی حرکت پہ نگاہ رکھنا پڑتی۔ چنانچہ یہی بنیادی دلچسپی مسلمانوں کو آسمانوں کی بہت گہرائیوں تک لے گئی اور انسان علم ہیئت سے آشنا ہوا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اول اول خلیفہ مامون الرشید کے حکم سے مسلمانوں نے دنیا کی پہلی رصد گاہ

قائم 813ء میں بغداد میں قائم کی جہاں بیٹھ کر وہ ستاروں کے جہاں دریافت کرنے لگے۔ (40*)

833ء میں دنیا کی دوسری رصدگاہ دمشق میں قائم کی گئی اور اس کے بعد یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ کامل چھ صدیوں تک جاری رہا۔ عالم اسلام میں جگہ جگہ رصدگاہیں قائم ہوگئیں اور لوگ علم ہیت میں مگن ہوگئے۔ علم ہیت سے مسلمانوں کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بعض صاحب ثروت مسلمانوں نے اپنے گھروں میں ذاتی رصدگاہیں بھی قائم کر رکھی تھیں تا کہ وہ ستاروں کی حرکات پہ نگاہ رکھ سکیں۔ یاد رہے کہ رصدگاہ تعمیر کرنے کا تخیل سب سے پہلے مسلمانوں کے ہاں ہی دیکھا گیا اس سے قبل لوگ علم کے اس طریقے سے آشنا نہ تھے۔

✡✡✡✡✡✡

مسلمانوں کی اس پیش رفت کے نتیجے میں دسویں صدی عیسوی تک مسلمان علمائے فلکیات اس موضوع پر کئی ہزار کتابیں لکھ چکے تھے اور بہت سی جدولیں بھی تیار کر لی گئی تھیں جن کی مدد سے نہ صرف انسان سورج اور چاند کی حرکت کو متعین طور پہ دیکھ رہا تھا بلکہ بدلتے ہوئے موسموں کی وجوہات کا مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ علم فلکیات کے ضمن میں سب سے پہلے الفرغانی (932-861ء) کا نام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اُن کی لکھی ہوئی کتاب "**المدخل الی علم هيئة الافلاك**" نے یورپ میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اہل مغرب کئی صدیوں تک اس کتاب کی اہمیت کے معترف رہے۔ دراصل علم ہیت پر اس کتاب میں اس علم کے بنیادی اصول وضع کیے گئے تھے اس لیے مغربی ایشیا میں سات سو سال تک اس کتاب پہ اعتماد کیا جاتا رہا۔ سورج، چاند اور ستاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے مسلمانوں نے اصطرلاب ایجاد کیا۔ دنیا کا سب سے پہلا اصطرلاب الفزادی نے تیار کیا۔ اگلے کچھ سالوں میں مسلمانوں نے علم ہیت میں اپنے قدم مزید آگے بڑھائے اور الخوارزمی (المتوفی 847ء) نے نہ صرف پہلے سے بہتر اصطرلاب

تیار کیا بلکہ اس موضوع پر دو کتابیں بھی لکھیں۔ جابر بن سنان (المتوفی 903ء) نے رصد کا ایک ایسا آلہ تیار کیا جس سے زاویوں کی پیمائش منٹوں میں کی جاسکتی تھی۔ اس آلے کو کروی اصطرلاب (Spherical Astrolable) کہا جاتا تھا۔ تاہم جو سب سے شاندار اصطرلاب کہلایا اسے الزرقالی (1029-1100ء) نے تیار کیا جو "صفیحۃ زرقالیہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ علم فلکیات کو جاننے والوں نے زرقالی کی اس ایجاد کو فلکیات میں انقلاب قرار دیا اور اس کی بہت تکریم کی ۔ پھر علی بن عیسیٰ (388ء) نے ایک اور آلہ سدس (Sextant) ایجاد کیا جس سے کم سے کم فاصلے کی پیمائش کرنا بھی ممکن ہوگیا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے ثالث (Triquetrum) تکونی آلے، عکس ساز آلے، آنکھ کے پہناوے مزولے (Quardrant) اور زاویہ گیر (Dioptra) جیسے اوزار بنائے اور مسلمان فلکیات دانوں کو فلکیاتی آلات بنانے میں خصوصی مہارت حاصل تھی جس کے بعد ہی وہ سورج اور چاند کی حرکت ، روشنی اور رفتار کے متعلق حتمی رائے قائم کرنے کے قابل ہو ئے۔ عرب فلکیات دان خاص طور پہ اس ضمن میں قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے مختلف گھڑیوں کے ذریعے وقت کی پیمائش پر دھیان دیا اور اسی مقصد کے لیے پینڈولم ایجاد کیا گیا۔ (41*)

علم ہیت میں مسلمانوں نے اپنی معاونت کے لیے جو آلات تیار کیے وہ نہایت اعلیٰ درجے کے تھے۔ مسلمانوں نے آٹھویں صدی کے آغاز میں ہی اصطرلاب بنالیا تھا جب کہ یورپ والے دسویں صدی سے پہلے اصطرلاب سے آشنا نہ تھے عربوں نے یہ آلہ بہت خوبصورت بنایا تھا جس سے بیک وقت وہ ایک سائنسی آلہ اور فنی شاہکار بن گیا تھا۔ مسلمانوں نے مشاہدے کے لیے جو آلات تیار کیے تھے وہ اُن آلات سے بہتر تھے جنھیں یونانیوں نے ایجاد کیا تھا اور انھیں استعمال کرتے رہے تھے۔ مسلمانوں کے آٹھویں نویں صدی عیسوی کے فلکی آلات اُن آلات سے بہتر تھے جو اہل مغرب پندرہویں صدی میں استعمال کرتے تھے اس سے مسلمانوں کی اس میدان میں برتری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ مسلمان سائنس دانوں نے اہل یونان کے بر

خلاف علم فلکیات میں مشاہدے پر زور دیا اور مسلمان سائنس دان سر افلاک پھیلے ستاروں کی حرکات کے طویل مطالعے کے بعد ہی کوئی نتیجہ اخذ کرتے تھے۔ یہ ہیت دان سائنسی اصولوں پر پختگی سے قائم رہتے اور نتائج اخذ کرنے میں جلدی نہ کرتے تاہم جب وہ کوئی نتیجہ نکال لیتے تو اُس پہ اصرار کرتے کہ یہ اُن کی ماہ و سال کی محنت کا نتیجہ ہوتا۔ اور وہ اُس وقت تک کسی مشاہدے کو حتمی نتیجے تک نہ پہنچاتے جب تک کہ وہ کئی بار ایک ہی امر کا مشاہدہ نہ کر لیں۔ علم فلکیات کے موضوع پر عبدالرحمان صوفی (903-986ء) کی کتاب ''**صور الکواکب الثابتۃ**'' وسطی زمانے کا شاہکار تصور کی جاتی ہے۔ مغرب کے ماہر فلکیات نے اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا۔ یورپ کی کئی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے۔ (Phlip.K. Hitti) نے صوفی کی اس کتاب کے بارے میں لکھا کہ:

A Master Piece of observation astronomy.

یہ کتاب رصدی ہیت کا شاہکار ہے۔

934ء میں صوفی نے ایک کہکشاں کو دریافت کیا مگر دنیا نے اُن کی باتوں کو اہمیت کے قابل نہ سمجھا۔ مگر صوفی کو اپنے علم پہ اعتماد تھا اس لیے اُس نے اپنی دریافت شدہ گلیکسی کو Andro Meda galaxy M 31 کا نام دیا۔ صوفی کے سات سو سال بعد 1612ء میں یہی گلیکسی جب ایک جرمن ماہر فلکیات سائمن نے دریافت کی تو دنیا نے اُس کی بات کا یقین کر لیا گیا۔ حالانکہ سائمن نے یہ کارنامہ ایک بہت بڑی ٹیلی سکوپ کی مدد سے سرانجام دیا تھا جب کہ صوفی کی رہنمائی اُس کے علم ہیت نے کی تھی۔ ازاں بعد صرف امریکہ والوں نے صوفی کی علمی رفعت کو تسلیم کیا اور چاند کے ایک 47 کلو میٹر لمبے کریٹر کو صوفی (Azophi) کے نام سے موسوم کیا۔

1011ء میں مشہور ماہر فلکیات ابوالوفا نے چاند کی تیسری حالت جس کو اصطلاح میں انحراف قمر (Lunar Veriation) کہا جاتا ہے دریافت کیا۔ مگر لوگوں نے اُن کی بات کو نہ مانا

۔چاند کی اسی حالت کی تشریح جب 1559ء میں ایک مغربی یعنی ڈنمارک کے ٹائیکو براسے نے کی تو لوگوں نے اسے تسلیم کرلیا۔ابولوفا نہایت اعلیٰ درجے کا ماہر فلکیات تھا بعد میں مغرب نے اُن کی علمی رفعت کو تسلیم کیا۔(42*)

ابولوفا نے اس بات کو بھی دریافت کیا کہ:

چاند کی زمین کے گرد گردش کے دوران سورج کی کشش کے ماتحت خلل واقع ہوتا ہے۔اس وجہ سے دونوں اطراف میں ڈگری پندرہ منٹ کا فرق پڑتا ہے ۔علم فلکیات میں اسے Evection یعنی چاند کا گھٹنا بڑھنا کہا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

البتانی (858-929ء) ایک عظیم ماہر فلکیات تھے انھوں نے مشہور ماہر یونانی ماہر فلکیات بطلیموس کی غلطیوں کی نشاندہی کی اور اُن کی تصحیح کی۔انھوں نے ماضی میں قائم کیے جانے والے غلط تخمینوں کی جگہ درست اور صحیح یا کم از کم آج کی تسلیم شدہ مقداروں سے بڑی حد تک قریب قیمتیں دریافت کیں۔اہل مغرب میں سے کپلر، گلیلیو اور کوپرنیکس نے البتانی سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔

✡✡✡✡✡✡

ابن یونس (1009) کی خدمات بھی فلکیات کے میدان میں تسلیم شدہ ہیں۔انھوں نے سورج کے جھکاؤ کے زاویے کی جو قیمتیں معلوم کی ہیں وہ بالکل درست ہیں۔آج کی جدید سائنس نے بھی ابن یونس کے زاویوں کو درست قرار دیا ہے۔ابن یونس پر اہل مغرب نے ایک تھیسس لکھا جس پہ PHD کی ڈگری دی گئی یہ تھیسس بعد میں شائع بھی کیا گیا جس سے ابن یونس کی اس میدان میں دسترس کا حقیقی اندازہ ہوا۔

✡✡✡✡✡✡

الزقالی (1029-1100ء) نے ایک فلکی آلہ ایجاد کیا جس نے علم فلکیات میں انقلاب بپا کر دیا۔انھوں نے اپنے اس آلہ سے جو مشاہدات کیے اُن سے برآمد ہونے والے نتیجے حال کی مقداروں کے مطابق ہیں۔اُن کی تیار کی گئی زیچ یورپ میں (Toledian Table) کے نام سے مشہور ہے۔الزرقالی کی سب سے اہم دریافت وہ نظریہ ہے جس میں انھوں بتایا کہ ستاروں کے مقابلے میں اوج شمس حرکت پذیر ہے۔الزقالی نے کپلر سے کئی سو سال پہلے اس بات کی اطلاع کی تھی دنیا گول نہیں بیضوی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

اس کے بعد الفرغابی کا نام آتا ہے۔فرغابی کی کتاب " **کتاب فی الحرکات السماویہ و جوامیع النجوم** " کو علم فلکیات کی اہم کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔فرغابی نے زمین اور کئی ستاروں کے قطر معلوم کیے۔

✡✡✡✡✡✡

ہارون بن علی (المتوفی 901ء) بھی ماہر فلکیات تھے۔انھوں نے معاصر علماء میں ممتاز مقام حاصل کررکھا تھا۔ہارون بن علی بہت سے فلکیاتی آلات پہلی بار دنیا کے سامنے لائے۔

✡✡✡✡✡✡

الرازی(935-854ء) کا شمار صف اول کے فلکیات دانوں میں کیا جاتا ہے۔اگرچہ وہ کئی دوسرے علوم میں بھی بے مثال تھے۔طب اور کیمیا میں اُن کی دسترس کا ذکر گزر چکا ہے۔رازی کی کتاب"**کتاب الکواکب الثابتۃ المصور**"کو فلکیاتی مشاہدات کا حرف آخر قرار دیا جاتا ہے۔رازی کو بجا طور اپنے عہد کا عجیب وغریب شخص قرار دیا جاتا تھا۔رازی کے علم کی کوئی انتہا نہ تھی اور اُن کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا تھا جن کو اللہ کی طرف سے بے شمار علم سے نوازا گیا ہو۔

✡✡✡✡✡✡

البروجی ایک اور ماہر فلکیات کا نام ہے جس نے علمی حلقوں کھلبلی مچا رکھی تھی بارہویں صدی عیسوی میں البروجی نے لولابی نظریہ پیش کیا جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی کتاب"**کتاب الھیۃ**"میں کیا۔اس کتاب کے علمی انکشافات نے فلکیاتی سائنس میں تہلکہ مچ دیا۔البروجی نے نظریہ بطلیموس کو غلط ثابت کیا اور اپنی علمی مہارت سے بطلیموس کے ہزار سالہ تسلط کو ختم کردیا۔

✡✡✡✡✡✡

نصیرالدین طوسی بھی ماہر فلکیات تھے۔انھوں نے ایک خطی اصطرلاب ایجاد کیا جس کی مدد سے بہت پیمائشوں کو درست کیا گیا۔فلکیاتی مشاہدات پر اُن کی کتاب"**تذکرہ فی العلم الھیۃ**"کو علم فلکیات کی شاندار کتاب قرار دیا گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ نصیرالدین کے پانچ سو سال بعد کوپرنیکس نے جو فلکیاتی ماڈل دنیا کے سامنے رکھا وہ دراصل نصیرالدین طوسی کا

علمی معرکہ تھا اور یہ بھی کہ بد یانتی میں اہل مغرب کا کوئی ثانی نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

احمد بن سجستانی (1024ء) نے زمین کی گردش کا درست حساب پیش کیا مگر لوگوں نے اُن کے اس علمی کارنامے کی مطلق پرواہ نہ کی۔ مگر احمد بن سجستانی کے پانچ سو سال بعد جب کوپر نیکس نے زمین کی گردش پہ روشنی ڈالی تو لوگوں نے اسے تسلیم کیا حالانکہ اس میں کوپر نیکس کا کوئی ذاتی کمال شامل نہ تھا۔ حیرت ہے علم کی چوری اسی قوم کو راس آتی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوالحسن علی احمد نسوی (1030ء) کا شمار بھی قابل تعظیم مسلمان ہیت دانوں میں کیا جاتا ہے اس لیے کہ انھوں نے وقت کی تقسیم کا فارمولا وضع کیا اور وقت کو گھنٹوں منٹوں اور سیکنڈوں میں تقسیم کیا۔

✡✡✡✡✡✡

ابن سینا کو کون نہیں جانتا اُن کی علم ہیت میں مہارت بھی مسلّمہ تھی حالانکہ ہم انھیں ایک فلسفی اور حکیم کے طور پہ جانتے ہیں۔ انھوں نے ستاروں کے باہمی ربط کو جاننے کے لیے ایک آلہ تیار کیا جو (Vernier Scale) سے بہت مشابہ تھا۔ ابن سینا نے برسوں زہرہ پہ نظریں جمائیں رکھیں اور یہ نتیجہ نکالا کہ یہ ستارہ سورج کی نسبت زمین سے زیادہ قریب ہے۔ یورپ کی علمی بدیانتیوں کو کون نہیں جانتا اس لیے انھوں نے زہرہ کے اس قصے کو بھی اپنی جھولی میں ڈال لیا۔ انھوں نے ابن سینا کے گلے سے اتار کے یہ ہار سات سو سال بعد ایک امریکی (Jemermia Horrocks) کے گلے میں ڈال دیا۔ اللہ علم کے چوروں پہ

لعنت کرے۔

✡✡✡✡✡✡

البیرونی(1048ء) کا شمار بھی علم فلکیات کے ماہرین میں کیا جاتا ہے۔البیرونی نے اپنے انکشافات کو" **مکالید علم الٰھیہ** " نامی کتاب میں بیان کیا ہے۔البیرونی علم فلکیات میں ممتاز مقام کے حامل تھے۔انھوں نے زمین کی محوری حرکت کا مشاہدہ کیا اوراس سے دنیا کو آگاہ کیا۔انھوں نے لوگوں کو بتایا کہ سورج زمین کے گرد اپنا چکر ایک سال میں پورا کرتا ہے ۔اس سے قبل وہ لوگوں کو بتا چکے تھے کہ زمین گول ہے اوراپنے محورسورج کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔البیرونی نے جب یہ نظریہ پیش کیا تب اہل مغرب دورتاریکی(Dark age) میں تھا اس لیے اہل مغرب نے اُن کی باتوں کو مذاق میں اڑادیا۔ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اگر وہ البیرونی کی باتوں کوتسلیم کرتے توانھیں کلیسا کے جبر کا سامنا کرنا پڑتا جواس سے قبل اپنی ہی قوم کے بہت سے صاحب علم کونگل چکا تھا۔البیرونی نے اپنی کتاب" **مکالید علم الٰھیہ** " میں زمین کا گول نقشہ بنایا تاکہ وہ مختلف سمندروں کی اصل جغرافیائی ہیئت کوواضح کرسکیں۔ انھوں نے آسمان پہ موجود چمکتے ستاروں کے جھرمٹ پہ بھی نگاہ ڈالی اوراُن کو جانوروں کی اشکال سے تشبیہ دے کرواضح کرنے کی کوشش کی۔یادرہے کہ یورپ والے آج تک اسی سادہ سے طریقے کواپنائے ہوئے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ابن رشد(1198ء) بھی ماہرفلکیات تھے۔انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن کے تراجم مغربی اقوام میں صدیوں تعظیم کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔ابن رشد نے ہی سب سے پہلے سورج کی سطح پر دھبے(Sun Spot) دریافت کیے۔قبل ازیں ابن رشد کو ہم ایک بہت

بڑے فلسفی کے طور پہ جانتے ہیں اور اُن وجہ شہرت علم فلسفہ ہی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

جابر ابن افلاح (1009ء) کا شمار اندلسی ماہر فلکیات میں کیا جاتا ہے جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم اندلسی ہیت دانوں کا احوال بیان نہیں کر سکے۔ جابر ابن فلاح کا تعلق اندلس سے ہی تھا۔ انھوں نے رصد گاہوں میں استعمال کرنے کے لیے ایک آلہ ایجاد کیا جس کو (Torquetum) کہا جاتا تھا۔ یورپ میں یہ آلہ بہت مقبول ہوا۔ علم فلکیات میں مسلمانوں کی دریافتیں انکشافات اور ایجادات کی تفصیل ہم نہیں لکھ سکے اس لیے کہ جو کچھ بیان کیا ہے وہ بھی اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ مسلمان علم کے دوسرے شعبوں کی طرح علم فلکیات میں بھی دوسری اقوام سے کوسوں آگے تھے اور چھ سات صدیوں تک اس علم میں اُن کا کوئی ثانی نہ تھا اور یہی مقصود نظر تھا۔(43*)

✡✡✡

علم ارضیات

علم ارضیات کو آسانی کے لیے جغرافیہ بھی کہا جاتا ہے۔اگرچہ لفظ جغرافیہ علم ارضیات کو بہت محدود کر دیتا ہے کہ علم ارضیات بہت وسیع علم ہے اور جغرافیہ قدرے محدود علم ہے۔قرون وسطیٰ میں علم جغرافیہ ہو یا علم ارضیات ہر دو پہ مسلمانوں کی اجارہ داری قائم تھی۔دنیا کی دیگر اقوام کے لیے اس قدرے مشکل علم کو حاصل کرنے کے امکانات اس لیے بھی محدود تھے کہ ایک تو اُن کے معاشروں میں علم کی روایت پختہ نہ تھی دوسرے یہ علوم بہت گراں تھے اور اُن کی حد استطاعت سے وراء تھے۔نویں صدی عیسوی تک مسلمان اس علم میں کافی مہارت حاصل کر چکے تھے۔اس لیے کہ اُن کے لیے یہ کوئی مشکل علم نہ تھا جب وہ آسمانوں کی طرف متوجہ رہتے اور لوگوں کو علم ہیت کے رموز سے آگاہ کرتے تو زمین تو اُن کے قدموں میں پڑی تھی۔اسے ناپ لینا اُن کے لیے چنداں مشکل نہ تھا اس لیے کہ اس سے قبل وہ آسمانوں کی پہنائیوں کو ماپ چکے تھے۔مسلمانوں نے اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھیں اور اس علم میں وہ مہارت حاصل کی جو اس سے قبل تاریخ کے کسی دور میں بھی حاصل نہ کی گئی تھی۔دراصل جغرافیہ میں مسلمانوں کی دلچسپی کے کئی محور تھے۔مسلمان اکثر و بیشتر تجارت پیشہ تھے اور انھیں اپنے اموال لے کر دور چین تک جانا ہوتا تھا اس لیے زمینی اور سمندری راستوں کا جاننا اُن کے لیے از حد ضروری تھا اور اس سلسلے میں انھوں نے پیش رفت کی اور علم جغرافیہ کے بنیادی اصول وضع

ہونے لگے۔ تجارت کے علاوہ دنیا بھر میں پھیلے مسلمانوں کو حج پر پہنچنے کے لیے راستوں سے واقفیت ضروری تھی۔ اس کے علاوہ نماز ادا کرنے کے لیے قبلہ کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے زمین کی ہیت سے آشنا ہونے کے باوصف ہی قبلہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امور سلطنت سمیت بہت سے معاملات تھے جن کا براہ راست تعلق علم جغرافیہ سے تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے اس علم میں مہارت حاصل کرنے کا عزم کیا اور ایک صدی کے اندر اندر دنیا کو بتا دیا کہ چین کہاں ہے اور ہندوستان کہاں ہے۔

مسلمانوں نے عالمی سطح کے بہت سے جغرافیہ دان پیدا کیے۔ اُن کے انکشافات اور اکتشافات کا عمل صدیوں جاری رہا۔ عہد وسطیٰ کے اس دور میں مسلمانوں نے اس ضمن میں دنیا کی بہت خدمت کی۔ اس کی تفصیل بیان کرنا اس لیے ممکن نہیں کہ یہ سلسلہ دراز صدیوں کی وسعت اختیار کیے ہوئے ہے اس لیے ہم یہاں صرف چند جغرافیہ دانوں کے تذکرے پر ہی اکتفاء کریں گے۔

مسلمان جغرافیہ دانوں کے علمی معرکے سامنے آنے سے پہلے یہ نظریہ قبول عام حاصل کر چکا تھا کہ زمین چپٹی ہے اہل مغرب کی کم علمی کی انتہا ہے کہ وہ زمین کے متعلق اسی تصور پہ قائم تھے۔ مسلمانوں نے پچاس سال کی تحقیق کے بعد ہی دنیا کو بتا دیا کہ زمین گول ہے۔(44*)

مغربی مورخین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ دیگر علوم کی طرح مسلمان علم جغرافیہ میں بھی برتری لیے ہوئے تھے۔ چنانچہ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہد تک یہ بات صاف ہو چکی تھی زمین گول ہے۔ مسلمان جغرافیہ دان اس ضمن میں کئی کتابیں لکھ چکے تھے۔ ہم یہاں ابن خردازبہ(850ء) کی ایک کتاب کا ذکر کریں گے جس میں وضاحت کے ساتھ اس امر کو بیان کر دیا گیا ہے کہ زمین گیند کی طرح گول ہے اور فضائے بسیط میں اس طرح رکھی ہے جس طرح انڈے میں زردی رکھی ہوتی ہے۔ مزید ذکر کیا گیا کہ زمین کے چاروں طرف ہلکی ہوا ہے۔ نیز مسلمان تاجروں کی آسانی کے لیے اسی کتاب میں تجارتی رستوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ حیرت ہے کہ بارہ سو سال قبل لکھی گئی اس کتاب میں مشرق بعید جہاں آج جاپان چین اور کوریا جیسی ریاستیں ہیں کے جغرافیائی حالات کا

تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ابن رستہ (903ء) ایک اور ماہر جغرافیہ دان ہے جس کی کتاب " **الاعلاق النفسیہ**" نےعلم جغرافیہ میں بہت سے نئے درواکیے۔ بلکہ اہلِ مغرب تواس کتاب کو بلا مبالغہ جغرافیہ کا انسائیکلوپیڈیا قرار دیتے ہیں۔ابن رستہ نے بہت سے علمی دلائل سے اس بات کو ثابت کیا کہ زمین گول ہے۔ابن رستہ کو یہ دلائل اس لیے دینے پڑے کہ مغرب اس بات کو ماننے سے انکاری تھا کہ دنیا گول ہے کیونکہ اس بات کا بائبل میں کوئی تذکرہ نہ تھا۔چنانچہ کلیسا نے مسلمان جغرافیہ دانوں کے دلائل کو ماننے سے انکار کر دیا۔بلکہ کلیسا تو پندرہویں صدی عیسوی تک اسی نظریے کا قائل تھا کہ زمین چپٹی ہے۔حتیٰ کہ کوپرنیکس نے مسلمانوں کی کتابیں پڑھ کے یہ نتیجہ نکالا کہ زمین گول ہے۔مگر کلیسا کا جبر اس قدر شدید تھا کہ کوپرنیکس کو یہ بات زبان پہ لانے میں برسوں بیت گئے اور جب یہ بات اُس کی زبان سے نکل گئی تو وہ خود کو کلیسا کی ناراضگی سے نہ بچا سکا۔

✡✡✡✡✡✡

اسلامی دنیا کے سب سے بڑے جغرافیہ دان تو بلاشبہ المسعودی (957ء) ہی ہیں جن کا پورا نام ابو الحسن مسعودی ہے اور جنھوں نے علم جغرافیہ پہ دنیا کی سب سے ضخیم کتاب تحریر کی جو 30 جلدوں پہ مشتمل تھی۔اس کتاب میں جیوگرافی، جیولوجی اور نیچرل ہسٹری کے متعلق نایاب ذخیرہ موجود ہے۔ مسعودی نے اس کتاب میں علم کے کئی جہانوں کو سمو دیا ہے۔انھوں نے بحیرہ مردار اور علم طبقات الارض پہ بیش بہا مباحث چھوڑے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

محمد المقدسی (1000ء) میں علم جغرافیہ پہ ایک اور بڑی کتاب لکھی جو آج مفقود ہو چکی ہے صرف اُس کا فرانسیسی ترجمہ موجود ہے جو اس بات کو بیان کر رہا ہے کہ محمد المقدسی کی یہ کتاب ایک بہت بڑا علمی شاہکار تھی۔اس کتاب کا نام " **احسن التقالیم فی معرفتہ الاقالیم**" بیان کیا گیا

ہے۔اس کتاب میں واقعات، مشاہدات اور تجربات کی بنا پر وسیع اور اہم جغرافیائی مواد پیش کیا گیا ہے۔جس طرح البیرونی کی کتاب "**تاریخ ہند**" کو ہندی جغرافیہ کی شاندار کتاب قرار دیا جاتا ہے اسی طرح المقدسی کی "**احسن التقالیم فی معرفتہ الاقالیم**" کو عرب جغرافیے کی سب سے بڑی کتاب قرار دیا جاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

مقدسی کے بعد البیرونی کا ذکر کیا جاتا ہے۔البیرونی (973-1050ء) نے جغرافیہ پہ ایک شاندار کتاب "**تاریخ الھند**" لکھی جو ہندوستان کے بارے میں ایک شاہکار کتاب ہے۔کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔البیرونی نے زمین کے گول ہونے اور رات دن کے تغیر پر تفصیلی بحث کی ہے۔اس کتاب میں وہ بہت سی معلومات درج ہیں جو اس سے پہلے کسی جغرافیہ داں کے ہاں نظر نہیں آتیں۔کہا جاتا ہے کہ البیرونی نے ہی سب سے پہلے علم ارضیات کی بنیاد رکھی۔انھوں نے ہی سب سے پہلے کشش ثقل کا تذکرہ کیا۔البیرونی انتہا کا عالم تھا علم کے کئی پہلوؤں سے اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔علم جغرافیہ میں اُس کی مہارت تامہ کا یہ عالم تھا کہ ایک ہزار برس پہلے البیرونی نے دنیا کے گیارہ شہروں کا طول بلد عرض بلد معلوم کیا تھا جو آج تک درست ہے۔وہ پاکستان کے ایک شہر جہلم میں اترا تھا قریب کے ایک گاؤں میں گیا اور وہاں بیٹھ کر زمین کا محیط معلوم کیا جو جدید دنیا کی پیائش سے انتہائی قریب تھا یعنی صرف 78 میل کا فرق تھا اور یہ فرق قابل ذکر نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ابوعبیدہ اللہ بن عبد العزیز البکری (1094ء) نے ایک جغرافیائی لغت تیار کی جس میں مختلف شہروں اور مختلف علاقوں اور جگھوں کے نام تحریر کیے۔ (Well Deurant) کہتا ہے کہ وسطی زمانہ میں مسلمانوں میں دو ہی جغرافیہ دان پیدا ہوئے اُن میں ایک بکری ہے اور دوسرا ادریسی۔

✡✡✡✡✡✡

ادریسی (1156ء) بھی ماہر ارضیات تھے۔انھوں نے علم جغرافیہ پر ایک شاندار کتاب لکھی جس کا بہت سی مغربی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ادریسی کی یہ کتاب پورے تین سو سال اہل مغرب کے نصاب میں شامل رہی ۔ یورپ والے اس کتاب میں شامل نقشوں کو حرفِ آخر قرار دیتے تھے۔ادریسی نے نقشہ نویسی کے فن کو کمال تک پہنچایا۔دنیا کا سب سے پہلا نقشہ بھی ادریسی نے ہی بنایا تھا۔جس نے طویل عرصہ تک دنیا کی رہنمائی کی۔

✡✡✡✡✡✡

ادریسی کے بعد یاقوت حموی کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو ایک مسلمان سیاح اور جغرافیہ دان تھے۔یاقوت حموی عالم دین بھی تھے اور اُن کی بہت سی کتابیں آج تک پڑھی جاتی ہیں۔یاقوت حموی نے اپنے سفری مشاہدات بھی قلمبند کیے ہیں جن میں جغرافیہ سے متعلق بیش بہا معلومات موجود ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

زکریا بن محمد القزوینی (1281ء) بھی ایک مسلمان ماہر ارضیات ہیں۔انھوں نے سب سے پہلے موسموں کے بدلنے کی وجوہات بیان کیں۔قزوینی نے سات ہواؤں کا تذکرہ کیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابن سعید (1274ء) نے مشہور مقامات اور شہروں کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔اُن کے بیان

کیے ہوئے طول بلد اور عرض بلد آج تک درست تصور کیے جاتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ابن سعید کے علاوہ ابوالفدا ء ہیں جو نامور مسلمان جغرافیہ دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

عبدالرشید ابن صالح ابن نوری (1404ء) بھی نامور مسلمان جغرافیہ دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

قطب الدین شیرازی (1310ء) بھی نامور مسلمان جغرافیہ دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

کمال الدین فارسی بھی نامور مسلمان جغرافیہ دانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔الغرض مسلمان جغرافیہ دانوں نے دنیا بھر کی سیاحت کی ، چپے چپے کا حال لکھا۔ہر ملک کے پہاڑوں ، دریاؤں ، جنگلوں جھیلوں، قصبوں، بستیوں ، شہروں اور وادیوں تک کو گن ڈالا۔انھوں نے لوگوں کے تہذیب وتمدن زبان وادب رسم ورواج اور لباس وطعام الغرض ہر پہلو پہ گہری نظر ڈالی۔(45*)

✡✡✡

میکانیات

مسلمانوں نے میکانیات (Machanics) کے شعبہ میں اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ مسلمان سائنس دانوں نے بہت سے آلات بنائے، مشینیں ایجاد کیں اور اس موضوع سے متعلق طرح طرح کی کتابیں لکھیں۔ احمد بن موسیٰ نے ''کتاب الخیل'' کے عنوان سے (880ء) لگ بھگ ایک کتاب لکھی جس میں ایک سو سے زیادہ آلات اور مشینوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن سو مشینوں میں سے 75 خود اُن کی اپنی ایجاد کردہ تھیں۔ اسی کتاب میں بہت سے ایسے کھلونوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا حال پڑھ کے حیرت ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے ایسی ایسی مشینیں ایجاد کی جن کی کارکردگی سے عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔ مسلمانوں نے ایسے برتن بنائے جن میں پانی پینے سے برتن میں موسیقی بج اٹھتی۔ قرون وسطیٰ میں مسلمان سائنس دانوں نے آلات (Tools) کے موضوع پہ بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں آب رسانی اور آب پاشی کے ذرائع کے لیے مختلف آلات کی تفصیل ملتی ہے۔ آبی گھڑیاں، پانی کو اوپر لے جانی والی مشینیں اور رہٹ بنانے میں مسلم ماہرین نے ان کتابوں میں بیش بہا معلومات فراہم کی ہیں۔ بعض کتابوں میں ایسی مشینوں کا ذکر ہے جو پانی، پارے، وزن اور جلتی موم بتیوں سے حرکت کرتی تھیں۔ اب ہم کچھ اُن ماہرین کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے مشینوں اور حرکت کا تذکرہ کیا ہے۔ بدیع الزماں

اسماعیل ابن الرزاز المعروف بہ الجزری نے اپنی ایک کتاب میں ساتویں صدی کی پہلی دہائی میں آبی اور شمسی گھڑیوں، مختلف قسم کے برتنوں، صراحیوں، شکل بدلنے والے فواروں، پانی اوپر لے جانے والی مشینوں اور دوسری کئی مشینوں کا ذکر ہے۔ مسلمان علماء نے اِن مشینوں کی ساخت اور بناوٹ کے اصولوں پر نہایت سادہ زبان میں روشنی ڈالی ہے۔ مسلمانوں نے آب رسانی پر خصوصی توجہ دی جس کے نتیجے میں کئی مشینیں وجود میں آئیں۔ اِن میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ مشین نعورا تھی۔ یہ مشین کسی دریا یا جھیل کے پانی کو بلندی پر لے جا کر ایک حوض میں گرا دیتی تھی۔ وہاں سے اس پانی کو شہر کی پختہ نالیوں کی طرف روانہ کر دیا جاتا جس سے ہر گھر کی پانی کی ضرورت پوری ہوتی۔ نعورا کا رواج تقریباً تقریباً پورے عالم اسلام میں پھیل گیا تھا۔

مسلمانوں کے عہد سے پہلے پن چکیاں تھیں جو پانی سے چلتی تھیں مگر وہ عام نہ تھیں۔ اسلامی عہد میں پن چکیوں کا عام رواج ہو گیا۔ چوتھی صدی ہجری تک مسلمانوں نے مدو جزر سے چلنے والی پن چکی تیار کر لی تھی۔ بعد میں انھی پن چکیوں کو آرا مشینوں اور کاغذ کی ملوں میں استعمال کیا گیا۔ جن علاقوں میں پانی نہ تھا وہاں مسلسل ہوائیں چلتی رہتی تھیں۔ انھی علاقوں میں پن چکیوں کا عام رواج تھا۔ اہل مغرب گیارہویں صدی عیسوی تک پن چکیوں سے بالکل ناواقف تھے جبکہ مسلمانوں کے علاقوں میں یہ پن چکیاں نویں صدی عیسوی میں بھی موجود تھیں اور مسلمان اُن کی مدد سے آٹا پیسا کرتے تھے ۔ ازاں بعد انھی پن چکیوں سے گنے کا رس نکالا جانے لگا۔ اِن پن چکیوں کا آغاز مسلم ہسپانیہ سے ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ یورپ میں رواج پا گئیں۔

وسطی زمانہ میں مسلمانوں کو فن حرب اور جہاز سازی میں بھی کمال حاصل تھا مسلمانوں نے بحری جہازوں کو جنگ اور تجارت ہر دو مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کے تجارتی جہاز اس قدر بڑے ہوا کرتے تھے کہ اُن میں سے بعض جہاز ایک ہزار ٹن سے زائد وزن اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ جنگی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے جہاز دو دو ہزار سپاہیوں کو لے کر نکلتے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان بڑے بڑے بحری جہاز بنانے پہ قادر تھے۔ زمانہ وسطی میں مسلمان

علماء نے فن سپاہ گری پہ پچاس سے زائد کتابیں لکھیں۔رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ہی مسلمان منجنیق کا استعمال سیکھ چکے تھے۔چنانچہ مسلمانوں نے طائف اور خیبر کے محاصروں میں منجنیق کا استعمال کیا ۔عباسی خلفاء نے منجنیق کے استعمال کو وسعت دی۔انھوں نے بڑی بڑی منجنیقیں بنائیں جنھیں انھوں نے دشمن پہ آتش گیر مادہ اور دھماکہ خیز مواد پھینکنے کے لیے استعمال کیا۔اسلحہ اور بارود کا استعمال بھی سب سے پہلے مسلمانوں نے ہی کیا۔عام طور پہ خیال کیا جاتا ہے کہ بارود چینیوں کی ایجاد ہے مگر درست یہ ہے کہ بارود بھی مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے اور بندوق بھی مسلمانوں نے ہی بنائی ۔ مسلمانوں نے ہی 1304ء میں توپ بنائی۔

مسلمانوں نے فن حرب کو خوب ترقی دی ۔ بندوق سازی میں مسلمانوں کو کمال کی مہارت حاصل تھی۔مغلیہ عہد میں ایک سائنس دان فتح اللہ شیرازی نے ایک ایسی بندوق ایجاد کی جو ایک راؤنڈ میں بارہ فائر کرتی تھی۔گستاولی بان نے لکھا ہے کہ عرب کثرت سے توپ خانے کا استعمال کرتے تھے۔

مسلمانوں نے ایک خاص قسم کا راکٹ یجاد کیا جس کا نام "سہم" تھا۔اس راکٹ میں بارود بھر کر اس کے فیتے کو آگ لگا کر دشمن کی طرف چھوڑ دیا جاتا تھا۔سہم کے بعد مسلمانوں نے "سہم ساعی" ایجاد کیا جو عجیب وغریب راکٹ تھا اس لیے کہ وہ بارود لے کر دشمن کی طرف جاتا۔اپنے دامن میں سمیٹے آتش گیر مادے کو دشمن کے بیچ جا کر خارج کرتا اور اُسی جگہ پہنچ جاتا جہاں سے اُسے چھوڑا گیا تھا۔انھی راکٹوں میں ایک قسم "فتاش" کی تھی جس میں کاغذ یا چمڑے کے پر ہوتے تھے اسے پتنگ کی طرح اڑایا جاتا تھا اس سے قلعوں اور پہاڑوں پہ قائم دشمن کے ٹھکانوں پہ آتش گیر مادہ گرایا جاتا تھا۔انھی ایام میں مسلمانوں نے پانی کی سطح پر تیرنے والا ایک تارپیڈو بھی بنایا جو لوہے کی مضبوط چادر سے بنایا جاتا تھا۔اس کے علاوہ گھڑی سازی کا فن بھی خاص مسلمانوں کا فن گنا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے طرح طرح کی گھڑیاں بنائیں۔ہارون الرشید کے عہد میں مسلمان گھڑیاں بنانا سیکھ چکے تھے۔ہارون الرشید نے اپنے ایک عیسائی باج گزار بادشاہ شارلیمن کو ایک گھڑی دی۔اُس

گھڑی سے بارہ بجے بارہ گھوڑے نکلا کرتے۔ بادشاہ نے دربار سجا رکھا تھا کہ بارہ بج گئے گھڑی کے گھڑیال بجنے لگے اور گھوڑے نکلنے لگے یہ دیکھ کر عیسائی بادشاہ اپنے تمام درباریوں سمیت بھاگ اٹھا ۔عباسی عہد میں ہی محمد بن موسی الفرغانی (861ء) نے سب سے پہلے دھوپ گھڑی بنائی۔ جس کے بعد دھوپ والی گھڑیاں کئی جگہ بنائی گئیں اور اُن کا عام رواج ہو گیا۔ مسلمانوں نے ایسا گھڑیال بھی بنایا تھا جس سے صرف نماز کے اوقات میں آواز آتی تھی۔ الغرض مسلمانوں نے طرح طرح کی حیران کن اور عجیب وغریب گھڑیاں بنائیں۔ جن میں شمسی اور آبی گھڑیوں کے علاوہ لنگر دار گھڑیاں بھی شامل تھیں۔ چنانچہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ گھڑیوں کا استعمال سب سے پہلے عربوں نے ہی کیا۔

اندلس کے باسی مسلمان سائنس دان عباس ابن فرناس (المتوفی 1009ء) نے اپنے گھر میں رصد گاہ قائم کر رکھی تھی جس میں انھوں نے مصنوعی طور پر چاند ستاروں اور بجلی کی گرج وچمک کا ماحول پیدا کر رکھا تھا غالباً یہ دنیا کا سب سے پہلا پلانی ٹیریم ہوگا۔

محمد بن شاکر نے (المتوفی 867ء) نے ایک کیمیائی ترازو ایجاد کیا جس پہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کا وزن بھی کیا جا سکتا تھا۔ الخازنی نے بھی بہت سے ترازو بنائے تھے۔ مغرب میں عام طور پہ خیال کیا جاتا ہے کہ ہوا میں اڑنے کا خیال سب سے پہلے اہل مغرب کے ذہن میں آیا اور آلیور نے گیارہویں صدی میں اڑنے کی کوشش کی اور شدید زخمی ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہوا میں اڑنے کا خیال بھی سب سے پہلے مسلمانوں ہی کو آیا اور آلیور سے دو سو سال پہلے اندلس کے مسلمان سائنس دان ابن فرناس نے ہوا میں اڑنے کا تخیل پیش کیا۔

یہ ایک طویل داستان ہے جس کا تذکرہ بسیط ہے ہم نے میکانیات میں مسلمانوں کے رجحانات اور

ارتقائی تخیل کو پیش کردیا ہے جس سے مسلمانوں کی اس شعبے سے لگن اور اُن کی مہارت کھل کے سامنے آجاتی ہے۔(*46)

✡ ✡ ✡

تاریخ

انسان نے جب علوم وضع کیے تو غالباً سب سے پہلے تاریخ نویسی کا آغاز ہوا ہوگا اس لیے کہ اپنے آباء کے قابل فخر کارناموں کو زیادہ دیر تک زندہ رکھنا انسان کی قدیمی خواہش رہی ہے(47*)۔انسان نے شعوری ارتقاء کے بہت سے پڑاؤ طے کر لیے تھے جب عرب میں وہ خورشید طلوع ہوا جس کی روشنی سے بحر و بر جگمگا اٹھے۔تب انسان تاریخ نویسی کے فن سے آگاہ ہو چکا تھا، اہل چین نے اپنی تاریخ مرتب کر لی تھی۔اہل یونان نے فلسفہ کے بہت سے نظریات انسان کو پیش کر دیئے تھے اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام آنے تک انسان اپنی شعوری پختگی کو پہنچ چکا تھا چنانچہ جب قرآن نے انسان کو مخاطب کیا تو اُس میں بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کی عبرت کے لیے تاریخ کے بہت سے در وا کیے۔قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پہ گذشتہ امتوں کے احوال تفصیل سے بیان کیے جن کو خالق سے بغاوت کے جرم میں تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔قوم نوح علیہ السلام ، قوم شعیب علیہ السلام قوم صالح علیہ السلام ، قوم ہود علیہ السلام اور قوم لوط علیہ السلام کے تذکرے سے قرآن کا مقصود یہ ہے کہ انسان خالق کی اطاعت پہ خود کو قائم رکھے ورنہ اپنے انجام کے بارے میں سوچے کہ اگر ماضی میں گذری اُن عظیم الشان اقوام کو برباد کر دیا جاتا ہے تو اُسے بھی اللہ کا عذاب آ سکتا ہے۔مسلم تاریخ نویسی کا آغاز اگرچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پہ اتاری گئی کتاب مقدس سے ہی ہو چکا تھا تاہم مسلمانوں

نے قرآن کے اسلوب کو نظر میں رکھتے ہوئے علم تاریخ کے بنیادی خدوخال وضع کیے اور انسانوں کو علم تاریخ کی حقیقی ماہیت سے آگاہ کیا کہ مسلم تاریخ سے قبل مرتب کی گئی انسانی تاریخ محض بادشاہوں کے تذکرے تک ہی محدود تھی۔

مسلمانوں نے فن تاریخ کا آغاز رسول اللہ ﷺ کی مبارک زیست کے ہر ہر لمحہ کو محفوظ کرنے کے عمل سے شروع کیا۔ چنانچہ فن وسیر و مغازی نے نہ صرف مسلم تاریخ بلکہ تاریخ عالم پہ بھی مثبت اثرات چھوڑے اور لوگ اپنے مشاہیر کی زندگیوں کو محفوظ کرنے لگے۔ اگرچہ اس سے قبل اس طرح کی کوئی روایت نظر نہیں آتی حتیٰ کہ قوم بنی اسرائیل کی طرف اترے جلیل القدر انبیاء ورسل کی تاریخ بھی غیر محفوظ رہی صرف اُس قدر معلوم ہے جو قرآن میں بیان کر دی گئی۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مغرب نے فن تاریخ نویسی مسلمانوں سے سیکھا اور اہل مغرب اس بات کا اعتراف کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے چنانچہ دیکھیں کہ (Dr. Ioan) کہتا ہے کہ!

حدیث تاریخ اور سیرت نگاری میں مسلمانوں کا سب سے عظیم کارنامہ فن اسماء الرجال ہے۔ یہ وہ فن ہے جس میں احادیث وسنت کی صحت معلوم کرنے کے لیے راویوں کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کے بعد اسوۂ رسول ﷺ شریعت کا دوسرا اہم ماخذ ہے اس لیے محدثین نے رسول اللہ ﷺ سے مروی احادیث میں صحیح اور غلط کے درمیان تمیز کرنے کے لیے یا دوسرے لفظوں میں احادیث کی صحت وسقم جاننے کے لیے راویوں کے حالات معلوم کرنے کا فن ایجاد کیا جس کو علم اسماء الرجال کہا جاتا ہے۔ اس فن کا فائدہ یہ ہوا کہ 12 ہزار ایسے افراد کے حالات زندگی تاریخ میں محفوظ ہو گئے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔ اُن کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین میں ہزاروں راویوں اور پھر اُن سے روایت کرنے والوں کے حالات بھی اسی فن کی بدولت مسلمانوں کی تاریخ میں محفوظ ہو گئے۔

مغربی محقق (Alloys Springer) نے لکھا کہ اندازہ ہے کہ فن اسماء الرجال کی بدولت پانچ لاکھ لوگوں کے حالات اگلی نسلوں تک پہنچے۔ چنانچہ (Alloys Springer) ہی کا بیان

ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں گزری جنھوں نے اس قدر عظیم الشان علم کی بنیاد رکھی ہو۔ یہ اسی فن کی بدولت ہے کہ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ محفوظ کرلیا اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ مسلمانوں کے لیے اطاعت کی راہگذر ہے۔ چنانچہ مسلم تاریخ کا درخشاں نشان سیرت و مغازی کا وہ پہلا مرحلہ ہے جو مسلم تاریخ کا نقطہ آغاز ہے۔ مسلمان محدثین اور سیرت نگاروں نے مسلمانوں کی جس تاریخ کا آغاز کیا وہ آگے بڑھتی رہی پھلتی پھولتی رہی اس لیے کہ مسلمان ایک ہزار سال تک اس دنیا میں دوردور تک حکمران تھے۔ یہ خیال کہ خلیفہ منصور عباسی کے عہد تک مسلمانوں میں تدوین و تالیف کا آغاز ہی نہ ہوا تھا ایک اور سفید جھوٹ ہے جو یورپ کے مستشرقین سے ہمارے ہاں منتقل ہوا اور بہت سے لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اہل عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج گو کم سہی مگر مدتوں سے چلا آرہا تھا۔

آپ ﷺ کی حیات مبارک میں ہی اس امر کا اہتمام موجود تھا کہ صحابہؓ قرآن کریم کی آیات کو جہاں اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے وہیں اسے کاغذ کپڑے ہڈی پتھر چمڑے اور کھجور کے پتوں تک جو چیز بھی دستیاب ہو پر تحریری شکل میں بھی محفوظ کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ کئی صحابہؓ تو زبانِ اقدس ﷺ سے نکلنے والے ہر لفظ کو تحریر کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے ان کو منع نہیں کیا بلکہ ان کے اس استفسار پہ فرمایا کہ اس زبان سے خیر کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ میں سے حضرت عمرؓ ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ ، حضرت طلحہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابو حذیفہؓ ، حضرت ابوسفیانؓ ، حضرت شفاءؓ بنت عبداللہ اور حضرت امیر معاویہؓ لکھنا بھی جانتے تھے اور پڑھنا بھی۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ہی تحریرات کا ایک مجموعہ جمع ہو گیا تھا جس کی بنا پر بعد میں فنِ سیرت اور علومِ حدیث کی بنیاد رکھی گئی۔ ان میں وہ احادیث تھیں جو حضرت علیؓ حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے قلم بند کی تھیں۔ بہت سے تحریری فرامین تھے جو آپ ﷺ نے مختلف قبائل کو تحریر کیے، اور معاہدات تھے جو آپ ﷺ نے دیگر قبائل یا اقوام سے کیے تھے، جیسے کہ صلح حدیبیہ اور میثاق مدینہ وغیرہ اور پھر وہ

خطوط تھے جو آپ ﷺ نے مختلف سلاطین اور امرا کے نام ارسال فرمائے تھے۔ تاہم آپ ﷺ کے وصال کے بعد فنِ روایت پہ کام اتنی تیزی سے ہوا کہ ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب روایات اور احادیث کا دفتر ولید کے کتب خانے سے منتقل کیا گیا تو صرف امام زہریؒ کی مرویات اور تالیفات کو منتقل کرنے کے لیے گھوڑوں اور گدھوں کی مدد حاصل کی گئی۔

اس وقت روایات کے سلسلے میں مختلف صحابہؓ کی ترجیحات کے مدارج مختلف تھے۔ عمومی طور پر صحابہؓ ان اقوال و افعال پر زیادہ توجہ کرتے جن کا تعلق امورِ شریعت سے تھا۔ اور یہی وہ کوششیں تھیں جنھوں نے بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے دین کی آسان فقہ کے راستے ہموار کیے۔ اہل عرب میں رواج تھا کہ وہ اپنی باہم لڑائیوں کی یاد میں طویل نظمیں تحریر کرتے جس میں اس معرکے کی تمام تفصیلات کا احاطہ کیا جاتا۔ مگر آپ ﷺ کی تربیت نے اہل عرب کے مزاج کو پوری طرح بدل کے رکھ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام اور کفر کے درمیان ہونے والے معرکوں کی تفصیلات کو احکام شریعت سے موخر رکھا گیا اور خلفائے راشدین اور اکابر صحابہؓ کا طرز عمل یہی رہا ہے کہ انھوں نے احکامِ شریعت کو فنِ مغازی پہ مقدم رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دور میں جن علماء نے فنِ مغازی پہ کام کا آغاز کیا ان کو ابتدا میں زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی۔

چنانچہ اس فن کے سرخیل واقدی اور ابن اسحاق ہیں جن کو قبول عام کا درجہ کبھی بھی حاصل نہ ہو سکا۔ بلکہ واقدی کو تو محدثین علانیہ کذاب کہتے ہیں۔ تاہم تحریر و تدوین کا کام جب ایک بار شروع ہو گیا تو پھر اس فن نے اپنے نقطہ عروج تک پہنچ کے ہی دم لیا۔ مسلمان حکمرانوں کو اس بات کا بخوبی ادراک حاصل تھا کہ چونکہ یہ دین رہتی دنیا تک قائم رہنے والا ہے اور اس میں عرب و عجم کی پہچان اب ختم ہوئی جاتی ہے بلکہ پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے ہی دین اسلام دنیا کے کونے کونے پہ دستک دے رہا تھا اور عجمی مسلمانوں کی تعداد اہل عرب سے زیادہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ تمام اسلامی اثاثوں کو سپرد قلم کر دیا گیا تا کہ قیامت تک آنے والا ہر مسلمان دین متین کی روشنی سے اپنے سینوں کو منور کرتا رہے۔ حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ جب اول اول حضرت عمرؓ نے مجھ سے اس بات کا تذکرہ

کیا کہ آیات قرآنی کو اب لکھ لینا چاہیے تو مجھے اس بات پہ حیرت ہوئی اور میں نے برملا انکار کر دیا کہ میں بھلا کوئی ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں جس کو نبی کریم ﷺ نے نہ کیا ہو اور میں اپنی اس بات پہ اڑا رہا اس وقت تک جب تک کہ اللہ نے میرے سینے کو اس بارے میں وسعت عطا نہ کر دی پھر میں بھی حضرت عمرؓ کے ہمراہ ہو گیا۔

تب قرآن کو پہلی بار ایک ہی لوح میں محفوظ کیا گیا اس کے بعد حضرت عثمان غنیؓ نے اسے لہجہ قریش کے مطابق تدوین کرایا اور باقی تمام لہجوں میں قرات کی ممانعت فرما دی۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں درسِ فقہ اور حدیث کے بہت سے حلقے قائم تھے جو لوگوں کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کراتے اور اسوہ رسول ﷺ سے آگاہی فراہم کرتے۔ تاہم جونہی بنی امیہ کے دور کا آغاز ہوا انھوں نے فوراً ہی مبادیاتِ دین کی تدوین کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے عبید بن شرعیہؒ کو یمن سے بلا کر قدماء کی تاریخ مرتب کرنے کا حکم دیا اور اس سلسلے میں ان کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچائی جس کے نتیجے میں "**اخبار الماضیین**" مرتب ہوئی۔ ان کے بعد عبدالملک بن مروانؒ اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا اور گراں قدر تصنیفات تحریر کرائیں۔

سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ میں تفسیر قرآن جیسے بڑے منصب کا خود کو اہل نہ جانتا تھا مگر عبدالملک بن مروانؒ نے بڑی محبت سے مجھے اس کام پہ آمادہ کیا۔ چنانچہ حضرت سعید بن جبیرؒ نے قرآن کی اولین تفسیر کی جوان کی زندگی میں طبع نہ ہو سکی بعد میں جس تفسیر نے "**تفسیر عطا بن دینار**" کے نام سے شہرت پائی وہ دراصل انھی کی تحریر تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزمؒ کو جو وقت کے بڑے محدث تھے تدوین احادیث نبوی ﷺ پر آمادہ کیا۔ ابوبکر بن محمد شہر نبوی مدینہ کے قاضی تھے اور مشہور محدث سیرت نگار تاریخ نگار اور فقیہہ امام زہریؒ کے استاد تھے۔ امام زہری مشہور محدث اور صحیح بخاری کے مولف امام محمد بخاریؒ کے استاد تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور تک سیر و مغازی پہ سیر حاصل کام نہ ہوا تھا۔

چنانچہ انھوں نے اپنی توجہ فن روایت کی اس خاص صنف کی جانب مبذول کی اور غزوات نبوی ﷺ کے احوال بیان کرنے کے لیے عاصم بن عمر بن قتادہؒ انصاری کا انتخاب کیا جو جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی نبوی ﷺ کا احوال بیان کیا کرتے۔

فن روایت کے استحکام اور سیرت و مغازی کے واقعات کو محفوظ رکھنے لیے اہل علم کا ایک پورا قافلہ تھا جنھوں نے اپنی زندگیاں خاص اس فن سے وابستہ کر رکھی تھیں۔اس سے اگلا عہد تاریخ نویسی کا ہے جس کا آغاز عہد بنی امیہ (660-750ء) میں اُس وقت ہوا جب حضرت امیر معاویہؓ کے حکم پر عبید بن شبرمہ الجرمی (المتوفی 687) نے "**كتاب الملوك و اخبار الماضيين**" نامی کتاب لکھی۔مورخین اسے مسلم تاریخ کی اولین کتاب قرار دیتے ہیں۔ابن اسحٰق نے خلیفہ منصور کے عہد (768ء) میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت پہ کتاب لکھی۔جسے پہلی باقاعدہ سیرت نبوی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخی نویسی میں تیزی آتی گئی اور مسلمانوں نے علم تاریخ پہ بے پناہ کتابیں لکھنی شروع کر دیں۔کثرت تصنیف کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حافظ مغلطائی (المتوفی 1360ء) نے ایک عام سے شخص کے پاس تاریخ کے موضوع پہ ایک ہزار کتابیں دیکھیں۔اِن کتابوں میں بعض اس قدر ضخیم تھیں کہ اُن کا جائزہ لینے کے لیے عمر نوح درکار تھی۔مسلمانوں کی تاریخ پہ لکھی گئی ایک کتاب "**تاریخ دمشق**" 80 جلدوں پہ مشتمل تھی۔

چنانچہ آج یورپ کے مستشرقین تاریخ نویسی کے فن میں چاہے جتنے بھی دعوے کرلیں وہ اس امر کو جھٹلانے کے قابل نہیں ہیں کہ ان کے پیش کردہ اکثر تاریخی اور عمرانی نظریات کہیں نہ کہیں جا کر مسلمان مورخین ہی کا تصور نکلتے ہیں اس لیے کہ ان کے ہاں آج بھی مذہب کا ایک دھندلا سا عکس ہی موجود ہے اور کسی دھندلے عکس سے شفاف آئینے مرتب نہیں کیے جا سکتے۔ اپنے قیمتی اثاثوں اپنے آفاقی نظریات کے تحفظ اور اپنی تاریخ کے زریں واقعات کو روشن رکھنے کے لیے مسلمان قوم کا یہ حال تھا کہ چوتھی صدی ہجری کے ایک مورخ مسعودی اپنی کتاب '**مروج الذھب**" میں اپنے قدماء کا ذکر کرتے ہوئے 80 بلند پایہ مورخوں کے حالات قلم بند کرتے ہیں اور مسعودی سے چالیس

سال بعد ''محمد بن اسحاق الندیم بغدادی'' نے اپنی کتاب '' الفہرست '' میں سینکڑوں تاریخ نویسوں اور اوران کی مطبوعات کا احوال بیان کیا ہے۔ بعد میں آنے والوں میں سے آٹھویں صدی ہجری کے مورخ ''الذہبی'' مسلمان ممالک میں لکھی جانے والی ہزاروں کتابوں کے مطالعے کے بعد تاریخ کی چالیس قسمیں بیان کرتے ہیں اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے فنِ روایت نے انسانی تمدن میں علم تاریخ کو کس بام عروج تک پہنچایا ہے۔

الذہبی کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ ان کے ذاتی کتب خانے میں محض تاریخ کی ایک ہزار سے زائد کتابیں موجود تھیں۔ حافظ سخاویؒ (متوفی ۹۰۲) نے اپنی کتاب '' **الاعلان با لتوبیخ**'' میں علم تاریخ کے سینکڑوں پہلوؤں پر افادیت کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے اور ایسی سینکڑوں کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جو قصص الانبیاء سیرت بنوی ﷺ تاریخ صحابہؓ خلفا و سلاطین وزرا مورخین اور محدثین اطباء و ادبا اور شعرا کے حالات پر لکھی گئیں تھیں۔

مسلم علماء میں سے ہم مورخین کو سب سے زیادہ یاد کرتے ہیں کہ اس لیے کہ ایک تہذیب کے متعلق ہمارے پاس جو بھی علم ہے وہ انھیں مورخین کی بدولت ہے۔ اِن مورخین کے بغیر یہ تہذیب ہمارے لیے اتنی ہی نا معلوم ہوتی جتنی کہ چمپالون سے پہلے کی فرعونی تہذیب۔ دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلم تاریخ دانوں نے اپنی کتابوں میں معلومات کا وسیع ذخیرہ مہیا کیا ہے۔ چنانچہ عظیم مسلم مورخین ابن جریر طبری، مسعودی اور ابن مسکویہ نے تعصّبات سے بالاتر رہتے ہوئے جس طرح تاریخی حقائق کو منتقل کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ مسعودی (957-888ء) کا سب سے بڑا علمی کارنامہ '' **مروج الذھاب و المدائن**'' تیس جلدوں پہ مشتمل عالمی تاریخ کی ایک شاہکار اور مستند کتاب ہے۔ ابن خلکان کی کتاب '' **وفیات الاعیان** ''سوانحی تاریخ کا شاہکار ہے۔ ابن خلکان نے اس کتاب میں 865 نامور اسلامی شخصیات کے احوال زیست جمع کیے ہیں۔ مسلمان مورخین میں اس کے بعد حسن بن جلجل (994-944) اندلسی تھے جن کا شعبہ طب تھا۔ انھوں نے ایک بہت شاندار کتاب لکھی جس میں انھوں نے 571 اطباء کی سوانح عمریاں پیش کی ہیں۔ کتاب کا

نام " **تاریخ الاطبا و الحکماء** "بیان کیا گیا ہے۔

اسی دور میں ابن حزم نے (994-1064ء) نے مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور ایک شاہکار کتاب لکھی ۔ ابن حزم نے دنیا کے مشہور مذاہب پر بے لاگ تبصرہ کیا ۔ (Well Deurant) نے کہا کہ ابن حزم کی یہ کتاب "**الفصل فی الملل و الا ھواء و النحل** " تقابل ادیان پر دنیا کی قدیم ترین کتاب ہے۔

عزیرالدین ابن الاثیر(1160-1231ء) بھی مسلم مورخین میں ایک معتبر نام ہے۔انھوں نے دنیا کی تاریخ پہ " **تاریخ الکامل فی التاریخ**" نامی شاہکار کتاب لکھی۔چودہ جلدوں پہ مشتمل یہ کتاب ایک مکمل تاریخ مانی جاتی ہے۔انگریزی زبان میں اس کتاب کا ترجمہ ہالینڈ سے شائع ہوا ہے۔

اس کے بعد ابن خلدون (1332-1406ء) کا عہد آتا ہے جن کو تاریخ نگاری کا سرتاج بھی کہا جاتا ہے۔ابن خلدون کو سب سے بڑا مورخ قرار دیا جاتا ہے اور ابن خلدون ہی سے کئی نئے علوم کا اجرا ہوا جیسے کہ عمرانیات اور سماجیات وغیرہ۔مغربی مورخ (Arnoled B Tayen)ابن خلدون کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جہاں تک علم فلسفہ و تاریخ کا تعلق ہے تو عربی ادب جس عظیم نام سے روشن ہے وہ ابن خلدون ہے۔عیسائی دنیا اس کی نظیر پیش نہیں کر سکی۔ابن خلدون نے اپنی تاریخ کا آغاز شاندار مقدمے سے کیا ہے۔ابن خلدون کا مقدمہ تاریخ عالم میں ایک گراں قدر اور بے مثال اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔

(Phlip.K. Hitti) ابن خلدون کے بارے میں لکھتے ہیں کہ!

دراصل تاریخ کی حقیقی اہمیت اور ماہیت کا موجد یا کم از کم فن سماجیات کا اصل بانی ابن خلدون ہی ہے۔کسی عرب مورخ یا کسی یورپی مورخ نے کبھی تاریخ کا اس قدر مفصل اور گہرا جائزہ پیش نہیں کیا جس قدر ابن خلدون نے تاریخ ابن خلدون میں اقوام کا حال پیش کرتے ہوئے کیا ہے۔ نقادوں کا اتفاق ہے کہ ابن خلدون اسلام کے عظیم ترین تاریخی مفکر ہیں۔چنانچہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ نگاری عالمی تاریخ نویسی میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔مسلمان تاریخ نویسوں

کے تذکرے میں (Jaorge Sarton) لکھتے ہیں کہ مسعودی اور طبری نے اسلام کی نہیں بلکہ بنی نوع انسان کی خدمت کی ہے۔اس لیے کہ سب سے بڑا فلسفی فارابی مسلمان تھا،سب سے بڑا ریاضی دان ابوالکامل مسلمان تھا،سب سے بڑا جغرافیہ دان قاموسی مسلمان تھا اور سب سے بڑا مورخ ابن جریر طبری بھی مسلمان تھا۔الغرض مسلمانوں نے تاریخ نویسی کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا انھوں نے تاریخ وسیر کے ہر حوالے سے یادگار اثاثہ چھوڑا ہے۔ایک جرمن مستشرق (Westan field) نے اسلام کی پہلی دس صدیوں میں پیدا ہونے والے مورخین کی خدمات اوران کے احوال پر سیر حاصل بحث کی ہے اس نے ان کی تعداد 590 بیان کی ہے جن میں اکثر مولفین کی تصنیفات کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہیں۔علم تاریخ میں مسلمان علماء کی لازوال جہد وسعی نے دنیا سے جہالت کے اندھیروں کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔قرن اول ہی سے مسلمان علم کے ہر پہلو کو ایک فرض کی طرح جانتے تھے جیسے کہ اللہ نے مسلمانوں پہ نماز فرض کی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر علم بھی فرض کیا ہے بلکہ مسلمانوں کو سفر کرنے کی بھی تلقین کی ہے تا کہ وہ دنیا کی اُن مختلف اقوام کے حالات سے واقف ہو سکے جنھوں نے انکار کیا اور اُن کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔

چنانچہ علمِ تدوینِ حدیث سے شروع ہونے والی اس عظیم مہم کو جسے متاخرین تاریخ کے نام سے یاد کرتے ہیں کو اگر ہم اس کو دو عہدوں میں تقسیم کریں تو دور اول کے مسلمان مورخین میں الواقدی (م ۲۰۸ھ)ابو عبیدہ (م۲۰۹ھ) ابن سعد (م ۲۳۰ھ) المدائنی(م ۲۳۵ھ)الدینوری(م۲۶۹ھ) بلاذری (م ۲۸۴ھ) اور امام طبری(۳۱۰ھ) کے نام بہت نمایاں ہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جن کی عہد ساز جہدِ مسلسل نے لوگوں کے دلوں سے اس ابہام کو دھو دیا ہے کہ تاریخ بادشاہوں کے قصوں کا نام ہے۔اس میں سامان عبرت کم اور قصہ گوئی زیادہ ہوتی ہے۔

اسلام آنے کے بعد جہاں انسانی تمدن میں ہر حوالے سے گراں قدر تبدیلی محسوس کی گئی وہیں تاریخ نویسی کے بھی نئے در وا ہوئے۔عہدِ اول کے مورخین نے اپنے اس جدافنِ تاریخ نویسی میں اسلوب کی ندرت اور سہل نگاری کے تمام پہلو مدنظر رکھے۔تاہم علامہ طبریؒ کے دور سے متصل ہی ایک

دوسرے مسلمان مورخ ''المسعودیؒ'' نے تاریخ نویسی کو اس پہلو سے قدرے وسعت دی کہ تاریخ محض حالات وواقعات کی تمثیل ہی بن کے نہ رہ جائے بلکہ اس نے تجزیاتی انداز کے بجائے تنقیدی اور سماجی ومعاشرتی نقطہ نظر پیش کرنے کا آغاز کیا یہی وہ بنیاد تھی جس پہ آگے چل کے علامہ ابن خلدونؒ نے وہ رفیع الشان عمارت تعمیر کی جس نے دنیا میں ایک تہذیبی اور عمرانی تہلکہ پیدا کر کے رکھ دیا۔ چنانچہ ہم المسعودیؒ کے عہد سے ہی تاریخ نویسی کے دوسرے دور میں داخل ہوتے ہیں جہاں ابن خلدونؒ نے المسعودیؒ کی وضع کردہ ان راہوں پہ چلتے ہوئے فنِ تاریخ نویسی کو بے کراں وسعتوں سے روشناس کرایا جن سے آج کا جدید یورپ بھی مستفیذ ہورہا ہے۔ انسانی رویوں اوران کے ابتدائی معاشرتی ڈھانچے کی بنیادی خامیوں اوراس عہد کے عمرانی چیلنجوں کا جس انداز میں ابن خلدونؒ نے جواب دیا ہے اس کی مثال آج کا جدید دور بھی دینے سے قاصر ہے اس عہد کے یہ نام تاریخ نویسی کے حوالے سے قابل قدر ہیں۔ ابن مسکویہ (م ۴۲۱ھ) ابن الندیم (م ۳۸۵ھ) ابوالفراج (م ۳۵۶ھ) خطیب بغدادی (م ۳۶۳ھ) ابن حزم (م ۴۵۶ھ) ابن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) ابن الجوزی (م ۵۹۶ھ) ابن الاثیر (م ۶۳۰ھ) ابن سعد مغربی (م ۳۶۹ھ) یاقوت رومی (م ۶۲۶ھ) ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) ابوالفداء (م ۶۸۹ھ) ابن کثیر (م ۶۹۶ھ) ابن خلدون (م ۸۰۸ھ)۔ (48*)

✡ ✡ ✡

فلسفہ

مسلم ہسپانیہ نے یورپی فکر میں جو عظیم ترین اضافہ کیا وہ علم فلسفہ ہے۔صدیوں تک یورپ کی درس گاہوں میں طالب علموں کو مسلمان فلسفیوں کی کتابیں پڑھائی جاتی رہیں۔عرب فلاسفر کی تالیفات اور اُن کے تخیلات کا کثیر حصہ وقت کی راکھ میں پوشیدہ ہو گیا تاہم اس قدر ضرور باقی ہے جس سے علم فلسفہ میں مسلمانوں کی علمی رفعت کا احساس کیا جا سکے۔مسلمان فلسفیوں نے علم فلسفہ کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔انھوں نے علم فلسفہ کو یونانی خرافات سے نجات دلا کے ایک علم کے طور پہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔مسلمان فلاسفہ نے علم فلسفہ کو نفس کی مختلف حالتوں کو بیان کرنے کے بجائے انسانی نفس کو روحانیت کی وادیٔ میں اترنے پہ مائل کیا اور نفس کو غارت گر بننے کی بجائے حق کی معاونت پہ اکسایا اور اسے مذہب کی مطابعت اختیار کرنے کی طرف مائل کیا۔اگرچہ یونانی فلسفہ میں اُن کی مروج مذہبی دیو مالا کو خاص مقام حاصل تھا تاہم مسلمان فلاسفہ نے علم فلسفہ کا جو جدید تصور پیش کیا وہ سراسر مذہبی تھا۔چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یونانی فلسفے کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کا عمل کندی نے شروع کیا فارابی نے اسے جاری رکھا اور ابن سینا نے اسے مکمل کیا۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

یعقوب الکندی (م873ء) پہلے شخص تھے مسلم علماء میں جنھیں فلسفی کے طور پہ جانا گیا۔کندی نے

361 کتابیں لکھیں جن میں فلسفے پر بیس کتابیں تھیں۔اہلِ مغرب نے اِن کتابوں کے ترجمے کیے اور مسلم فلسفہ کی اساس سے آشنائی حاصل کی۔کندی کی کتابیں آج تک اسلامی فلسفے کی بنیاد تصور کی جاتی ہیں اور آپ کی کتابوں کو ہر دور میں سراہا گیا۔کندی کا فلسفہ میں موضوع روح اور عقل تھا۔کندی نے کہا کہ مثالی انسان (Ideal Man) وہ ہے جو جسمانی لذت کو ترک کر دیتا ہے اور اپنی زندگی کو غور و فکر کے لیے وقف کر دیتا ہے۔کندی کہتا ہے کہ معاشرہ انسان کے لیے کسی آئینے کی مانند ہے اس آئینے کو دیکھ کر انسان اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔انسان کو دیکھنا چاہیے کہ اُس کے دوستوں اور قریبی لوگوں میں کیا کیا خامیاں ہیں اُسے سوچنا چاہیے کہ یہی خامیاں یقیناً اُس کی ذات میں بھی موجود ہوں گی۔اس طرح انسان اپنی برائیوں سے جان چھڑا سکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابونصر فارابی (870-950ء) بھی مسلم فلاسفر تھے۔کہا جاتا ہے کہ ابونصر فارابی دنیا کی ستر زبانیں جانتے تھے۔اُن کی کتابوں کی تعداد 114 بیان کی گئی ہے۔اِن میں سے پچاس سے زیادہ کتابیں فلسفے اور منطق پر ہیں۔اُن کے علمی کارناموں کی وجہ سے انھیں معلم ثانی بھی کہا جاتا ہے۔یاد رہے کہ فلسفہ کا معلم اول ارسطو کو کہا جاتا ہے۔ابونصر فارابی پہلے شخص تھے جنھوں نے حکمیاتی اصولوں پر علوم کی طبقہ بندی کی جو آج تک رائج ہے۔الفارابی نے اپنی تعلیمات میں مثالی معاشرے کے تصور کو موضوع بحث بنایا تھا۔فارابی کے نزدیک مذہب کے بغیر کوئی بھی معاشرہ کبھی مثالی معاشرے کی شکل میں نہیں ابھر سکتا۔

✡✡✡✡✡✡

ابن سینا (980-1039ء) بھی مسلم فلسفی ہو گزرے ہیں۔ابن سینا کو علم حکمت کا بادشاہ کہا جاتا تھا ابن سینا نے یوں تو سینکڑوں کتابیں لکھیں تاہم خاص فلسفے پر اُن کی کتابوں کی تعداد 22 ہے۔فلسفے

پراُن کی کتابوں کواہل مغرب نے بہت اہمیت دی اوراُن کی کتابوں کے تراجم کرائے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں اہل مغرب کے بچے فلسفے کے موضوع پر ابن سینا کی کتابیں ہی پڑھا کرتے تھے کیونکہ ابن سینا کی کتابیں اہل مغرب کے نصاب میں شامل تھیں۔ مغرب کے معروف فلسفی دے کارت پر ابن سینا کی تعلیمات کا گہرا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ابن سینا نے ہی پہلی بار مذہب اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ اُن کا سب سے بڑا علمی کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے تصوف کو سائنسی اصولوں پر مرتب کیا اور اپنی تعلیمات کی بنیاد عقل کو قرار دیا۔ ابن سینا کی معروف کتابوں میں "**الشفاء اور القانون**" شامل ہیں۔ یہی کتابیں عہدِ وسطیٰ کے فکر و فلسفہ کا نقطۂ عروج تصور کی جاتی ہیں۔

ابن سینا کے خیالات نے اہل مغرب کو شدید طور پہ متاثر کیا۔ جب اُن کی کتاب "**الشفاء**" کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا تو یورپ کے علمی حلقوں میں تہلکہ مچ گیا اور ابن سینا کی فکر یورپ کے گوشے گوشے تک پھیل گئی۔ مغربی مورخین میں سے راجر بیکن اور دے کارت خاص طور پہ ابن سینا کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ راجر بین نے کہا کہ ارسطو کے بعد ابن سینا ہی فلسفے کا بادشاہ ہے۔ چنانچہ آج تک بڑے بڑے عیسائی محققین کی کتابیں ابن سینا کے حوالہ جات سے بھری پڑی ہیں۔ نہ صرف عیسائی بلکہ یہودی مفکرین بھی ابن سینا کے علمی تخیل سے متاثر تھے۔ چنانچہ یہودی فکر و فلسفہ پر ابن سینا کی چھاپ کو آج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یورپ کے تعلیمی اداروں پہ ابن سینا کے افکار صدیوں چھائے رہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابن سینا کے بعد مسلم فکر و فلسفہ کے آسمان پر خورشید غزالی طلوع ہوا اور خوب چمکا۔ امام غزالی (م1111ء) کو اخلاق کا امام کہا جاتا ہے انھوں نے فلسفہ پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ امام غزالی کی کتابوں کے تراجم مغربی زبانوں میں کیے گئے اور اہل مغرب نے غزالی کے فکر و فلسفہ سے خوب

استفادہ کیا۔امام غزالی نے مشرق میں یونانی فکر وفلسفہ کی ساری عمارت منہدم کر دی۔ڈیوڈ ہو یوم کی تعلیمات بنیادی طور پہ امام غزالی کے فکر وفلسفہ ہی کی تشریح ہے۔دے کارت کے فکر وفلسفہ کا محور بھی غزالی ہی کا فلسفیانہ تصور ہے۔فلسفہ میں امام غزالی کی شاہکار کتابوں " **تہافۃ الفلاسفہ اور المقاصد الفلاسفہ** " نے یورپی فکر ونظر کو شدید طور پہ متاثر کیا۔

چنانچہ یورپ کا فکر وفلسفہ دراصل امام غزالی ہی کا عطا کردہ ہے۔خود مغربی محققین نے ہی دنیا کو اس امر سے آگاہ کیا ہے کہ (Ramoned Daweas) جیسے مغربی فلاسفہ نے فکر وفلسفہ کے موضوع پر کام کرنے کے بجائے امام غزالی کے تصور اخلاق وعمل کو اپنایا اور امام غزالی کے علمی کام کو اپنے نام سے شائع کرا کے فلاسفر بن بیٹھے۔دے کارت جیسے شخص کو دیکھیں جسے مغرب جدید فلسفے کا بانی قرار دیتا ہے نے امام غزالی کی پوری پوری کتابیں اپنے نام پر شائع کرالیں۔اسی طرح فرانسیسی فلاسفر (Paskell) کو دیکھیں کہ انھوں نے امام غزالی کی وفات کے بعد مابعد الطبیعات پہ ایک کتاب لکھی تو اپنی طرف سے ایک حرف نہیں لکھا بلکہ اس ضمن میں جو کچھ امام غزالی لکھ گئے تھے اُسے اٹھایا اور اپنے نام سے شائع کرا کے فلسفی بن بیٹھے انھوں نے اتنا بھی نہیں کیا کہ دو چار فقرے ہی بدل دیتے سچ ہی کہتے ہیں کہ نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے؟؟؟

حالانکہ (Jaorge Sarton) کہتا ہے کہ:

اسلام ہمیشہ سے انسانیت کی رہنمائی کرنے والا مذہب رہا ہے اس لیے کہ اسلام نے ایسے ایسے صاحب علم پیدا کیے مغرب کے پاس جن کا کوئی جواب نہ تھا۔سارٹن کہتا ہے کہ جب غزالی تھا تو صرف غزالی ہی تھا اُس کا کوئی ثانی نہ تھا، جب زرقالی تھا تو علم ہیت میں صرف زرقالی ہی تھا کوئی اُس کا ہمسر نہ تھا، جب عمر خیام تھا تو کوئی نہ تھا جو کہتا کہ وہ ریاضی میں عمر خیام کا ہمسر ہے، جب ابن خلدون کا عہد آتا ہے تو دنیا میں کوئی مورخ دکھائی نہیں دیتا جو ابن خلدون کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے چنانچہ یہ لوگ اپنے معاصرین سے بہت اونچے مقام پہ کھڑے تھے جہاں تک پہنچنے کی خواہش تو کی جاسکتی ہے مگر وہاں تک پہنچنا نہایت دشوار ہے۔امام غزالی نے فلسفیانہ تصوف کو رواج دیا۔اُن کی

تعلیمات میں انسان کو دنیا کی رغبت اختیار کرنے سے روکا گیا ہے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے مجاہدہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔تاہم بہت سے غیر اسلامی تصورات کے موجد بھی امام غزالی ہی ہیں جن کو اسلام میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا تاہم مغرب نے اِن امور کو بخوشی قبول کیا ؟؟؟

✡✡✡✡✡✡

ابن رشد(1198ء) مسلم اسپین کے عظیم فلسفی تھے۔اہل مغرب ترتیب کے حوالے سے ارسطو اور ابن سینا کے بعد ابن رشد کو رکھتے ہیں اور انھیں دنیا کا تیسرا بڑا فلسفی قرار دیتے ہیں۔ابن رشد کے فکرو فلسفہ نے اہل مغرب پر گہرے اثرات مرتب کیے یہی وجہ ہے کہ ابن رشد کی کتابیں چھ صدیوں تک مغرب کے تعلیمی نصاب میں شامل رہیں۔ابن رشد کی کئی سو کتابوں میں سو کتابیں فلسفے پر تھیں۔ابن رشد کی کتابوں کے تراجم اہل مغرب کی علمی تشنگی کو ہوا دے رہے تھے۔نیپل یونیورسٹی جو اٹلی میں قائم ہوئی اُس نے ابتدا ہی سے ابن رشد کی کتابوں کو اپنے نصاب میں شامل کیا اور آج تک شامل رکھا ہوا ہے۔کہا جاتا ہے کہ عبرانی میں تورات کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والی کتابیں ابن رشد ہی کی ہوا کرتی تھیں۔ابن رشد کے متعلق محققین بجا طور پہ کہتے ہیں کہ مسلمان فلاسفہ میں سے سب سے زیادہ اہل مغرب کو ابن رشد نے متاثر کیا۔

ارسطو نے جمہوری طرز حکمرانی کا جو تصور پیش کیا تھا وہ خام تھا ابن رشد نے جمہوری نظام حکومت کی اساسات کو وضع کیا۔ابن رشد ساجی اور اجتماعی نظام میں باہمی تعاون اور عدل و توازن کی دعوت دیتے ہیں اُن کا مثالی معاشرہ بھی اگر چہ مذہبی معاشرہ ہے مگر انھوں نے اپنی اس فکر پہ زور نہیں دیا۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اہل مغرب کی طرح ابن رشد بھی مذہب کو انفرادی معاملہ سمجھتے تھے بلکہ اس کے برعکس ابن رشد کی تمام تعلیمات میں اجتماعیت کا عکس نمایاں ہے۔ابن رشد سے عیسائی اور یہودی مفکرین بھی متاثر تھے۔عورت کے متعلق ابن رشد کا خیال ہے کہ خالق نے اُسے مرد کے

مساوی خصوصیات سے نوازا ہے اس لیے عورت بھی معاشرے میں مرد کی طرح عملی اور مثبت کردار ادا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

چنانچہ عہد حاضر کے معروف فلسفی (Bertendersal) کا یہ بیان قابل فہم ہے کہ ابن رشد مسلمانوں کی بجائے انسانوں کا فلسفی تھا۔ اسی لیے مسلمانوں کی نسبت عیسائیوں اور یہودیوں نے ابن رشد سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ مغرب کی نشاۃ ثانیہ میں دکھائی دینے والے بڑے بڑے نام بالواسطہ یا بالاواسطہ ابن رشد کے افکار سے ضرور متاثر رہے ہیں ۔ چنانچہ (Rojeer Backon) (leounardou Wenchi) اور (Rajeer Brono) خاص طور پہ ابن رشد سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اہل مغرب میں ابن رشد کی تکریم کا یہ حال تھا کہ فرانسیسی بادشاہ لوئی یازدہم اپنی قوم کو حکم دیتا ہے کہ ہر سکول میں ابن رشد کی تعلیمات کو لازمی قرار دیا جائے۔ پڈوا کی یونیورسٹی میں ابن رشد کا فلسفہ سترھویں صدی تک چھایا رہا۔ اٹلی کے شمالی حصوں میں ابن رشد کے افکار مدتوں چھائے رہے۔ وینس کی اشرافیہ سترھویں صدی عیسوی تک خود کو ابن رشد کی پیروی میں مجبور پاتی ہے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ ابن رشد نے فلسفہ میں جو نام کمایا وہ کم ہی لوگوں کے حصے میں آیا۔

✡✡✡✡✡✡

ابن عربی بھی عالم اسلام کے بہت بڑے صوفی فلاسفر تھے ۔ انھوں نے دوسو سے زائد کتابیں لکھیں۔ ابن عربی نے نظریہ وحدت الوجود متعارف کرایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا ایک ظاہر ہے جو نظر آ رہا ہے اور ایک باطن ہے جس کا نام اللہ ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ابوبکر رازی (م935ء) بھی عظیم فلاسفر تھے۔ وہ حکیم اور طبیعات دان بھی تھے۔ اُنھوں نے بہت سی

کتابیں لکھیں۔فلسفہ پراُن کی کتابوں کی تعداد 44 ہے جبکہ اُن کی کل کتابوں کی تعداد دوسو سے زائد ہے۔ابوبکر رازی کی بیشتر کتابوں کے مغربی زبانوں میں تراجم کیے گئے۔

✡✡✡✡✡✡

مسلم اسپین نے بھی دنیا کو بہت سے فلاسفر تھے۔اِن فلاسفر نے انسانی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے بحث کی۔ابن باجہ(1185ء) کو پہلا اسپینی مسلم فلاسفر قرار دیا جاتا ہے۔ابن باجہ نے فلسفے پر22 کتابیں لکھیں۔ ابن باجہ کی کئی کتابوں کے لاطینی اور عبرانی تراجم اب تک دستیاب ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ابن الطفیل(1186ء) بھی مسلم اسپین کے فلاسفہ میں شامل ہیں۔فلسفے پر ابن طفیل کی شاہکار کتاب "**حئی بن یقظان**" ہردور میں مقبول رہی۔اس کتاب کے کئی زبانوں میں ترجمے کیے گئے خاص طور پہ انگریزی اور فرانسیسی تراجم تو مدتوں دستیاب رہے۔ابن الطفیل نے کائنات کا قدرے مختلف تصور پیش کیا ہے۔ابن الطفیل کے فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز دوسروں کے لیے ہے۔درخت اپنا پھل خودنہیں کھاتا،دریا اپنا پانی خودنہیں پیتے،یہ بہاریں،یہ برساتیں،یہ نغمے،یہ زمزمے سب دوسروں کے لیے ہیں پس وہی نظام زندگی کائنات سے مطابقت اختیار کرسکتا ہے جودوسروں کے لیے ہو۔

✡✡✡✡✡✡

امام ابن تیمیہ(1263-1228ء)ایک عظیم فلسفی تھے۔انھوں نے پانچ سو کے قریب کتابیں لکھیں ۔بیان کیا گیا ہے کہ یونانی فلسفہ پر پہلی ضرب امام غزالی نے لگائی اور آخری ضرب ابن تیمیہ نے لگائی۔امام تیمیہ کی بہت سی کتابیں اب تک موجود ہیں اوراردوزبان میں اُن کے ترجمے ہو چکے ہیں

۔امام ابن تیمیہ نے بھی تصوف کی راہ اپنائی اور بہت سے علمی انکشافات کیے۔اُن کا موضوع مادیت اور روحانیت رہا۔انھوں نے فلسفہ تصوف کی ترویج کی۔

✡✡✡✡✡✡

عمر خیام بھی مسلم فلاسفر تھے، عام طور پہ اُن کی شہرت ایک ریاضی دان کی حیثیت سے ہے۔تاہم انھوں نے فلسفے کے موضوع پر بھی کئی کتابیں لکھیں۔انھوں نے دو سوالوں کے جواب دیئے۔جن میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کو کیوں بنایا گیا اور انسان کو عبادت کرنے کا حکم کیوں دیا گیا۔

✡✡✡✡✡✡

مسلمان فلاسفہ کی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو دو باتیں خاص طور پہ اُن کے علم کلام میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں۔اول یہ کہ وہ یونانی فلاسفہ کے افکار سے بالکل بھی متاثر نہ تھے اور انھوں نے یونانی فلسفہ کی ترویج کے بجائے فلسفے کے نئے اور اچھوتے پہلوؤں کو اپنی بحث کا موضوع بنایا۔یونانی فلاسفہ عام طور پہ حیات و کائنات میں فرق کرتے دکھائی دیتے ہیں۔جبکہ مسلمان فلاسفہ نے حیات کی روحانی رونق کو اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔مسلمان فلاسفہ نے انسان کو زندگی میں خواہش کرنے سے روکا اور انھیں خواہش سے فاصلہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔انھوں نے روحانیت کو مادیت پر ترجیح دی اور روحانی اطمینان ہی کو حاصل زیست قرار دیا۔مسلمان فلاسفہ کے تمام تصورات کو درست قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ اُن کے ہاں تصوف کا جو تصور پایا جاتا ہے وہ اسلام کے بنیادی نظریات و عقائد سے بعید بلکہ بعض اوقات متضاد ہوتا ہے۔ (49*)

✡✡✡

ادب

مسلمانوں نے جب مغربی علاقے فتح کیے اور اہل یورپ پہ یلغار کی تو وہاں کی بیشتر آبادیاں کلیسا کے جبر تلے سسک رہی تھیں۔ علم ہر پہلو سے زوال پذیر تھا۔ تاہم جب مسلمانوں کا اقتدار مغرب میں مستحکم ہو گیا تو مسلمانوں اور مقامی باشندوں کے باہم میل جول سے نئے فکر و فلسفہ نے جنم لیا۔ چنانچہ اب اس امر میں کوئی شک نہیں کہ عربی ادب و زبان نے اہل مغرب پہ گہرے نقش چھوڑے۔ ازمنہ وسطیٰ کے یورپی ادب چاہے وہ نثر ہو یا نظم پہ مسلم اسلوبِ بیان اور عربی لغت کا گہرا اثر پایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک اسپین کا کسان کھیتی باڑی کے لیے جو الفاظ استعمال کرتا ہے اُن کی اکثریت عربی زبان سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح اُن کے ہاں بہت سے پھولوں، پھلوں، پودوں اور ترکاریوں کے نام عربی ہیں اور اُن میں ہزار سال سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ بیشتر ہسپانیوں کی زبان پہ ایک لفظ ابھی تک موجود ہے جس کے معنی سے وہ واقف نہیں تاہم وہ اسے بول جاتے ہیں اور وہ لفظ ہے انشاء اللہ مسلمانوں سے طویل تامل کی وجہ سے اہل مغرب کی زبان و ادب مسلمانوں کے اسلوب سے متاثر ہوتے رہے اس لیے کہ عربی زبان و ادب اپنی گونا گوں خوبیوں کی وجہ سے بے حد دلفریب اور پر کشش ہے۔ چنانچہ جب اہل عرب کی علمی اور فلسفیانہ کتابوں کا مغرب میں رواج ہوا تو اُس کے ساتھ ہی عربی ادبیات کے دوسرے شعبوں میں بھی لوگوں کی دلچسپی بڑھنے

لگی۔لوگوں میں خصوصاً اخلاقی تمثیلوں اور قصے کہانیوں کا شوق بڑھ گیا جو عربی ادبِ لطیف کا جزو غالب تھیں۔چنانچہ آج بھی فرانس کے پرانے رومانی قصوں میں عربی اسلوبِ بیان کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔مسلمانوں کا اہل مغرب کی زمینوں ہی پہ قبضہ نہ تھا بلکہ اُن کے عمدہ اخلاق و ادب نے مغرب کو ذہنی طور پہ بھی جھکا رکھا تھا اور مغرب اُسی طرف چل نکلتا جس طرف انھیں مسلمان جاتے دکھائی دیتے۔یہی وجہ ہے کہ مغرب عربی اسلوبِ ادب سے کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکا۔الف لیلیٰ کی افسانوی داستان کامل آٹھ نو صدیوں تک اہل مغرب کے ہاں شائع ہوتی رہی۔ الف لیلیٰ کو ہر مغربی زبان میں شائع کیا گیا اور اتنی بار شائع کیا گیا کہ اُن کی آنے والی نسلیں بھی اُن کرداروں سے آگاہ رہیں جو صدیوں سے اُن کے تعاقب میں تھے۔موجودہ صدی میں سب سے زیادہ شہرت کی حامل سیریز (Harry Poter) کیا ہے الف لیلیٰ کی ایک بھونڈی نقل۔قدیم عہد گزرنے اور مسلمانوں سے آزادی حاصل کرلینے کے باجود عمر خیام کا نام انگلستان اور فرانس میں آج بھی ایران سے زیادہ جانا جاتا ہے تو اُس کی وجہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ اہل مغرب بہت گہرائی تک مسلمانوں کے اسلوبِ ادب سے متاثر ہوئے۔

جب مسلمانوں نے نقاشی اور خطاطی میں معرکے کے اسلوب وضع کیے تب بھی مغرب اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔چنانچہ تب وہ یہ نہ دیکھتے کہ کیا لکھا ہے بلکہ یہ دیکھتے کہ کس قدر خوبصورتی سے لکھا گیا ہے۔چنانچہ کسی مغربی ریاست نے اپنے سکے پہ کلمہ طیبہ نقش کرالیا اور وہ نہ جانتے تھے کہ انھوں نے اپنے سکے پہ کیا لکھا ہے۔ادبیات میں وہ مسلم فکر و فلسفہ سے خوب متاثر ہوئے۔عمر خیام کی رباعیات کا پہلا انگریزی ترجمہ (1859ء) میں لندن سے شائع کیا گیا۔عمر خیام نے اپنی اس کتاب میں 75 رباعیات شامل کیں۔جلد ہی عمر خیام کی کتابوں کے دیگر یورپی زبانوں میں بھی ترجمے ہونے لگے۔جس کی وجہ سے عمر خیام اہل مغرب میں اس قدر مقبول ہوگئے کہ اُن کے پرستاروں نے لندن میں عمر خیام کلب قائم کرلیا۔بعد میں امریکہ میں بھی اسی طرح کے کلب قائم ہوئے۔ازمنہ وسطیٰ میں فردوسی سے بڑا کوئی شاعر نہ تھا۔بیان کیا گیا کہ اب تک اہل یورپ نے

دنیائے اسلام کی مہیب عسکری قوت کے سامنے تو مجبوراً سر جھکایا تھا مگر جلد ہی اُن کو اس احساس نے گھیر لیا کہ مسلمان ذہنی اور ادبی اعتبار سے بھی اُن سے فائق ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد علوم عربیہ کا جو سیلاب آیا اس میں عربی ادبیات چاہے وہ نثر ہوں چاہے نظم کا بہت بڑا ذخیرہ شامل تھا جو کم و بیش یورپ کی تمام ادبی اصناف میں نفوذ کر گیا اور اس نے مغربی نشاۃ ثانیہ کی ذہنی تحریک کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ لیکن ازمنہ وسطیٰ کے ادبیات میں مسلمانوں نے جو اہم ترین اضافہ کیا وہ نثر اور نظم دونوں میں عربی تہذیب و ثقافت کا اثر تھا یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے علم کائنات کا گہرا اثر مغربی فکر و فلسفہ پہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دیکھیں کہ دانتے کے فکر و فلسفہ میں رسول اللہ ﷺ کے سفر معراج کا عکس محسوس کیا جاتا ہے تو دیگر اہل مغرب کے فلسفہ میں پہلی بار مسلم صوفیہ کے تصور تعشق کا رنگ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دانتے اور دیگر اطالوی شعرا کے ہاں تصوف کے تخیلانہ مظاہر حاوی نظر آتے ہیں۔

مغربی مورخ تسلیم کرتا ہے کہ زمانہ وسطیٰ کی روحانی تحریک خالص عربی پس منظر رکھتی تھی کیونکہ جرمن نے ایرانی شاعری کا نہایت گہرا اثر قبول کیا تھا اور جرمن ادب ایرانی اسلوب سے متاثر ہو رہا تھا مشہور جرمن سیاح (Olearius) نے سعدی کی گلستان و بوستان کا ترجمہ کر لیا تھا جس سے جرمن خوب استفادہ کر رہے تھے اور نرم و لطیف ایرانی ادب سے حظ حاصل کر رہے تھے۔ اگر چہ اس سے قبل وہ کھردرے رشین ادب سے ہی واقف تھے۔ گلستان و بوستان نے اس زمانہ کے جرمن ادب کو تازگی اور مفید تحریک مہیا کر دی اس کے بعد جرمن ادب پر ایرانی ادبیات کا اثر مسلسل جاری رہا۔

چنانچہ وسطی زمانہ میں عربی سفرناموں اور احوال حال کی دیگر کتابوں نے مغربی ادب پہ کافی اثر ڈالا اور عربی ادب کی اخلاقی حکایات نے مغربی اسلوب ادب کو متاثر کرنا شروع کیا۔ عربی ادب کا یہ اثر نہایت گہرا تھا اور رفتہ رفتہ پورے یورپ میں پھیلتا چلا گیا یہاں تک کہ اس زمانے کی طبع زاد تصانیف کتاب سندباد ملفوظات فلاسفہ اور کلیلہ دمنہ کے اثر سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکیں کہ یہی عربی

ادب تو اِن تصانیف کا بنیادی محرک ثابت ہوا تھا۔اس کے بعد عربی تہذیب وثقافت کا ایک تسلسل تھا جو مغربی ادب کا حصہ بن گیا۔چنانچہ آج کا مغربی مورخ جیسے کہ(Jaorge Sarton)(Robert Briffault)اور(Phlip.K. Hitti) وغیرہ اس بات کا اعتراف کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے کہ اگر''الف لیلیٰ'' نہ ہوتی تو نہ''رابنسن کروسو''لکھی جاتی اور نہ ہی شاید''گلیورز ٹریولز'' کا کوئی وجود ہوتا۔

مورخین نے عربی ادبِ لطیف کے ایک اور شعبے سے بھی بحث کی ہے جس کو مقامات کہا جاتا ہے۔ازمنہ وسطیٰ کا مغربی ادب اس سے شدید طور پر متاثر تھا یہ عربی اسلوبِ تحریر کا ایک پرتکلف شعبہ ہے۔اگر ہم یورپی ادبیات کی پوری وسعت پہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلم مشرق کے ادبیات کا اثر پہلے صرف ایک تنگ اور غیر تخلیقی رقبے تک محدود تھا۔لیکن جب اس امر کا احساس ہوا کہ مشرق نے ادبی روحیت میں ایک قسم کے خمیر کا کام کیا ہے تو اس کی اہمیت نہایت وسیع ہو جاتی ہے۔

ادب کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے فنون لطیفہ کے ہر شعبے میں اپنے تفوق کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے خوش نویسی اور خطاطی کو بام عروج تک پہنچا دیا۔اہل مغرب اِن دلکش نقوش کو دیکھتے اور ششدر رہ جاتے۔مسلمانوں نے خاص قرآن حکیم کی محبت میں فن خطاطی کو وہ رفعت عطا کی کہ معاصر اقوام جس کا تصور بھی نہ کرسکتی تھیں۔عربی زبان میں مختلف خطوط کی بہت گنجائش تھی جس کا مسلمان خوش نویسوں نے خوب فائدہ اٹھایا اور فن خطاطی کو وہ دلکش زاویے عطا کیے جنھوں نے نظروں کو اپنی طرف کھینچا اور لوگوں کی دلوں کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کیا۔ چنانچہ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں یہ ممکن ہی نہ تھا کہ کوئی شخص عربی زبان سیکھے بغیر علم کے کسی پہلو میں مہارت حاصل کرلے۔


NO;113
زوال امت کا نوحہ، جب مسلمان نے آسمانی رہنمائی کی
بجائے اپنے نفس کی آواز پہ کان دھرے۔تب وہ جو
کل تک اُن کے محلوں کے باہر پہرہ دیا کرتے تھے
محلوں کے اندر آج گھس آئے کہ وہ جانتے
تھے جس فسوں کی بنا پہ وہ محل کے اندر
تھے اُسے انھوں نے چھوڑ دیا ہے
علم کی راہ بھول بیٹھے ہیں۔
زوال کی منزلیں

زوال امت کا نوحہ

قوموں کا عروج و زوال فطرت کے اُن اٹل قوانین کے تحت ظاہر ہوتا ہے جو ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ انھی ابدی قوانینِ فطرت کی زد میں انسانی تاریخ کی سینکڑوں اقوام آئیں اور بام عروج سے قعر مذلت میں جا گریں۔ مسلمانوں کی عظیم الشان ریاست جو مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی تھی بامِ عروج سے زوال کی منزلوں کو نکلی تو اُس کا محرک بھی وہ ابدی قانونِ فطرت تھا جس کے بعد زوال یقینی ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کا زوال بھی ایک داستان کی طرح ہے جس کا وسیع تسلسل امت کے عظیم ماضی کا گواہ ہے۔ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی چھوڑی ہوئی میراث کو جب تک سینے سے لگائے رکھا تب تک انھوں نے دنیا پہ حکومت کی۔ علوم عالم میں رفعتیں حاصل کیں اور دنیا کے گوشے گوشے کو علم کی روشنی سے منور کیا۔ مسلمانوں کی قوت عمل نے اس وقت کی معلوم دنیا کے نصف سے زیادہ حصے پر اہل ایمان کی حکومت قائم کی اور بقیہ نصف کو اپنے علم و تہذیب کا خوشہ چین بنایا۔ اسلامی تہذیب دنیا کی بہترین تہذیب مانی گئی اور دنیا مدتوں اُس سے فیض یاب ہوتی رہی۔ پھر دورِ انحطاط آیا۔ کسی

ایک متعین بات کو مسلمانوں کے زوال کی وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ تاریخ کا مزاج دھیما ہوتا ہے اور تبدیلی کا عمل سست۔ مسلمانوں نے کم و بیش ایک ہزار سال تک دنیا پر حکومت کی اس لیے اس کو بکھرتے بکھرتے بھی کئی صدیاں لگ گئیں۔ جیسا کہ ہسپانیہ میں دیکھیں تو مسلم اندلس اجڑ چکا مگر اپنے قبضے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عیسائیوں کو دو سو چالیس سال تک انتظار کرنا پڑا کہ غرناطہ کی غیور اسلامی حکومت کسی صورت ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھی۔

مسلمان حکمرانوں نے جب علم کی راہ کو چھوڑا اور حبِ جاہ نے اُن کے دلوں میں راہ پائی تب مسلمان زوال کی طرف چل نکلا۔ یہاں بھی اس بات کو متعین کرنا دشوار ہے کہ کب اور کس حکمران نے پہلے پہل اپنے آباء کی روایات سے انحراف کیا اور امت کو زوال کی راہ پہ ڈال دیا۔ اس لیے کہ عباسی عہد حکومت میں سینکڑوں سال تک سینکڑوں حکمران مسلمانوں پہ حکومت کرتے رہے جن میں نیک بھی تھے، صالح بھی تھے، بد بھی تھے عیاش بھی تھے، عدل و انصاف فراہم کرنے والے بھی تھے اور ظلم و جبر ڈھانے والے بھی تھے۔ شراب پینے والے بھی تھے اور راتوں کو تہجد پڑھنے والے بھی تھے۔ عقل والے صاحب دانش بھی تھے اور بے عقل بھی تھے جو شاطر وزیروں کے ہاتھ کھلونا بنے رہے۔ علم دوست بھی تھے اور جاہل بھی، اُن میں شجاع بھی تھے تو کاہل بھی، وقت کے ساتھ ساتھ چلنے والے بھی تھے اور ناعاقبت اندیش بھی، اُن میں شیر کی طرح باوقار بھی تھے تو لومڑی کی طرح عیار بھی، اُن میں وفادار بھی تھے تو غدار بھی تھے۔

الغرض سلطنت عباسیہ میں ہر طرح کے بادشاہ ہو گزرے۔ تاہم اُن کا دین اسلام تھا اور خلافت اسلامیہ مسلمانوں کا عمومی مرکز و محور بھی تھی۔ اس لیے اگرچہ سلطنت عباسیہ چاہے جتنی بھی کمزور رہی ہو دشمن اُس سے لرزتے ہی رہے۔ سلطنت عباسیہ کے دور میں مسلمانوں کی انگنت خودمختار حکومتیں بھی قائم تھیں مگر سلطان تیمور جیسا غیور اور خودسر حکمران ہو یا افریقہ کے نیم وحشی مرابطین ہوں بہرحال وہ خلیفہ سے سند حکومت حاصل کرنا اپنے لیے اعزاز تصور کرتے تھے۔ اس لیے خلافت عباسیہ کے حکمرانوں کی ذاتی نااہلیوں کے باوجود کئی صدیوں تک بغداد کا رعب و دبدبہ دنیا پہ قائم

رہا۔سلطنت عباسیہ کے زوال میں اگرچہ ریاست کے اندرونی حالات کو بھی دخل تھا تاہم سب سے بڑی وجہ تاتاریوں کی وہ یلغار تھی جو انسان نما نیم وحشی لوگ تھے۔تہذیب وتمدن سے جن کو کوئی علاقہ نہ تھا اس لیے انھوں نے نہ صرف بغداد کو فتح کیا بلکہ علم کے تمام نشان بھی مٹا کر رکھ دیئے۔اس کے باوجود اسلامی خلافت کا خاتمہ نہ ہوسکا صرف اتنا ہوا کہ عباسی خلافت کی جگہ فاطمی خلافت نے لے لی مگر جلد ہی ترک سلطانوں نے اسلامی خلافت کا احیاء کیا اور عثمانی خلافت کے تحت مسلمان ایک بار پھر دنیا پہ چھا گئے تاہم مرکزی خلافت میں اب وہ بات نہ تھی جو پہلے کبھی تھی اس لیے کہ عیسائی اقوام نے مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ کھول لیا تھا جنھیں ہم صلیبی جنگوں کے نام سے جانتے ہیں۔ مگر صلیبی جنگوں میں دشمن کی بدترین شکست کے باوجود اسلامی خلافت کا وہ وقار بحال نہ ہوسکا جو دو صدیاں قبل تھا۔

عثمانی خلافت نے مسلمانوں کو مرکزیت کی کمزور ہی سہی ایک ڈور سے ضرور باندھے رکھا حتیٰ کہ 1919ء میں خود ترکوں نے ہی عثمانی خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔کچھ صدیاں قبل جب مسلمان اقتدار کی خاطر اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹنے لگے اور ایک بھائی اپنی ریاست کے استحکام کے لیے عیسائیوں سے مدد حاصل کرتا تو اُس کا دوسرا بھائی اپنے مقبوضہ جات کی حفاظت کے لیے کسی دوسرے عیسائی کا دروازے پہ دستک دیتا تو ریاست کے سیاسی وقار کا اندازہ لگانا کچھ دشوار نہ رہا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان جو کل تک علم کے میدان میں جستجو کے نئے اُفق دریافت کر رہا تھا کائنات کی ماہیت پہ غور کر رہا تھا وہ رُک گیا،علم جامد ہوگیا،علماء مخمصے میں پڑ گئے اور علمی روایت کمزور پڑنے لگی۔مذہب پرست علماء نے یہ غضب کیا کہ اپنے پیش رووں کے تفکر کو حرف آخر قرار دے دیا اور علم کے میدانوں میں مزید غور وفکر کو بدعت اور گمراہی قرار دے دیا۔یہ عمل بالکل ویسا ہی تھا جیسے چند صدیاں قبل کلیسا نے اہل یورپ کو ہر قسم کے علمی تغیر سے جبراً روک رکھا تھا۔یہی اخلاقی پستی اہل مغرب کو لے ڈوبی تھی اور وہ صدیوں زوال کی راہوں میں منزل کی تلاش میں سرگرداں رہے اور اب اسی اخلاقی پستی نے مسلمانوں کو گھیر رکھا تھا اور مسلمانوں کی عظیم الشان سیاسی ریاست دنیا کے نقشے

سے رفتہ رفتہ غائب ہونے لگی تھی۔ اسلامی ممالک ایک ایک کر کے نکبت و پستی کا شکار ہونے لگے اور چند صدیوں کے الٹ پھیر میں ہی اکناف عالم میں اقتدار کا ڈنکا بجانے والی مسلم قوم کی نسلیں تو باقی رہ گئیں لیکن اقتدار اور سر بلندی علم و حکمت کے پیچھے پیچھے رخصت ہو گئے۔ آج ہم سروں کو گنتے ہیں تو دنیا کی آبادی میں ایک ثلث سے کچھ کم ہیں اور بہت سے معدنی اثاثہ جات کی ملکیت کے باوجود مسلمان ہی آج دنیا کی سب سے کمزور قوم ہے۔

جب مسلمانوں نے کائنات میں غور و فکر کی عادت ترک کی اور جاہل مذہبی مُلّا نے مزید غور و فکر پر بدعت اور گمراہی کی مہر لگا دی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں نہ صرف دنیاوی علوم کا سرچشمہ خشک ہو گیا بلکہ دینی علوم میں بھی اُس جمود نے جنم لیا جس میں امت آج تک مبتلا چلی آ رہی ہے۔ اس لیے کہ زمانی اور مکانی تقاضوں کے تحت مسلمان علماء نے دین کی جو تشریح کی اگر چہ اُس کو بہترین قرار دیا جا سکتا ہے مگر مسلمانوں نے اُس تشریح و تعبیر کو غیر متبدل قرار دے دیا بلکہ اسی شریعت کو دین قرار دے لیا اور اس سے انحراف کرنے والوں کو کافر کہا گیا۔ اِس عمل کا فوری نتیجہ تو جمود محض تھا مگر اس کا دیرپا اثر نہایت تباہ کن تھا۔ دنیا کی دوسری قومیں جنھوں نے مسلمانوں ہی سے دنیاوی علوم سیکھے تھے وہ اپنے دائرہ عمل میں خود کو آزاد محسوس کرتی تھیں اس لیے انھوں نے مسلمانوں ہی کے وضع کردہ علوم میں تفکر و تدبر کی مشق سے بے پناہ اضافہ کیا بلکہ اگلے مرحلے میں انھوں نے اپنی علمی سیادت کا اعلان بھی کر دیا اور مسلمان ممالک لکیر پیٹتے رہے۔

مسلمانوں میں شوق و تجسس مفقود ہوا اور دنیوی علوم میں پسماندگی سے علماء میں احساس کمتری پیدا ہوا۔ جس سے ایک نئے اور عجیب ردعمل نے جنم لیا جس کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان احساس کمتری کا شکار ہوا اور مسلمان علماء نے مسلمانوں کو قناعت اور دنیا سے بے رغبتی کی دعوت دے دی جو اسلام کے مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کی ایک چوتھائی آیات انسان کو تسخیر کائنات کی طرف بلا رہی ہیں تو انسان دنیا سے بے اعتنائی کس طرح برت سکتا ہے۔ چنانچہ اس قناعت اور دنیا سے بے رغبتی نے دین اسلام میں کئی اُن امور کو جنم دیا جو نہ صرف اسلام

کے لیے نئے تھے بلکہ اسلام کی ضد تھے۔ مسلمان علماء نے دنیا کو مردار قرار دے دیا اور دنیا کی خواہش کرنے والے کو کتا کہا جانے لگا۔ انھوں نے لوگوں کو کم خوری کی طرف بلایا اور ستر پوشی سے زیادہ اکتساب دنیا کو مکروہ قرار دے دیا وہ وسیع تر انسانی مسائل سے نبرد آزما ہونے کے بجائے کسی ویران کونے میں بیٹھ کر دعا کرنے کو ترجیح دینے لگے اور یہیں سے اسلام میں خانقاہی نظام زیست در آیا ۔خانقاہی نظام زیست نے توکل کا قدیمی تصور بدل دیا اور مسلمانوں سے کہا کہ رموزِ کائنات پہ تدبر کرنے سے شیطانی وسواس جنم لیتے ہیں اس سے دور رہنا چاہیے۔ اسلامی دنیا میں پستی کا چلن تھا حکومت واقتدار جانے سے مسلمانوں کی معاشی حالت بھی گر گئی تھی جس کے نتیجے میں اُس کے تخیل زیست میں بھی فرق آیا اور مسلمانوں میں طبقاتی نظام بھی در آیا۔

اسلامی عقائد میں یہ بگاڑ مسلمانوں کی غربت اور بے کسی کے حسب حال تھا۔ اس لیے کہ قوم کا غریب طبقہ ایسی تعلیم کی اشاعت کرنے والے علماء کے زیر اثر رہا جو علم کی حقیقت سے دور اور تخیل دین سے ناآشنا تھا۔ یہ اُس مولوی کا مکتب تھا جس نے خود کسی ادارے سے تعلیم حاصل نہ کی تھی اُس کا مبلغ علم قرآن کا پڑھنا تھا اور اُسے بھی درست پڑھنا اُس کے بس کی بات نہ تھی اس لیے کہ وہ عربی زبان سے واقف نہ تھا۔ فقہ میں اُس کا علم گاؤں والوں سے زیادہ تھا اگرچہ وہ خود بھی فقہ کے لفظ سے آگاہ نہ تھا۔

چنانچہ اُن کے شاگرد اُس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جن کے پاس علم حاصل کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ تھا اس لیے دنیاوی علوم اور فنون میں مہارت حاصل کرنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ دوسری طرف قوم کے متوسط اور فارغ البال طبقات تھے جنھیں عصر حاضر کے دنیوی علوم تک دسترس تھی مگر وہ علماء کے علمی تنزل سے آگاہ تھے اس لیے وہ اپنے بچوں کی دینی تربیت کی طرف متوجہ نہ ہوئے بلکہ اُن کی خواہش صرف اس قدر تھی کہ اُن کے بچے معروف عصری علوم میں مہارت حاصل کر لیں اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ مگر جب یہ نسل جوان ہوئی تو اگرچہ وہ تعلیم یافتہ اور تہذیب یافتہ تھے مگر وہ اپنی بنیاد کھو چکے تھے اور اُن کے ذہنوں میں یہ خیال راسخ ہو چکا تھا کہ مغربی علوم جدیدہ اور مغربی

نظریاتِ حیات اسلامی نظام حیات سے زیادہ معتبر، زیادہ محقق اور زیادہ مفید ہیں۔ میراث المزمل ﷺ کی ساری جلد دراصل اسی جاہلی تخیل کے رد میں لکھی جا رہی ہے۔ آج کے مسلم نوجوان کو علوم جدیدہ کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے اہل مغرب کی جس علمی رفعت کا احساس گھیر لیتا ہے اور جس کے نتیجے میں وہ اُن کی علمی برتری کا قائل ہو جاتا ہے۔ دراصل اس احساس کے پس منظر میں اُس کی لاعلمی کو دخل ہے اس لیے کہ وہ نہیں جانتا کہ ابھی کل تک یہی اہل مغرب تاریکی کے اُن گھٹا ٹوپ اندھیروں میں تھے اور جہالت کی اُن بسیط پستیوں میں تھے جس کا اعتراف کرتے ہوئے آج انھیں شرم آتی ہے تب مسلمان عروج کی اُن منزلوں میں تھے جن کا تذکرہ پیچھے گذر چکا ہے کہ اُن ایام میں بغداد، دمشق، قاہرہ، اشبیلیہ، غرناطہ ہی علم کے وہ روشن مینار تھے جن سے آتی روشنی کو مغرب للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا مگر اُسے حاصل کرنے سے گریزاں تھا کہ یہ اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ اور جب مسلمان آپس میں لڑلڑ کر کمزور ہو گئے اور عیسائیوں کو مسلمانوں پہ غلبہ حاصل ہو گیا کہ تو علم کی یہ میراث انھیں بغیر کسی تردد کے ہاتھ لگ گئی جس کے پیچھے مسلمانوں کی کئی صدیوں کی تحقیق تھی۔ انھی علوم کو اپنے نام سے شائع کرانے کے بعد مغرب نے خود کو مہذب اور باقی دنیا کو غیر مہذب کہنا شروع کر دیا۔

تاہم مغرب کی تہذیب میں مثبت اطوار کی کمی کی وجہ سے اُن کی تہذیبی اور سماجی برتری دنیا کے لیے کبھی پسندیدہ مقام حاصل نہ کر سکی، مادی میدان میں اُن کی کامیابی حیرت انگیز تھی اس لیے دنیا ایک مدت سے اُن کی پیروی پہ مجبور چلی آتی ہے۔ مغرب نے ایسا نظام زیست وضع کیا جو مذہب بیزار اور اخلاقی قدروں سے آزاد تھا اس لیے اُن کے پاس اپنے بنیادی مسائل کے حل کے لیے بہت سا وقت اور بہت سی توانائی تھی اُن کی مقابل دنیا کی واحد قوم مسلمان غفلت کی گہری نیند سو رہی تھی اس لیے مغرب نے کافی ترقی کی۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں مغرب بیداری کے عمل سے گزر رہا تھا تو مسلمان گہری نیند میں اترنے سے قبل اونگھ رہا تھا۔ چنانچہ اس پیش منظر نے مسلمان نوجوان کے سامنے تصویر کا صرف ایک رخ پیش کیا میں جس میں مغربی معاشروں کی چمک دمک تھی

مادی رفعتوں کی یلغار تھی، اور زمام کار پہ اُن کی مستحکم دسترس تھی جس نے مسلم نوجوان کو اُس احساس کمتری میں دھکیل دیا جس کا کوئی جواز نہ تھا اس لیے کہ تصویر کے دوسرے رخ کو دیکھنے سے یہ احساس زندہ ہو جاتا ہے کہ مغرب جس محل میں آسودگی اور آسائش کے پل گزار رہا ہے وہ محل تو چوری کا ہے اور مسلمانوں نے ہی اُس کو تعمیر کیا تھا۔ اس امر سے آگاہی مسلمان نوجوان کو اُس احساس تفاخر کی طرف لے جاتا ہے جس کے بعد وہ مغرب کو خدا ماننا چھوڑ دیتا ہے اور انھیں دنیا کی ایک عام قوم تصور کرتا ہے۔ بلکہ اگر وہ ذرا سی گہرائی میں اتر کے دیکھتا ہے تو اُسے مغرب کی اُس اخلاقی کجی سے بھی آگاہی حاصل ہو جاتی ہے جو مغرب کی اصل میراث ہے۔ مسلمانوں کے زوال کے حقیقی اسباب کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ہزار سالہ اقتدار کے دوران ہونے والی سیاسی وسماجی تغیر کو نگاہ میں رکھا جائے۔ آیئے ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔(50*)

تاریخ کے بعض اصول بہت پختہ ہیں جن کی بنا پر غالب قومیں زوال پذیر اور پستی میں گری ہوئی قومیں بامِ عروج کو چھو لیتی ہیں۔ اسی اصول کے تحت مسلمانوں کی عظیم الشان ریاست کو کمزوریوں کا دیمک اندر ہی اندر چاٹتا رہا اور دشمن اس طاق میں رہا کہ وہ دروازہ جس کو دیمک کھا رہی ہے گرے تو وہ اس سے اندر داخل ہو جائیں اور مسلمانوں کو عظمت و رفعت کے اُس منصب سے ہٹا دیں جس پر وہ گذشتہ ہزار سال سے قائم چلے آ رہے تھے وہ تو شاید اس مقصد میں کامیاب نہ ہوتے مگر مسلمانوں کے اندرونی افتراق نے انھیں یہ موقعہ فراہم کر دیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔

مسلمانوں کی سیاسی بساط

مسلمانوں کے سفرِ تنزل پہ نگاہ عمیق ڈالی جائے تو یہ امر متحقق ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال میں حب جاہ کی خواہش نے بنیادی کردار ادا کیا۔ مسلمان اپنے مستحکم سیاسی برتری کی صحیح تعظیم نہ کر سکے اور آخر میں محلاتی سازشوں نے مسلمانوں کو وہ وقت بد بھی دکھایا کہ بغداد کی خلافت عباسیہ بغداد تک ہی محدود ہو کے رہ گئی تھی۔ مسلمانوں نے دورِ استحکام میں جو علمی میراث وضع کی اُسے غیروں نے بانٹ لیا اور کل کے جاہل آج بیگانا سوٹ پہن کے خود کو مہذب کہنے لگے۔ اہل مغرب نے اپنی سیاسی اور سماجی تعمیر کو مذہب سے دوری کا ثمر قرار دیا اور دنیا میں سیکولر نظریہ زیست کی بنیاد رکھی مغرب کے سیاسی نظام میں استحصال دھوکا اور بد عہدی کے عنصر غالب رہے۔ کسی موقع پر اُن کی تفصیل تحریر کی جائے گی۔ یہاں مسلمانوں کے سیاسی نظم سے بحث کرنا مقصود ہے تا کہ مسلمانوں کے سیاسی نظام کے تنزل کے حقیقی اسباب کو سمجھا جا سکے۔ مسلمانوں کے سیاسی نظام کی ابتداء تو رسول اللہ ﷺ کے وقت ہو گئی تھی۔ تاہم رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں میں خلافت کے مسئلے پہ اختلاف

سامنے آیا۔رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کا مسئلہ جس کا اصطلاحی نام خلافت وامامت ہے مسلمانوں میں سیاسی تغیر کا باعث ہوا۔مسلمانوں میں سب سے عظیم الشان ریاست خاندان بنی عباس نے قائم کی۔ اسی کو خلافت عباسیہ بھی کہا جاتا ہے۔مسلمانوں کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں بڑی بڑی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں، کئی خاندانوں کے چشم و چراغ تخت نشین ہوئے، صدیاں بیت گئیں مسلمان حکومت و اقتدار کے ساتھ ساتھ علم وحکمت کی سب سے ارفع مسند پہ رونق افروز تھے۔دنیا کی کوئی قوم اُن کی ہم سر نہ تھی مسلمانوں کی عسکری وسیاسی رفعت وہ طلسمی خواب تھا، اہل مغرب نے جس کی کبھی خواہش بھی نہ کی تھی۔

پہلی صدی ہجری میں بنو امیہ مسلمانوں کے حاکم تھے۔بنی امیہ جس اسلامی سلطنت پہ حکمران تھے وہ بہت وسیع تھی۔عباسی دور حکومت میں دیگر اسلامی مملکتیں بھی خلافت کا دم بھرتی تھیں اور مرکزی خلافت سے سند حکومت حاصل کرتی تھیں۔ماتحت حکومتوں کی حیثیت سے عباسی خلافت کے آخری دور تک یہ حکومتیں مرکزی خلافت کے تحت ہی اپنے اپنے علاقوں پہ حکمران تھیں۔یہ حکمران خلافت عباسیہ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور عباسی خلفاء کے نام کا خطبہ پڑھتے تھے۔وہ اُسی علَم کے تحت اپنے علاقوں میں حکومت کرتے تھے جو انھیں بغداد کے عباسی خلیفہ کی طرف سے عطا کیا جاتا تھا۔ عباسی خلفاء میں بہت سے حکمران ایسے تھے جنھیں علم سے محبت تھی۔

اسلامی تاریخ میں علوم وفنون کی تدوین کا آغاز انھی عباسی خلفاء کے عہد میں شروع ہوا اور اسی عہد میں اوج کمال کو پہنچا۔اگرچہ حدیث وسیرت ومغازی اور تاریخ وطب پہ دو چار کتابیں بنی امیہ کے دور میں بھی تالیف وترجمہ ہوئیں مگر اُن کو اُس عظیم تر علمی سلسلہ کی کڑی قرار نہیں دیا جاسکتا جس نے عباسی دورِ حکومت میں دنیا کو بدل کے رکھ دیا تھا۔عباسی عہد خلافت میں علمی رفعتوں کا تذکرہ گذشتہ ابواب میں گزر چکا ہے۔چنانچہ مورخین نے بجا طور پہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کی ساری دماغی ترقیاں، علمی کارنامے اور اکابر علماء اور علم وفن کے بہترین ذخائر عباسی عہد کی یادگار ہیں۔عباسی خلفاء کا پایہ تخت بغداد تھا جو مدینۃ العلم کے نام سے معروف تھا کہ یہاں ہر فن کے صاحب کمال موجود تھے جس سے

ساری دنیا کے تشنگان علم سیراب ہو رہے تھے۔ تمدنی نقش آرائیاں البتہ اموی عہد سے شروع ہو چکی تھیں لیکن اُن کی تکمیل بھی عباسی عہد حکومت میں ہی ہوئی۔ مختلف قوموں کے میل جول، خصوصاً عجمیوں کے اثر نے تہذیب و معاشرت میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ عباسی خلفاء کی تمدن نوازی نے ایرانی، کلدانی، مصری، رومی، یونانی اور ہندی تہذیب و تمدن کے گونا گوں رنگوں سے سادہ عرب تمدن میں وہ بوقلموں نقش آرائیاں کیں کہ عباسی عہد خلافت کا تمدن دنیا کے لیے حیرت کدہ بن کے رہ گیا۔ جو کچھ بغداد نے قبول کیا اُسے ہی مشرق میں اسلامی تمدن قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ کشمیر و کاشغر سے لے کر قاہرہ سے غرناطہ تک بغداد کے تمدن ہی کو دینی تمدن قرار دے دیا گیا اور مشرق کے جس حصہ میں بھی مسلمانوں کی کوئی نئی حکومت قائم ہوئی یا نئی طاقت برسرِ عروج آئی عباسی تمدن ہی اس کا مایہ خمیر قرار پایا۔ چنانچہ مسلمانوں کے تمدن، علوم و فنون اور حکمت و سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ بنو عباس کے عہد حکومت سے بحث کی جائے۔

تاریخ اسلام سے آشنا لوگوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہی جانشینی کے مسئلہ نے مسلمانوں میں اختلاف کا بیج بو دیا تھا۔ تاہم چونکہ اُس وقت رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی جو دین سے نہ صرف مخلص تھے بلکہ حب جاہ سے بھی کوسوں دور تھے اس لیے انھوں نے حالات کو سنبھال لیا اور مسلمانوں کو متفرق نہ ہونے دیا۔ اسی طرح پہلی دو خلافتیں گزر گئیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت کے آخری زمانے تک رسول اللہ ﷺ کے اُن صحابہ کی ایک بڑی تعداد دنیا سے رخصت ہو چکی تھی جنھوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے اکتسابِ فیض حاصل کیا تھا اس لیے رفتہ رفتہ ملک میں شورش نے جنم لیا۔ انھی صحابہ کی اولادیں تھیں جنھوں نے اول اول حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پہ اقربا پروری کے الزام لگانے شروع کیے۔ اُن میں جوش زیادہ اور اخلاص قدرے کم تھا، خصوصاً خاندان قریش کے نوجوان زیادہ متحرک تھے اور وسیع ترین اسلامی ریاست کو اپنی ملکیت تصور کرتے تھے۔ اگرچہ اس عظیم تر اسلامی ریاست کے قیام میں قریش کے ساتھ عرب کے دیگر تمام قبائل بھی شامل رہے تھے۔ چنانچہ قریش کے نوجوانوں کے عزائم

نے عدل پسند اہل عرب کو مایوس کیا اور ردعمل کی ایک لہر جنم لینے لگی۔ دوسری طرف مفتوحین تھے جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ مسلمانوں کا مرکز کمزور ہو اور وہ مسلمانوں کی حکومت سے نجات حاصل کریں۔ یاد رہے کہ وہ اسلام سے نجات حاصل کرنے کے متمنی نہ تھے بلکہ صرف عربوں سے خائف تھے۔

دیکھیں کہ مصر وشام کے علاقے اسلامی تسلط سے پہلے رومیوں کی نوآبادیاں تھے۔ اس لیے مصر وشام کو روم کی حکومت کے مٹ جانے کا کوئی خاص افسوس نہ تھا۔ مگر ساتھ ہی ایرانی بھی تو تھے جہاں اُن کی قومی حکومت تھی اور چاہے وہ جیسی بھی تھی بہرحال اُن کی اپنی حکومت تھی جس کے چھن جانے کا دکھ اُن کے دل میں ابھی تک موجود تھا۔ وہ مسلمانوں سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے مگر اسلام کی مہیب قوت سے خائف تھے اس لیے کہ اسلام کی طاقت کم نہ ہوتی تھی بلکہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس لیے اگرچہ اہل ایران اور دیگر کئی عجمی ریاستوں نے فی الحال اس خیال کو تو اپنے دل سے نکال دیا تھا کہ وہ جنگ کر کے مسلمانوں سے آزادی حاصل کر سکتے ہیں مگر یہ خیال اُن کے دل سے کبھی محو نہ ہوا کہ وہ ایک محکوم قوم ہیں۔

ایسی صورت میں اُن کے سامنے ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ سیاسی تھا۔ انھوں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ بالآخر وہ اسلامی مرکز کو اس بات پہ مجبور کر دیں گے کہ اُن کو علامتی خود مختاری عطا کی جائے یا کوئی ایسا نظام وضع کیا جائے جس میں اُن کے لیے زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کرنا ممکن ہو جائے۔ تاہم اپنے اس تخیل پہ عمل کرنے کے لیے کوئی قابل عمل منصوبہ اُن کے سامنے موجود نہ تھا اس لیے رفتہ رفتہ وہ مایوس ہوتے جا رہے تھے کہ اچانک ہی مرکز سے انھیں شورش کی خبریں آنے لگیں جو اُن کے خیال میں خوش آئند تھیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کو پردہ فرمائے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا اس لیے مسلمانوں کو عقائدی طور پہ منتشر کرنا تو ممکن نہ تھا اور مسلمانوں کی عظیم عسکری قوت کے سامنے بغاوت کا نتیجہ صرف موت تھا اس لیے شریر دماغوں نے سیاسی تفریق کا راستہ اپنایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سخت گیر طبیعت اور ریاست کے ہر ہر پہلو پہ گہری بصیرت نے اہل عجم کو کوئی ایسا

موقع فراہم نہ ہونے دیا جس کو بنیاد بنا کر وہ اپنی تشنہ آرزؤں کا نوحہ اسلامی مرکز کے کانوں تک پہنچا سکیں۔ تاہم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ عہدِ خلافت میں حالات اُن کو موافق نظر آنے لگے اور وہ متحرک ہو گئے۔

بات کو سمجھنے کے لیے ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔

رسول اللہ ﷺ کو شرفِ نبوت سے نوازا گیا تو قریش ہی عربوں کے حکمران تھے قریش میں کئی خاندان تھے۔ تاہم بنو ہاشم اور بنو امیہ کو خاص مقام حاصل تھا۔ بدر میں قریش پہلی بار مسلمانوں کے مقابلے پہ اترے تو بدترین شکست کھائی۔ قریش کے بہت سے سردار مارے گئے تو حکومت تنہا بنو امیہ کے ہاتھ آ گئی اور ابو سفیان قریش کے سردار ہو گئے۔ بنی ہاشم نے اس پہ اعتراض نہ کیا اس لیے کہ حضرت ابو طالب کے انتقال کے بعد بنو ہاشم کے بیشتر اعمائدین مدینہ ہجرت کر گئے تھے اور صرف حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے جو مکہ میں موجود تھے۔ قریش انھیں اپنا ساتھی سمجھتے تھے حالانکہ وہ اسلام قبول کر چکے تھے مگر بعض مصلحتوں کی بنا پہ اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھے۔ اس طرح گویا غزوہ بدر سے لے کر فتح مکہ تک عملاً قریش اور بنو امیہ ہی ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ فتح مکہ کے بعد بنو امیہ کی ریاست کا عملی خاتمہ ہو گیا۔

تاہم بنو امیہ کی ریاست کے خاتمے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اُن کے مقابل قریش کی حکومت قائم ہو گئی بلکہ رسول اللہ ﷺ نے دراصل مسلمانوں کی حکومت قائم کی تھی۔ تب بنی ہاشم اور بنو امیہ کا تصور مٹ گیا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی قائم کی ہوئی مساوات اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ شائد اسی قبائلی عصبیت کو مٹانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے بنی ہاشم کو کوئی بڑا منصب عطا نہ کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ہونے والے خلفاء میں بھی یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ میں سے نہ کوئی اموی تھا نہ ہاشمی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے منصب خلافت سنبھالا تو چونکہ وہ اموی تھے اس لیے پھر اموی اور ہاشمی کا سوال پیدا ہو گیا بلکہ شاید پیدا کر دیا گیا۔ شام میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد سے ہی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ حکمران چلے آ رہے تھے

جو بنو امیہ سے تھے اس لیے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چن لیا تو ملک شام نے یعنی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زیر اثر علاقوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امارت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص طلب کر لیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا دارالحکومت مدینہ سے عراق منتقل کر لیا اس لیے کہ وہاں بنو ہاشم کی ایک بڑی جماعت تھی جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کے لیے تیار تھی اور اُن کے ہمراہ عجمیوں کی ایک بڑی تعداد تھی جو ایران سے لے کر خراسان تک حکمران تھے اس طرح پہلی بار اسلامی ریاست دو بڑے حصوں میں منقسم ہو گئی ایک طرف شام میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی اموی حکومت تھی تو دوسری طرف عراق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہاشمی حکومت قائم تھی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پورا عہد حکومت جنگ و جدل کی نظر ہو گیا۔ تب مسلمان امت کی اِن باہمی جنگوں سے اکتائے ہوئے تھے چنانچہ لوگوں کی خواہش پر حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہ نے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جگہ خلیفہ ہوئے تھے نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی اور دور دور تک بنو امیہ کی حکومت قائم ہو گئی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اس قربانی سے بنو ہاشم خوش نہ تھے اور نہ ہی انھوں نے دل سے بنو امیہ کی اس سیادت کو تسلیم کیا تھا۔ چنانچہ بنو ہاشم جو جاہلیت کی اصطلاح تھی اسلام کے بعد اہل بیت نبوی کی مذہبی اصطلاح میں بدل گئی اور اب مقابلہ اہل بیت نبوی اور بنو امیہ میں تھا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی امارت سنبھالنے کے بعد اہل بیت نبوی کی پوری مدارت کی اور بظاہر ہر طرح سے اُن کی دلجوئی کی۔ مگر یزید کی جانشینی نے اُن کے سارے کیے کرائے پہ پانی پھیر دیا۔ اور یہ رواشت کی وہ بدترین مثال تھی جس کا اس سے پہلے کوئی دستور نہ تھا مسلمانوں کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پہ حیرت ہوئی مگر چونکہ حکومت بنو امیہ کے ہاتھ میں تھی اس لیے کچھ لوگوں نے ڈر کر اور کچھ لوگوں نے فتنہ سے بچنے کے لیے یزید کی بیت کر لی۔ تاہم قریش اور اہل بیت نبوی میں جو لوگ اخلاقی طاقت رکھتے تھے انھوں نے اس جبری اور موروثی جانشینی سے اختلاف کیا

۔اُن میں سب سے اہم شخصیت حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کے صاحب زادے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کی تھی۔حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم کے نواسے تھے۔اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہم کے صاحبزادے تھے۔علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے بھی طاقت کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا اور یزید بن معاویہ کی بیعت کرنے سے گریز کیا۔یزید بن معاویہ کے اِن مخالفین میں سے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اور حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہم نے مزاحمت کی راہ کو چنا جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم زہد و تقوی کی طرف متوجہ ہو گئے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے خود کو علم کی دنیا میں گم کر لیا۔حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہم نے یزید بن معاویہ کے ساتھ جنگ کا ارادہ کیا اور عراق میں موجود اپنے حمائتیوں کی طرف چل دیئے۔وہ عراق نہ پہنچ سکے بلکہ سرکاری فوجوں نے انھیں راستے میں ہی کربلا کے مقام پہ روک کر اہل بیت کے ساتھ شہید کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے حجاز و عراق میں اپنی حکومت قائم کر لی۔حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اور یزید کی فوجوں کے مابین جنگ جاری تھی۔یزید کی فوجوں نے مکہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اور اُن کی منجنیقوں سے پھینکے گئے پتھر بیت اللہ کے صحن میں گر رہے تھے۔تبھی یزید کی فوجوں کو اطلاع ملی کہ یزید مر گیا ہے۔یزید کی فوجوں نے محاصرہ اٹھالیا اور شام کی طرف روانہ ہو گئے۔یزید کے بعد اُس کا بیٹا معاویہ حکمران ہوا مگر کربلا کے واقعات نے اُس کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا اس لیے اُس نے چند دن بعد ہی حکومت چھوڑ دی اور گوشہ نشین ہو گیا۔

دوسری طرف حضرت امام حسین رضی اللہ عنہم کے صاحبزدے امام زین العابدین تھے جو بیمار تھے اور جنگ و جدل سے گریزاں تھے۔اُن کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہم کے ایک اور صاحبزادے تھے جو غیر فاطمی تھے۔یعنی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم کے بطن سے نہ تھے بلکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہم کی بیوی حنفیہ سے تھے۔اُن کا نام محمد بن حنفیہ تھا۔چنانچہ شیعان علی اور حضرت

حسین ابن علی کے طرفدار محمد بن حنفیہ کے ماتحت ہوگئے اور بنو امیہ کے خلاف جدو جہد کرنے لگے۔حضرت معاویہ کے خاندان سے موروثی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔تاہم بنوامیہ کے ایک شاطر مروان بن حکم نے شام میں بنوامیہ کی حکومت کا اعلان کردیا۔اُس نے بنوہاشم کے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کو شکست دے دی اور بنوامیہ کی حکومت کی تاسیس کردی۔حضرت علی رضی اللہ عنہم کے پوتے حضرت زین العابدین نے سیاست سے کناری کشی اختیار کرلی تو شیعہ گروہ نے محمد بن حنفیہ کی اطاعت قبول کرلی یہاں سے فاطمی اور غیر فاطمی کی اصطلاع کا آغاز ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہم اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہم کی اولاد کو فاطمی کہا گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی دوسری بیویوں کی اولاد کو علوی کہا گیا۔چنانچہ حضرت زین العابدین کی گوشہ نشینی اختیار کرلینے کے بعد سیاست کے میدان میں اب علوی سرگرم تھے۔محمد بن حنفیہ کے انتقال پہ اُن کے بیٹے ابو ہاشم عبداللہ نے امویوں کے خلاف خفیہ جدو جہد جاری رکھی۔ابو ہاشم عبداللہ ملک شام میں کہیں سفر کررہے تھے کہ مرض الموت نے انھیں آلیا جب وہ انتقال کرنے لگے تو اتفاق سے اُن کے پاس اس وقت حضرت عباس رضی اللہ عنہم کے پوتے محمد بن علی ہی موجود تھے انھوں نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ محمد بن علی کے ہاتھ پہ بیعت کرلیں۔اس طرح خلافت وامامت کا استحقاق حضرت علی کی اولاد سے حضرت عباس کی اولاد کی طرف منتقل ہوگیا اور حضرت محمد بن علی خلافت عباسیہ کا پہلا پتھر ثابت ہوئے۔محمد بن علی نے 126ھ میں انتقال کیا اور اُس کے تین سال بعد ہی بنوعباس نے بنوامیہ سے حکومت چھین لی اور عظیم الشان عباسی خلافت کی بنیاد رکھی۔

عباسی خلافت 132ھ سے 656ھ تک قائم رہی۔اسلامی حکومتوں میں مذہبی وسیاسی حوالے سے عباسی دور خلافت ہی کو مسلمانوں کا سنہری دور قرار دیا جاتا ہے۔اس لیے کہ تمام علوم وفنون،تہذیب وتمدن اور سیاسی وعسکری رفعت مسلمانوں کو اسی دور میں حاصل ہوئی۔عباسی سلطنت پانچ سو سال سے زائد عرصہ تک قائم رہی۔اس مدت میں خلافت عباسیہ پر تغیر وانقلاب اور عروج وزوال کے بڑے بڑے دور گزرے اُس نے ہارون،مامون اور معتصم کی عظمت وشان اور جاہ وجلال کے مظاہر

بھی دیکھے اور اُن کے بعد خلفاء کے تنزل اور عظیم الشان عباسی خلافت کے احکامات کی وہ تذلیل بھی دیکھی جن کا کبھی تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔زوال کی یہ داستان بہت پیچیدہ ہے اور اس کا تذکرہ بہت بسیط جس کی یہاں کوئی گنجائش نہیں اس لیے کہ اگر ہم یہ لکھنا شروع کر دیں کہ کس عباسی بادشاہ نے کن کن لوگوں کو قتل کر کے اپنی حکومت کو استحکام بخشا، یا اُن محلاتی سازشوں کی طرف متوجہ ہو جائیں جن میں بھائی بھائی خون کا پیاسا نظر آتا ہے اور اپنے باقی بھائیوں کو قتل کرنے کے بعد جو بچ رہتا وہ تخت پہ بیٹھ جاتا۔تو ہم اُس طویل راہداری میں جا نکلیں گے جس کے آخر میں خلافت عباسیہ کا زوال ہے، حکومت اندلسیا کا اختتام ہے اور خلافت عثمانی کا عروج و زوال ہے۔ دراصل تو یہ تذکرہ اُن سیاسی کوتاہیوں اور عسکری کمزرویوں سے گزرتا ہوا زوال کے منطقی نقطہ تک پہنچتا ہے جو مسلمانوں کی تاریخ کے بدترین صفحات سے ہم تک پہنچتے ہیں۔

مسلمانو کے زوال کی ایک وجہ تاتاریوں کو بھی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ تاریخ اسلام کا قابل ذکر واقعہ ہے کہ جب بغداد میں اسلامی خلافت کا سورج غروب ہو رہا تھا تب دنیا کے کئی خطوں میں اسلام کا سورج ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ چنانچہ دیلمی، غزنوی، سلجوقی، تابکی، ایوبی، خوارزمی، تیموری اور مغل مسلم دنیا کی حکمرانی کی روایت کو ابھی باقی رکھنے والے تھے۔ مصر کی فاطمی خلافت جب ترکوں کا بوجھ نہ سہار سکی تو دنیا کے سامنے اب ترک عثمانی خلافت کا جاہ و جلال تھا جو اگلی دو صدیوں تک دنیا کا نظام اپنے ہاتھوں میں تھامے رکھنے والا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی اس وسیع سیاسی بساط کا پس منظر بھی اُتنا ہی شاندار تھا جتنا کا اُس کا پیش منظر۔ مسلمانوں کے ہاں سے خلافت رخصت ہوئی۔ احیائے امت کا تصور معدوم پڑ گیا، مسلمان حکمرانوں نے ایک ایک اینٹ کی الگ الگ مسجد بنالی تو وقت کی محکوم قوموں کو سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔ ایک دو صدیوں کی جدوجہد کے بعد مغرب دنیا پہ غالب آ گیا۔ مغرب کے غلبے کو تین چار صدیاں ہونے کو آئیں۔ مغرب اور جدید سائنس نے دنیا کو کیا دیا آئندہ صفحات میں انھی امور کا جائزہ لیا جائے گا۔(51*)

⌘⌘⌘

مغرب میں بیداری کی لہر

وہ مدتوں سے محکوم تھے اور اُن کے حکمران کئی تھے۔ وہ کلیسا کے محکوم تھے، مسلمانوں کے محکوم تھے اپنے غاصب حکمرانوں کے محکوم تھے، بیماریوں اور وباؤں کے محکوم تھے، غربت وعسرت کے محکوم تھے بے کسی وانارکی کے محکوم تھے، وہ جہالت کے محکوم تھے، وہ پادری کے محکوم تھے، وہ زمیندار کے محکوم تھے ،کارخانہ دار کے محکوم تھے، وہ روایات کے محکوم تھے، مذہب کی خرافات کے محکوم تھے، فرقہ وریت کے محکوم تھے۔ الغرض اہل مغرب نے خود اپنی زبان سے اس امر کا اعتراف کیا کہ وہ (Dark age) میں تھے۔ چودویں پندرہویں صدی کا مغربی معاشرہ شدید مذہبی معاشرہ تھا۔ کلیسا کا اثر اس قدر بسیط تھا کہ حکمران تک اُس سے بغاوت کا تصور نہ کر سکتے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ ابتداء میں بائبل پر چرچ کا قبضہ تھا۔ لوگ کلیسا کے جبر وتشدد کے خلاف تھے اس لیے چرچ کے خلاف کئی تحریکیں اٹھیں۔ اُن میں 1376ء لولارڈز (Lollards) 1514ء میں لوتھر اور کلون (Calvin) کی تحریکیں قابل ذکر ہیں۔ مشہور مورخ ''LONDAS'' نے کہا کہ اِن تحریکوں کے نتیجے میں لوگوں

کی بائبل تک براہ راست رسائی ہوگئی۔اس کے نتیجے میں چرچ اور مذہبی علماء کا اقتدار قدرے کمزور ہوگیا۔ چرچ کا تسلط کمزور ہوگیا تو لوگ شہروں کا رخ کرنے لگے۔ کیونکہ وہ جاگیردار کے ظلم سے اکتائے ہوئے تھے۔اسی وجہ سے یورپ میں شہروں کی حالت بہتر ہونا شروع ہوئی اور وہاں تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔حکمرانوں نے تاجروں کو اپنے ساتھ ملا کر کلیسا کے اقتدار کو کمزور کرنے کا عمل شروع کیا۔

یہ عیسائیت کا دوسرا دور تھا جب رومی شہنشاہ قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور بادشاہ اور چرچ کا الحاق عمل میں آ گیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ قسطنطین نے بھی عیسائیت کو اُس کے عقائد کی وجہ سے نہیں بلکہ سیاسی مصلحت کی وجہ سے اختیار کیا تھا۔ دراصل تو وہ طاقت کا پجاری تھا اور عیسائیت قبول کرنے سے اُس کی طاقت بڑھ گئی تھی۔عیسائیت کو چرچ کے ادارے کے ذریعہ جب سیاسی سرپرستی اور اقتدار حاصل ہوا تو اُس سے اندرونی طور پہ بھی سیاسی سوچ میں تبدیلی آئی اور سلطنت رومہ میں یہ عزم پیدا ہوا کہ وہ طاقت کے ذریعے پوری انسانیت کو عیسائی بنا کر دنیا پہ ایک ہی مذہب کو مسلط کر دیا جائے۔ چنانچہ قسطنطین نے چرچ کے ادارے کو منظّم کیا اور اُس کے عہدیداروں کو اعلیٰ و کمتر میں تقسیم کیا تا کہ جو غیر مساوی تقسیم قوم میں پائی جاتی ہے وہی مذہبی اداروں میں بھی نفوذ کر جائے۔

رومی سلطنت نے چرچ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو وسیع مراعات سے نوازا۔لوگوں کو جاگیریں عطا کیں۔ امراء کے ٹیکس معاف کر دیئے گئے۔ چنانچہ لوگوں نے عیسائیت میں اپنے اموال اور جانوں کو زیادہ محفوظ دیکھا تو عیسائیت کی طرف راغب ہو گئے۔اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ لوگوں نے بڑے پیمانے پر عیسائیت قبول کی مگر دوسری طرف عیسائیت کا اصل عقیدہ پس پردہ چلا گیا اور عیسائیت کی قدیم روایات کا خاتمہ ہوگیا۔ پوپ کی طاقت میں بھی بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ پال نے عیسائیت کی اصل روح کو پس پشت ڈال کر اس الہامی مذہب کی جو تشریح کی اُس نے عیسائیت کی روح تک کو بدل کے رکھ دیا۔ مگر لوگوں نے پال کی تمام ترمیموں کو تسلیم کر لیا اور کلیسا نے اس پہ مہر تصدیق ثبت کر دی۔کلیسا لوگوں کی نجی زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ ہر عیسائی کے لیے اس بات کو لازم

قرار دے دیا گیا کہ وہ سال میں ایک بار ضرور اپنے گناہوں کا اعتراف کرے اور بدلے میں پادری کو پیسے دے ۔ اس سے کلیسا نہ صرف دولت مند ہو گیا بلکہ حریص بھی ہو گیا۔ راہب اور پادری وعظوں کے ذریعے لوگوں میں مذہبی جذبہ، عقیدت اور ولولہ پیدا کرنے لگے۔ جب وعظ ہوتا تو لوگ آخرت، گناہ اور حضرت عیسیٰؑ کی مظلومیت پہ روتے۔ خصوصیت سے وہ وعظ بہت مقبول ہوتے جن میں امراء کی عیسائیوں پر تنقید ہوتی اور عورتوں کو اُن کے فیشن پر لعن طعن کی جاتی۔ عورتوں کی تفریح اور اُن کے مشاغل پر جارحانہ حملے کیے جاتے ۔ اِن وعظوں کا مقصد یہ ہوتا کہ لوگوں کو آخرت اور جہنم سے زیادہ سے زیادہ خوفزدہ کیا جاسکے۔

لوگوں کے مذہبی جذبات کو اس قدر ابھار دیا جائے کہ وہ اپنی دولت کا ایک مناسب حصہ چرچ کو دیتے رہیں۔ اس طرح معاشرے میں عیسائیت کا تسلط قائم ہو گیا۔ تاہم اس کا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں میں مذہبی توہمات بھی حد سے زیادہ بڑھ گئے ۔ لوگ بیماری اور ہر مصیبت کے وقت پیروں سے دعائیں مانگتے اور فالیں نکلواتے ۔ قحط، خشک سالی اور وباؤں کے زمانہ میں نام نہاد مذہبی رسومات کے دامن میں پناہ حاصل کرتے ۔ دوسری طرف جب چرچ کو اس قدر دولت ملی اور اقتدار میں بھی اس کا حصہ شامل کر لیا گیا تو معاشرے میں چرچ کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ رہا۔ چرچ بدعنوان اور عیاش ہو گیا۔ قرون وسطی میں تو چرچ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ خانقاہیں چرچ کے عنوان سے بداخلاقی اور عیاشی کے اڈے بن کے رہ گئیں۔ ننوں اور پادریوں میں جنسی تعلقات استوار ہو گئے۔ وینس کے صرف ایک چرچ میں بدعنوانی اور عریانی کے اتنے واقعات پیش آئے کہ بعد میں اُن کی تفصیلات بیس جلدوں میں تحریر کی گئیں۔

عیسائیوں کی سلطنت رومہ کا یہی پیش منظر تھا، وہ سماجی عقائدی اور اخلاقی پستیوں کا شکار تھے جب مسلم شہ سواروں نے اُن کے دروازوں پہ دستک دی۔ عسکری طور پہ وہ مضبوط تھے اس کے باوجود وہ عرب مسلمانوں کی یلغار کا سامنا نہ کر سکے اور سلطنت رومہ بکھر گئی۔ اُن کی ریاست کے اکثر و بیشتر علاقوں پر مسلمان متصرف ہو گئے جو علاقے بچ رہے اُن میں سینکڑوں وار لارڈز نے اپنی اپنی حکومت

قائم کرلی اس طرح مملکت رومہ تو محض تذکرہ تاریخ کے لیے باقی رہی مگر سارا عیسائی معاشرہ فیوڈل لارڈز کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔ مرکزی نظم ختم ہونے سے جرمن لٹیروں کی بن آئی اور انھوں نے فرانس اور اٹلی کے شہروں میں امراء کو لوٹنا شروع کر دیا۔ امراء نے جب دیکھا کہ اُن کی عزت اور جائیداد کا تحفظ اسی میں ہے کہ وہ کسی فیوڈل لارڈ کی پناہ میں چلیں جائیں تو انھوں نے ایسا ہی کیا جس کی وجہ سے یورپ کے شہر ویران ہونے لگے اور اُن کے گاؤں آباد ہوتے گئے۔

شہروں میں اب صرف وہی لوگ بچے تھے جن کے پاس کچھ نہ تھا جسے کوئی لوٹ سکے اور گاؤں میں فیوڈل لارڈ کا اپنے کسانوں اور دوسرے لوگوں سے غیر تحریری معاہدہ تھا کہ وہ لوگوں کی حفاظت کرے گا اور لوگ اُسے ٹیکس ادا کریں گے۔ اس طرح شہر اور گاؤں کے درمیان ربط کم ہو گیا۔ رہی سہی کسر راستوں کے غیر محفوظ ہونے نے پوری کر دی اس لیے کہ کوئی مستحکم مرکزی نظام نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی سڑکیں ٹوٹ پھوٹ گئیں تھیں۔ چنانچہ ہر گاؤں خود کفیل ہو گیا اور اپنے فیوڈل لارڈ کے سائے میں آرام اور سکھ کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اگرچہ یہ ایک عارضی سکھ تھا اس لیے کہ فیوڈل لارڈز نے رفتہ رفتہ اپنے کسانوں اور دیگر لوگوں کو انسان سمجھنا چھوڑ دیا اور چرچ کا سہارا لے کر خود کو لوگوں کی عقیدت کا محور بھی قرار دے لیا۔

جلد ہی فیوڈل لارڈز میں موروثی حکومت کا تصور بھی جڑ پکڑ گیا۔ موروثی اختیارات کے بعد اس طبقہ میں فخر و غرور اور طاقت کے احساس نے جنم لیا۔ وہ اس کا اظہار دولت کی نمائش سے کرتے قیمتی زیورات پہنتے اور خود کو محافظ دستے میں لے کر چلتے اور خود کو دوسروں سے ممتاز ثابت کرتے۔ اگرچہ تب یورپ میں فیوڈل طبقہ پیدا ہو چکا تھا مگر یورپ میں جو چند کمزور سی بادشاہتیں ابھی قائم تھیں وہ اس فیوڈل نظام کو پسند نہ کرتی تھیں۔ چنانچہ بادشاہ اور فیوڈلز میں ایک ہمہ وقتی کشمکش قائم رہی۔ جب اشیاء کی ادائیگی سکوں میں ہونے لگی اور سکے پر یقیناً بادشاہ کی تصویر ہوا کرتی تو بادشاہ فیوڈل لارڈز سے طاقت ور ہو گیا۔ شہروں میں اب تجارت فروغ پا رہی تھی جس کے ٹیکسوں کی بے پناہ آمدنی کی وجہ سے بادشاہ کی طاقت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسی دوران عرب بارود ایجاد کر چکے تھے جب وہ

یورپ پہنچا تو بادشاہ فیوڈل لارڈز سے مزید بے نیاز ہو گیا کہ اب اُسے اُن سواروں کی ضرورت نہ تھی جس کے لیے وہ پہلے وار لارڈز سے مدد حاصل کرنے پہ مجبور تھا۔ چنانچہ پندرہویں صدی عیسوی تک فیوڈل لارڈز کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی اور یورپ میں کئی مطلق العنان بادشاہتیں قائم ہو گئیں۔ شاہی خاندانوں نے آپس میں شادی کو رواج دیا اور یہ طے کر دیا کہ بادشاہ کا بڑا بیٹا ہی بادشاہ ہو گا اس طرح انھوں نے وارثتی جھگڑوں کا راستہ روک دیا۔ انھوں نے باہمی معاہدے کیے اور آپس میں لڑنے کے بجائے مسلمانوں سے لڑنے کے عزم کا اظہار کیا جن کی عظیم الشان اسلامی ریاست مشرق و مغرب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اہل یورپ کی اسی بیداری نے صلیبی جنگوں کے اولین سلسلے کو پیدا کیا۔ چنانچہ یورپی اقوام اب شدید طبقاتی نظام کی زد میں تھیں وہ وار لارڈز کے بھی غلام تھے، تاجر کے بھی غلام تھے، بادشاہ کے بھی غلام تھے اور کلیسا کے بھی غلام تھے۔ دوسری طرف اُن کو بیماریوں اور وباؤں کا سامنا تھا۔ قحط تھا، خشک سالی تھی، اور غربت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ آبادی کے تناسب سے وہ اپنے پیداواری زرائع کو ترقی نہ دے سکے تھے۔

زمین کو بار بار کاشت کرنے سے اُس کی زرخیزی ختم ہونے کو آئی تھی کیونکہ ابھی تک پیداوار کو بڑھانے اور زمین کو جلد ہی دوبارہ قابل کاشت بنانے کے نئے طریقے وجود میں نہ آئے تھے۔ چنانچہ غذائی کمی کی وجہ سے لوگ اس قابل نہ تھے کہ وہ بیماریوں اور وباؤں کا مقابلہ کر سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آسانی سے پلیگ کا شکار ہو جاتے تھے۔ 1337ء کے پلیگ کی وجہ یہ تھی کہ جب منگولوں نے کریمیا کا محاصرہ کیا تو انھوں نے وہ ہتھیار استعمال کیا جس کا اہل یورپ نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا اور نہ ہی اُن کے پاس اس مہلک ہتھیار کا کوئی توڑ تھا۔ منگولوں نے پلیگ سے مرے لوگوں کی لاشیں لیں اور منجنیق کے ذریعے انھیں جینوا کے شہر میں پھینکوا دیا۔ چند ہی دنوں میں پلیگ کے جراثیم سارے شہر میں پھیل گئے۔ جب اہل جینوا وہاں سے بھاگے تو یورپ میں جہاں بھی وہ گئے پلیگ کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ چنانچہ جلد ہی پلیگ سارے یورپ میں پھیل گیا جس کے نتیجے میں لاکھوں لوگ موت کے گھاٹ اتر گئے۔ پلیگ کا شکار زیادہ تر شہری علاقے تھے۔ دِنوں میں ہی شہروں کے شہر اجڑ

کے رہ گئے۔ گھر تھے مگر مکینوں سے خالی تھے، سڑکیں تھیں مگر وہاں صرف لاشیں تھیں، چرچ تھے مگر وہاں دعائیں کرتے پلیگ کے مریض تھے ایک گرتا تو دوسرا حضرت عیسیٰ کے مصلوب مجسّمے کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ کھیت بغیر کاشت کے پڑے تھے اور کارخانے بغیر مزدوروں کے تھے۔ کیا امیر کیا غریب سبھی اس مہلک مرض کا شکار ہوئے اور موت اُن کے شہروں میں دندناتی پھرتی تھی۔ اگلی صدی میں اہلِ مغرب کو بلیک ڈیتھ (Black Death) کا سامنا تھا۔ جس نے یورپ کی کل آبادی کے 4% کو نگل لیا۔ اِن وباؤں اور غربت نے طبقاتی تفریق کو مزید وسیع کر دیا۔ محروم طبقوں میں جو بے چینی تھی اُس نے فیوڈل لارڈ اور کسانوں کے مابین وسیع تر اختلاف کو جنم دیا جس کا نتیجہ تشدد کی صورت میں برآمد ہوا کہ غلامی کے اس طویل تسلسل نے آخر لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا اور کسانوں کی اُن بغاوتوں کا آغاز ہوا جو کئی صدیوں پہ محیط تھیں۔

چنانچہ لوگوں کا ردِعمل کئی صورتوں میں ظاہر ہوا۔ مثلاً پندرہویں صدی میں بلقان نامی گاؤں کے کسانوں نے خفیہ مشاورت کی اور طے ہوا کہ وہ سب ایک ساتھ مل کر اپنے فیوڈل لارڈ پہ حملہ کریں گے اور اُسے قتل کر دیں گے اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔ بعض گاؤں میں لوگوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کونسلیں قائم کیں جنھوں نے اپنے فیوڈل لارڈز کو بتایا کہ وہ بھی انسان ہیں اور اُن کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ بعض علاقوں میں کسانوں نے اپنے لارڈ کی زمینوں پر ہل چلانے سے انکار کر دیا اور اپنے مطالبات منظور نہ ہونے تک کھیتوں میں نہ جانے کے عزم کا اظہار کیا۔ اسی قسم کی کئی کونسلوں کا ذکر انگلستان کی تاریخوں میں بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ کسانوں کی بغاوتوں کا ایک تسلسل تھا جو جرمنی سے لے کر فرانس اٹلی اور یورپ کے دیگر ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔ زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم طبقات نے امراء کے خلاف شدید جدوجہد کی۔ 1381-82ء میں انگلستان میں وائٹ ٹیلر کی قیادت میں کسانوں کی بڑی بغاوت سامنے آئی۔ 1451ء میں جیک کیڈ کی قیادت میں ایک بڑی بغاوت ہوئی جس میں کسانوں اور دست کاروں نے مل کر حصہ لیا۔ رفتہ رفتہ یہ بغاوتیں پورے یورپ میں پھیل گئیں۔ جرمنی میں ایسی کئی بغاوتوں کا پتہ چلتا ہے۔ بوہیما

میں 1410ء جان ہس کی قیادت میں کسانوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے چرچ کے استحصال کے خلاف بغاوت کر دی۔ جو اُن میں سے قدرے بہادر تھے وہ ڈاکو بن گئے جو امراء کو لوٹتے اور اُن کا مال اپنے جیسے غریب لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔ یہ لوگ قومی ہیروز کی صورت سامنے آئے اور لوگ اُن کی تعریف میں نغمے گانے لگے۔ اسی پس منظر میں انگلستان میں رابن ہڈ ابھرا جو لوگوں کا ہیرو تھا وہ امیروں کو لوٹتا اور اُن کا مال غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔

باغیوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ فیوڈل لارڈ اور چرچ دونوں عام انسان کا استحصال کرتے ہیں اس لیے معاشرے سے اِن دونوں طبقوں کو مٹا دیا جائے۔ اِن بغاوتوں کے پس منظر میں اگرچہ وباؤں اور غربت کو بھی دخل تھا تاہم بہت سی سیاسی وسماجی ناانصافیاں بھی شامل رہیں تھیں جن کے خلاف عام لوگوں کا غم وغصہ بغاوت کی شکل میں اُبلا۔ تاہم باغیوں نے کلیسا اور فیوڈل لارڈز کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ حکمران طبقے کا نقطہ نظر یہ تھا کہ چونکہ اِن بغاوتوں سے سماجی تنظیم ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے اس لیے انھوں نے طاقت اور قانون کا سہارا لے کر اِن تمام بغاوتوں کو با آسانی کچل دیا تھا اور مغرب کا عام شہری شدید جانی و مالی قربانی کے باجود اِن بغاوتوں کے ثمر سے محروم ہی رہا تھا۔ اسی دوران پاپ اربن دوم نے مغرب کے اِن محروم لوگوں کو نجات کی ایک راہ کی طرف بلایا۔ اُس نے لوگوں سے کہا متحد ہو جاؤ اور مشرق پہ حملہ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

چنانچہ غریب کسانوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا اُن میں مذہبی جنون کو پروان چڑھایا گیا۔ چرچ اور فیوڈل لارڈ کے اس اتحاد نے صلیبی جنگوں کو جنم دیا۔ اگرچہ جدید تحقیق سے اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اِن جنگوں میں کلیسا کے مقاصد اور تھے، فیوڈل لارڈ کے مقاصد اور تھے جن کا اس مقدس جنگ لڑنے والے عام سپاہی کے جذبات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یاد رہے کہ یہ سلسلہ 1099ء سے 1291ء تک جاری رہا تھا۔ چوتھی صلیبی جنگ میں کلیسا اور فیوڈل لارڈز کے مقاصد کھل کے سامنے آ گئے جنھوں نے عام عیسائی کو بہت مایوس کیا۔ اس صلیبی لشکر نے بازنطینی سلطنت کے دارالحکومت قسطنطنیہ پہ قبضہ کیا تو وہاں خوب لوٹ مار کی۔ قسطنطنیہ سے لوٹی ہوئی اس دولت کا بڑا حصہ

جب اُن اطالوی تاجروں کو ادا کیا گیا جنھوں نے اس جنگ میں سرمایہ کاری کی تھی تو عام عیسائی کو بہت ندامت ہوئی۔ صلیبی جنگوں نے اہل مغرب کی تاریخ پہ گہرے اثرات مرتب کیے۔ مگر عیسائیوں کی اس بے پناہ یلغار سے عظیم الشان اسلامی ریاست کو کوئی خاص نقصان نہ پہنچایا۔ صلیبی جنگیں صرف مشرق وسطیٰ تک محدود تھیں۔ جب کہ اسلامی ریاست کی حدیں روس سے لے کر ہندوستان تک اور مکہ سے لے کر ہسپانیہ اور براعظم افریقہ کے بہت بڑے حصے تک وسیع تھیں اس لیے مشرق وسطیٰ سے باہر کی اسلامی دنیا کو صلیبی جنگوں سے کوئی فرق نہ پڑا تھا اور نہ ہی انھوں نے اس میں خاطر خواہ دلچسپی لی تھی۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے عیسائیوں کے لیے سلطنت عباسیہ کی قوت ہی کافی تھی۔ اگرچہ سلطنت عباسیہ بھی براہ راست اس جنگ میں ملوث نہ ہوئی تھی بلکہ مشرق وسطیٰ کے خود مختار حکمرانوں کو اسلامی خلافت کی صرف اخلاقی حمایت ہی حاصل تھی اور اس جنگ کے لیے سلطان صلاح الدین ایوبی کو صرف اسی کی ضرورت تھی عسکری حوالوں سے وہ خود کفیل تھے۔

چنانچہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے خود ہی 1191ء میں عیسائیوں سے بیت المقدس کو چھین لیا تب وہاں اُس لشکر کا کوئی نام ونشان نہ تھا جسے ابتداء میں عیسائی راہبوں نے مرتب کیا تھا۔ عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کے خلاف بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ بدلے میں مغرب کے ذہن میں اُس مذہبی تعصب اور تنگ نظری نے جنم لیا جس کی جڑیں آج تک باقی ہیں۔ مغرب نے اسلام کا حلیہ بگاڑنے کی ہر ممکن کوشش کی اگرچہ وہ اس میں ناکام رہے۔ بلکہ وہ بازنطینی ریاست پر قبضہ کے بعد انھوں نے آرتھوڈکس عیسائیوں کو بھی عیسائیت سے خارج کر دیا کیونکہ وہ پوپ کی معصومیت کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے روس اور ایشیا میں بسنے والی عیسائی اقوام کو بالکل نظر انداز کر دیا تو عیسائیت صرف اہل مغرب کا دین بن کے رہ گئی۔ صلیبی جنگوں کے نتیجے میں مغرب نے جو کامیابیاں سمیٹیں وہ بھی کم نہ تھیں۔ انھوں نے بہت سال مال و دولت بھی سمیٹا اور یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارتی راستوں سے بھی آگاہ ہوئے۔ جب وہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے اپنے گھروں سے نکلے تھے تو وہ کنویں کے مینڈک تھے۔ جب وہ اپنے کنویں سے نکلے تو انھوں نے جانا

کہ یہ دنیا تو بہت وسیع ہے۔انھوں نے پہلی بار اپنے بدنوں پہ مشرق کا بنا ہوا نفیس ہلکا اور ریشمی لباس پہنا تو انھوں نے جانا کہ وہ تو اب تک کھدر پوش تھے۔اطالوی تاجر جنگ کو بھول گئے تھے اور انھوں نے صرف تجارت پہ اپنی توجہ مرکوز کر دی۔انھوں نے مشرق سے کپڑے کی تجارت کی اور بیش بہا منافع کمایا۔مغرب نے مسلمانوں سے کاغذ بنانا سیکھا اور اسے اپنے ملکوں میں رواج دیا۔علاوہ ازیں انھوں نے پہلی دفعہ چینی کے برتن دیکھے،شیشہ بنانے کا فن سیکھا،گرم مصالحوں سے آشنائی حاصل کی ، چاول اور شکر کے بارے میں جانا کہ یہ تمام چیزیں اُن کے لیے اجنبی تھیں۔انھوں نے ہوائی چکیاں دیکھیں جن سے بجلی پیدا کی جاتی تھی۔انھوں نے مسلمانوں کے قلعے اور محلات دیکھے تو اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

الغرض انھی جنگوں سے انھوں نے مسلمانوں سے سائنس طب اور فن حرب کے اولین سبق سیکھے اور بعد میں انھیں مغرب میں رواج دیا۔صلیبی جنگوں سے انھیں ایک فائدہ یہ ہوا کہ وہ فیوڈل لارڈز جنھوں نے اپنے لالچ کی بنا پہ اِن جنگوں میں نہ صرف شرکت کی تھی بلکہ اپنا سرمایہ بھی لگایا تھا انھیں مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے اور لوگوں پہ اُن کی گرفت کمزور پڑ گئی۔شہروں میں ایک نئے طبقے نے جنم لیا جو تاجر کا طبقہ تھا جلد ہی تجارت میں وہ اس قدر کامیاب ہو گیا کہ گاؤں کے فیوڈل لارڈ سے کوسوں آگے نکل گیا۔چنانچہ بادشاہ کی نظر میں بھی فیوڈل لارڈ کی وقعت کم ہو گئی اور تاجر طبقہ حکمرانوں سے قریب ہو گیا۔

کیونکہ اب تاجر ہی بادشاہ کو جنگوں کے موقع پہ قرض دیا کرتا تھا اور فیوڈل لارڈ اب اس قابل بھی نہ رہا تھا کہ بادشاہ تک اس کی رسائی بھی ہو سکے۔صلیبی جنگوں کے دیگر اثرات میں سے ایک یہ ہے کہ جب تجارت نے مغرب میں فروغ پایا تو تاجروں کو اپنے سرمایے کی حفاظت کے لیے کسی مستحکم ادارے کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔تب دنیا میں بینکاری نظام قائم ہوا اور چند ہی برسوں میں بینکنگ نے مغرب میں انقلاب بپا کر دیا۔چونکہ بینکوں کے پاس لوگوں کی دولت اکٹھی ہو گئی تھی اس لیے بینک بھی بڑے سرمایے کے ساتھ تجارت کے میدان میں اتر آئے اور یورپ کے صنعتی

انقلاب کی بنا رکھی گئی۔ حالانکہ ایک صدی قبل تاجروں اور بینکاروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور فیوڈل لارڈز کے مقابلے میں اُن کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ لیکن معاشرے کبھی ایک جگہ ٹھہرے نہیں رہتے۔ تب مسلمان ابھی زوال کی ابتدائی منزلوں میں تھے اور اہل مغرب ترقی کی شدید ہوس لیے ہوئے تھے اس لیے اُن کی پیہم جدو جہد مغربی معاشروں کو تیز رفتار ارتقاء کی جانب لیے جارہی تھی اُن کے گاؤں، شہر، برادری، رسم و رواج حتیٰ کہ عقائد تک ارتقاء پذیر تھے۔ تجارتی ترقی میں تیزی آرہی تھی۔ تجارت کے پھیلاؤ نے سودی قرض دینا شروع کیا جس کی وجہ سے چھوٹی صنعتوں کو پھلنے پھولنے لگا۔ ہنڈی کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے پیداوار کے اضافے انتظام، تقسیم کار اور سرمایہ کے تحفظ کے لیے عمدہ قوانین وضع کیے جنھیں ریاست نے تحفظ فراہم کیا فیوڈل لارڈ کا اثر بہت کم ہو چکا تھا۔ تجارت کی روز افزوں ترقی سے لوگ شہروں کا رخ کرنے لگے تھے۔ چنانچہ شہروں کی آبادی تیزی سے بڑھی اور بعض شہر پھیل کر کاسمو پولٹن ہو گئے۔ جہاں تاجروں اور حکمران طبقے نے علوم وفنون کی سرپرستی کی۔

چنانچہ تجارت کے ساتھ ساتھ مغرب میں شاعروں، ادیبوں، مجسمہ سازوں اور مصوروں کو وظائف جاری کیے جانے لگے جس کی وجہ سے علوم وفنون ترقی کرنے لگے۔ شہر دیہات سے بھاگ کر آنے والوں کے لیے پناہ گاہ بن گئے تھے کیونکہ یہاں اُن کو کسی لارڈ کے استحصال کا ڈر نہ تھا وہ کام کرتے اور بدلے میں اچھی اجرت پاتے۔ سماجی اور معاشی تبدیلیوں سے شہروں کا رنگ بدلنے لگا۔ اس سے قبل شہر کی سب سے بڑی عمارت چرچ کی ہوا کرتی تھی اب تجارتی کمپنیوں نے بھی اپنے بڑے بڑے دفاتر بنانے شروع کر دیئے تھے۔ بینکوں نے لوگوں کے مال کی حفاظت کرنے کے لیے مضبوط اور بڑی عمارتیں بنائیں۔ چنانچہ شہر کا ماحول جو اس سے قبل سراسر مذہبی نظر آتا تھا اب اُس میں تبدیلی نظر آرہی تھی۔ تجارتی سرگرمیوں نے لوگوں کی ترجیحات اور مشاغل کو متاثر کیا تھا اور اب لوگ مذہبی ماحول اور اثرات سے قدرے باہر نکل آئے تھے اور سیکولر ماحول پیدا ہونے لگے تھا۔ اسی دوران ریناساں کی تحریک سامنے آئی جو ابتدا میں اگرچہ صرف کلیسا کے استحصالی نظام کے خلاف ایک چھوٹی

سی بغاوت نظر آتی تھی مگر اس کا اختتام اہل مغرب کی زندگی سے مذہب کے خاتمے پہ ہوا۔ ریناساں کی تحریک کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مورخین نے لکھا ہے کہ قرون وسطیٰ میں جب یورپی معاشرے فیوڈل لارڈز، کلیسا اور بادشاہ کے کارندوں کے یرغمال بنے ہوئے تھے تب تجارتی سرگرمیوں نے زور پکڑا اور تاجر اپنی دولت کے بل بوتے پر ایک بڑی طاقت بن کے ابھرے تو انھیں تجارتی ضروریات کے لیے ایک ایسے معاشرے کی ضرورت تھی جس کی تعلیم سیکولر ہو اور اگلی نسل سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو اُن کے تجارتی نظام کو وسعت دیں۔ سائنس دان ہوں جو اپنی ایجادات سے اُن کے کام کو آگے بڑھائیں، فلسفی اور مفکر ہوں جو مذہب کی روایت پسندی اور عقیدے کی سختی کو کم کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ عام آدمی کو توہمات، مذہبی تنگ نظری سے آزاد کرا کے اسے معاشرے کا فعال شہری بنایا جائے۔

مگر سوال یہ تھا کہ ایسا کس طرح ہو؟

چنانچہ انھوں نے قدیم یونانی تہذیبوں اور خاص طور پہ عربوں کے اُن علمی نظریات کی جانچ پڑتال شروع کی جو انھوں نے زندگی کو تناسب عطا کرنے کے لیے تحریر کیے تھے۔ عربوں ہی کے ذریعے یونانی تراجم اُن تک پہنچے۔ قرون وسطیٰ کا معاشرہ اِن دونوں تہذیبوں سے نا آشنا ہو چکا تھا۔ مگر عربوں کے ذریعے جب یونانی تراجم اُن تک پہنچے تو انھوں نے اس سے اُس مٹی ہوئی یونانی تہذیب کو دریافت کیا جو ایک صحت مند معاشرے کے طور پہ جانا جاتا تھا۔ جب قسطنطنیہ پہ مسلمانوں یعنی عثمانی خلافت کے دور میں قبضہ کیا گیا تو وہاں سے بہت سے صاحب دانش بھاگ کر یورپ پہنچے تھے انھوں نے مغربی تاجروں کی اس کھوج میں اُن کی مدد کی اور پرانے مسودوں میں دبا ہوا ایک عہد دریافت کیا۔ یہی دور تھا جب پریس ایجاد کیا گیا۔

تب علمی ترقی کی رفتار ایک دم بڑھ گئی۔ بے دریغ کتابیں چھپنے لگیں۔ یونانی و رومی دور کی تاریخ یادداشتیں معاہدے، شاعری اور ادب چھپنے لگا۔ خود بائبل کے متن پہ بے پناہ تنقید کی جانے لگی۔ تحقیق کے جو نئے معیار اور طریقے دریافت ہو چکے تھے اُن کی بنیاد پر جب بائبل پہ تحقیق کی گئی تو اُس میں

سچ بہت کم پایا گیا اور جھوٹ کی کثرت کو محسوس کر لیا گیا۔تب پوپ الگزینڈر پنجم نے چھاپہ خانے کو غیر شرعی کام قرار دے دیا مگر اب دیر ہو چکی تھی اور کلیسا کی بجائے اب صاحب ثروت تاجر تھے جنھوں نے معاشرے کی باگ دوڑ سنبھال رکھی تھی۔اس لیے چرچ کے اس حکم پہ زیادہ توجہ نہ دی گئی اور کتابیں چھاپنے کا کام جاری رہا۔دراصل اُن کا خیال تھا کہ اب مذہبی تعلیم کے علاوہ لوگوں کو سیکولر تعلیم کی بھی ضرورت تھی تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کو تقلید کے اُس تسلسل سے آزاد کرایا جائے جس نے کئی صدیوں سے یورپی معاشروں کو جمود کا شکار بنا رکھا تھا۔

چنانچہ لوگوں کو مذہبی خرافات کے بجائے گرامر، منطق، جیومیٹری، ریاضی اسٹرونومی، قانون اور طب پڑھنے کی طرف متوجہ کیا جانے لگا۔مغربی تاجر تنظیموں نے کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنے کے لیے اپنے خزانوں کے منہ وقت کی حکومتوں کے سامنے کھول دیئے۔چنانچہ فلورنس، نیپلز، وینس اور اٹلی کی دوسری ریاستوں میں تیزی سے علمی مدارس قائم کیے گئے جس کے نتیجے میں جلد ہی اُن کو مثبت اشارات ملنے شروع ہو گئے۔اس لیے کہ اُن کا نوجوان بھی اب مذہبی خرافات کی بجائے اُن علوم میں دلچسپی لینے لگا تھا جنھیں حاصل کر کے وہ اپنی اسی زندگی کو جنت بنا لے۔وہ دیکھ رہے تھے کہ جن لوگوں کے پاس دولت ہے انھیں کلیسا کی اُس جنت کی کوئی خاص پرواہ نہیں جسے حاصل کرنے کے لیے کلیسا نے انسانوں کا بے پناہ استحصال کیا تھا۔

یورپ کی بیداری میں عام لوگوں کی بپا کی ہوئی اُن تحریکوں کا بہت بڑا حصہ تھا جو انھوں نے اپنے سماجی اور مذہبی جبر کے خلاف بپا کی تھیں۔چنانچہ پہلے کسانوں کی بغاوت، پھر ہیومنسٹ تحریک، اس کے بعد رینا ساں کی تحریک، پھر روشن خیالی کی تحریک اور آخر میں صنعتی انقلاب کی طرف اہل مغرب کی جدوجہد نے اُن کو آخر کلیسا کے اُس جبر سے آزاد کرا ہی لیا جس کے خلاف انھوں نے صدیوں جدوجہد کی تھی۔مگر یہ اُن کی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ روشن خیالی کی تحریک کو جن ہاتھوں نے شروع کیا تھا وہ اسے انجام تک نہ پہنچا سکے۔اس لیے کہ انھوں نے لوگوں کو خدا کے انکار کی طرف کبھی بھی نہ بلایا تھا وہ تو محض کلیسا کی حد سے بڑی ہوئی طاقت کو کم کرنا چاہتے تھے۔مگر یہ تحریک مختلف ہاتھوں سے

ہوتی ہوئی جب اُن سیکولر ہاتھوں تک پہنچی جو خدا سے انکاری تھے تو انھوں نے کلیسا سے جان چھڑانے کے بجائے ایک ہی بار خدا سے جان چھڑا لینا مناسب خیال کیا۔ اُن کی عیاری کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سولھویں اور سترہویں صدی کے مغربی دانشوروں نے اپنی تحریروں میں کبھی خدا کا انکار نہیں کیا بلکہ اپنے قول و فعل سے لوگوں کو اس امر کی طرف بلایا کہ دولت حاصل کرو کہ خوشی کا منبع دولت ہے۔ دراصل وہ مغرب کے اُس سماج کے نبض شناس ثابت ہوئے تھے جس میں تاجر کی خواہش تھی کہ اُسے وہ ورکر ملے جو مذہبی عذر سے پاک ہو اور صرف کام کرنا جانتا ہو۔ چنانچہ مغربی محققین نے لوگوں کو صنعتی انقلاب کی برکتوں سے آشنا کیا۔ جب تجارت نے اُن معاشروں میں خوب ترقی کر لی اور جگہ جگہ دولت کے کرشمے نظر آنے لگے تو مغربی محقق اور تاجر دونوں کی خواہش بہ یک وقت پوری ہونی لگی کہ لوگ مذہب اور خدا سے بیگانہ ہو کر خود ہی دولت کے حصول میں پاگل ہونے لگے۔ انھیں اپنی پیداوار کے لیے نئی منڈیوں کی تلاش ہوئی تو شریفانہ طریقے سے تجارت کرنے کے بجائے انھوں نے دولت اور طاقت کے استعمال سے اپنی تجارت کو بڑھانا شروع کیا حتیٰ کہ کیا ولندیزی اور کیا اطالوی، کیا فرانسیسی اور کیا انگریز سبھی اپنے ملکوں سے نکل کھڑے ہوئے اور مشرق کا رخ کیا۔

اسلامی حکومتیں زوال کا شکار تھیں اس لیے میدان اُن کے لیے کھلا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہ آدھی دنیا کو نگل گئے اور ڈکار تک نہ لیا۔ وہ تو بھلا ہو ہٹلر کا جس نے بیسوی صدی میں ان مغربی اقوام کو اپنے گھر کا راستہ دکھایا۔ مغرب اپنے گھر کو لوٹا مگر اُس کا استحصال جاری رہا۔ اُس نے دنیا کو پہلی دنیا اور تیسری دنیا میں تقسیم کر دیا۔ یہ آج کا عصر ہے جو ہمارا موضوع نہیں۔ صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ مغرب نے خدا کو بھلا کر کچھ بھی نہیں پایا۔ اُنھوں نے خدا کا انکار کن علمی اور عقلی نظریات کے باعث کیا اگلے صفحات میں انھیں زیر بحث لایا جائے گا۔ (52*)   انشاءاللہ

میراث علم کا انتقال

تب مسلمان عسکری طور پہ ہرگز بھی کمزور نہ تھے مگر وہ وقت کے بدلتے اطوار کو نظر انداز کرنے کے جرم کا شکار ہوئے تھے۔ عباسی ریاست یہ سمجھتی تھی کہ تاتاری کبھی اُس پہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کریں گے مگر اُن کا یہ خیال غلط ثابت ہوا اور تاتاریوں نے حملہ کر دیا۔ یورپ میں مسلمان طاقتور تھے مگر اُن کی طاقت منقسم ہو چکی تھی ۔ ہسپانیہ کی عظیم اسلامی ریاست اگرچہ طاقتور تھی مگر وہ کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو چکی تھی جس کی وجہ سے اُن کی طاقت بھی منقسم ہو چکی تھی بلکہ اُس طاقت کو اب مسلم حکمران ایک دوسرے کے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ اور انھوں نے اس امر کو نظر انداز کیا کہ سارا یورپ ہسپانیہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور اپنے باہمی افتراق کے باوجود متحد ہو کر مسلم ہسپانیہ پر چڑھ دوڑنے کے عملی منصوبے بنا رہا ہے۔ مغرب کامیاب ہو گیا، مسلم ہسپانیہ مٹ گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ علم کی جو بسیط وراثت مسلم عہد ہسپانیہ اور عباسی عہد خلافت میں مرتب ہوئی تھی مغرب اسے سنبھالنے کا بھی اہل نہ تھا۔ چنانچہ مسلمان جب عسکری محاذوں پہ شکست کھا گیا تو علم

کا وہ ارتقاء بھی یک لخت رُک گیا جس کی وجہ سے مسلمان اُن رفعتوں کے حقدار ٹھہرے تھے اور دوسری قومیں جس سے محروم تھیں۔ علم کا وہ جھنڈا زمین بوس ہو گیا جس کی بنیاد انسانیت کی فلاح پہ رکھی تھی۔ یاد رہے کہ عسکری محاذوں پہ مسلمانوں کی پسپائی اور اہل مغرب کی پیش قدمی کے باوجود اہل مغرب اس قابل نہ تھے کہ وہ اس جھنڈے کو زمین سے اٹھا سکتے۔ بلکہ وہ کلیسا جس کے ایماء پہ مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر یہ عسکری مہم شروع کی گئی تھی وہ تو اس قدر جاہل تھا کہ اُس کے کارندوں نے مسلم ہسپانیہ کے شہروں میں قائم اکثر علمی خزائن کو آگ کی خوراک بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی اس قدر علمی اثاثہ محفوظ رہا کہ جب تقریباً سو سال بعد اہل مغرب کو علم کی اہمیت کا احساس ہوا اور انھوں نے مسلمانوں کے علمی ذخائر کو اطالوی، جرمن اور انگریزی زبانوں میں منتقل کیا تو دنیا کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

مسلمان علماء اور محققین کی سات سو سالہ علمی رفعت کے نشانوں نے مغرب کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ علم طب، علم ریاضی اور علم فلکیات کے تمام تر جدید علمی رجحانات کی بنیاد مسلمانوں کے اسی علمی اثاثے پر رکھی ہیں جو عہد عباسی اور مسلم عہد ہسپانیہ میں مرتب کیے گئے۔ عیسائی ایک بدعہد قوم ہیں انھوں نے اپنے رب سے بدعہدی کی، اپنے رسول کو خدا بنا لیا اور اللہ کے رسول نے اُن کو جن امور سے روکا تھا اُن سب کو اپنا لیا۔ بددیانتی کی یہی سرشت عود کر سامنے آئی جب انھوں نے مسلمانوں کے علمی خزائن کو حاصل کر لیا۔ اُن کے سامنے اب وہ بیش بہا علمی وراثت تھی جس کے وارث مغلوب ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس بندر بانٹ میں انھوں نے مسلمانوں کے نام کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اب اُن کے پاس وسائل تھے، طاقت تھی، علم کی ایک روایت بھی اُن کے ہاں قائم ہو چکی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کے علمی اثاثہ جات میں سے انھوں نے دین اور اُس کی حقانیت کو الگ کیا اور ایک طرف پھینک دیا کہ دین کے نام سے ہی اُن کو کلیسا کا جبر یاد آ جاتا تھا اور وہ لرز اٹھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مسلمانوں سے اسلام کے علاوہ سب کچھ آنکھ بند کر کے لے لیا بلکہ اپنے نام پہ منتقل کر لیا۔ چنانچہ معاشیات، اخلاقیات، عسکریات، سماجیات میں جو مثبت پہلو مغربی معاشروں میں اجاگر ہوئے وہ

انھی علمی خزائن کی بنیاد پہ وضع ہوئے جو دراصل مسلمانوں کی میراث تھی۔ میں ذکر کر چکا ہوں کہ جب ابن الہیثم آنکھ کے پیچیدہ ترین آپریشن کر رہے تھے تب مغرب میں امراض چشم کا ایک بھی ماہر موجود نہ تھا اور وہ سر درد کے مریض کے سر پہ ڈنڈے مار مار کر اُس کو مار دیتے تھے کہ اُن کا خیال تھا کہ اس کے سر میں شیطان گھس گیا ہے۔

اس سطح کی علمی ذہنیت کے حامل معاشروں کو جب بیٹھے بٹھائے مسلمانوں کی انمول علمی میراث مل گئی تو وہ خود کو مہذب اور باقی ساری دنیا کو غیر مہذب کہنے لگے۔اُن کے سائیکل ٹھیک کرنے والوں اور لکڑی کاٹنے والوں تک نے مسلمانوں کی دقیق علمی کتابوں کو اپنے نام سے شائع کرا لیا اور عالم بن بیٹھے۔انھوں نے مسلمانوں کی ہر ایجاد اور ہر علمی دریافت کے سامنے کسی مغربی کا نام لکھنا اپنا فرض منصبی سمجھ لیا۔پھر مغرب ہی کے کچھ راست باز مورخین نے لوگوں کو اس امر سے آگاہ کیا کہ مغرب کی ترقی مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔مسلمان علماء کی ہزار سالہ علمی جدو جہد ہی مغرب کی ترقی کی بنیاد ہے۔مزید براں انھوں نے ایسے انکشافات بھی کیے جن سے ظاہر ہوا کہ مغرب نے اپنی فطری بد دیانتی کی بدولت مسلمانوں کی علمی میراث کو کس طرح اپنے نام پہ منتقل کیا۔اس کی تفصیل نہایت بسیط ہے،ہم یہاں صرف چند اشارات پہ اکتفاء کریں گے۔

◄◄ ۔انھوں نے کہا:

علم کیمیا کی ابتداء فرانس کے موسیو انٹو نے لاوراں لوائی زیر نے کی۔

حقیقت یہ ہے کہ!

علم کیمیا کی بنیاد جابر بن حیان نے رکھی تھی۔

✡✡✡✡✡✡

◄◄ ۔انھوں نے کہا: بارود راجر بیکن کی ایجاد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ!

راجر بیکن سے صدیوں پہلے مسلمان بارود ایجاد کر چکے تھے۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

قطب نما (خلویوگوجہ) نے ایجاد کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ!

قطب نما عربوں کی ایجاد ہے۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

پینڈولم گلیلیو نے ایجاد کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ!

پینڈولم مصری سائنس دان ابن یونس کی ایجاد ہے۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

کشش ثقل کو نیوٹن نے دریافت کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ!

نیوٹن سے کئی صدیاں قبل ابو یوسف یعقوب کندی نے کشش ثقل پہ کتابیں لکھ دی تھیں۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

حرکت کے بنیادی قوانین نیوٹن نے دریافت کیے۔

حقیقت یہ ہے کہ!

نیوٹن سے کئی سو سال پہلے حرکت کرتے اجسام کا مطالعہ ابوبکر رازی نے کیا تھا اور اس پہ کتابیں بھی لکھیں۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

قوس قزح کی وجہ ایک فرانسیسی نے دریافت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ!

کمال الدین فارسی نے سب سے پہلے قوس قزح کے بارے میں صحیح نظریہ پیش کیا۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

وقت اور حرکت کے مابین تعلق کو واضح کرنے کے بارے میں وہ ایک جرمن (Bob ELGSANDER) نام لیتے ہیں یاد رہے یہ ایک فرضی نام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ!

ابن سینا نے سب سے پہلے وقت اور حرکت کے مابین تعلق کو واضح کیا۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

عینک فرانسیسی ماہر چشم (Colen) نے ایجاد کی۔

حقیقت یہ ہے کہ!

عینک ابن فرناس نے ایجاد کی۔

✡✡✡✡✡✡

◀◀۔انھوں نے کہا:

دوربین گلیلیو نے ایجاد کی۔

حقیقت یہ ہے کہ دوربین ابو محشر بلخی نے گلیلو سے کئی صدیاں پہلے ایجاد کی تھی۔

✡✡✡✡✡✡

◀◀۔انھوں نے کہا:

ریاضی میں Decimal کا اضافہ (Simon Stevin) نے کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ!

علم ریاضی میں Decimal کا اضافہ (Simon Stevin) سے سو سال پہلے الکاشی نامی مسلمان نے کیا تھا۔جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُن کی کتاب ''مفتاح الحساب'' میں Decimal کا پورا کلیہ بیان کیا گیا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

◀◀۔انھوں نے کہا:

علم ریاضی میں logretham کا اضافہ (Napier) نے کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ!

علم ریاضی میں logretham کا اضافہ (Napier) نے نہیں بلکہ ابوالحسن اقلیدسی نے کیا۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

ریاضی میں علامتوں یعنی X&Y کا استعمال سب سے پہلے فرانسیسی ریاضی دان (Vita) نے کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ!

علامتوں کو سب سے پہلے الخوارزمی نے رواج دیا وہی الجبرا کے موجد ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

علم اسٹرانومی کی بنیاد (Tycoquetum) نے رکھی جو ڈینش تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ!

علم اسٹرانومی کی بنیاد ابولوفا نے رکھی جو مسلمان تھے۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔انھوں نے کہا:

سب سے پہلے دوران خون کا مطالعہ (William Harvey) نے کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ!

یہ کارنامہ ابن یونس نے سرانجام دیا تھا۔

یہ اُس طویل داستان کی ایک سرسری سی جھلک ہے جس سے ہم صرف یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ خود کو مہذب کہنے والا مغرب کس قدر بڑا چور ہے۔ ہم نے طوالت کے خوف سے تمام تفصیلات درج نہیں کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس امر کا اعتراف بھی اہل مغرب ہی سے آیا جنھوں نے قدرے فراغ دلی سے کام لیا ہے ورنہ اس سے قبل تین صدیوں تک تو اہل مغرب مسلمانوں کے تمام تر علمی ذخائر پہ متصرف رہا اور مسلمانوں کو وحشی ہی کہتا رہا۔ ہم نے مسلمانوں کی علمی میراث کا بہت تذکرہ کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کچھ نظائر یہاں پیش کر دیئے جائیں۔

- علم کیمیا کے موجد مسلمان ہیں۔
- کاغذ اور کپڑے کو رنگنے کا طریقہ مسلمانوں نے دریافت کیا۔
- کاغذ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- بارود مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- قطب نما مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- علم ریاضی کی بنیادیں مسلمانوں نے وضع کیں۔
- الجبرا کے موجد الخوارزمی ہیں۔
- علم طبیعات مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔
- علم فلکیات کا آغاز مسلمانوں نے کیا۔
- تیزاب مسلمانوں کی دریافت ہے۔
- کیمرہ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- صابن کا استعمال سب سے پہلے مسلمانوں نے کیا۔
- عینک مسلمانوں نے ایجاد کی۔
- شیشہ سازی کو عربوں نے عروج تک پہنچایا۔

- الکحل مسلمانوں کی دریافت ہے۔
- گندھک مسلمانوں کی دریافت ہے۔
- فولاد سازی کو مسلمانوں نے رواج دیا۔
- سرکہ مسلمانوں کی دریافت ہے۔
- پارہ مسلمانوں کی دریافت ہے۔
- بصریات کے موجد کندی ہیں۔
- قوس قزح کی تشریح مسلمانوں نے کی۔
- انعکاس اور انعطاف کے قوانین مسلمانوں نے دریافت کیے۔
- حرکت کے قوانین مسلمانوں کی دریافت ہیں۔
- نظریہ اضافت پہ سب سے پہلے مسلمانوں نے اظہار خیال کیا۔
- پیمائش کے آلات مسلمانوں نے ایجاد کیے۔
- پن چکیاں مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔
- گھڑیاں مسلمانوں کی ایجاد ہیں۔
- بندوق مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- ڈوبے ہوئے بحری جہازوں کو سطح پر لانے کا طریقہ مسلمانوں نے دریافت کیا۔
- اصطرلاب مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- ترازو مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- راکٹ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- فوارہ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- چھاپہ خانہ مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- شکر مسلمانوں کی ایجاد ہے۔

- کھاد تیار کرنے کا طریقہ مسلمانوں نے دریافت کیا۔
- مصنوعی حرارت سے انڈوں سے بچے سب سے پہلے مسلمانوں نے نکالے۔
- کولڈ سٹوریج مسلمانوں کی ایجاد ہے۔
- علم الارضیات کی بنیاد البیرونی نے رکھی۔
- علم الحیوان کی بنیاد ابن سینا نے رکھی۔
- علم طب میں رازی نے کمال حاصل کیا۔
- ریاضی میں مسلمانوں کا اہم کارنامہ صفر کی دریافت ہے۔
- ابوالحسن علی بن احمد نے دنیا کو اشاری نظام دیا۔
- الگورزم، سائن اور لاگرتھم مسلمانوں کے علوم ہیں۔
- ابوسعید احمد بن محمد نے سب سے پہلے مثلثوں کا مطالعہ کیا۔
- لیپ ائیر کا آغاز عمر خیام نے کیا۔
- دنیا کی پہلی رصدگاہ مسلمانوں نے بنائی۔
- چاند کے سمندر کے مدوجزر پہ اثرات کا نظریہ ابومحشر بلخی نے پیش کیا۔
- عمر خیام نے ریاضی میں گراں قدر اضافے کیے۔
- لین دین کے لیے ہنڈیوں کا طریقہ مسلمانوں کی دریافت ہے۔
- الخوارزمی نے دنیا کو سب سے پہلی جیبی جدول دی۔
- سورج کی کشش کو سب سے پہلے مسلمانوں نے پہچانا۔
- سورج کی سطح پہ دھبے ہیں اس کا انکشاف مسلمان ماہر فلکیات نے کیا۔
- زمین کی گردش کو سب سے پہلے مسلمانوں نے دریافت کیا۔
- دنیا کا پہلا پلینی ٹیریم ابن فرناس نے بنایا۔
- زکریا بن محمد القروینی نے انکشاف کیا کہ موسم کیوں بدلتے ہیں۔

- زمین کے محیط کی پیمائش سب سے پہلے البیرونی نے کی۔
- اہل علم اب جانتے ہیں کہ کولمبس سے سینکڑوں سال پہلے مسلمان امریکہ جا چکے تھے۔
- ابن خلدون نے دنیا کو فلسفہ تاریخ سے آگاہ کیا۔

✡✡✡✡✡✡

یہ ایک مختصر دستاویز ہے جو ہم نے بیان کی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تذکرہ بہت بسیط ہے اور الگ سے ایک جلد کا متقاضی ہے مگر ہم یہاں صرف اس بات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی علمی رفعت کوئی تاریخی مغالطہ نہیں بلکہ وہ ایک حقیقت ہے جس نے دنیا میں اپنے وجود کو ثابت کیا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں عیسائیوں کی حالت زار کا بیان گزر چکا ہے۔ مگر یہی پست قوم جب مسلمانوں کی علمی میراث کی وارث ہوئی تو کہنے لگی کہ مسلمان تو وحشی اور اجڈ قوم ہیں صرف وہی علم کی مسند اعلیٰ پر فائز ہیں۔ حالانکہ اُن کی علمی صلاحیتوں کا یہ حال تھا کہ مسلمانوں کی دریافتوں اور علمی انکشافات کو سمجھنے میں اُن کی کئی نسلیں خرچ ہوگئیں اور جب وہ اس قابل ہوئے کہ وہ علم کے اِن خزائن سے کماحقہٗ فائدہ اٹھا سکیں تو انھوں نے اپنی قوم کو مادیت اور خدا سے بے اعتنائی کے اُس نظام زیست کی طرف بلایا جس کا عکس آج کے مغربی معاشروں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کے علمی خزائن سے کئی سو سال تک وابستہ رہنے سے اُن کے ہاں علم کی اُس روایت نے جنم لیا جس کی بنا پہ انسان نے جدید سائنس کی طرف مراجعت کی۔ جدید سائنس نے بلاشبہ انسانیت کی بہت خدمت کی۔ ہمیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں انسانی زندگی کو سہل بنانے کے لیے سائنس نے جو بے شمار ایجادات کیں مسلمانوں کا اُس میں بہت کم حصہ ہے۔ مگر سائنس جب خدا کے تصور کے بغیر آگے بڑھی تو اُس کے دامن سے انسانیت کے فلاح کے نظائر کم اور انسانیت کی بربادی اور ہلاکت کے اسباب زیادہ منظر عام پہ آئے۔ ہمارے اس استدلال کو سامنے رکھتے ہوئے آنے والے مباحث پہ نظر رکھیں تو آپ جان جائیں گے کہ مغرب نے گذشتہ تین چار صدیوں میں علم نام پہ

صرف جہالت بانٹی ہے کہ خدا کے انکار سے بڑی بھی کوئی جہالت ہو سکتی ہے؟؟؟

✡ ✡ ✡

تین شیطان، ایک بیان

سترہویں اٹھاریں صدی میں مغرب میں گندی نالی میں کیڑوں کی طرح ہر طرف عالم جنم لے رہے تھے جن کی کوئی علمی سوچ نہ تھی بلکہ وہ صرف مسلمانوں کی نقالی کو علم سمجھتے تھے۔ چنانچہ فلسفہ ہو یا سائنس مغرب کے علماء نے انسان کو صرف یہ درس دیا کہ وہ خدا کا انکار کریں اس کے بعد ہی اُن پہ دنیاوی ترقی کے دروازے کھلیں گے۔ چنانچہ تھامس ہوبس ہو یا رینے ڈیکارٹ، فرانس بیکن ہو یا ڈیوڈ ہیوم، برٹرنڈ رسل ہو یا ہربرٹ سپنسر، اگسٹ کومٹ ہو یا عمانویل کانٹ، شوپنہائیر ہو یا فریڈرک نٹشے سب کی تعلیمات میں ایک بات یکساں تھی کہ انسان اور کائنات کے باہمی تعلق میں کسی خالق کی کوئی گنجائش نہیں۔ خود مغرب کا معاشرہ بھی سائنس اور صنعت کے انقلاب میں مشغول تھا اور کلیسا کے جبر کو بھولا نہ تھا اس لیے وہ خود بھی کسی خالق سے کسی قدر بیزار تھا اب عیسائیت کلیسا کی بڑی بڑی عمارتوں میں مقیّد تھی۔ پادری موجود تھا چرچ موجود تھا مگر عیسائی موجود نہ تھے۔ اس لیے کہ عیسائیوں کے پاس اب وقت نہیں تھا کہ وہ چرچ میں اپنا وقت برباد کریں انھوں نے زبان سے خدا کا انکار نہیں کیا تھا بلکہ اپنے عمل سے خدا کا انکار کیا تھا۔ اوپر سے اُن کا ہر صاحب دانش اُن کو یہی بتا رہا تھا کہ یہ

کائنات محض اتفاق سے وجود میں آ گئی تھی اس کا کوئی خالق نہیں۔لوگوں کو یہ نظریات پسند آ رہے تھے کہ وہ بھی اپنے دل میں اب چرچ سے کوئی عقیدت محسوس نہ کرتے تھے۔اُن کے علم کا عمومی مزاج خدا کے انکار پہ رکھا تھا۔بہت سے محققین اور سائنس دانوں نے اپنی تحقیق کو اس طرح پیش کیا جس سے لوگوں میں مذہب بیزاری کے جذبات پیدا ہوں۔

رفتہ رفتہ مغربی معاشرہ مادیت کی اُن راہوں کو چل نکلا جس میں کسی خالق کی کوئی گنجائش نہ تھی۔تاہم انیسویں صدی میں تین سکالرز نے اہل مغرب کی زندگی پہ انمٹ نقوش چھوڑے اور وہ انھی نظریات کے اثیر ہو کے رہ گئے جن کی طرف اِن تین لوگوں نے اُن کو بلایا تھا۔اُن تین لوگوں کے نام یہ ہیں سر چارلس ڈارون،سگمڈ فرائیڈ اور کارل مارکس۔یہی وہ تین لوگ تھے جنھوں نے انیسویں صدی میں وہ انقلاب بپا کیا جس کے بعد عملی طور پہ اہل مغرب دین اور روحانیت سے بہت دور اور مادیت اور الحاد سے بہت قریب ہو گئے۔ڈارون،مارکس اور فرائیڈ کے نظریات میں مشترک قدر یہ تھی کہ اُن تینوں نے خدا کا انکار کیا۔

ڈارون نے کہا:

انسان بن مانس کی اولاد ہے اور ترقی کے زینے طے کرتا ہوا موجود ہیت تک پہنچا ہے۔اُس کا کوئی خالق نہیں وہ خود بخود ہی پیدا ہو گیا تھا۔

فرائیڈ نے کہا:

انسان کے تمام جذبات ایک بنیادی جذبہ سے پیدا ہوتے ہیں جس کو شہوت کہا جاتا ہے۔اور جنسی جذبہ ہی سب سے شدید جذبہ ہے یہی جذبہ انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔وہ دوسرے نفسیات دانوں کی طرح روٹی کپڑا اور مکان کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار نہیں دیتا بلکہ کہتا ہے کہ انسان کا سب سے پہلا حق شہوانی جذبہ کی تسکین ہے۔

مارکس نے کہا:

انسان کی نجات اس میں ہے کہ وہ معاشی رفعت حاصل کرے۔دولت ہی میں تمام تر خوشی ہے اور

تمام جذبے دولت ہی سے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ وہ دولت ہی کو انسان کی پہلی اور آخری منزل قرار دیتا ہے۔ آج مغرب کا ہر شہری انھی نظریات کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ پولینڈ کا کوئی شہری ہو یا آسٹریا کا کوئی حجام، ناروے کا کوئی استاد ہو یا انگلستان کا کوئی پولیس مین، ڈنمارک کا کوئی دیہاتی ہو یا سوئٹزرلینڈ کا کوئی گھڑی ساز، پیرس کا تاجر ہو یا نیویارک کا بینکرز۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کارلس مارکس، ڈارون یا فرائیڈ کو جانتے ہوں مگر اُن کی زندگی کے چوبیس گھنٹوں کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ سب اُنھی نظریات کے پیروکار ہیں جو اِن لوگوں نے مغرب کو دیئے تھے۔ اُن کے دن کا آغاز شراب سے ہوتا ہے۔ اُن کا سارا دن سودی کاروبار میں صرف ہوتا ہے یا وہ کوئی بھی کام کرتے ہوں دولت حاصل کرنے کا جنون قدر مشترک ہے۔

اُن کی رات زنا اور شراب کے نشے میں بسر ہوتی ہے اور وہ کسی خالق کے ذرا بھی احسان مند نہیں جس نے انھیں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ بلکہ اُن تمام کی مشترکہ سوچ یہی ہے کہ جو کچھ انھیں حاصل ہے وہ اُن کی اپنی محنت اور ذہانت کا نتیجہ ہے اور وہ اس طرز زیست سے بالکل مطمئن ہیں جس کو انھوں نے اپنا رکھا ہے۔ اپنی سماجی برائیوں، اخلاقی پستیوں، روحانی کمیوں اور انسانیت سے فروتر اس تخیل زیست پہ نظر ثانی کرنے کے لیے نہ تو اُن کے پاس وقت ہے اور نہ ہی وہ کسی سنجیدہ سوچ کے حامل ہیں کہ وہ زندگی کی مقصدیت پہ غور کریں۔ اُن کے نزدیک زندگی خوشی کے حصول کا نام ہے اور خوشی سے اُن کی مراد عیاشی ہے۔ مغرب نے اپنی قدیم روایات سے انحراف کی راہ کو اپنایا ہے جس کے باعث اُن کے معاشرے عجیب سی پست صورت اختیار کر گئے ہیں کہ اُن کی موجود نسل میں اسی فیصد نوجوانوں کو اپنی ماں کا نام تو معلوم ہے کہ وہ اس کے پیٹ میں نو مہینے تک مقیم رہے ہیں مگر انھیں اپنے باپ کا نام معلوم نہیں کہ وہ کس کے نطفے ہیں۔ بلکہ شاید اُن کی ماں کو بھی درست طور پہ معلوم نہ ہو کہ وہ کس کا بچہ ہے۔ کیونکہ وہ ہر روز مانع حمل گولیاں کھا کر ایک نئی گود سجاتی ہے تو اسے کیا معلوم یہ ناپسندیدہ مہمان کس رات اُس کے وجود کا حصہ بن گیا حالانکہ نہ اُس کی ماں کو اس کی خواہش تھی اور نہ ہی اُس کا باپ اس جھنجٹ کو پالنے کا خواہش مند تھا وہ تو محض وقتی خوشی حاصل

کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے اور اگلی صبح انھوں نے جدا ہو جانا تھا اور اگلی رات کے لیے نیا ساتھی تلاش کرنا تھا۔ اسی تگ ودو میں اُن کی جوانی گذر جاتی ہے اور وہ کسی اولڈ ہوم میں بوسیدہ اور بودیتے گوشت کی طرح سوچتے ہیں کیا زندگی یہی ہے۔ مگر وہ اسی زندگی کو اپنائے ہوئے ہیں اور کیوں اپنائے ہوئے ہیں اس کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ ہے کہ جب وہ کسی خالق کے وجود کے انکاری ہیں تو خالق کی رحمت بھی اُن سے دور ہے۔

اس لیے چار روزہ زندگی کو وہ خوشی کی تلاش میں گزار دیتے ہیں اور صحرا میں بھٹکے کسی مسافر کی طرح سراب ہی کو منزل سمجھ لیتے ہیں۔ اُن کی زندگیوں کو اِن راہوں پہ ڈالنے کے لیے جو علمی اور عقلی استدلال فراہم کیا جاتا ہے وہ مارکس، فرائیڈ اور ڈارون ہی کے نظریات سے فراہم کیا جاتا ہے ۔ڈارون، فرائیڈ اور مارکس کی تعلیمات ہی مغربی نظریہ حیات کے بنیادی پتھر ہیں جن پر لادینی مادہ پرست مدنیت کی عمارت استوار کی گئی ہے۔ یہی نظریات مغربی تہذیب کا سرچشمہ ہیں۔ انھی نظریات نے مغربی ممالک کے باشندوں کے طرزِ زیست کو متعین کیا ہے۔ اِن فلاسفر کے نظریات اہلِ مغرب میں دور تک سرایت کر گئے ہیں اور اُن کا بسیط اثر آج تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یورپی اقوام کا طرزِ عمل اس بات کا غماز ہے۔

مثال کے طور پہ دیکھیں کہ ڈارون نے کہا کہ فطرت یہی ہے کہ طاقتور کمزور کو کچل دے۔ آج مغرب اسی پہ عمل پیرا ہے۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ جس چیز کو علمی طور پہ فطری سمجھ لیتی ہے عملی زندگی میں اسی کو درست قرار دے لیتی ہے۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء کمزور کی فنا اور قوی کی کامیابی کی بنا پہ منتج ہونے والی کشمکش حیات میں اسی طرزِ عمل کو فطرت قرار دے رہا ہے۔ اسی کے مدنظر انسان کی عملی زندگی میں افراد اقوام اور طبقات کی کشمکش بھی فطری اور درست قرار پاتی ہے اور اس کے نتیجے میں قوی کا کمزور کو نگل جانا بھی فطرت قرار پاتا ہے۔ دیکھیں کہ آج مغرب بالکل اسی قانون پہ عمل پیرا ہے وہ اقوام کا استحصال کر رہا ہے۔ کہیں انھیں معاشی شکنجوں میں جکڑ رکھا ہے تو دیگر اقوام کو طاقت کے بل پہ دبا رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے اس نقطہ نظر نے دنیا کا چہرہ لہولہان کر رکھا ہے۔

اِن فلاسفہ کے نظریات سے پہلے دنیا ایسی نہ تھی۔ تب دنیا میں رواداری اور اخلاق کا چلن تھا۔ لوگ بنیادی انسانی حقوق کے بارے میں سوچتے تھے۔ اب لوگ صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتے ہیں۔ مغرب کا معاشرہ بھی اس سے قبل ایک مذہبی معاشرہ تھا۔ معاشرے میں مذہبی اخلاق کا ایک وقار تھا جسے ڈارون جیسے بے عقلوں نے چھین لیا۔ تب مغرب میں بالعموم اُس مذہبی تصورِ مساوات کا کسی قدر تخیل موجود تھا جو اُن کے پیغمبر لے کے آئے تھے۔ مذہبی اخلاقیات کے باعث طاقتور اور کمزور کے حقوق یکساں تھے اور طاقتور کے ہاتھ کمزور کی حق تلفی کے خلاف آواز اٹھائی جا سکتی تھی۔ تاہم ڈارون کے نظریات سامنے آنے کے بعد اُس کے نظریہ ارتقاء نے پہلی بار انسانوں کے ذہن میں اس خلجان کو پیدا کیا کہ طاقت ور کا کمزور کو نگل جانا اصول فطرت کے خلاف نہیں بلکہ عین فطرت ہے۔ طاقتور اقوام کا کمزور اقوام کو دبائے چلے جانے کا جواز بھی اسی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ نسلی برتری اور امتیاز کے نظریئے بھی اس سرچشمہ سے سیراب ہوتے ہیں۔

چنانچہ نئی تہذیب کے اس رجحان اور نظریہ نے قدیم اخلاقی قدروں کو نگل لیا۔ نئی روشنی کے دلدادہ نئے نظریات کو خوشی سے قبول کر رہے تھے مگر قدامت پسند اور روایت پسند حلقوں سے ڈارون کے اس غیر انسانی اور غیر اخلاقی نظریہ حیات کے خلاف آواز اٹھائی جا رہی تھی۔ اِن میں سب سے بلند آواز مذہبی حلقوں کی تھی۔ چنانچہ معاشرے پہ ایک دباؤ بن گیا جس کے باعث جدت پسندوں نے اس مسئلے کا ایک نیا حل ڈھونڈ نکالا۔ وہ حل یہ تھا کہ قدامت پسندوں کی ہاں میں ہاں ملائی جائے مگر عملی طور پہ نئے رجحانات اور نظریات کو اپنائے رکھا جائے۔ اس مصلحت بینی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی روشنی کے پیروکار کے لیے ریاکاری کوئی عیب نہ رہی بلکہ ایک ہنر بن گئی آرٹ قرار پائی۔ قبل ازیں انسان کے ظاہر اور باطن کا ایک ہونا مذہبی اقدار میں سے ایک اہم اخلاقی قدر تھی جس کے گرد فرد اور اقوام کی تقدیریں گھومتی تھیں۔ لیکن ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے غیر مرئی اثر نے اس انمول مذہبی قدر کو بری طرح کچل ڈالا اور ریاکاری معاشرے کا معمول قرار پائی۔ دلوں میں بغض و عناد کے باوجود خندہ پیشانی سے ملنا، بظاہر انتہائی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مبہم اور

صقیل الفاظ استعمال کرنا اور میڈیا کے سامنے الفاظ کے ہیر پھیر سے خود کو حق پہ ظاہر کرنا جدید دور کا سفارتی ادب قرار پایا۔ چنانچہ اُن معاشروں میں چالاکی، عیاری اور مکاری کو اس قدر فروغ حاصل ہوا کہ ایمانداری اور سچائی کو سادہ لوحی قرار دیا جانے لگا۔

یہ الفاظ تحریر کرتے ہوئے مجھے وہ منظر یاد آ رہا ہے جب امریکی سیکریٹری دفاع نے چمکتی دمکتی روشنیوں میں کیمرے کے سامنے آ کر کہا کہ عراق پر حملہ دراصل غلط اطلاعات کی بنا پہ کیا گیا تھا تاہم مقاصد حاصل کر لیے گئے ہیں۔ تب اُس کے چہرے پہ دس لاکھ عراقیوں جن میں چار لاکھ دس سال سے چھوٹی عمر کے بچے بھی شامل تھے کے خون ناحق پہ ندامت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ یہی ڈارون ازم ہے۔ کوئی ایک شخص جو کمزور ہو قتل کے بدلے قتل کر دیا جاتا ہے اور جو طاقت ور ہو دس لاکھ لوگوں کا قاتل ہو وہ مصنوعی خوشبوؤں سے مہکتے سوٹ، چمکتے دمکتے بڑے بڑے ہالوں میں بلند مسند پہ کھڑے ہو کر کیمروں کی کھنکھناتی روشنیوں میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے دس لاکھ لوگوں کے قتل کا اعتراف کرتا ہے مگر دنیا کی کوئی عدالت اس قاتل کو مجرم قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتی۔

یہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہی تھا کہ انسان اپنے حیوانی آباؤ اجداد کی خصلتوں کی طرف عود کرنے پہ مجبور ہوا۔ اور ظاہر ہے اُن باپ بندر تھا جو جنگل میں رہتا ہے تو اس کے منطقی نتیجے کے طور پہ انھوں نے اس دنیا میں جنگل ہی کا قانون رائج کیا۔ ذرا سی گہری نگاہ ڈالیں۔ اپنے اردگرد دیکھیں۔ عالمی سیاست کی چالبازیوں پہ صرف چند لمحے غور کریں تو آپ جان جائیں گے کہ واقعتاً آج دنیا میں جنگل ہی کا قانون رائج ہے۔ ڈارون ہی کا نظریہ ارتقاء پھل پھول رہا ہے۔ آج مغربی اور طاقتور اقوام UNO میں دنیا کے تمام تر مسائل اسی قانون کے تحت حل کرتی ہیں۔ مظلوم کی آواز اُس کے گلے میں پھنس کے رہ گئی ہے۔ اور زبردست قوتیں کھاتی بھی ہیں اور غراتی بھی ہیں۔ جب کسی معاملے پہ رائے شماری کا وقت آتا ہے تو کمزور اقوام کو حق کے خلاف ناحق کی حمایت پہ مجبور بھی کرتی ہیں ایک نہیں ہزاروں مسئلے اس کے شاہد ہیں۔ تفصیلات سے تمام عالم کے اخبارات بھرے پڑے ہیں۔ پھر فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات ہیں جن میں کھلے طور پہ انسان کو جنسی حیوان قرار دیا گیا ہے۔ اُس نے جنسی بے راہ روی کو عین فطرت کی پکار بتایا ہے۔ فرائیڈ نے کہا کہ اخلاقی بندشوں سے انسان میں جور دعمل پیدا

ہوتا ہے اسی سے بیماریاں جنم لیتی ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کو کھلی جنسی آزادی ہو جس طرح سور اور کتا جنسی آزادی پہ یقین رکھتے ہیں اور نام نہاد اخلاقی قدروں کی پرواہ نہیں کرتے اسی طرح انسان کو بھی سور اور کتا بن جانا چاہیے جب اُسے ضرورت محسوس ہو تو اُسے صرف عورت کی ضرورت ہے چاہے وہ اس کی بہن ہو یا بیٹی۔

ذرا غور کریں کیا مغرب فرائیڈ کی بات پہ ایمان نہیں لے آیا۔ جواب یہ ہے کہ ہاں آج مغرب فرائیڈ ہی کے جنسی نظریات کا پیرو ہے اور جنسی حیوان بن چکا ہے ۔ وہاں محرمات کی بھی کوئی قید نہیں۔ اگرچہ عام طور پہ ایسا نہیں ہوتا کہ انسان میں شرف کا احساس کبھی کتے اور سور کی اخلاقی پستی تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ آج کا مغربی شہری فرائیڈ کے تخیل حیات کے عین مطابق جنسی حیوان بن چکا ہے۔ وہ زندگی کا ساتھی نہیں بلکہ ایک رات کا ساتھی چاہتا ہے۔ وہ بچے پیدا نہیں کرنا چاہتا کہ اُن کو پالنے کے لیے اُس کے پاس وقت نہیں۔ چنانچہ ناروے، سویڈن اسٹریلیا، کینیڈا اور کئی دیگر مغربی مما لک میں حکومتیں مراعات اور انعامات کا اعلان کر کر کے تھک گئی ہیں کہ کون سا جوڑا ہے ناجائز ہی سہی مگر دوسرا بچہ پیدا کرے اور ہم سے اتنا انعام لے جائے کیونکہ اِن اقوام کو یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ آئندہ صدی میں شاید کوئی اُن کا نام لیوا ہی نہ باقی بچے۔

قدیم عیسائی تہذیب کے محافظ آخر انگلستان کا بھی یہی حال ہے اور اس بات کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ عنقریب اُن کی اپنی آبادی تارکین وطن سے کم ہو جائے گی اور ملک کے قوانین تارکین وطن بنایا کریں گے۔ یاد رہے کہ انگلستان میں مشرقی مما لک کے باشندوں کی تعداد کئی کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ مگر یہ سب کیا ہے۔ یہ فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ یہ فرائیڈ کی گندی ذہنیت کا عکس ہے کہ اُس نے انسان کو اخلاقی قدروں سے منہ موڑنے کی دعوت دی اور اُسے کتے اور سور کے برابر بنا دیا۔ یہ الہامی اخلاقی اقدار سے انحراف کی سزا ہے کہ اہل مغرب اپنی نئی نسل کو عورت کے رحم میں جانے سے روک دیتے ہیں اور اسے اٹھا کر کونے میں پڑے کوڑے کے ڈرم میں ڈال دیتے ہیں۔ فرائیڈ نے عورت کو گھر سے باہر نکال دیا۔ عورت بے حیائی کا آلہ بن کے رہ گئی۔ وہ کسی کے دل کے رانی ہونے کے بجائے شمع محفل بن گئی۔ کنواری ماں بننا عیب نہ رہا۔ حرامی بچوں کی کثیر تعداد

مغربی حکمرانوں کے لیے دردسر بن کے رہ گئی اور یہی فرائیڈ کے علم کا ثمر تھا۔ پھر مارکس نے مادی الحاد کو آخری دلیل فراہم کر دی۔ ڈارون اور فرائیڈ کے تیار کردہ معاشروں میں دولت کی ناہموار تقسیم، سرمایہ داروں کی عیاشی، غریبوں کی فاقہ کشی اور اخلاقی قدروں کے فقدان نے کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ چنانچہ مزدور کی بے بسی جب انتہا کو پہنچی تو اُس نے غضب ناک ہو کے کروٹ لی اور ہر قید و بند سے آزاد ہو کر وحشی جانور کی طرح سرمایہ دار پہ ٹوٹ پڑا۔ جوش غضب میں اُس نے سرمایہ دار کے ساتھ ساتھ اخلاق و مذہب کو بھی تہ تیغ کر دیا۔ روس کے خونی انقلاب میں سرمایہ داروں کے ساتھ مذہبی اجارہ داروں کو بھی چن چن کے قتل کیا گیا کہ ڈارون اور فرائیڈ کی طرح مارکس کے نظریہ حیات میں بھی کسی خدا کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ اشتراکیوں نے مذہب اور سرمایہ کی لاش پہ مزدوروں کی تنظیم کے ساتھ ایک ایسی تحریک منظّم کی جس میں دولت کی مساوی تقسیم کے ساتھ ساتھ تمام تر انسانی دکھوں سے نجات کا مژدہ سنایا گیا تھا۔ مگر خالق کے تصور سے عاری اس نظام حیات کا ہماری نظروں کے سامنے جو عبرت انگیز انجام ظاہر ہوا اس سے انسانیت نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ڈارون، فرائیڈ اور مارکس نے دنیا کو کیا دیا اگلے صفحات میں ہم اِنھی تینوں سکالرز کے نظریات اور اُن کے نتیجے میں استوار ہونے والے معاشروں کے احوال پہ بحث کریں گے۔

✡ ✡ ✡

ڈارون مارکس اور فرائیڈ نے انسانوں کی کس بسیط آبادیوں کو ذہنی خلجان میں مبتلا اور اُن سے اُن کے خدا کو چھین لیا اس کا اندازہ لگانا تو دشوار ہے تاہم حقیقت یہی ہے کہ دور دور تک جہاں تک نظر جاتی ہے انسانوں کے وہ معاشرے نظر آتے ہیں جو یا تو کسی تصور خدا کے بغیر ہی زیست کر رہے ہیں یا پھر روایتی طور پر اگر اُن کے ہاں کسی خدا کا تصور موجود بھی ہے تو عملی طور پر وہ اس سے لاتعلق ہو چکے ہیں اور بس ایک رسمی سا تعلق ہے جس کی بنا پر وہ خود کو ایک خدا شناس معاشرہ کہتے ہیں مگر اصل صورت یہی ہے کہ وہ خدا کو بھول چکے ہیں۔

چارلس ڈارون

وہ 1808ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ ڈارون کا بچپن مذہبی لوگوں کے سائے میں بسر ہوا۔ جامعہ کیمبرج سے اُس نے دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ اس ڈگری کو حاصل کرنے کے بعد اُسے پادری بننا تھا مگر اُسے ایک سائنسی تحقیقاتی محکمے میں نوکری مل گئی جو لوگوں کی چھوٹی موٹی مہمات کو سائنسی تحقیق کے لیے روانہ کیا کرتے تھے۔ ڈارون جب اپنی پہلی سائنسی تحقیق پہ روانہ ہوا تو وہ چوبیس سال کا ایک مذہبی نوجوان تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سمیت بیگل نامی بحری جہاز سے روانہ ہوا تو عام لوگوں کی طرح انسانی ارتقاء کے بارے میں اس کا نظریہ بھی یہی تھا کہ ہر جاندار کو انفرادی اور خاص طور پہ خالق نے اپنے امر سے بنایا ہے۔ تین سال بعد جب ڈارون جنوبی امریکہ کے ساحلوں سے ہوتا ہوا ایکوڈور کے راستے انگلستان میں داخل ہوا تو وہ ملحد ہو چکا تھا اور حیات کے ارتقاء کے بارے میں اس کے خیالات بدل چکے تھے۔ تاہم فوری طور پہ ڈارون نے اس کا اظہار نہ کیا کہ اُس کا معاشرہ ایک مذہبی معاشرہ تھا وہ اپنے خیالات کو مرتب کرتا رہا۔ آخر جب اُس کی عمر 48 سال کی ہوئی تو 1859ء میں اُس نے اپنی کتاب (The Origin of Species) شائع کر دی۔ جس میں اُس نے

انسانی ارتقاء کا وہ نظریہ پیش کیا جس نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا حالانکہ وہ نظریہ شرفِ انسانیت سے پست اور تمام تر عقلی معیار سے گرا ہوا تھا۔ مگر اہل مغرب جو اپنی زندگیوں سے مذہب کو خیر باد کہہ چکے تھے شاید ایسے ہی کسی نظریہ حیات کے منتظر تھے جو اُن کو اللہ رب العالمین کی غلامی سے بھی نجات دلا دے ۔اس نظریے کو عقلی قرار دیا جاتا ہے مگر عقل سے اُس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ اس لیے ہم پہلے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو پیش کریں گے اس کے بعد اُس پہ عقلی حوالوں سے تنقید کریں گے حالانکہ بہ حیثیت ایک مسلمان ہمیں اس کی ضرورت نہیں اس لیے کہ قرآن حکیم میں انسان کے نظریہ حیات اور ارتقاء کے تمام تر مراحل کو تفصیلاً بیان کر دیا گیا ہے مگر ہم مسلمانوں میں سے بھی ایک طبقہ ہر اُس تخیل کو آسمانی صحیفہ قرار دینے پہ مصر ہے جو مغرب سے آیا ہو۔ اس لیے ہم نے مناسب جانا کہ ڈارون کے نظریہ ارتقائے حیات کا ایک عقلی جائزہ پیش کر دیا جائے تا کہ جن کی عقلوں میں خلجان اور رویوں میں کجی ہے شاید اُن کے لیے ہدایت کا کوئی سامان ہو سکے۔ سادے لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے کہ ڈارون نے انسان کو بندر کی ترقی یافتہ شکل بتایا ہے۔ یہ بات درست ہے اس لیے کہ گہرائی میں جا کر بھی ڈارون کے نظریہ حیات سے یہی بات سامنے آتی ہے۔ تاہم علمی نقطہ سے اگر ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بیان کیا جائے تو اس کی اہم کڑیاں یہ ہیں۔

1۔ جانوروں میں توالد و تناسل کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اگر اُن کی نسلوں کا بہت بڑا حصہ مسلسل ختم نہ ہوتا رہے تو اُن کی تعداد نا قابل برداشت حد تک بڑھ جائے۔

✡✡✡✡✡✡

2۔ رہائشی علاقوں کی محدود وسعت، خوارک کی محدود مقدار اور اس بے تحاشا بڑھتی ہوئی رفتار تولید کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جانوروں میں جہد للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTANCE) کا عمل رونما ہو۔ کشمکش حیات یہی بقاء اصلح (SURVIVAL OF

(FITTAST) کا باعث بنا کرتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

3۔ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک بنی نوع کے جانوروں کے انفرادی جسموں کی ساخت میں قدرے اختلاف (INDIVIDUAL DIFFEREANCE) ہوا کرتا ہے۔یہ اختلاف نسلوں میں خفیف لیکن مسلسل ردوبدل کا نتیجہ ہوتا ہے۔یہ ردوبدل اکثر موروثی بھی ہوا کرتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

4۔ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جہد للبقاء کی مسلسل کشمکش سے اعضاء حیوانی میں جو خفیف ردوبدل پیدا ہوتا ہے اگر وہ مفید حال ثابت ہو تو نسل حیوانی کے بقاء واستحکام کا باعث بنتا ہے اور اگر مضر ثابت ہو تو یہی ردوبدل ماحول کی سازگاری میں اضافہ کرکے نسل کی فنا کا باعث بن جاتا ہے۔جس طرح جہد للبقاء کی کشمکش میں وہی حیوانی نسلیں باقی رہتی ہیں جو مفید ردوبدل کے مسلسل قدرتی انتخاب (NATURAL SELECTION) کی حامل ہیں۔مفید ردوبدل کا مسلسل اجتماع ہی باقی رہنے والی نسلوں میں عمل ارتقاء (EVOLUTION) کا سبب بنتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

5۔ارتقائی منازل طے کرنے کا یہ عمل نہایت سست رفتار ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا مگر یہ عمل نباتات اور حیوانات کی ہر نوع (SPECIES) اور قسم (GENUS) میں قرن ہا قرن سے جاری چلا آتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

6۔حیوانوں کے انواع واقسام کی اکثر کڑیاں اس قدر مسلسل اور مربوط نظر آتی ہیں کہ ایک نوع دوسری نوع کی ارتقائی شکل معلوم ہوتی ہے اور یہ تسلسل اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انسان بن مانس اور بندر کی ارتقائی شکل ہے اور اس پوری ارتقائی لڑی کی ابتدائی کڑی کوئی واحد خلیہ(CELL)والا کرم حقیر ہوگا۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں اہل علم کے لیے کوئی جدت نہ تھی۔جدت صرف اس بات میں تھی کہ سالہا سال کی تحقیق کے بعد اسے باضابطہ دلائل کے ساتھ سائنس بنا کر پیش کیا گیا تھا ورنہ ارتقائے حیات کا خیال قدیم یونانی فلاسفہ کے زمانہ ہی سے چلا آتا ہے چنانچہ ہیراکلیتس (HERACLITUS)نے حضرت مسیح کی پیدائش سے بھی پانچ سو سال پہلے یہ خیال پیش کیا تھا کہ حیات کی مختلف شکلوں سمیت کائنات کی ہر شئے تبدیل ہورہی ہے۔ہیراکلیتس کے پچاس سال بعد ایک اور یونانی مفکر ایمپی ڈولکز(EMPEDOCLES)نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ حیات جمادات سے پیدا ہوئی ہے اور حیوانات نباتات سے نکلے ہیں۔تاہم یہ سب تخیل قیاساتِ محض تھے اور انسان کی اس آرزو کی پیداوار تھے کہ وہ ہر پیچیدہ مسئلے کو سادہ اور آسان فہم دیکھنا چاہتا تھا۔اِن نظریات کے پیچھے کوئی عقلی دلیل موجود نہ تھی۔

مغرب کے جدید فلاسفہ اور سائنس دانوں کی جدت یہ تھی کہ انھوں نے اس انسانی آرزو کو حقیقت ثابت کرنے کے لیے دلائل کی جستجو کی۔شواہد کا کھوج اٹھایا اور منطقی ثبوت فراہم کرنے کی سعی کی۔تب مغرب کے دماغ پر زندگی کی مکینیکل تشریح کا بھوت سوار تھا بلکہ ایک زمانہ تک تو وہ کائنات کو بھی ایک بڑی مشین ہی قرار دیتے رہے۔چنانچہ کائنات کے بعد اب وہ حیات کی میکانی تشریح کے خواہش مند تھے۔اور اُن کی اس خواہش کو ڈارون نے بھرپور انداز سے پورا کیا۔تھامس ہسکلے نے ڈارون کے نقطہ نظر کی تائید کی اور اسے آگے بڑھایا۔یہ محض اتفاق نہیں بلکہ ڈارون کی خرافات

کے خلاف گہرا تحقیقی مطالعہ تھا جس کو مذہب کے حوالے سے آسٹریا کے ایک گوشہ نشین راہب گریگور منڈل (Gregor Mendel) نے پیش کیا۔ڈارون کی کتاب (The Origin of Species) چھپنے سے پہلے ڈارون علمی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکا تھا اس لیے جب اُس کی کتاب چھپی تو اُس کی علمیت پہ ہر طرف سے تعریف کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔دوسری طرف گریگور منڈل ایک گمنام راہب تھا جس کی سماج میں کوئی خاص حیثیت نہ تھی۔اس لیے گریگور منڈل نے جب ڈارون کی کتاب (The Origin of Species) پہ نقد لکھا تو کوئی اسے چھاپنے کو بھی تیار نہ تھا۔آخر ایک غیر معروف سائنسی رسالے نے گریگور منڈل کی تحقیق توریث (GENETICS) شائع کرہی دی۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس رسالہ نے گریگور منڈل کی تحقیق کو شائع کیا وہ خسارے میں تھا اور بند ہوا چاہتا تھا۔جس شمارے میں گریگور منڈل کی تحقیق چھپی وہ بھی تقسیم نہ ہوسکا بلکہ اُس میراث کی طرح پڑا رہا جس کا کوئی وارث نہ ہو۔پچاس سال گزر گئے۔لوگوں نے بڑی خوشی سے ڈارون کے نظریہ حیات کو قبول کرلیا تھا۔آخر پچاس سال بعد کسی صاحب علم کی نظر سے گریگور منڈل کی وہ تحقیق گزری تو اُس نے اسے دوبارہ سے چھاپنے کا عزم کیا۔گریگور منڈل کی تحقیق سامنے آتے ہی ڈارون کے علمی غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔اس لیے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقائے حیات میں پہلے ہی کوئی عقلی اساس موجود نہ تھی۔اب ہم گریگور منڈل کی تحقیق کو ایک طرف رکھتے ہوئے ڈارون کے نظریہ حیات کا عقلی جائزہ لینے کی سعی کریں گے۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون نے کہا کہ:

جانوروں میں توالد و تناسل کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اگر اُن کی نسلوں کا بہت بڑا حصہ مسلسل ختم نہ ہوتا رہے تو اُن کی تعداد ناقابل برداشت حد تک بڑھ جائے۔

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ!

دراصل تو یہ ڈارون کا اپنا تخیل ہے ہی نہیں بلکہ ایک چوری شدہ تخیل ہے جسے لوگ پہلے سے مالتھس (MATHUS) کے حوالے سے جانتے ہیں۔فرق صرف اس قدر ہے کہ مالتھس نے کہا تھا کہ انسان اپنی آبادی کو کنٹرول کریں ورنہ ایک دن اُن کو خوراک اور رہائشی علاقوں کی قلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ڈارون نے اسے حیوانات تک وسعت دے دی۔مگر اپنے اس تخیل کو سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی شہادت پیش نہیں کی کہ خالق کی بنائی ہوئی مخلوق میں سے کب کوئی مخلوق خوراک اور رہائش کی قلت کی وجہ سے نابود ہوئی۔حقیقت یہ ہے کہ ڈارون کا یہ تخیل ایک علمی نظریے سے زیادہ کسی دیوانے کی بڑ نظر آتی ہے جو خالق سے بے زار ہو۔ورنہ دیکھیں کہ سٹارفش ایک سیزن میں تیس لاکھ انڈے دیتی ہے اگر ہر سٹارفش کے تیس لاکھ انڈے مچھلیوں میں بدل جائیں تو اگلے روز سمندروں سے پانی ختم ہو جائے اور ہر طرف صرف سٹارفش ہی نظر آئے مگر قدرت کے کاموں میں جو حکمت ہے اُس میں دخل اندازی سے ایسے ہی بے وقوفانہ نظریات سامنے آتے ہیں جیسا کہ ڈارون صاحب نے فرمایا تھا۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون آگے جا کے کہتا ہے کہ!

رہائشی علاقوں کی محدود وسعت، خوارک کی محدود مقدار اور اس بے تحاشا بڑھتی ہوئی رفتار تولید کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جانوروں میں جہد للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTANCE) کا عمل رونما ہو۔کشمکش حیات یہی بقاء اصلح (SURVIVAL OF FITTAST) کا باعث بنا کرتا ہے۔

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ!

ذی حیات اور اُس کی خوراک پر تھوڑا سا تامل اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ حیوانات ہی کی چند

اقسام دوسرے حیوانات کی خوراک ہیں اور جو نسلیں خوراک بنتی ہیں اُن کی خوراک بناتات ہیں۔ آسانی سے سمجھ میں آنے والی مثال ہے کہ جنگل میں شیر کی نسبت ہرن بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور شیر بہت کم اس لیے کہ شیر ہرن کو کھا جائے گا مگر شیر کی طبعی عمر تک جنگل کا کوئی باسی اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ چنانچہ یہ خالق کی تقسیم اور اُس کے اندازے ہیں جو سو فیصد درست ثابت ہوتے ہیں کہ اُس نے اِس کائنات کو کھیل تماشا نہیں بنایا بلکہ ایک سنجیدہ مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ خطہ ارض پہ نگاہ ڈالیں تو آپ کہیں گے کہ افریقی ممالک میں لوگ بھوک سے بھی مرجاتے ہیں مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ امریکہ اس قدر گندم پیدا کرتا ہے کہ ہر سال اُسے لاکھوں ٹن گندم سمندر میں پھینکنی پڑتی ہے کیونکہ وہ اس کی ضرورت سے زائد ہوتی ہے پس ثابت ہوا کہ خطہ ارض پہ انسانوں کے لیے خوراک کی کوئی کمی نہیں اور اگر اس زمین پہ انسان بھوک سے مرتے ہیں تو وہ کچھ انسانی گروہوں کی بے حسی کی وجہ سے مرتے ہیں نہ کہ خوراک کی کمی کی وجہ سے؟؟؟

جہاں تک ڈارون کے نظریہ (SURVIVAL OF FITTAST) کا تعلق ہے تو وہ بھی سراسر باطل ہے۔ اس لیے کہ بفرض محال اگر اس بات کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ قلت غذا کی بنا پہ جانور کبھی کبھار جہد للبقاء کی کشمکش میں مبتلا ہو کر بقائے اصلح کا باعث بنا کرتے ہیں تب بھی یہ امر بدستور غور طلب رہے گا کہ اس جہد للبقاء کی نوعیت کیا ہوگی۔ کیا وہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے تقاضوں پہ پورا اترے گی؟ حقائق اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ کیونکہ ڈارون کے جہد للبقاء کے تصور میں جاندار اپنی نسل بدل لیتے ہیں اپنی شکل بدل لیتے ہیں وہ کہتا ہے کہ ڈائنوسار پہلے مچھلی تھا جو ہزاروں سال کے تغیر سے بدل گیا۔ دوسری طرف اس بات کے بھی کوئی شواہد نہیں ملے کہ غذائی قلت کے باعث جانوروں کی باہمی کشمکش سے اُن کے حیوانی اعضاء میں کسی قسم کا تغیر آیا ہو۔ قلیل مقدار خوراک پر جانوروں میں جنگ اُن کی قدرتی توانائی کو اجاگر کرنے کا باعث تو بن سکتی ہے مگر اُن کے جسموں میں کسی قسم کی تبدیلی کا محرک نہیں ہوسکتی۔ قلت غذا کی صورت میں جانوروں کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ طاقتور جانور کمزور جانوروں کو اپنی خوراک بنالیں گے، کمزور انواع قلیل غذا کی صورت میں

آپس میں لڑمریں گے یا پھر بھوک سے ہلاک ہو جائیں گی۔ تاہم اِن تمام صورتوں میں گیدڑ نہ تو کبھی شیر بنا ہے اور نہ بکری کبھی بھینس بنی ہے۔ چنانچہ حیوانوں میں جسمانی تغیر کا کوئی تاریخی ثبوت ہمارے سامنے نہیں۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ حوادثِ زمانہ سے جانوروں کی بڑی تعداد اپنے علاقے کو چھوڑنے پہ مجبور ہو جاتی ہے۔ نئے علاقے میں جا کر اُن کے جسم آب ہوا کے زیر اثر اُن کے جسم میں تبدیلیاں ناگزیر ہیں مگر تب بھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ انھوں نے اپنی نسل بدل لی ہو۔ فرض کریں کہ قطب شمالی کے سفید برفانی ریچھ یا سرد ممالک کی گھنی اون والی پہاڑی بھیڑوں کو شدید گرمی والے علاقے میں منتقل کر دیا جائے تو ہونا تو یہ چاہیے کہ نئے ماحول کے تقاضوں کے مطابق آہستہ آہستہ اُن بھیڑوں کے جسم سے دبیز اون کم ہو جائے یا برفانی ریچھ کی چربی کی تہہ بہہ نکلے۔ مگر عام مشاہدہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ یہ جانور مر جاتے ہیں مگر اُن کے جسم میں کوئی تغیر در نہیں آتا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جو بھیڑیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چار ہزار سال پہلے چرائی تھیں وہ سرد علاقوں کی گھنی اون والی بھیڑیں تھیں۔ آج چار ہزار سال بعد بھی اُن علاقوں میں بالکل ایسی ہی بھیڑیں پائی جاتی ہیں جیسی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بھیڑوں کی ہزارہا نسلیں گزر چکی ہیں مگر اُن میں نام کو بھی تغیر نہیں پایا گیا۔ اور بغیر کسی تغیر کے یہ نسلیں پھلتی پھولتی رہیں۔ چنانچہ ڈارون کے اس تخیل کو بھی بلا دریغ رد کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون مزید کہتا ہے کہ:

ہمارا مشاہدہ ہے کہ ایک ہی نوع کے جانوروں کے انفرادی جسموں کی ساخت میں قدرے اختلاف (INDIVIDUAL DIFFEREANCE) ہوا کرتا ہے۔ یہ اختلاف نسلوں میں خفیف لیکن مسلسل ردوبدل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ ردوبدل اکثر موروثی بھی ہوا کرتا ہے۔

جواب دعویٰ یہ ہے کہ:

انفرادی جسموں کی ساخت میں ردو بدل کے جن مشاہدات کا ڈارون نے سہارا لیا ہے اُن کی دو نوعتیں ہیں۔ایک تو یہ کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں کئی قسم کے اختلافات نظر آتے ہیں۔ایک بیٹا لمبا ہے تو دوسرا پست قد،ایک کا گورا ہے تو دوسرا سانولا یا پھر کالا ہے،ایک لڑکی کے بال کالے ہیں تو دوسری کے بھورے ہیں،ایک کی آنکھیں سیاہ ہیں تو دوسری کی نیلی،ایک کے بال گھنے ہیں تو دوسری کے چھدرے،مزید براں اُن میں چہرے مہرے کا فرق ہے،ہڈی کاٹھی کا فرق ہے،ڈیل ڈول کا فرق ہے۔اور یہ تمام افتراق بے شک موجود ہیں بلکہ اِن میں مزید اختلافات کی گنجائش بھی موجود ہے۔مگر حقیقت یہ ہے کہ انھیں موروثی قرار دینا پرلے درجے کی بے علمی ہے۔کوئی بھی سمجھدار آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اختلاف جہد للبقاء کا نتیجہ ہے۔کیونکہ رحم مادر میں دورانِ حمل کا ماحول تمام بچوں کے لیے یکساں ہوتا ہے اور یہ خیال کرنا کہ وہاں کسی کشمکش حیات کے نتیجہ میں ایک بچے کا رنگ گورا اور دوسرے کا کالا ہو گیا،ایک مہمل خیال ہے۔خود ڈارون بھی اسے جہد للبقاء کہنے سے گریز کرے گا۔

جدید سائنس نے اب اِن عقدوں کو کھول دیا ہے اور اب انسان جانتا ہے کہ افراد میں اس طرح کے افتراق کے اسباب بالکل جداگانہ ہیں اور یہ کوئی موروثی امر نہیں ہے۔جسمانی ساخت میں ردو بدل کے مشاہدہ کی دوسری صورت یہ ہے اور جس پہ دراصل ڈارون نے اپنے نظریہ کی عمارت کھڑی کی ہے وہ جانوروں میں افزائش نسل کے تجربات ہیں۔ماہرین افزائش نسل اکثر گھوڑوں مویشیوں اور مرغیوں کی ایسی بہترین نسلیں تیار کرتے رہتے ہیں جو مختلف خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں اور اُن کی یہ خصوصیات یقیناً موروثی ہوتی ہیں۔جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ماہرین افزائش نسل نے مرغیوں میں زیادہ انڈے دینے والی اور زیادہ گوشت دینے والی مرغیاں پیدا کی ہیں مگر ڈارون اس سے جو نتیجہ نکالتا ہے وہ بعید از قیاس ہے۔ یہ درست ہے کہ افزائش نسل سے کسی حیوان کی بہتر موروثی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے ملاپ سے حیوانوں کی اعلیٰ نسل پیدا کرنا ممکن ہے مگر یہ ردو

بدل کبھی بھی اس قدر بسیط نہیں ہوسکتا کہ مرغی بکری بن جائے یا بندر گھوڑا بن جائے۔

ڈارون مزید کہتا ہے کہ:

ماحول سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے جہد للبقاء کی مسلسل کشمکش سے اعضاء حیوانی میں جو خفیف ردو بدل پیدا ہوتا ہے اگر وہ مفید حال ثابت ہو تو نسل حیوانی کے بقاء واستحکام کا باعث بنتا ہے۔اور اگر مضر ثابت ہو تو یہی ردو بدل ماحول کی سازگاری میں اضافہ کرکے نسل کی فنا کا باعث بن جاتا ہے۔جس طرح جہد للبقاء کی کشمکش میں وہی حیوانی نسلیں باقی رہتی ہیں جو مفید ردو بدل کے مسلسل قدرتی انتخاب (NATURAL SELECTION) کی حامل ہیں۔مفید ردو بدل کا مسلسل اجتماع ہی باقی رہنے والی نسلوں میں عمل ارتقاء (EVOLUTION) کا سبب بنتا ہے۔ارتقائی منازل طے کرنے کا یہ عمل نہایت سست رفتار ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آتا مگر یہ عمل نباتات اور حیوانات کی ہر نوع (SPECIES) اور قسم (GENUS) میں قرن ہا قرن سے جاری چلا آتا ہے۔

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ:

آج کی جدید سائنس نے اب بہت سے رازوں سے پردے اٹھا دیئے ہیں اور ڈارون کے علم کا بھانڈا ابھرے چوک میں پھوڑ دیا ہے۔آج انسان جانتا ہے کہ ذی حیات افراد کے ہر خلیہ (LIFE CELL) میں خاص قسم کے باریک ذرات ہوتے ہیں جنھیں کروموثوم (CHROMOSOME) کہا جاتا ہے۔اگرچہ قدرت نے ہر نوع حیوانی کے لیے کروموثوم کی تعداد مختلف مقرر کی ہے مگر بہر حال حیات کی بنیاد کروکوثوم ہی پہ رکھی ہے۔حضرت انسان کے ہر خلیہ میں کروموثوم کے تیئیس جوڑے ہوتے ہیں۔خواہ وہ انسان یورپ کا نام نہاد مہذب شہری ہو یا افریقہ کا وحشی سیاہ فام، زرد چینی ہو یا سرخ انڈین۔ہر ایک متنفس کے ہر حیاتی خلیے میں باریک دھاگوں کی صورت کروموثوم کی تیئیس جوڑیاں موجود ہوتی ہیں اور انھی کروموثوم کی بدولت موروثی صفات اگلی نسلوں تک منتقل ہوتی ہیں۔یہی کروثوم حیات ہے اور یہی حیات کی منتقلی کا سبب بھی ہیں۔حیوانی

خلیے تقسیم کے ذریعے بڑھتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے بچے کی نشو ونما ہوتی ہے۔تمام عمر قدیم خلیے مرتے رہتے ہیں اور اُن کی جگہ جدید خلیے جنم لیتے رہتے ہیں۔نوعمری میں نئے خلیوں کی پیدائش کی رفتار تیز ہوتی ہے اور قدیم خلیوں کی موت کی تعداد کم ہوتی ہے۔جوانی میں مرنے والے خلیوں اور نئے پیدا ہونے والے خلیوں کی تعداد متوازن ہو جاتی ہے جبکہ بڑھاپے میں مرنے والے خلیے پیدا ہونے والے خلیوں سے تعداد میں بہت بڑھ جاتے ہیں۔جب ایک خلیہ تقسیم ہو کر دو بنتا ہے تو تقسیم سے پہلے کروموثوم عمل طباعت سے اپنے مثنیٰ تیار کرتے ہیں۔اس طرح دونوں خلیوں میں تیئس تیئس کروموثوم کے جوڑے موجود رہتے ہیں۔جب نر اور مادہ کے ملاپ سے حمل قرار پاتا ہے تو نر کا جرثومہ تیئس کروموثوم لاتا یادر ہے کہ وہ تیئس کروموثوم کا جوڑا نہیں لاتا بلکہ اکہرے تیئس کروموثوم لاتا ہے۔عورت کے بیضہ سے اُسے مزید تیئس کروموثوم ملتے ہیں اس طرح نر کروموثوم کو جوڑا مل جاتا ہے۔اِن دونوں کروموثوم کے ملاپ سے نیا خلیہ بنتا ہے اور وہی نئی زندگی ہے۔

کروموثوم (CHROMOSOME) درحقیقت باریک ذرات کی ایک تسبیح ہوتی ہے جس کے ہر دانے کو جین (GENE) کہا جاتا ہے۔ہر کروموثوم میں دانوں کی جوڑی ہوتی ہے۔اور ہر تسبیح میں جینز کے تقریباً تین تین ہزار دانے ہوا کرتے ہیں۔اس تسبیح کا ہر دانہ ایک مخصوص خصوصیت کا حامل اور امین ہوا کرتا ہے۔اور اسی مخصوص جین کے ذریعے ہی وہ اپنی مخصوص وراثت کو آگے منتقل کرتا ہے۔یا یوں کہہ لیں کہ اس تسبیح کا ہر دانہ یعنی ہر جین انسان کے نوشتہ تقدیر کا پروانہ ہے اور اس کے ہر دانے پر وہ موروثی مقدرات ثبت ہیں جو اُس نے اپنی اگلی نسل کو منتقل کرنے ہیں۔تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ موروثی خواص میں اُس وقت تک کوئی تبدیلی ممکن نہیں جب تک اس جینز کی اس تسبیح کو کوئی غیر معمولی حادثہ پیش نہ آئے۔اپنے معاشروں میں ہم جو نامکمل یا معذور بچے دیکھتے ہیں اُن کی معذوری کی وجہ جینز کی اس تسبیح کو غیر معمولی طور پہ پیش آنے والا کوئی حادثہ ہوتا ہے۔

چنانچہ قانون وراثت کے اِن جدید انکشافات نے ڈارون کے اس نظریہ کی جڑ کاٹ دی ہے۔ ڈارون نے جو محل اس بنا پہ تعمیر کیا تھا کہ ماحول سے بہتر ہم آہنگی کے تقاضے کے مدنظر حیوانی اعضاء

اپنے اندر ردوبدل کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور یہ مسلسل نسلوں میں چلنے والا سست رفتار عمل نسل در نسل خفیف تبدیلیاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔قانون توریث کی جدید تحقیق نے ڈارون کے اس خیال کو رد کر دیا۔ماہرین نے اس ضمن میں انسانی جین پہ ریڈیائی انتشار کا مطالعہ بھی کیا ہے جس سے جینز میں خفیف تبدیلیاں پیدا ہونے کا امکان موجود ہے۔ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو بچانے والی چند قوتیں فضائے بسیط کے کسی ریڈیائی انتشار سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔مگر وہ دوسری جنگ عظیم میں ایٹم بموں کے استعمال سے پیدا ہونے والے عظیم تر ریڈیائی انتشار سے کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہیں کر سکے۔اس ریڈیائی انتشار نے انسانی جینز میں جو تغیر پیدا کیا اور جس کو متاثرہ جینز نے اگلی نسلوں تک منتقل کیا وہ تمام تر منفی اثرات تھے اُن میں کسی قسم کی بھلائی دیکھنے میں نہیں آئی۔ہیروشیما اور ناگا ساکی پہ ایٹم بم گرائے جانے کے بعد ریڈیائی انتشار سے متاثر ہونے والوں کے جینز میں جس قدر تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہ سب کی سب تخریبی تھیں۔لاکھوں متاثرہ انسانوں میں سے کسی ایک میں بھی کسی تعمیری تبدیلی کو رپورٹ نہیں کیا گیا۔لہٰذا قدرتی انتخاب (NATURAL SELECTION) تو یہی ہوگا کہ غیر متاثرہ افراد کے مقابلے میں ایٹمی ریڈیائی اثر سے متاثر ہونے والی تمام نسلیں تباہ ہو جائیں اور قدیم غیر متاثرہ نسلیں باقی رہ جائیں اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جینز میں ریڈیائی اثر سے پیدا ہونے والی تمام تبدیلیاں تخریبی ہی ہوا کرتی ہیں اور کسی ارتقاء کے عمل کا باعث نہیں بن سکتیں۔قدرتی انتخاب کی تو نوبت ہی نہیں آتی اور قدرتی انتخاب کی کثرت و اجماع سے عمل ارتقاء کا وجود میں آنا ایک ایسی آرزو بن کے رہ جاتا ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گی۔چنانچہ جب انسانی جینز میں ردوبدل کا امکان ہی مفقود ہو گیا تو نسلاً بعد نسلاً اس کا جاری رہنے کا تخیل بھی زمین بوس ہو گیا اس لیے ڈارون کی لاعلمی پہ نوحہ کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

ڈارون نے مزید کہا کہ:

حیوانوں کے انواع واقسام کی اکثر کڑیاں اس قدر مسلسل اور مربوط نظر آتی ہیں کہ ایک نوع دوسری نوع کی ارتقائی شکل معلوم ہوتی ہے اور یہ تسلسل اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ انسان بن مانس اور بندر کی ارتقائی شکل ہے اور اس پوری ارتقائی لڑی کی ابتدائی کڑی کوئی واحد خلیہ (CELL) والا کرم حقیر ہوگا۔

✡✡✡✡✡✡

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ:

یہ تکرار بے سود ہے جب وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا تو نوحہ گری سے کیا حاصل۔ نباتات اور حیوانات کی ہر نوع اور ہر قسم کے ارتقائی عمل کا جاری رہنا ایک بے بنیاد خیال ثابت ہوا۔ جس کی تائید میں نہ تو قابل توجہ عقلی دلائل ہیں اور نہ ہی تاریخ کے اوراق سے ڈارون کے نظریات کی حمایت میں کوئی ثبوت فراہم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ حضرت انسان کو بندر کی اولاد قرار دینا نہ صرف انسانیت کی توہین ہے بلکہ اس نظریہ میں اُس شرف کا بھی مذاق اڑایا گیا ہے جس سے باری تعالیٰ نے انسان کو نوازا ہے۔ چنانچہ کسی ایک نوع کا دوسری نوع میں منتقل ہو جانے کی راہ میں قانون توریث (Genetic law) سد سکندری کی طرح کھڑا ہے جسے نہ توڑا جاسکتا ہے اور نہ عبور کیا جاسکتا ہے۔ مختلف حیوانی انواع کے کروموسوم اور جینز کی مختلف ساختیں اور مقداریں نباتاتی یا حیوانی انواع کی ایک دوسرے میں تبدیلی کو ناممکن قرار دے رہی ہیں اور کرمِ حقیر سے حضرت انسان تک کی ارتقائی اڑان کا سہانا خیال اب ایک سراب بن چکا ہے۔ (53*)

✡ ✡ ✡

ڈارون کس قدر احمق تھا کہ جس نے اپنے آباء کو بندر بنا کے رکھ دیا۔ وہ شرف انسانیت سے کس قدر دور تھا کہ اُس نے خالق کی سب سے خوبصورت تخلیق پر حرف زنی کی اور اسے بندر کہہ دیا۔ درحقیقت بندر بھی اللہ کی مخلوق ہے مگر حسن و عقل میں اُس کا انسان سے کیا مقابلہ کہ مرد کی وجاہت اور عورت کی دلکشی کے فسانے ہر دھڑکتے دل میں لہریں لیتے ہیں۔ خالق نے انسان کو دوسری مخلوقات سے یوں فضیلت بخشی کی انسان کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور دیگر مخلوقات کو کلمہ کن سے۔

نظریہ ارتقاء اور اسلام

قرآن عظیم و برتر کتاب ہے اور اسلام دین حق ہے۔ قرآن و سنت کی موجودگی میں کسی مسلمان کو حیات و کائنات کی کسی میکانی تشریح کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ خواہش۔ انسان کے اس پیچیدہ ترین مسئلے کے بارے میں مسلمانوں کے ہاں سرے سے کوئی ابہام ہی نہیں پایا جاتا اس لیے مسلمان اس بات کو نہایت اطمینان سے بیان کر دیتا ہے کہ یہ کائنات میرے رب کی تخلیقی برتری کی دلیل ہے اور اس کائنات کی سب سے اہم مخلوق انسان ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کے زمین پہ اتارا ہے تا کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے گنتی کے چند روز خالق کی اطاعت میں گزارے اور ابدی جنتوں کی طرف روانہ ہو جائے۔ ذرا سا غور کرنے سے یہ بات کھل کے سامنے آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو انسان کے لیے مطیع کر دیا ہے۔ اللہ نے انسان کی شان کو بہت بلند کیا ہے کہ آخر وہ ربِ کائنات کا نائب ہے اور ربِ کائنات کے نائب کے رتبے کے کیا کہنے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ کسی وفادار کنیز کی طرح ہر لحہ اُس کی شان کے آگے جھکا جاتا ہے۔ دیکھیں کہ گلاب کا حسن اور خوشبو اللہ

تعالیٰ نے گدھے کے لیے تو پیدا نہیں کی بلکہ یقیناً اسے اپنے نائب کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے پیدا کیا ہے۔ کسی حسینہ کی لہراتی زلفوں کے سائے سے سانپ اور شیر کو کیا مطلب یہ تو اللہ کے نائب کی دلجوئی ہے۔ برسات کے موتیوں کی رم جھم سے کوئی بکرا تو محفوظ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ تو خالق کی طرف سے اپنے نائب کو تحفہ ہے۔ نیلگوں اور بدلتے منظروں والے آسمان کی طرف کبھی کسی بیل نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا کہ یہ حضرت انسان کے لیے غور کا مقام ہے کہ وہ اپنے خالق کی تخلیقی مہارت کا اعتراف کرے اور اُس کی پاکی بیان کرنے کے لیے اس کے آگے جھک جائے۔

طلوع سحر کا مبہوت کن منظر بھینسوں کو ذرا بھی متاثر نہیں کرتا کہ اُن کو وہ دل ہی عطا نہیں کیا گیا جو حسن کے ہر خیرہ کن منظر کے سامنے دھڑکنے کی ترتیب بھول جایا کرتا ہے یہ دل تو خالق نے صرف اپنے نائب کے سینے میں رکھا ہے۔ جب آسمانوں کی زینت ٹمٹماتے چراغوں کی صورت اللہ کے نائب کو جھانکتی ہے تو اُن شکر گزار اور جھکی کمر والے اطاعت شعار بندوں کو دیکھ انھیں رشک آتا ہے اور وہ خواہش کرتے ہیں کہ کبھی خالق اُن کی وفا بھی تو آزمائے۔ مگر خالق ہے کہ اُسے ہر دم اپنے نائب کی بہتری کی فکر رہتی ہے کہ آخر وہ اپنے نائب سے بے پناہ محبت بھی تو کرتا ہے۔

دیکھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نائب کو زمین پہ اتارنے سے پہلے ہی اس قدر بسیط اہتمام کیے جن پہ نظر ڈالنے سے انسان کا دل اس قدر نرم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے رب کے احسانات کے آگے جھکا چلا جاتا ہے اور سر اٹھانے کو اُس کا من ہی نہیں کرتا۔ ابھی اللہ کا خلیفہ زمین پہ نہیں اترا مگر اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا ٹھنڈی ہو جاو وہ آنے والا ہے، سمندروں سے کہا بہنے لگو میرا نائب آنے والا ہے، پھولوں سے کہا کھِل جاؤ میرا خلیفہ آنے والا ہے، آسمانوں سے کہا سنور جاؤ تا کہ میرے خلیفہ کی آنکھیں تمھیں دیکھیں تو سکون پائیں، پہاڑوں سے کہا تھم جاؤ تا کہ زمین پہ میرے خلیفہ کا قدم نہ ڈولے سورج سے کہا اپنی ڈیوٹی سنبھالو میرے خلیفہ کی آمد آمد ہے، زمین سے کہا طرح طرح کے میوہ جات اُگاؤ خبردار میرے خلیفہ کو طعام و دہن کی کوئی دِقت نہ ہو، دریاؤں سے کہا خیال رہے میرا خلیفہ تم پہ سوار ہو تو اُسے اپنے سینے پہ اٹھائے رکھنا، نخلستانوں سے کہا خنک ہو جاؤ شاید میرے خلیفہ کی سواری تیرے

دامن میں اترے، ہواؤں سے کہا سبک خرامی سے چلنا تاکہ میرے خلیفہ کو نا گوار نہ گزرے خوشبوؤں سے کہا دامن گل میں گھس جاؤ وہ تمہیں پا ہی لے گا آخر وہ میرا خلیفہ ہے، درختوں سے کہا ہر ہر ذائقے کے پھل اُگاؤ تاکہ میرا خلیفہ انہیں چکھے تو خالق کی ارفع شان کے آگے سر جھکا دے زمین سے کہا مختلف رنگوں میں منقسم ہو جاؤ کہیں سفید کہیں سبز کہیں سرخ کہیں سلیٹی تاکہ تمہاری ایک ہی صورت کی یکسانیت میرے خلیفہ کے مزاج کو گراں نہ گزرے، چاند سے کہا اپنے حسن کے سارے رنگ میرے خلیفہ پہ عیاں کر دے تاکہ وہ بارِ خلافت آسانی سے اٹھا سکے، موسموں سے کہا بدلتے رہو میرا خلیفہ بہت نازک مزاج ہے، دھنک سے کہا اپنے رنگ بکھیرتی رہا کرو میرا بہت خلیفہ حسن پسند ہے، چوپائیوں سے کہا دیکھو میں نے تمھیں اپنے خلیفہ کی خوراک بنایا ہے اس لیے خوشی خوشی اپنی جان میرے خلیفہ کے ذوق طبع کے لیے قربان کر دینا، بادلوں سے کہا کھل کے برسنا خبردار میرا خلیفہ تنگی محسوس نہ کرے، پرندوں سے کہا گیت گاؤ میرا خلیفہ حسن سماعت کے ذوق سے معمور ہے، آبشاروں سے کہا بہتی رہو تاکہ میرا خلیفہ تمھارے حسن کے لطیف احساس سے لطف اندوز ہو زمین سے کہا سنو میرا خلیفہ ایک بیج ڈالے تو ستر دانے اگانا اور ہر پودے پر سو بالیاں اٹھانا تاکہ میرے خلیفہ کو شکر گزاری کے لیے وقت ملتا رہے، دن سے کہا اجالے بکھیر دو تاکہ میرا خلیفہ خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکے، رات سے کہا خامشی کو اوڑھ لینا تاکہ میرا خلیفہ آرام سے نیند پوری کر سکے، بہاروں سے کہا اپنی شوخیوں سے میرے خلیفہ کا دل بہلانا، جگنو سے کہا میرے خلیفہ کو ہنساؤ، شفق سے کہا میرے خلیفہ کے شوق دید کو ذرا ٹھہر، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیفہ کو زمین پہ اتارنے کا عزم کیا تو سب فرشتوں سے کہا میرے خلیفہ کو سلامی دو اور سارے فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا۔ خدا غارت کرے ڈارون کو اُس نے اتنی عظمتوں والے اللہ کے اس نائب کو بندر کی اولاد بنا دیا ڈارون کے مقابل اسلام نے انسان کو کس قدر رفعت عطا کی ہے یہی اسلام کا نظریہ ارتقاء ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے انکار نے مغربی معاشروں کو اخلاقی پستی کے اُس زنداں میں ڈال دیا جہاں انسان کی اخلاقی حیثیت کتے اور سور سے زیادہ نہیں رہی۔ قرآن حکیم میں تفصیل سے آدم کی ابتداء

اور انتہا کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

ارشاد ہوا کہ:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً
قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ
نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی
الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِیْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ
اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ○ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ
فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ
غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ
تَكْتُمُوْنَ ○ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِیْسَ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ○
وَقُلْنَا یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا
مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ
فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا
فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ
لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی
حِیْنٍ ○ فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ
التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا فَاِمَّا یَا

تِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○

(القرآن الحکیم سورۃ البقرۃ 2 /30-39)

ترجمہ:

”پھر ذرا اُس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔انھوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کومقرر کرنے والے ہیں جواُس کے انتظام کوبگاڑ دے گااور خونریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اورآپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔اس کے بعد اللہ نے آدم کوساری چیزوں کے نام سکھائے، پھرانھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیااور فرمایا: اگرتمھارا خیال صحیح ہے تو ذرا اِن چیزوں کے نام توبتاؤ؟

انھوں نے عرض کی:

نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم توبس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کودے دیا ہے۔حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔

پھراللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا:

تم انھیں اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔جب آدم نے اُن کوسب چیزوں کے نام بتادیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اورزمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جوتم سے مخفی ہیں،

جو کچھ تم ظاہر کرتے ہووہ بھی مجھے معلوم ہےاور جو کچھ تم چھپاتے ہواُسے بھی میں جانتا ہوں۔

پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے مگر ابلیس نے انکار کیا۔

وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔

پھر ہم نے آدم سے کہا:

تم اور تمھاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور یہاں بفراغت جو چاہو وہ کھاؤ مگر اس درخت کا رُخ نہ کرنا ورنہ ظالموں میں شمار ہو جاؤ گے۔

آخر شیطان نے اُن دونوں کو اِس درخت کی ترغیب دے کر ہمارے حکم کی پیروی سے ہٹا دیا اور انھیں اُس حالت سے نکلوا کر چھوڑا جس میں وہ پہلے تھے۔

ہم نے حکم دیا کہ:

اب تم یہاں سے اتر جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تمھیں ایک خاص وقت تک زمین میں ٹھہرنا ہے اور وہیں گزر بسر کرنی ہے۔

اُس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کر لی جس کو اُس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

ہم نے کہا کہ:

تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے کسی رنج و خوف کا کوئی موقع نہ ہوگا اور جو اُس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“۔

✡ ✡ ✡

سگمنڈ فرائیڈ

اہل مغرب نے مذہب کو خیر باد کہا تو ساتھ ہی وہ قدیم اخلاقی روایات سے بھی انکاری ہو گئے۔ ابھی چند صدیاں پہلے مغرب کا معاشرہ ایسے ہی تھا جیسا کہ کوئی مذہبی معاشرہ ہوسکتا ہے جو اخلاقی روایات کی پوری پاسداری کرتا ہو۔ تب مغرب میں بھی ماں بہن کی اُسی طرح تکریم کی جاتی تھی جس طرح کہ مشرق میں کی جاتی ہے۔ مغرب میں جو انقلاب آیا وہ انقلاب کلیسا کے جبر کے خلاف ایک بڑی مزاحمت تھی مگر جب معاشرہ سیکولر ہو گیا تو اُن کا دامن اخلاقی روایات سے بھی تہی ہو گیا۔ مغرب کے معاشروں کی یہ تبدیلی تدریجاً رونما ہوئی۔ ڈارون نے جب اُن سے کہا کہ انسان یونہی بس اتفاق سے پیدا ہو گیا تھا اور بندر سے ترقی کرتا ہوا موجودہ شکل تک پہنچا ہے اور انسان کا کوئی خالق نہیں تو مذہب بیزار معاشرے نے عافیت کی سانس لی۔ اور جب ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ (SIGMUND FRUD) نے اُن کو آزاد شہوت رانی کی طرف بلایا تو انھوں نے اسے بغیر کسی ردوکد کے قبول کر لیا اور اُس پست اخلاقی رویے کو اپنا لیا جس کے بدترین مظاہر آج کے مغربی معاشروں کا عرف ہیں۔

سگمنڈ فرائیڈ قوم یہود سے تھا۔ وہ اگرچہ ملحد تھا اور کسی خالق کے وجود سے انکاری تھا مگر ساتھ ہی ساتھ وہ ایک کٹر یہودی بھی تھا اور یہودیت کے خلاف بات سننے کو تیار نہ تھا۔ وہ ایک آدم بیزار شخص تھا کہنے کو تو وہ ماہر نفسیات تھا مگر حقیقت میں وہ خود پاگل تھا اس لیے کہ انسانوں کو جس آزاد شہوت رانی کی طرف اُس نے بلایا تھا وہ تو کتوں اور سوروں کے سماج میں دیکھی جاتی ہے مگر حیرت ہے کہ مغرب نے اُسے اپنا لیا اور اخلاقی لحاظ سے وہ کتوں اور سور کے مماثل ہو گئے۔

فرائیڈ یہودیوں کے انھی خاندانوں میں شامل رہا ہوگا جو جلا وطنی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہودیوں کو اپنی قبیح عادات کی وجہ سے کبھی انگلستان سے نکالا گیا تو کبھی فرانس نے انھیں حکم دیا کہ وہ اِن کے ملک سے نکل جائیں اور اہل جرمن نے یہودیوں سے جو بدترین سلوک کیا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ چنانچہ جلاوطنی کی آگ میں جلتے مغضوب قوم بنی اسرائیل کی باقیات کے انھیں گھرانوں میں سے ایک غریب گھرانے میں آسٹریا کے ایک دور دراز گاؤں میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ 1856ء پیدا ہونے والے اس لڑکے کا نام فرائیڈ رکھا گیا۔ بنی اسرائیل کے افراد ایک بڑی تلخ حقیقت کا شکار ہیں۔ پیدا ہوتے ہی اُن کے کانوں میں جبری طور پہ اس تخیل کو انڈیل دیا جاتا ہے کہ وہ ایک برگزیدہ اور خدا کی پسندیدہ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک ایسی نسل جسے خدا تعالیٰ نے اپنی رحمتوں کے لیے مختص کر لیا ہے۔ اور اُن کا تعلق اس قوم سے ہے جن کو دوسری تمام اقوام پہ برتری عطا کی گئی ہے۔ تاہم جب وہ لڑکے شعور کی آنکھ کھولتے تو دیکھتے ہیں کہ جو کچھ اُن کے بزرگوں کہا تھا معاملہ تو اُس کے برعکس ہے۔ کسی برگزیدہ قوم سے تو اُن کا کیا تعلق ہوگا وہ تو اس دنیا کی عام اقوام سے بھی نہایت پست ہیں جنھیں نہ بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں اور نہ ہی اقوام عالم میں انھیں کسی حوالے سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی قوم ہیں جسے دنیا نے ظلم وستم کا تختہ مشق بننے کے لیے چن لیا ہے۔ جب وہ اپنی تاریخ پہ نگاہ ڈالتے ہیں تو انھیں اور بھی ندامت ہوتی ہے کہ وہ صدیوں سے محروم، مغضوب اور مصائب سے دوچار چلے آئے ہیں۔ چنانچہ عقیدہ اور مشاہدہ کے اس بڑے تضاد نے اُن کی نئی نسل میں ایک طرف تو خدا سے مایوسی

اور لادینی رجحان کو اجاگر کیا تو دوسری طرف نسلی تعصب کو بھی جنم دیا۔ چنانچہ قوم بنی اسرائیل میں ایسے مفکر پیدا ہونے لگے جو ایک طرف تو خدا کے منکر تھے مگر ساتھ ہی وہ یہودیوں کے نسلی تعصب سے بھی پُر تھے۔ فرائیڈ انھی میں سے تھا۔ فرائیڈ کے کو میں طبعاً سیرت المزمل ﷺ میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُس کے نظریات اس قدر فحش اور مصنوعی اور لغو ہیں کہ انھیں زیر بحث لانے میں کراہت کا ایک عنصر موجود تھا۔ مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ چین سے لے کر جاپان تک، بینکاک سے لے کر ہانگ کانگ تک، فرانس سے لے کر جرمنی تک، آسٹریا سے لے کر ڈنمارک تک، روس سے لے کر کیوبا تک، ہالینڈ سے لے کر فن لینڈ تک، کینڈا سے لے کر آسٹریلیا تک، سویزرلینڈ سے لے کر ناورے تک، اسپین سے لے کر بیلجیئم تک، اٹلی سے لے کر تھائی لینڈ تک، انگلستان سے لے کر امریکہ تک کتنے ہی ممالک ہیں کتنی ہی قومیں ہیں کتنے ہی معاشرے ہیں جنھوں نے فرائیڈ کے آزاد شہوت رانی کے تصور کو اپنا لیا ہے تو دل دہک سا رہ جاتا ہے۔

دماغ میں سوال اٹھتا ہے کیا یہ لوگ پاگل ہیں؟

جواب آتا ہے کہ نہیں۔

کیونکہ علوم عالم میں اُن کا ڈنکا بج رہا ہے، ٹیکنالوجی میں انھوں نے ماعصر اقوام کو پیچھے چھوڑ دیا ہے معاشیات، عسکریات اور سیاسیات میں وہ دوسری قوموں سے ممتاز ہیں جس سے یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ پاگل نہیں ہیں۔ تو اگر وہ پاگل نہیں ہیں تو اس جنسی دیوانگی کے پیچھے وہ کونسا ہے راز ہے جس کے پیچھے دنیا کی درجنوں اقوام سینکڑوں ممالک اور انگنت معاشرے پاگل ہوئے جاتے ہیں۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ چونکہ وہ خود کو کسی قوت قاہرہ کے سامنے جوابدہ تصور نہیں کرتے اس لیے زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف کشید کرنے کے جنون میں مبتلا ہیں لیکن یہاں پھر وہی سوال موجود ہے کہ دنیا میں شہوت کے سوا بھی تو لذت کے بہت سے پہلو موجود ہیں جن کی طرف اِن اقوام اور معاشروں کا رجحان سرسری سا ہے۔ اِن اقوام میں صاحب دانش لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں

۔مگر شاید اُن کے صاحب دانش بھی اپنی قوم کی اس دیوانگی پہ تنقید نہیں کرتے۔کیا اُن کے اس رجحان کے پیچھے کوئی ایسا راز ہے جس سے دوسری اقوام لاعلم ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں جن معاشروں میں اخلاقی رویے مستحکم ہیں اور عورت اور مرد نکاح کے بعد خلوت میں جاتے ہیں اُن میں تو جنسی دیوانگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔مانا کہ شہوت انسان کا فطری جذبہ ہے، طاقتور جذبہ ہے مگر اس جذبے کو دنیا میں ہر جگہ تسکین حاصل ہو رہی ہے۔آزاد شہوت رانی کے اِن معاشروں میں جنسی جرائم بھی اُن علاقوں سے زیادہ ہیں جہاں اخلاقی اقدار کی پاسداری کی جاتی ہے۔سب سے زیادہ جنسی تشدد امریکہ میں ریکارڈ کیا گیا ہے حالانکہ وہاں آزاد شہوت رانی کا دستور ہے۔چنانچہ اس دیوانگی کے پیچھے یقیناً کسی خاص نظریے کی پیروی مقصود ہے جو انسان اخلاقی طور پہ کتے اور سور کے برابر اتر آیا ہے۔

مورخین نے لکھا ہے کہ فرائیڈ نے جنسی نفسیات کے جن حوالوں پہ بحث کی ہے اور جو نتائج نکالے ہیں اُن میں سے اکثر غلط ثابت ہو چکے ہیں مگر مغربی معاشرے آزاد شہوت رانی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ کوئی دلیل انھیں حیا کی طرف مائل نہیں کر سکتی کیونکہ حیا کا تعلق اُس اندرونی احساس سے ہے جو اُس کا معاشرہ اُس کا نظریہ حیات اُس میں پیدا کرتا ہے۔مغربی ممالک میں اکثریت عیسائی معاشروں کی ہے جو ایک الہامی دین تھا۔اُن کے دین نے انھیں کسی قسم کی آزاد شہوت رانی کی طرف نہیں بلایا بلکہ عمومی عرف کے مطابق نکاح کی دعوت دی ہے۔اخلاقی اقدار اور روز جزا کا خوف دلایا ہے۔مگر اِن مغربی ممالک کے عام باشندوں کا چلن روس کے ملحدین سے مشابہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ سوال کرنے پر امریکی یا برطانوی شہری کہے گا وہ کرسچن ہے اور رشین شہری کہے گا وہ کیمونسٹ ہے۔کیمونسٹ سے تو اگلا سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں مگر کسی امریکی یا برطانوی شہری سے اگر دوسرا سوال کر ہی دیا جائے کہ اُن کے دین نے اُن کے لیے کیا ضابطہ اخلاق متعین کیا ہے تو اُن کا علم دین ختم ہو جائے گا اس لیے کہ نہ وہ اپنے دین کے بارے میں کچھ جانتے ہیں، نہ جاننا چاہتے ہیں اور نہ ہی اُن کے پاس ایسی فضول باتوں کے لیے وقت ہے۔اس لیے اگر اہل مغرب کو

ملحدین کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اُن کا عمل ہے جس سے یہ دلیل فراہم ہوتی ہے کہ اُن میں اور ملحدین میں کوئی فرق نہیں۔فرائیڈ کا نظریہ حیات کیا تھا؟ اُس نے لوگوں کو کس بات کی طرف بلایا؟ اُس نے ایک انسانی جذبے کی اس قدر لغو تشریح کیوں کی؟ لوگوں کی کثیر تعداد نے فرائیڈ کے نظریے کو بغیر کسی تنقید و تحقیق کے کیوں اپنا لیا، انھی سوالوں کے جواب کھوجنے کے لیے ہمیں فرائیڈ کے نظریات سے براہ راست واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔

فرائیڈ نے جب تعلیم مکمل کی تو یہودی ہونے کی وجہ سے کوئی اُسے منہ نہ لگاتا تھا۔خود فرائیڈ بھی نہایت بدمزاج اور آدم بیزار تھا۔چند یہودیوں کے سوا اُس نے زندگی بھر اپنا کوئی دوست نہیں بنایا۔اُس نے اپنا شہر چھوڑ دیا اور کسی دور دراز قصبے میں ایک یہودی ڈاکٹر نے نسلی عصبیت کی بنا پر اُس کو اپنا نائب مقرر کر لیا۔نوجوان ڈاکٹر فرائیڈ یقیناً خود بھی زنا میں بری طرح ملوث رہا ہوگا۔اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ اُس کی دلچسپی اُن عورتوں میں تھی جو اپنے خاوند سے بے زار تھیں۔ہسٹریا کا مرض اُس کی دلچسپی کا موضوع تھا۔اُس کے پاس بہت سی عورتیں آتیں جو اپنے خاوند کے ظلم کا شکار ہوتیں۔اول اول تو فرائیڈ اُن کا علاج اُسی معروف طریقے سے کرتا رہا جو اُن دِنوں مروّج تھا تاہم بعد میں اُس نے اپنے طریقہ علاج کو بدل لیا۔

اُسے ہپناٹزم میں بھی کچھ مہارت تھی۔جب عورتیں تھکی ماندی اور اپنے خاندوں کے ظلم سے ہراساں اُس کے پاس آتیں تو وہ اُن کو ہپناٹائز کر لیتا اور اُن سے کہتا جو کچھ تمھارے دل میں ہے اُگل دو، وہ مریضوں سے بے تکلف ہو جاتا اور اُن سے اُن کی نجی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا۔اِن معلومات کو وہ ایک جگہ درج کرتا رہتا۔اُس کے علاج سے عورتیں ٹھیک ہو جاتی تھیں۔ اُس کو علاقہ میں شہرت حاصل ہوگئی تھی ۔ اُس نے اپنے علاج کے طریقہ کار کا نام نفسیاتی تجزیہ (PSYCHO ANALYSIS) رکھا۔وقت اسی طرح گزرتا رہا مگر جب اُس کے

نظریات لوگوں کے سامنے آئے تو وہ کچھ زیادہ پسندیدہ نہ تھے۔یقیناً اُن کے خلاف کلیسا اور مذہبی حلقوں نے آواز اٹھائی مگر تب کلیسا کا اثر اس حد تک کم ہو چکا تھا کہ لوگوں کے دل میں اب اُس کا کوئی وقار نہ تھا اس لیے لوگ فرائیڈ کے نظریات سے متاثر ہونے لگے۔

فرائیڈ نے کہا کہ!

انسانی ذہن تین شعبوں میں منقسم ہے،لاشعور(UNCONCIOUS)ذہن کا سب سے بڑا شعبہ ہے جو تمام خواہشات کا نفسانی گھر ہے۔انسان کی تمام آرزوں کا سر چشمہ جذبہ شہوت ہے۔خوشی کا حصول انسان کا واحد مقصد ہے اور شہوت اُس کی سب سے بڑی خوشی ہے۔ذہن کا دوسرا شعبہ تحت الشعور (PRE-UNCONCIOUS) ہے۔اور تیسرا شعبہ شعور (CONCIOUS) ہے۔شعور کے شعبہ میں انسان خواس خمسہ کے تمام تاثرات وصول کرتا ہے جو تحت الشعور کے راستے لاشعور کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔تمام جذبات،تمام خیالات، تمام مشاہدات اور تمام یادیں لاشعور میں مدفون ہیں اور تحت الشعور کے جھرونکے سے گزر کر شعور کی سطح پر ابھر آتی ہیں۔تحت الشعور میں تہذیب وتمدن،اخلاق وروحانیات کے تاثرات نے ایک محکمہ احتساب قائم کر رکھا ہے جو لاشعور سے ابھر کر تحت الشعور تک آنے والی خواہشات کی چھان بین کرتا ہے اور اُن میں سے مناسب خیالات اور آرزوں کو شعور کی سطح تک ابھر آنے کی اجازت دیتا ہے اور نامناسب خواہشات کو واپس لاشعور کی طرف دھکیل دیتا ہے۔مگر حیوانی جذبات بھوکے شیر کی طرح انسان کے لاشعور میں بیٹھے مسلسل ہلچل مچا رہے ہوتے ہیں اور وہ شعور کی سطح تک ابھر کر عملی میدان میں جلوہ گر ہونا چاہتے ہیں۔لیکن تہذیب وعقل کا محتسب اُن کو ابھرنے کی اجازت نہیں دیتا۔تب یہ خواہشات محتسب سے بچنے کے لیے عجیب عجیب بہروپ بھرتی ہیں تاکہ وہ کسی طرح جلوہ آرا ہو پائیں۔اِن خواہشات کے انھی مچلتے بہروپوں سے خوابوں کی دنیا آباد ہوتی ہے۔فرائیڈ کہتا ہے کہ طنز ومزاح،خاندانی،قبائلی اور قومی توہمات،

رسم و رواج، ثقافت اور مذہبی عقائد اور عبادات تمام تر انھی پوشیدہ جذبوں کے مختلف بہروپ ہیں جنھیں تہذیب کا محتسب جلوہ گر ہونے سے روک لیتا ہے۔خیالات اور جذبات قانون اور اخلاق کے احتساب کی جانب سے بار بار لاشعور کی طرف دھتکارے جاتے ہیں۔اس مسلسل دباؤ کی وجہ سے یہ جذبات رفتہ رفتہ لاشعور کی گہرائیوں میں دب کر گرہ گیر ہو جاتے ہیں ۔یادوں سے دور اور گہری تہوں کے نیچے مستور یہ جذبات جب اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں تو انسانی طبع میں الجھن اور کشمکش کے آثار واضح ہونے لگتے ہیں یہی کشمکش(CONFLICTS) بعد میں نفسیاتی عوارض(NEUROSES)اور ہسٹریا جیسے امراض کا باعث بنتے ہیں۔گویا ڈاکٹر فرائیڈ یہ کہنا چاہتا ہے کہ نفسیاتی بیماریاں گویا فطری جذبات کو غیر فطری احتساب کے ذریعے دبائے رکھنے کا ردعمل ہیں۔فطرت کو غیر فطری طور پہ دبانے کی سزا ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔۔۔آگے جا کے وہ کہتا ہے کہ:

خواب مدفون جذبات کے مظاہروں کے سوا اور کچھ نہیں ۔ یہ پوشیدہ آرزوں کے اعلانات ہیں جو احتساب کے خوابیدہ چوکیدار کو چکمہ دے کر تمثیلی زبان ،تصویری مرقعوں، اشاروں کنایوں اور پہیلیوں میں بے چین جذبات کی داستان بیان کرتے ہیں۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ۔۔۔فرائیڈ کے نزدیک.......

محبت ،نفرت ،رحم ،غضب ، جرأت ،خوف ،حزن ، وغیرہ اگر چہ انسانی جذبات کی متعدد شکلیں ہیں مگر اِن سب جذبات کا مصدر صرف ایک ہی بنیادی جذبہ ہے اور وہ ہے شہوت ۔ یہ بنیادی

جذبہ انسان کے نطفہ میں موجود ہوتا ہے، جنین کے ساتھ پرورش پاتا ہے اور بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اپنا مظاہرہ کرنے لگ جاتا ہے۔ پیدائش کے بعد بچہ کی بالیدگی کے ساتھ ساتھ جنسی شہوت کے جذبہ میں سے ہی تمام انسانی جذبات نمودار ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ اعلیٰ مذہبی تخیلات اور بلند روحانی جذبات بھی دراصل اسی سفلی جذبہ کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ خوف وامید وجلب منفعت کے جذبات جو انسانی عمل کے بنیادی محرکات سمجھے جاتے ہیں وہ بھی جنسی شہوت کے جذبہ ہی سے نمودار ہوتے ہیں۔ جنسی شہوت کا جذبہ بچے کی پیدائش کے وقت سے ہی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت بچہ اپنی ماں کی طرف راغب ہوتا ہے اور اُس سے ناجائز جنسی تعلق (INCEST) استوار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جنسی اعضاء کی عدم پختگی کی وجہ سے چونکہ بچہ ابھی جنسی اختلاط پہ قادر نہیں ہوسکتا اس لیے اس کی جنسی شہوت ماں سے محبت میں بدل جاتی ہے۔ بچہ جب باپ کو ماں کی طرف مائل دیکھتا ہے تو اُس کے اندر رقابت کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے اور وہ اپنے باپ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ماں بیٹے اور باپ بیٹی میں ناجائز محبت اور باپ بیٹے اور ماں بیٹی میں رقابت کے اس جذبے کو ڈاکٹر فرائیڈ اپنی قابل فخر دریافت قرار دیتا ہے اور اپنی اس دریافت کا نام اُس نے (OEDIPUS COMPLEX) رکھا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

⏮ ---فرائیڈ نے مزید کہا کہ!

چونکہ قدرت نے خود ہی انسان کو اِن سفلی اور مذموم جذبات کے چکر میں ڈالا ہے اس لیے اِن سے مفر ممکن نہیں۔ اخلاق وروحانیت کی درس وتدریس اور تہذیب وتمدن کی اصلاحی تحریکوں نے انسان کو اس فطری درندگی سے بلند تر کرنے کی انتھک کوششیں کی ہیں لیکن یہ تمام جدوجہد انسان میں موقتی انفعالی جذبہ پیدا کرنے سے زیادہ اور کچھ نہ کرسکیں۔ اور یہ انفعالی جذبہ بھی

مفید ثابت ہونے کی بجائے مضر ہی ثابت ہوا اور اِن انفعالی جذبات اور شہوت کے دباؤ کی آپسی کشمکش سے انسان مزید نفسیاتی عوارض کا شکار رہا۔ لہٰذا مذہبی اور اخلاقی آئیڈیل محض ایسے خواب ہیں جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے بلکہ یہ محض عظیم تر مغالطے(GREAT ILLUSIONS)ہیں۔

✡ ✡ ✡

فرائیڈ پہ نقد

اللہ تعالیٰ نے انسان کو تاج شرف سے مزین کیا ہے۔اور تاج شرف کیا ہے وہ عقل انسانی ہے جس نے انسان کو بھلے برے کی تمیز عطا کی ہے۔آزاد جنسی شہوت کے نظریے کو کوئی بھی عقلی اساس فراہم نہیں کی گئی۔انسانی کی شعوری تاریخ کے کسی بھی دور میں آزاد شہوت رانی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ مغرب کا دانشور بھی اس کو ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتا ہے مگر مغربی معاشروں میں آزاد شہوت رانی کا چلن اس قدر پختگی اختیار کر چکا ہے کہ اب اسے وہاں سے مٹانا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ پتہ نہیں وہ فرائیڈ کے نظریاتی پیروکار ہیں یا جنسی جنون کے بدحواس پاگل کہ انھوں نے تمام تر اخلاقی روایات کو خیر باد کہہ دیا ہے ۔ حالانکہ آزاد شہوت رانی نے مغرب کو کچھ بھی نہیں دیا سوائے ندامت اور پچھتاوے کے مگر یہ وہ آگ تھی جو بھڑک اٹھی تو بھڑکتی ہی رہی حتیٰ کہ اُس کے بداثرات سے مغرب اب خاندان جیسے بنیادی سماجی ادارے سے ہاتھ دھو چکا ہے مگر اس کے باوجود اُن کے قانون ساز ادارے ایسی قانون سازی کررہے ہیں جس کے نتیجے میں یہ آگ ابھی مزید بھڑکے گی۔فرائیڈ کے

نظریات بے عقلی اور جاہلیت کے واضح نشانات لیے ہوئے ہیں۔فرائیڈ یقیناً خود ایک جنسی مریض تھا جس نے اپنے تخیلات کو نظریہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور دنیا کے جن لوگوں کے دلوں سے خالق کا خوف اُٹھ چکا تھا انھوں نے اسے اپنا لیا۔حالانکہ آج کی دنیا میں بھی درجنوں معاشرے اور سینکڑوں ممالک موجود ہیں جن میں آزاد شہوت رانی کا کوئی تصور نہیں۔مسلمان تو خیر احکامات قرآن کا پابند ہے اور قرآن کی تعلیمات عین فطرت ہیں۔قرآن میں نکاح کو شہوت کی جائز راہ قرار دیا گیا ہے اور مرد کو نکاح میں آسانی فراہم کی ہے تاکہ وہ بدکاری سے بچ جائے۔

جہاں تک فرائیڈ کے نفسیاتی نظریات کا تعلق ہے تو جدید انکشافات کی روشنی میں اُن کا جائزہ لینے سے فرائیڈ اچھا خاصا جاہل ثابت ہوتا ہے اور اُس کے غیر انسانی اور جنسی طور پہ بیمار تخیلات کو عقلمندوں نے کبھی بھی درغور اعتناء نہیں جانا۔فرائیڈ نے انسان کے ذہن کو جو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے تو یہ تقسیم سراسر ایک فرضی تقسیم تھی جس کا کوئی ثبوت آج کی جدید سائنس فراہم نہیں کر سکی۔فرائیڈ نے جو کچھ بھی کیا وہ اُس کے بیمار دماغ کا شاخسانہ تھا۔چنانچہ مشاہدات کی نوعیت، جذبات کی کیفیت اور لاشعور کی ماہیت کے متعلق جدید سائنس نے وافر معلومات فراہم کی ہیں جن کی روشنی میں فرائیڈ کے نظریات دیوانے کی بڑ نظر آتے ہیں۔چنانچہ آج ہم جانتے ہیں کہ شعور انسانی دماغ کے ایک عمل کا نام ہے نہ کہ دماغ کے کسی حصے کا۔

انسانی دماغ میں شعور یا لاشعور کی تقسیم لایعنی ہے۔انسانی دماغ مربوط شکل میں پیدا کیا گیا ہے۔اُس کے حصے بخرے فرائیڈ نے کیے۔مگر جدید سائنس نے فرائیڈ کی اس دھوکا دہی کا پردہ فاش کر دیا۔جدید تحقیق نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے اندر پیدا ہونے والے جذبات و احساسات دراصل چند مخصوص غدودوں میں موقتی کیمیائی عمل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔جذباتی غدودوں میں کیمیائی مادہ پیدا کرنے یا روک رکھنے کا مقام انسانی دماغ میں ایک مخصوص جگہ پہ پایا جاتا ہے۔یہ کنٹرول جبلی طور پہ کام کرتا ہے اور انسان کے مخصوص موقتی ماحول کی رعایت سے مخصوص غدودوں میں کیمیائی عمل کو جاری کرتا اور روکتا ہے۔لیکن اِن کیمیاوی محرکاتِ جذبات کو پیدا کرنے

والی غدودیں دماغ سے باہر ہیں اور وہ کیمیائی مادہ پیدا کرتی ہیں وہ بھی دورانِ خون میں مل کر جسم میں جذباتی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ وہ مادہ دماغ کی طرف نہیں جاتا جس سے یہ امر کھل کے سامنے آجاتا ہے کہ جذبات کا منبع انسانی دماغ نہیں بلکہ اُس کا جسم ہے۔ چنانچہ اس سے فرائیڈ کے اس مفروضے سے ہوا نکل جاتی ہے جس میں اُس نے کہا تھا کہ لاشعور میں موجود جذبات ہمہ وقتی ہلچل مچائے رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس جدید سائنس اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جذبات انسان کا شعوری عمل ہے اور اس کا لاشعور سے کوئی تعلق ہی نہیں آیئے اس معاملے میں مغربی محققین کی رائے سے آگاہی حاصل کریں۔ مشہور امریکی ماہر نفسیات (Pro, Joseph Jastrow) اپنی کتاب (Freud His Dream and Sex Theories) میں لکھتے ہیں کہ:

''لاشعور فرائیڈ کے نظریات کا بنیادی مفروضہ ہے جس کے بغیر نفسیاتی تجزیہ کا وجود ناممکن ہے۔ فرائیڈ کی پوری تحریک اسی پر چل رہی ہے۔ یہ ایک مفروضہ ہے جو بنیادی سوال کا بڑا ہی شاطرانہ جواب تھا۔ لیکن چونکہ چند باتوں کی توجیہہ کے لیے ہمیں اس مفروضہ کی ضرورت ہے۔ محض اس بنا پہ اس کا جواز پیدا نہیں ہو سکتا کہ ہم لاشعور کے وجود کو فرض کر لیں۔ زمانہ قدیم میں ہسٹریا اور مماثل عوارض کی توجیہہ یوں کی جاتی تھی کہ مریض پہ ''جن'' قابض ہو گیا ہے۔ اس پہ بھوت پریت کا سایہ ہے۔ اگر آپ یہ فرض کرنے پہ آمادہ ہوں کہ جن بھوت ہوا کرتے ہیں اور لوگوں کو اِن تکلیف دہ عوارض سے پریشان کرنا اُن کی فطرت میں داخل ہے تب تو جیہہ مکمل ہو جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں جادوگرنیوں کو ایسے ہی مفروضات کا مجرم قرار دے کے مار دیا جاتا تھا۔ لیکن ہمارے ذہن ایسی غیر سائنسی اور غیر فطری توجیہہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہڈسن کے نظریے نے بھی کسی قدر مقبولیت حاصل کی تھی اور اُس نے بڑی جرأت سے اس بات کا اعلان کیا تھا کہ ہمارے دو نفس ہیں۔ ایک ہم اور ایک ہمارا ہمزاد۔ ایک

باشعور ہمزاد جو ہماری زندگی کے ظاہری اعمال بجالاتا ہے اور دوسرا لاشعور ہے جو اُن تمام پر اسرار اور غیر معمولی اعمال کا ذمہ دار ہے جن کی ہم توجیہہ نہیں کر سکتے۔ اگر واقعی ہی ہمارے دو نفس ہیں اور اُن کے یہی فرائض ہیں تو علم النفس کو کسی قدر قابل قبول توجیہہ مل جاتی ہے۔ جنوں اور بھوتوں کے مفروضوں سے کسی قدر بہتر، لیکن دلائل و براہین سے اُسی قدر عاری۔ ہڈسن کے نظریات سائنس کی حدود سے خارج تھے۔ اگرچہ اس نے بھی ہمزاد کے ذریعہ امراض کے علاج کا ایک طریقہ رائج کیا تھا لیکن وہ اب ''لاشعور'' کی تاریخ کا ایک باب اغلاط بن کے رہ گیا ہے۔ فرائیڈ کے لاشعور کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اپنے ثبوت میں کوئی فطری بنیاد پیش کرے ورنہ یہ بھی اسی کتاب کا ایک باب بن جائے گا۔ ڈملاپ کا کہنا ہے کہ فرائیڈ کے لاشعور کی حقیقت میں کوئی سائنسی بنیاد نہیں۔ وہ اسے اتنا ہی مردود قرار دیتا ہے جتنا بھوت کے سائے یا ہڈسن کے ہمزاد کو۔ دوسرے اہل علم جن میں نفسیاتی معالجوں کی اکثریت ہے کہتے ہیں کہ لاشعور کی تھوڑی بہت تو بنیاد موجود ہے لیکن اس کے شواہد اس قدر کمزور ہیں کہ فرائیڈ کے لاشعور کو کسی حال میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ پروفیسر جسٹر نے آخری نتیجہ یہ نکالا کہ میں یہ کہنے پہ خود کو مجبور پاتا ہوں کہ فرائیڈ کا لاشعور ایک بے بنیاد افسانہ ہے''۔

✡✡✡✡✡✡

چنانچہ اس بات میں اب کوئی شک نہیں کہ فرائیڈ کا یہ خیال کہ جذبات میں لاشعور میں طوفانِ بدتمیزی اٹھائے رہتے ہیں ہر پہلو سے غلط قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ ماہرین نے اس بات کے ثبوت پیش کر دیئے ہیں کہ جذبات وقتی ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں انھیں دوام اور بقا نہیں۔ وہ وقتی طور پہ پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔ جذبات غدودوں میں کیمیائی عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جسم کے مختلف

حصوں میں عارضی طور پہ نمودار ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر میں اپنا مظاہرہ کر کے ختم ہو جاتے ہیں۔ دماغ کے کسی حصہ شعور یا لاشعور میں اُن کا کوئی مسکن نہیں۔ تاہم حافظہ میں مرحوم جذبات کی یادیں اسی طرح برقرار رہتی ہیں جس طرح دیگر مشاہدات کی۔ لیکن وہ نہ کسی ہیجان کی صلاحیت رکھتی ہیں اور نہ اُن سے کسی قسم کا کوئی ردِ عمل پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرائیڈ کے شعور یا لاشعور کا نظریاتی محل ریت کے کسی تودے کی طرح بیٹھ گیا۔

✡✡✡✡✡✡

آیئے اب ذرا ''ننھے کی شہوت یا اوڈی پس کمپلیکس کا جائزہ لیتے ہیں۔

فرائیڈ کا یہ خیال کہ جنسی شہوت کا جذبہ ہی واحد اور بنیادی جذبہ ہے جو استقرارِ حمل کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور بچے کی پیدائش کے وقت سے ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور باقی تمام جذبات اسی بنیادی جذبے سے نمودار ہوتے ہیں۔

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ:

فرائیڈ کا یہ تخیل تمام تر بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ غدودوں کے علم نے اس نظریہ کو جہالت محض ثابت کر دیا ہے۔ آج بیالوجی کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جذبات مختلف غدودوں کے علیحدہ علیحدہ کیمیاوی مادوں سے پیدا ہوتے ہیں اور جنسی شہوت کو پیدا کرنے والی غدودیں دوسرے جذبات پیدا نہیں کر سکتیں۔ جنسی شہوت کا جذبہ سن بلوغت سے پہلے پیدا نہیں ہو سکتا۔ ماہرین نے بتایا ہے کہ جنسی شہوت کے علاوہ دیگر جذبات پیدا کرنے والی غدودیں تو بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی کام شروع کر دیتی ہیں مگر جنسی شہوت کی غدودیں بچے کی پیدائش کے وقت ناپختہ ہوتی ہیں اور دس بارہ سال کی عمر میں جا کے پختہ ہوتی ہیں۔ اُن کی پختگی کے بعد بھی بچہ کئی سال تک جنسی معلومات نہ ہونے کی بنا پہ صحبت پہ قادر نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی بچہ اِن امور سے مماثل حرکات کا مظاہرہ کرتا بھی ہے تو وہ بڑوں کی صحبت میں سیکھی ہوئی ظاہری حرکات کی محض نکالی

ہوتی ہیں۔ اِن ثابت شدہ اور مسلّمہ حقائق کے مدنظر یہ خیال کہ جنسی شہوت کا جذبہ ہی واحد بنیادی جذبہ ہے غلط قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر دیگر جذبات شہوت ہی سے نکلے ہوتے تو انسان کے لیے اُس وقت تک کسی دوسرے جذبے کا مظاہرہ کرنا ممکن نہ ہوتا جب تک کہ جذبہ شہوت کے کیمیائی مادوں کو پیدا کرنے والی غدودیں مکمل ہو کر اپنا عمل شروع نہ کر دیتیں۔ لیکن عام مشاہدہ اس کے برعکس ہے اس لیے کہ بچہ اپنی پیدائش کے تھوڑے ہی دِنوں بعد بچہ اپنی ماں کو پہچاننا شروع کر دیتا ہے، بلکہ جدید ترین تحقیق سے تو یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ پیدائش سے قبل ہی بچہ اپنی ماں کی آواز کو پہچاننے لگتا ہے اور پیدائش کے بعد وہ اپنے باپ اور چچاؤں اور پھوپھیوں یا جو اس سے زیادہ قریب ہوں، زیادہ محبت کریں بچہ اُس کی طرف مائل ہو جاتا ہے ۔ جب وہ روتا ہے تو چاہے دس لوگ اُسے چپ کراتے رہیں وہ چپ نہیں کرے گا مگر ماں کی گود میں جاتے ہی اپنے ماں کے بدن کی خوشبو سے وہ جان جاتا ہے کہ اب وہ اپنی ماں کے پاس ہے اس لیے فوراً ہی چپ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں جذبہ شہوت کو اگر کسی دوسرے جذبے کی اولاد قرار دیا جاتا تب بھی بات سمجھ میں آنے والی تھی کیونکہ یہ جذبہ دیگر جذبوں کے بعد نمودار ہوتا ہے۔ فرائیڈ کے نظریہ سے تو ایسا ہی لگتا ہے جیسے بچہ پہلے پیدا ہوا ہو اور ماں بعد میں؟؟؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر صاحب اولاد جو اپنے بچوں کی حرکات وسکنات کا کسی قدر مطالعہ کرتا ہے جانتا ہے کہ پانچ چھ سال کے معصوم بچوں کا جذبہ شہوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں۔ بلکہ وہ تو اگر اپنے ماں باپ کو اس حالت میں دیکھ لیں تو یہ سمجھنے سے قطعی قاصر رہتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ حیران رہ جاتے ہیں کہ اُن کے ماں باپ اس عجیب قسم کی ہاتھا پائی میں کیوں مشغول ہیں۔ اس سے زیادہ نہ اُن کا ذہن کام کر سکتا ہے اور نہ ہی اُن کی کوئی حس مشتعل ہوتی ہے۔ لیکن فرائیڈ اور اُس کے متبعین کی ہٹ دھرمی سے مجبور ہو کے ماہرین نفسیات کو اس بدیہی حقیقت کا تفصیلی مطالعہ کرنا پڑا۔ انھوں نے کم عمر لڑکے اور لڑکیوں

کی کثیر تعداد کو طویل عرصہ تک زیر مطالعہ رکھ کر شواہد کے ساتھ یہ نتیجہ شائع کیا کہ ''ننھے کی شہوت'' بے بنیاد افسانہ ہے اور اوڈی پس کمپلیکس محض ایک خیالی دھوکا۔ کمسن بچوں میں شہوت جنسی کا نہ تو کوئی جذبہ ہوتا ہے اور نہ ہی انھیں اس کا کوئی شعور ہوتا ہے۔ لڑکی کے مقابلے لڑکے کا ماں کی طرف کوئی خاص رجحان نہیں ہوتا اور لڑکی کا باپ سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا۔ لڑکی اور ماں میں یا لڑکے اور باپ میں نفرت کا مطلق کوئی جذبہ ہوتا ہی نہیں اور اس جذبے کا وجود سرے سے بے بنیاد ہے جس کی فرائیڈ دہائی دیتا ہے۔ کمسن بچوں میں جہاں کہیں رقابت اور نفرت کا جذبہ دیکھا گیا ہے اس کا ہدف ہمیشہ دوسرے بچوں ہی کو پایا گیا ہے جو اُن کے کھلونوں پہ قبضہ کرنا چاہتے ہوں۔

✡✡✡✡✡✡

اور فرائیڈ کا یہ کہنا کہ:

انسانی دماغ کا محتسب انسانی جذبات کو بار بار رد کر دیتا ہے اور انھیں واپس لاشعور میں دھکیل دیتا ہے جس سے نفسیاتی گھٹن پیدا ہوتی ہے جو انسان میں نفسیاتی عوارض کا باعث بنتی ہے۔

✡✡✡✡✡✡

جوابِ دعویٰ یہ ہے کہ:

عقلی بنیادوں اور جدید ترین سائنسی تحقیق نے فرائیڈ کے اس نظریے کو بھی باطل ثابت کر دیا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ عقل میں تمدن کے تقاضوں اور انسانی نفس کی خواہشات کے مابین تناؤ کی ایک صورت تو بہر حال موجود ہوتی ہے مگر اس کو کسی صورت بھی تصادم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جذبات کے مظاہرے عقل کے تقاضے اور تصادم کا امکان تینوں ہی شعوری کیفیتیں ہیں۔ اُن میں سے کسی کے لیے تحت الشعور یا لاشعوری سطح متعین کرنا خلافِ

حقیقت ہے۔نفس انسانی ایک وحدت ہے، انسانی جذبات کیا چاہتے ہیں اُس سے پوشیدہ نہیں۔اُس کی عقل کا تقاضا کیا ہے اُس پہ مستور نہیں۔لہٰذا دونوں تقاضوں میں سے کسی شعوری یا لاشعوری تصادم کا کوئی امکان نہیں۔انسان پورے شعور کے ساتھ اپنے ماحول کا ادراک رکھتا ہے۔یہ فیصلہ اُس کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ وہ اپنے جذبات کو لگام دے یا اُن کی پیروی کرے اور انھیں آزاد چھوڑ دے۔اگر وہ یہ فیصلہ کرے کہ جذبات کو کھلا چھوڑ دینا ہے تو عقل کے تقاضے داخل دفتر کر دیئے جائیں گے۔تصادم کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور انسان کھل کھیلتا ہے یہ الگ بات ہے کہ معاشرے سے اُس کی عزت وقار مٹ جاتا ہے۔اور اگر انسان فیصلہ کرتا ہے کہ اُسے اپنے جذبات کو لگام ڈالنی ہے اور معاشرے کا اچھا شہری بننا ہے تب بھی اُس کے اندر جذبات کا کوئی تصادم نہیں ہوتا بلکہ تہذیب وتمدن نے انسان کو جن اخلاقی اقدار کا پابند کیا ہے وہ انسان کی زندگی میں توازن کا باعث بنتی ہیں۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ فرائیڈ نے اپنی جہالت سے جذبات کی حبس وقید کو نفسیاتی الجھنوں کا باعث قرار دیا ہے۔حالانکہ قدرت نے خلقی طور پہ انسانی جسم میں ایسے انتظامات مقرر فرما رکھے ہیں کہ جذبات کی حبس بے جا کی نوبت ہی نہیں آتی۔اور اگر ماحول کی مجبوری یا خود انسان کا اپنا آہنی ارادہ جذبات کو قدرے دبا کے رکھتے ہیں تب بھی قدرت کی طرف سے مہیا کردہ انتشاری فوارے(ESCAPE VALVES) فوراً ہی کھل جاتے ہیں اور جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں اور انسان کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ راہبانیت کی طرف مائل اخلاق وروحانیت کے دلدادہ نوجوان جو اپنے جنسی شہوت کے جذبہ کو کچلنے کی کوشش میں مشغول ہوتے ہیں تو جب اُن کے جنسی جذبات ایک حد سے زیادہ دباؤ محسوس کرتے ہیں تو احتلام کے ذریعے قدرتی طور پہ وہ دباؤ ختم ہو جاتا ہے۔

شدید غصے کی حالت میں لڑتا ہوا انسان جب قوی تر کے مقابل خود کو بے دست وپا پاتا ہے تو اُس کے غصہ کی شدت پہلے غم کی شکل اختیار کرتی ہے اور پھر اشکباری اُسے اِس غم سے نجات دلا دیتی

ہے۔ باعزم انسان بھی جب شدتِ غم میں اپنے جذباتِ غم واندوہ کو دبانا چاہتا ہے تو اُس کی آنکھوں کے لبریز پیمانے اُسے اُس اذیت سے نجات دلا دیتے ہیں جس میں وہ مبتلا ہوتا ہے اوراس کے بعد وہ پرسکون ہوجاتا ہے۔اسی طرح خوف وہیبت کی شدت سے جب انسان بے بسی محسوس کرتا ہے تو اس کے نازک جذباتی آلات کو شکستگی سے بچانے کے لیے سکتہ یا بیہوشی اُس کی دستگیری کرتے ہیں ۔مگر ہوش میں آنے پر انسان خود کو ہلکا پھلکا اور بغیر کسی دباؤ کے ہشاش بشاش پاتا ہے۔

✡✡✡✡✡✡

اسی طرح فرائیڈ نے خوابوں کے بارے میں جو تخیل پیش کیا وہ بھی عبث ثابت ہوا۔

جواب دعویٰ یہ ہے کہ:

یہ خیال کہ اکثر خواب پراگندہ خیالی کا نتیجہ ہوتے ہیں نہایت قدیم خیال ہے جو ایک حد تک درست بھی معلوم ہوتا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پراگندہ خیالی ہی تمام خوابوں کا سبب ہے۔طوالت کا خوف تفصیلات سے مانع ہے مگر انسانی تاریخ شاہد ہے کہ کئی لوگوں نے خواب میں نظم ونثر کے عمدہ نمونے مرتب کیے ہیں۔کئی ایجادوں کے مرکزی خیال کی رہنمائی خوابوں ہی میں کی گئی،کئی لوگوں نے خوابوں میں مستقبل کے حالات بھی بتائے ہیں،سیرت کی یہ عظیم کتاب سیرۃ المزمل ﷺ جس کا آپ مطالعہ کررہے ہیں اس کو تحریر کرنے کا حکم بھی مجھے خواب ہی میں دیا گیا۔چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ خواب میں صرف پراگندہ خیالی ہی کارفرما نہیں ہوا کرتی بلکہ فکر ونظر کا ارتکاز بھی ہوا کرتا ہے،تخلیقی صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی اور علوم غیب کے انکشافات بھی۔مادہ پرست دانشور چونکہ غیر مادی اسباب کو احتمالی طور پہ بھی ماننے کو آمادہ نہیں ہوتے اس لیے وہ روحانیت کی طرف مائل قبیلے کے مشاہدات ومکاشفات کو درخوراعتناء نہیں سمجھتے۔وہ اس بات پہ غور کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ شاید اُن کی باتوں میں کوئی

حقیقت مستور ہو۔لہٰذا اُن سے یہ کہنا کہ خوابوں کے کچھ اسباب انسانی نفس میں موجود ہیں تو کچھ اور اسباب ماورائی بھی ہیں بالکل بے سود ہے۔ کیونکہ وہ اپنی آنکھوں پہ تعصب کی پٹی باندھ کر کسی ایسی حقیقت کو دیکھنا ہی نہیں چاہتے جو اُن کی خیالی دنیا سے باہر ہو۔خواب کی دنیا ایک وسیع دنیا ہے جس میں پراگندہ خیالی بھی ہے اور خیال آرائی بھی، عقل وخرد کے کرشمے بھی ہیں اور جذبات ومحبت کی نمائشیں بھی، جنت ارضی کے نظارے بھی ہیں اور عذابِ دوزخ کی سوزش بھی، نفس کی جذباتی الجھنیں بھی ہیں اور روح کی بلند پروازیاں بھی، عالم بالا سے تعلق کی استواری بھی اور دیدار رسول اللہ ﷺ بھی، یہ ایک وسیع دنیا ہے جس کو بلی کے خواب میں چھیچھڑے کہہ کے محدود کرنا جہالت محض ہے۔

چنانچہ فرائیڈ ہو یا ڈارون زندگی کے جاہلی نظریات کے داعی تھے۔انھوں نے انسانیت کو خیر کا کوئی پیغام نہیں دیا۔خالق سے بے اعتنائی نے اہل مغرب کے دل سخت کر دیئے جس کی وجہ سے اُن کی خارجہ پالیسی نے خطہ ارض کا چہرہ لہولوہان کر رکھا ہے۔وہ صرف مفادات کی زبان سمجھتے ہیں اور اپنے فائدے کے لیے نوع انسانی کے خون سے ہولی کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے۔ جنسی حیوانیت نے اُن کے روحانی احساس کو کچل کے رکھ دیا ہے۔غیر فطری زندگی نے اُن کے اندر اس قدر بگاڑ پیدا کر دیا ہے کہ وہ فرائیڈ کی جنسی آزادی کے اُس تخیل سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں جو اُس نے پیش کیا تھا۔ بلکہ آج تو وہ ہم جنس پرستی کے حق میں قوانین پاس کرانے میں منہمک ہیں۔لڑکا لڑکے کے ساتھ شادی کر رہا ہے اور لڑکی لڑکی سے لطف حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ وہ آگ جو فرائیڈ نے بھڑکائی تھی جنگل کی حدوں سے نکل کے آبادیوں کو مسمار کرنے کے درپے ہے۔مگر مغرب کسی بھی عقلی دلیل کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اپنی عورت کو بے لباس کر کے وہ خود مہذب اور جدید رجحانات کا حامل قرار دیتا ہے اور دوسروں کو جاہل اور دقیانوسی کہتا ہے۔کبھی وہ ایک الہامی دین کے پیرو تھے مگر آج وہ دین کے لفظ تک سے آشنا نہیں۔اللہ اُن پہ رحم فرمائے اور ہمیں ہدایت پہ کاربند رہنے کی توفیق عطا

فرمائے۔آمین (55*)

✡ ✡ ✡

کہتے ہیں جب لاکھوں لاشوں اور خون ایک بے انتہا سمندر سے گزر کے کیمونسٹ انقلاب بپا ہوگیا تب اس نظریہ حیات کے پیروکاروں نے اُس جنت میں جھانکنے کی کوشش کی جس کا انھیں خواب دکھایا گیا تھا تو اُن کے لیے تب بھی وہاں بھوک وافلاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ چنانچہ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ ماسکو ہی کی سڑکوں پر لینن اور مارکس کے مجسمے دیدہ عبرت بنے پڑے تھے اور تب کوئی دل نہ تھا جس میں ان کے لیے عزت ہو سچ تو یہ ہے کہ نجات صرف الہامیات کی پیروی سے حاصل ہوتی ہے باقی سب دھوکہ ہے اگر کسی کو شک ہو تو کسی کیمونسٹ سے پوچھ لے۔

کارل مارکس اور مادہ پرستی

خطہ ارض پہ اگرچہ ہمیشہ سے لوگوں کا ایک ایسا گروہ ضرور موجود رہا ہے جن کی عقلوں نے اُن کو دھوکا دیا اور انھوں نے خالق کے وجود کا انکار کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کی تعداد ہمیشہ قلیل ہی رہی۔ مگر لادینیت اور الحاد کی جو لہر مارکس کے نظریات کے بعد اٹھی اُس نے لوگوں کے انبوہ کثیر کو گمراہی کے اندھیروں کی نظر کر دیا۔ آج خطہ ارض پہ ایک ارب سے زائد لوگ خدا کا انکار کرنے والے ہیں۔ آج ملحدین کا یہ قبیلہ کارل مارکس کا پیرو ہے۔ کارل مارکس نے لوگوں کو اس بات کی طرف بلایا کہ انسان کے سارے دکھوں کا مداوا مادی برتری میں پنہاں ہے۔ مذہب صرف انسان کی توہم پرستی ہے اور انسان کو خدا کے تصور سے آزاد زندگی بسر کرنی چاہیے کیونکہ مذہب کی قید میں انسان مادی ترقی نہیں کرسکتا۔ کارل مارکس (1818-1883ء) ایک جرمن نژاد یہودی تھا۔ جس نے اپنے نظریات میں منفی رجحانات کو فروغ دیا۔ یہ وہ دور تھا جب مغرب میں مادیت کی لہر عروج پہ تھی۔ مغربی لوگ ابھی کلیسا کے جبر کو بھولے نہ تھے۔ وہ پہلے ہی دین سے بیزار تھے اور جب انھیں نظریاتی اور علمی سہارا

بھی مل گیا تو وہ خالق سے مزید بے اعتناء ہو گئے۔ یاد رہے کہ مغربی معاشرے قولاً ملحد نہیں بلکہ عملاً ملحد ہیں۔ زبان سے وہ خالق کا انکار نہیں کرتے بلکہ اپنے عمل سے خالق کی نفی کرتے ہیں۔ کارل مارکس کی تحریک کے بعد دنیا کے بہت سے ممالک نے الحاد کو اپنا لیا اور خالق سے انکاری ہو گئے۔ بیان کیا گیا ہے کہ مغرب میں جب سائنسی علوم کے عروج نے مادہ پرستی کے رجحان کو فروغ دیا تو فارغ البال لوگوں نے لادینی مادہ پرستی (DIALECTICAL MATERIALISM) کو اپنا شعار بنانا شروع کر دیا۔ نئی نئی ایجادات اور سرمایہ داری کی برکتوں نے معیار زندگی بلند کر رکھا تھا اور فارغ البالی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جمہوری خیالات کی اشاعت ہونے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ شاہی طرز کی حکومتیں یکے بعد دیگرے جمہوریت یا نیم جمہوریتوں میں تبدیل ہونے لگیں تھیں۔ جمہوری خیالات کی اشاعت میں سرمایہ دار طبقہ پیش پیش تھا لیکن جمہوریت ہی کی روشنی میں سرمایہ داری کی خرابیوں پر نظریں پڑنے لگیں۔ صنعتی دور کے مزدوروں کی خستہ حالی نے کئی فارغ البال دانشوروں کو متوجہ کرنا شروع کیا اور انھوں نے معاشی اور معاشرتی عدل کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اول اول اِن لوگوں کو سول سوشلسٹ کہا گیا۔ سرمایہ داری کی خرابیوں پر متوجہ ہونے والے اِن افراد میں ایک کارل مارکس بھی تھا۔ کارل مارکس کے نظریات پہ روشنی ڈالتے ہوئے اُس کا روحانی شاگرد (FREDRIC ENGELS) لکھتا ہے کہ:

> ''جس طرح ڈارون نے نامیاتی کائنات کا قانون ارتقاء دریافت کیا تھا اسی طرح مارکس نے یہ قانون دریافت کیا کہ انسانی تاریخ کس طرح ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ خیالی نظریات کے گھنے جنگلوں میں یہ سادہ حقیقت اب تک مستور پڑی تھی کہ انسان سیاست سائنس آرٹ اور مذہب وغیرہ میں مصروف ہونے سے پہلے کھانے پینے اور لباس کا محتاج تھا۔ لہٰذا بقائے حیات کے مادی اسباب کی پیداوار ہی بقاء انسان کی بنیادی اساس ہے۔ چنانچہ ہر دور میں کسی معاشرہ کی معاشی ترقی کا معیار ہی وہ بنیادیں فراہم کرتا ہے جن پہ متعلقہ لوگوں کی سیاسی تنظیمیں، قانونی نظریات، آرٹ

بلکہ مذہبی افکار تک استوار ہوا کرتے ہیں۔اس لیے مؤخر الذکر امور کی توجیہہ اِنھی معاشی اسباب کی روشنی میں کی جانی چاہیے نہ کہ اس کے برعکس جیسا کہ اب تک کیا جاتا رہا ہے"۔

✡✡✡✡✡✡

کارل مارکس نے سرمایہ داری نظام کے جبر کے خلاف اور سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی کشمکش کے مطالعہ کے بعد سرمایہ (DAS KAPITAL) نامی ضخیم کتاب لکھی جو تین جلدوں پہ مشتمل تھی۔ اس کتاب میں یہ مرکزی خیال پیش کیا گیا کہ ترقی پذیر تمدن کے مشینی دور نے پیداوار کے ارزاں میکانی طریقوں نے ایک طرف تو سرمایہ کے ارتکاز کو تقویت بخشی تو دوسری طرف گھریلو صنعتوں کی تباہی سے مزدوروں کی کثیر تعداد بے روزگار ہوگئی اور وہ اس بات پہ مجبور ہوگئے کہ کارخانہ دار کی شرائط پہ کام کریں۔تب مزدوروں کی اکثریت کی حق تلفی ہونے لگی۔ وہ روزانہ کی اجرت پہ کام کرنے لگے اور آجیر آجر کے حق خدمت کا بڑا حصہ خود رکھ لیتا۔

مزدوروں کا خون چوس چوس کر سرمایہ دار کی گردن موٹی ہونے لگی اور مزدور زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو بھی ترسنے لگا۔اگر مارکس کے نظریات یہیں تک رہتے تو دنیا کو اس پہ زیادہ اعتراض نہ تھا اور کسی حد تک مارکس کا موقف درست بھی تھا۔مگر مارکس نے دوسرا حملہ مذہب پہ کیا جسے دنیا کی اکثریت نے قبول نہ کیا۔اس لیے اگرچہ اُس کے متبعین کی تعداد کثیر ہے مگر تاریخ کے کسی بھی دور میں وہ مذہب پسندوں سے نہ بڑھ سکی۔ مارکس نے کہا کہ مذہبی اجارہ دار سرمایہ دار ہی کے کارندے ہیں اور بجائے اس کے کہ وہ سرمایہ دار کو تلقین کریں کہ وہ مزدور کا حق ادا کرے وہ مزدور کو تلقین کرتے ہیں کہ خالق کی مرضی یہی تھی کہ مزدور تنگ دست رہے۔ چنانچہ مارکس نے مزدور کو تیار کیا کہ وہ متحد ہو جائے اور نظام سرمایہ داری کا تختہ الٹ دیں اور ایک ایسے نظام کی بنا ڈالیں جس میں سرمایہ داری کے دوبارہ جنم لینے کا امکان ختم ہو جائے۔ مارکس نے بتایا کہ اُس کے وضع کردہ نظام سے ارتقائے معیشت کا

یہی فطری قانون بام عروج پہ پہنچ جائے گا جس سے نظام سرمایہ داری اپنی موت خود مر جائے گا۔ مارکس کے اس فطری قانون معیشت کو اُس کی اپنی قوم جرمنی نے رد کر دیا۔ انگلستان نے اسے ذرا بھی درخور اعتناء نہ سمجھا اور تب یہی دونوں قومیں معیشت کے بام عروج پہ تھیں۔ اس لیے کارل مارکس اپنے اس خواب کو سینے سے لگائے ہوئے ذلت کی موت مر گیا کہ دنیا خدا کا انکار کر دے گی اور اُس کے نظریہ حیات کو اپنا لے گی۔ تاہم اُس کے روحانی شاگرد انیجلز نے مارکس کے انقلابی خیال کی مسلسل اشاعت کی اور مزدوروں کو سرمایہ درانہ نظام کے خلاف متحد کیا۔ کیمونسٹ لیگ کی بنیاد رکھی اور کیمونزم کا بنیادی دستور وضع کیا جس میں اُس نے مذہب کے خلاف نظام سرمایہ داری سے بھی زیادہ زہر اُگلا۔ کیمونزم کے بنیادی دستور کی چند دفعات ذیل میں تحریر کی جاتی ہیں۔

انیجلز نے لکھا کہ:

"کیمونسٹ پارٹی اس بات کو نہیں چھپاتی کہ وہ مذہب کو بالکل رد کرتی ہے اور کائنات سے متعلق اسے غیر سائنسی اور دقیانوسی نظریہ قرار دیتی ہے۔ دہریت کی لادینی تعلیم کی اشاعت اور مذہب کے خلاف منظّم نظریاتی جہاد کے بغیر حقیقی اشترا کی نظریہ حیات کا تصور ہی ممکن نہیں۔ روسی کیمونسٹ پارٹی کا پروگرام مذہبی عقائد کی نامعقولیت کی وضاحت اور دہریت کی مسلسل تبلیغ قرار دیتا ہے۔ مذہب لوگوں کی روزمرہ زندگی میں غالب آنے والی مادی طاقتوں کا اُن کے دلوں میں ایک بے ہنگم پرتو ہے۔ ایک ایسا عکس جس میں کائناتی توانائیاں ہی مافوق طاقتوں سے متصف کر دی جاتی ہیں۔ داستانوں، لوک کہانیوں اور آرٹ کی دوسری شکلوں میں یہ تو ضروری نہیں کہ خیالات کی پرواز کو حقیقی سمجھا جائے لیکن اس کے برعکس مذہب خدا، شیطان اور فرشتوں کے خیالی تصورات ہی کو حقیقی سمجھتا ہے۔ تمام مذاہب میں یہ قدر مشترک ہے کہ مافوق طاقتوں پر یہ اعتقاد رکھا جائے۔ لوگوں نے مافوق طاقتوں پر یہ اعتقاد کہاں سے اپنایا اور ایسی ہستی کو جس کا کوئی وجود ہی نہیں انسان نے کیونکر تسلیم کر لیا۔ مافوق

طاقتوں پر اعتقاد، مذہب وتمدن سے ماقبل زمانے کے وحشی انسان کی بے بسی ظاہر کرتا ہے۔ ماقبل تاریخ وحشی دور میں لوگ تمام تر کائناتی طاقتوں کے بے بس غلام تھے۔ بادلوں کی گھن گرج، بجلی کی چمک، بارش سمندروں کی مدوجزر، سیلابوں، زلزلوں، آتش فشاں پہاڑوں کے پھٹنے، بیماریوں، اموات اور خوابوں کے قدرتی مظاہروں کی توجیہہ کرنے سے یکسر قاصر تھے۔ اِن مشاہدات اور اسی قسم کے دوسرے مشاہدات کی توجیہہ کے تقاضے تو بڑھتے چلے گئے۔ لیکن حصول علم کے اسباب بالکل ہی کمیاب تھے۔ لوگوں نے انسانوں اور قدرتی توانائیوں کو ہی مافوق طاقتوں سے متصف کرنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ پوجا پاٹھ، عبادت دُعا اور قربانی کے طریقے رائج کر لیے۔ اس طرح ابتدائی دور میں پیدا ہونے والے مذہبی اعتقادات سرمایہ دار معاشرہ میں اب بھی موجود چلے آرہے ہیں۔ مزدور عوام کی سماجی بدحالی، سرمایہ کی اندھی طاقت کا خوف، اندھی اس لیے کہ عوام اس کی پیش قیاسی نہیں کر سکتے۔ ایسی اندھی طاقتیں جو مزدوروں اور چھوٹے کاروباریوں کو زندگی کے ہر گام پر اچانک غیر متوقع اور حادثاتی تباہی بربادی، قلاشی، استحصال، فاقہ کشی اور موت سے ڈراتی بھی ہیں اور اُن میں مبتلا بھی کرتی ہیں۔ یہی مروجہ مذاہب کی جڑ ہیں۔ مادہ پرستوں کو یہ حقیقت بطور خاص اور مسلسل پیش نظر رکھنی چاہیے۔ عوام اُن مصائب وآلام سے نجات کے لیے جو استحصالی معاشرہ اُن پر عائد کرتا ہے اس کی وجہ سے لوگ مذاہب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ بے روزگاری کے خوف، افلاس اور ایٹمی جنگ کے خدشات نے مستقبل کو غیر یقینی اور مخدوش بنا رکھا ہے اور سرمایہ دارانہ معاشرہ کے سماجی تضاد سے کوئی راہ نجات نہ پا کر اکثر لوگ مذہب کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں تا کہ انھیں خوف و ہراس سے نجات ملے۔ مذہب کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ سائنس کا غیر ہو۔ یہ علم ایسا نہیں جو انسان کی قوت اور کائنات پر اس کی قدرت کو واضح کرے۔ بلکہ ایک اندھی عقیدت ہے جو

بنیادی طور پر خوف و ہراس پر مبنی ہے۔عقیدت کو کوئی ثابت نہیں کیا کرتا اُسے آزمایا ہی جاتا ہے مذہب انسان کی عقل، تجربہ اور مشاہدہ سے نہیں بلکہ اس کے جذبات سے خطاب کرتا ہے۔ یہ مصنوعی طور پہ جذبات کو مشتعل کرتا ہے۔موت کے بعد خوشحالی کے وعدے کرتا ہے، سزا، جزا، لعنت ملامت ،سماجی مقاطعہ ،جہنم کے خوف اور آگ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ مذہب لوگوں کے ذہنوں میں اندھا خوف پیدا کر کے انھیں ابدی زندگی کے سبز باغ دکھلاتا ہے۔مذہب انسان سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے مقدر پہ قانع ہو جائے۔زندگی کے آگے ہتھیار ڈال دے۔مذہب کے جذباتی پہلو ہی مذہب کا تانا بانا ہیں۔ ہر مذہب نے مذہبی رسوم کے طریقے بنا رکھے ہیں۔جن پر عقیدت منداس لیے عمل پیرا ہوا کرتے ہیں تا کہ مافوق طاقتوں کو متاثر کر سکیں۔ مذہبی رسومات کے یہ طریقے اہم نتائج کے حامل ہوا کرتے ہیں۔یہ عادت بن کر لوگوں کو مذہب کا غلام بنالیتے ہیں۔یہ وقتاً فوقتاً مذہبی تخیلات کو جنم دیتے ہیں اُن کو مستحکم کرتے ہیں اور تاریک تر اور مبہم جذبات کے دھاروں کو تیز کر دیتے ہیں جو مذہبی عقیدت سے وابستہ ہوتے ہیں۔

سوشلسٹ سوسائٹی میں مذہب کی سماجی جڑیں بالکل کٹ جاتی ہیں۔سرمایہ داری کی موت کے ساتھ ہی انسان سے انسان کی لوٹ کھسوٹ اور سماجی استحصال ختم ہو جاتے ہیں البتہ معاشرہ کے کچھ لوگوں کے ذہنوں میں مذہبی عقیدت باقی رہ جاتی ہے۔ سوشلسٹ ممالک میں مذہب صرف اسی شکل میں ماضی کی یادگار کے طور پہ باقی رہ گیا ہے جب تک معتقدین زندہ ہیں، عبادت گاہیں اور پادری بھی باقی ہیں۔سوشلسٹ ممالک کے قوانین ضمیر کی آزادی کی ضمانت دیتے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی عبادت کی آزادی بھی باقی ہے اور مذہب کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور لادینیت کی تعلیم دینے کی پوری پوری آزادی بھی۔مذہب کی باقی ماندہ یادگاریں اگرچہ سخت جان

ہیں لیکن لازوال تو نہیں وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائیں گی۔
مارکس نے کہا کہ مذہب اس موہوم خوشحالی کی آرزو کا نام ہے جو خوش آئند مغالطّوں کے محتاج معاشرے کا لازمی نتیجہ ہوا کرتی ہیں لیکن جونہی لوگ اس سے آگاہ ہو جائیں گے کہ حقیقی خوشحالی کیا چیز ہے اور وہ کیسے حاصل ہوتی ہے تو مذہب کا وجود ختم ہو جائے گا''۔

✡✡✡✡✡✡

ماسکو سے شائع ہونے والی نظریہ کیمونزم کا پرچار کرتی ہوئی ایک اور کتاب (A Short Story of Pre-Capitalist Society) میں مذہب کے خلاف کچھ یوں زہر اُگلا گیا ہے۔

''محنت کش عوام پر جاگیردار طبقہ کا اقتدار برقرار رکھنے کے حربے صرف معاشی استحصال اور سیاسی استبداد ہی نہ تھے بلکہ نظریات حیات کو بھی موثر طور پہ استعمال کیا جاتا تھا۔ جاگیری نظام میں مذہب اور کلیسا نے فیصلہ کن کردار انجام دیا۔ کلیسا نے بتایا کہ اس دنیا کی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بدلے دوسری دنیا میں جنت ملے گی۔ کلیسا کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ محنت کش طبقہ میں اطاعت گزاری کا جذبہ پیدا کر کے انھیں جاگیرداری استبداد کے خلاف جدو جہد کرنے سے باز رکھا جا سکے۔ مذہب اس دور میں روحانی زندگی پر ہمہ گیر اثر رکھتا تھا۔ اور کلیسا کا کام یہ تھا کہ اپنے مذہبی اقتدار سے مروجہ سماجی نظام کے نفاذ کی بنیادیں قائم رکھے۔ تاریخ کے جاگیرداری دور میں وسیع طور پر پھیلا ہوا دوسرا مذہب اسلام تھا۔ مسلمانوں کی مذہبی تنظیم نے ملک عرب میں جاگیرداری نظام کے نفاذ کی بنیادیں رکھیں اور اسلام ہی روحانی طور پہ اُن تمام ممالک

کے جاگیرداری سماج پر حکمران رہا جو عربوں نے فتح کیے۔ پھر اسلام ایشیا، افریقہ اور کسی حد تک یورپ میں بھی پھیل گیا۔ اسلام نے استبداد اور استحصال کے مروجہ نظام کے جواز کا فتوی نافذ کیا۔ مسلمانوں کی کتاب قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم اللہ کی طرف سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نافذ کردی گئی ہے۔ عیسایت کی طرح اسلام نے بھی غریبوں کو حکمران طبقہ کے استبداد کے تحت روزمرہ کی مشقت آمیز زندگی کے صلہ میں مرنے کے بعد بہترین زندگی کا وعدہ کیا ہے۔ اپنے وسیع تر اثرات کی بدولت بدھ مت بھی دنیا کے اہم مذاہب میں شامل ہے۔ چنانچہ بدھ مت میں بھی جاگیردار طبقہ نے سماجی ناہمواریوں کو جائز ٹھہرایا''۔

✡✡✡✡✡✡

لادینی مادی پرستی دلیل بیان کرتے ہوئے ملحدین نے کہا کہ:

انسانی فہم وادراک چونکہ مشاہدات وتجربات کے تجزیہ اور تعمیر نو پر قادر ہیں اس لیے وہ تاثرات کی شکست وریخت کی خیالی تصویریں بنالیا کرتے تھے لیکن ضروری نہیں کہ وہ سب تصویریں حقیقی بھی ہوں۔ تخیل اور نظریات کی تمام شکلیں قابل اعتماد نہیں اور انھیں مادی حقائق کے برابر درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ تخیلات کی پرواز میں حقیقت اور واہمہ کے درمیان امتیاز کا معیار الگ حیثیت کا حامل ہے۔ اس نظریہ کے مطابق یہی امر مسلّمہ تسلیم کیا جائے گا جو اس کائناتی مادہ اور توانائی کی روشنی میں اپنی حقیقت کا ثبوت فراہم کر سکے اسے ہی حقیقی تسلیم کیا جائے گا اور خیالات کی بقیہ تمام پروازوں کو فرضی اور غیر حقیقی قرار دیا جائے گا۔ اس مادی نظریہ کے مطابق جن، شیاطین، فرشتے، دیوی دیوتا اور خدا سب وہم کی ایجادیں ہیں جن کی کوئی سند نہیں اور مذہب کا سرچشمہ تمام تر توہم پرستی پہ مبنی ہے۔ حقیقت اور واہمہ کے درمیان امتیاز کا یہ طریقہ کار معقول اور عین منطقی ہے۔ چونکہ ہماری کائنات تمام تر مادی ہے اور انھی مادی تعبیروں میں ہمیں حقائق کا ثبوت تلاش کرنا ہے۔ اس لیے عقل

ودانش کے نزدیک واحد معقول مسلک جدلیاتی یا لادینی مادہ پرستی ہی ہو سکتا ہے۔اس نظریہ حیات کے مطابق تمام مذاہب دور جاہلیت کے حیوانی جذباتِ خوف ورجاء کی پیداوار ہیں۔جنھیں معاشرہ نے اپنی نادانی سے غیر ضروری اہمیت دے کر اپنے ہی پاؤں کی زنجیر بنالیا۔خود غرض لوگوں نے عوام کو ورغلانے اور اُن کو ناجائز استحصال کرنے کے لیے مذہب کو آلہ بنا رکھا ہے۔خدا پرستی اور مذہبی تخیل،اپنی توہماتی نوعیت کی وجہ سے معاشرہ کی ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ بنے ہوئے ہیں جنھیں ختم کرانا اشتراکی مادہ پرست معاشرے کا اولین فرض ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ سارا فسانہ جس پہ اشتراکیت کی ساری عمارت کھڑی ہے۔چونکہ اُن لوگوں نے اپنے تخیل کو علمی اور عقلی بتایا ہے اس لیے ہم بھی اُن کے علم وعقل کی نارسائی کا تذکرہ کریں گے اور اِس بات کو اُن پہ کھول کے رکھ دیں گے کہ جسے وہ عقل سمجھتے رہے وہ بے عقلی تھی، جسے وہ علم سمجھ رہے تھے وہ جہالت تھی، جسے وہ روشنی سمجھ رہے تھے وہ اندھیرا تھا، جسے وہ نجات سمجھتے تھے وہ قید تھی، جسے وہ خوشی سمجھ رہے تھے وہ غم تھا، جسے وہ آزادی سمجھتے تھے وہ دھوکا تھا، جسے وہ آسانی سمجھ رہے تھے وہ مشکل تھی جسے وہ درست سمجھ رہے تھے وہ غلط تھا اور اب تو تاریخی طور پہ بھی یہ امر ظاہر ہو چکا ہے۔اس لیے کہ وہ خواب جو مارکس نے دنیا کے مزدوروں کو دکھایا تھا کب سے اپنی موت آپ مر چکا ہے۔(55*)۔

✡ ✡ ✡

نظریہ اشتراکیت

اس سے قبل ہم نے کارل مارکس کے نظریے کے اُس حصے کا مطالعہ کیا ہے جس میں اُس نے کائنات کی مادی تشریح پیش کی ہے اور خالق کا انکار کیا ہے، مذہب کو تو ہم بتایا ہے۔اب ہم نظریہ اشتراکیت کا کچھ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کارل مارکس خدا کا انکار کرتا ہے، مذہب کو تو ہم بتاتا ہے مگر اس کے باوجود وہ خود بھی ایک جنت کی تلاش میں ہے۔ایک ایسی خیالی جنت کی تلاش میں ہے جس میں اُس کی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل ہو سکے۔اُس کی خیالی جنت میں انسان کو دکھوں سے نجات مل جاتی ہے۔اُس جنت میں کوئی بادشاہ نہیں بلکہ مزدور ہی بادشاہ ہے۔شاید مارکس بھول گیا تھا کہ مزدور آدابِ شاہی سے ناواقفیت کی وجہ سے اس منصب کے لیے نہایت ہی ناموزوں ہے۔سوشلزم ایک مخصوص نظام حیات کا نام ہے جس کے تین اجزائے ترکیبی ہیں۔اول نظریہ حیات ،دوم لائحہ عمل اور سوم منزل مقصود۔ چنانچہ مارکس کے تصوراتی معاشرے میں زندگی بغیر خدا کے، جدو جہد دولت کے لیے اور بادشاہت مزدور کے لیے ہے۔مارکس کی جنت ارضی میں تمام ذرائع پیداوار کی مالک حکومت ہے۔تمام مزدور حکومت کے کارندے ہیں اور اِن سب کی آخری منزل وہ جنت ہے جس میں دستورِ کیمونزم مروّج ہو۔مارکس کی اس جنت میں جہاں کوئی خدا نہیں وہاں کوئی بادشاہ بھی نہیں۔بس خوشی ہے اطمینان ہے اور لوگ بس عیاشی کر رہے ہیں۔سرمایہ دار اور مزدور کی باہمی

کشمکش کے تذکرے میں مارکس کی عمر گزر گئی ۔ وہ خود ایک ایسا شخص تھا جس کی معاشرے میں کوئی عزت نہ تھی ۔ وہ بے روزگار اور بے کس تھا۔ وہ ہوٹلوں کے کوڑے دان چھان چھان کر خوراک حاصل کرتا تھا۔ مگر اِس بات کا اُسے کوئی رنج نہ تھا وہ بس اپنی اُس جنت کی تلاش میں گم تھا جو اُس کے تخیل میں بسی تھی ۔ یہ نہیں کہ مارکس سے پہلے سرمایہ داروں کے استحصال کا کسی کو خیال نہ آیا تھا ۔ بہت سے لوگ تھے جنھوں نے معاشرے کی توجہ اس جانب مبذول کی تھی ۔ یہ لوگ سوشلسٹ کہلاتے تھے۔ تاہم کوئی انقلابی نظریہ یا حرکی تخیل اُن کے پیش نظر نہ تھا اور نہ ہی وہ لوگ مذہب سے آزادی چاہتے تھے۔ وہ تو بس اس قدر چاہتے تھے کہ محنت کش طبقے کو اُس کا پورا پورا حق مل سکے تاکہ معاشرے کے ہر فرد کی ضروریات کی احسن طور پہ تکمیل ہو سکے۔

لیکن وہ سوشلسٹ تحریک جو ایک انقلابی نظریہ حیات بن کر سوشلزم کے نام سے مقبول ہوئی جس کی بنیاد کارل مارکس نے رکھی اور جس کی تکمیل لینن نے کی ۔ وہ اِس اصلاحی اور قدیم اخلاقی تحریک سے بہت مختلف تھی جس کو سوشلسٹ چلا رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج جس چیز کو ہم ''سوشلزم'' کے نام سے جانتے ہیں وہ ایک مکمل ضابطہ حیات کی صورت میں ابھر کے سامنے آئی تھی اور اُس نے کارل مارکس کے نظریہ حیات ہی کو تمام انسانی دکھوں کا مداوا قرار دیا تھا۔ کارل مارکس لادینی مادہ پرستی کا قائل تھا اور لادینی مادہ پرستی اخلاقی قدروں کو بے سند قرار دیتی ہے اور ہر چیز کو خالص مادی بنیادوں پر پرکھنے کی قائل ہوتی ہے۔

چنانچہ کارل مارکس کے نزدیک مزدوروں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کے اخلاقی مطالبات اور مزدوروں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے سوشلسٹ تحریکیں مہمل اور بے معنی ہیں۔ جب سماجی انصاف اور انسانی بہبود کی کوئی مادی بنیاد ہی نہ ہو تو اس قسم کے مطالبات بے معنی ہی تصور ہوں گے۔ دراصل تو کارل مارکس کو مزدوروں کی خوشحالی یا بدحالی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی بلکہ اُسے معاشرہ میں پیدا ہونے والی اُن معاشی تبدیلیوں کا مطالعہ کرنے سے دلچسپی تھی جو سرمایہ داری کو جنم دے کر قوی ہیکل بنا دیتی ہیں۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا سرمایہ داری کی پیدائش کے مادی اسباب کیا ہیں اور سرمایہ داری کا

یہ مہیب دیو آگے چل کر کیا نتائج برآمد کرے گا۔کارل مارکس نے دیکھا کہ سرمایہ دار ہزاروں مزدوروں سے کام لیتا ہے اور اُن کی محنت سے حاصل شدہ پیداوار پہ اکیلا ہی متصرف ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اُس کے پاس تو دولت کے انبار اکٹھے ہونے لگتے ہیں مگر مزدور اپنی ضروریات کی بنیادی اشیاء سے محروم رہ جاتا ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ سرمایہ داری نظام حیات میں طبقاتی تقسیم اس قدر مہیب ہو جاتی ہے کہ ایک ہی معاشرے کے دو طبقوں میں انتہائی فصل جنم لے لیتا ہے جس سے دونوں طبقات ایک دوسرے کی نفرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔مارکس کا خیال تھا کہ مزدور چونکہ تعداد میں سرمایہ داروں سے بہت زیادہ ہیں اس لیے انھیں یہ احساس دلانے کی دیر ہے کہ وہ سرمایہ داری کی عمارت کو مسمار کر سکتے ہیں تو وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑے ہوں گے اور متحد ہو کر سرمایہ داروں سے اقتدار چھین لیں گے اس طرح اُس انقلاب کی تکمیل ہو جائے گی جس کا خواب مارکس نے دیکھا تھا اور مارکس کی خیالی جنت معرض وجود میں آ جائے گی۔

کارل مارکس نے اپنے تخیل کی زرخیزی کی بنا پہ دعویٰ کیا تھا کہ اُس کی خیالی جنت جلد ہی ساری دنیا میں قائم ہو جائے گی، متمدن اور ترقی یافتہ ممالک جلد ہی اُس کے معاشی نظریہ کو اپنا لیں گے۔ اگرچہ پیش منظر مارکس کے تخیل کے برعکس ظاہر ہوا اور کسی متمدن ملک نے اُس کے نظریہ کو درخور اعتناء نہ جانا۔مارکس نے کہا کہ اُس کا معاشی نظریہ لوگوں کی ضرورت بن جائے گا لوگوں کی اکثریت اُس کا تقاضہ کرے گی۔ایک عالمگیر انقلاب کے ذریعے مزدور کی آمریت قائم ہو جائے گی اور ذرائع پیداوار شخصی اقتدار سے نکل کر مزدوروں کے اجتماعی قبضے میں آ جائیں گے۔استحصالی طبقہ ختم ہو جائے گا تو حرص و ہوس کی بنیادیں بھی کٹ جائیں گی۔لوگوں کے دل سے مال و دولت اکٹھا کرنے آرزو باقی نہ رہے گی صرف محنت باقی رہے گی اور اُس کا عوض بہت بڑھ جائے گا حتیٰ کہ معاشرے میں نہ کوئی امیر ہو گا نہ غریب۔

مارکس نے کہا کہ سائنسی انکشافات کی کثرت اور تکنیکی مہارتوں کی فراوانی سے پیدا ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کی بنا پہ ہاتھ سے کام کرنے والوں کی ضرورت کم ہو جائے گی مگر اُن کا معاوضہ برقرار رہے گا۔اس طرح کام کرنا محنت نہیں بلکہ ایک شغل بن جائے گا۔ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ کام

مشقت کے لیے نہیں بلکہ وقت گزاری کے لیے کیا کریں گے۔ لوگ اجرت کے لالچ میں نہیں بلکہ وقت گزاری کے لیے کام کریں گے۔ پیداوار کی اس قدر فراوانی ہوگی کہ ہر شخص کو ہر چیز بلا قیمت اور حسب ضرورت دستیاب ہوگی۔ یہ مرحلہ سائنٹیفک کیمونزم کا مرحلہ ہوگا۔ گویا ٹھوس مادی بنیادوں پر کسی خالق کی مدد کے بغیر خود انسان کی اپنے ہاتھ سے تیار کی ہوئی جنت ارضی کا ماحول نہایت ہی فرحت بخش ہوگا۔ اگلے مرحلے میں حکومت بھی مزدور ہی کریں گے جن کے اختیارات لامحدود ہوں گے۔ کہہ سکتے ہیں کہ تب نہ کوئی حاکم ہوگا نہ کوئی محکوم۔ اس لیے کہ مارکس کی خیالی جنت میں حکومت کی کوئی خاص ضرورت ہی نہ ہوگی اس لیے کہ لوگ مطمئن اور خوشحال ہوں گے اپنی ضروریات پوری کرنے پہ قادر ہوں گے، خوش ہوں گے، آسودہ ہوں گے، امن میں ہوں گے دولت کی فراوانی ہوگی، اشیائے پیداوار سے گودام بھرے ہوئے ہوں گے، چوری نہ ہوگی، لوٹ کھسوٹ نہ ہوگی اس لیے حکومت کی بھی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

مارکس کی خیالی جنت بنانے والے اُن سوشلسٹوں کے برعکس جو اشتراکیت کو نظری اخلاقیات اور انصاف کے تقاضوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی مادی بنیادوں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے اور اُسے ایسی معیاری کیفیت بتاتے ہیں جس میں مزید کسی ارتقاء کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ تاہم اس قدیمی گروہ کے برعکس مارکس اور اینجلز نے اشتراکی معاشرہ کو مادی پیداوار کی انتہائی ترقی یافتہ قوتوں پر مبنی مسلسل ترقی کرنے والے سماجی نظام کی ارتقائی شکل قرار دیا ہے۔ اس طرح انھوں نے سائنٹیفک طریقے سے ثابت کیا کہ کیمونسٹ سوسائٹی اپنی ترقی میں دو مرحلوں سے گزرے گی ایک سوشلزم کا مرحلہ اور دوسرا سوشلزم ہی سے برآمد ہونے والا کیمونزم کا مرحلہ۔

مارکس کی خیالی جنت حقیقی معنوں میں تو کبھی بھی اور کہیں بھی قائم نہ ہوسکی مگر مارکسی نظریہ تنقیدی طور پر جس قدر بودا ہے اُسی قدر جذباتی اپیل کے حوالے سے قوی تر ہے کہ حسین خوابوں کے اس تسلسل

میں معاشرے کے محروم طبقے کے لیے بہت کشش تھی۔ چنانچہ دنیا کے کئی ممالک میں مزدور مارکس کے نظریات کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ کئی ممالک میں سوشلٹ قوت پکڑنے لگے مگر مارکس کی خیالی جنت کی طرف پہلا عملی قدم روس میں لینن نے اٹھایا اور روس میں زاروں کی بادشاہت کا خاتمہ کر کے وہاں مارکس کی ارضی جنت کی بنا رکھی اگرچہ یہ جنت نہایت بودی اور عارضی ثابت ہوئی صرف ستر سال بعد یہ جنت جہنم میں بدل گئی۔ آیئے انقلاب روس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔

✡ ✡ ✡

لینن اور اشتراکی انقلاب

مارکس اپنی زندگی کے آخری سالوں میں تھا۔اُس کے معاشی نظریات کو دنیا میں خاطر خواہ پزیرائی حاصل نہ ہوئی تھی۔وہ مایوس اور پژمردہ تھا اُس کی خیالی جنت قائم نہ ہوسکی تھی۔دنیا کی اکثریت آج بھی رب العزت کی ذات پہ ایمان رکھتی تھی جس سے مارکس نے دنیا کو روکنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔دوسرے کئی ممالک کی طرح جہاں جبر کے نظام قائم تھے۔روس میں بھی لوگوں کا ایک گروہ مارکس کے نظریات کی طرف متوجہ تھا اور وہاں سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔زار کی شہنشاہیت ظلم واستبداد میں مغربی بادشاہتوں سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔لوگ عیسائی تھے اور کلیسا کا گہرا اثر ورسوخ اُن کی زندگیوں پہ پایا جاتا تھا۔مارکس جب قبر میں اترا تو اُسے شاید ادراک بھی نہ تھا کہ اُس کی خیالی جنت روس میں ابتدائی مراحل میں ہے۔روس میں بھی مزدور شاہی استبداد،کلیسا کے جبر اور سرمایہ دار کے نامناسب رویہ کا شکار تھا اور دنیا کے دیگر مزدوروں کی طرح کوئی اُن کا پرسان حال نہ تھا۔کہ اسی دور میں روس کے ایک غریب سکول ٹیچر ایلیا نکولیش علیانو کے ہاں پیدا ہونے والے تمام بچے چاہے وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں عجیب باغی ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے کہ اُن کو زار کے کارندوں کا ذرا بھی خوف نہ تھا۔سارے بہن بھائی مذہب سے باغی تھے،سماجی قدروں کے منکر تھے اور کھلم کھلا زار کے خلاف باتیں کرتے تھے۔<u>1870</u> میں لینن پیدا ہوا۔اُس کے باپ نے اس

کا نام ولد میر ایلیاس علیا نور رکھا۔ لینن ابھی سکول میں ہی تھا کہ اُس نے زار روس کے خلاف باتیں کرنا شروع کر دیں اُس کا بڑا بھائی کالج میں اسی شغل میں مشغول تھا کہ اُسے زار کے کارندوں نے گرفتار کر لیا۔ جب لینن کالج پہنچا تو اُس کے بڑے بھائی کو شاہ سے بغاوت کے جرم میں موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔

لینن کو اس بات نے بہت دکھ دیا تھا اور یہ دکھ فطری تھا مگر اِس دُکھ نے لینن کے اندر جو ردعمل پیدا کیا وہ انتہائی نوعیت کا تھا۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ روس کے بادشاہ سے اپنے بھائی کا انتقام لے گا۔ تب لینن سترہ سال کا تھا جب اُسے شاہ کے خلاف باتیں کرنے کی پاداش میں گرفتار کیا گیا۔ مورخین نے وہ مقالمہ لکھا ہے جو اُس کی گرفتاری کے موقع پر لینن اور پولیس افسر کے درمیان ہوا۔

پولیس افسر نے لینن سے کہا:

نوجوان مجھے تمھاری جوانی پہ ترس آتا ہے۔ باغی بن کے تم کیا حاصل کر لو گے کیا تم نہیں جانتے کہ تمھارے سامنے ایک فصیل کھڑی ہے۔

لینن نے کہا:

مگر تم نہیں جانتے کہ فصیل بوسیدہ ہو چکی ہے ایک ہی دھکے سے گر جائے گی۔

اور وہ پولیس افسر لینن کی جرأت پہ ششدر رہ گیا۔

کچھ عرصے بعد جب لینن جیل سے رہا ہوا تو اُسے کالج سے نکال دیا گیا۔

لینن سوچ میں گم ہو گیا وہ جانتا تھا کہ زارِ روس ایلگزینڈر سوم کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اُسے بہت طاقتور تحریک کی ضرورت ہوگی۔ کئی دن کی سوچ بچار کے بعد بھی اُسے کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ ایک دن معمول کے مطالعے کے دوران اُس نے مارکس کو پڑھا تو اُس نے مارکس کے نظریات سے وہ خواب اخذ کیا جو دراصل تو اُس کا ذاتی خواب تھا مگر اُس نے کارل مارکس کے نظریے کو اپنی کامیابی کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس نے کارل مارکس کے نظریے میں وہ کچھ دیکھا جو دوسرے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ لینن نے سوچا کہ اس ملک میں مزدور کی حالت نہایت

دِگرگوں ہے اور مزدور اس قدر اکثریت میں ہے اور محروم ہے کہ اگر انھیں اُن سہانے خوابوں کی طرف بلایا جائے جن کا خیال کارل مارکس نے پیش کیا ہے تو شاید وہ متحد ہو جائیں اور اگر وہ متحد ہو گئے تو اُس کی منزل زیادہ دور نہ رہے گی۔

چنانچہ لینن کی سوانحہ حیات (LENIN A BIOGRAPHY) میں مصنف لکھتا ہے کہ:

''انقلاب کی آمد کو جس طرح لینن نے سمجھا اور کوئی نہیں سمجھ پایا۔ صدی کے موڑ پر اُس نے ایک نئی قسم کی پارٹی بنانے کا سوچا۔ ایک ایسی پارٹی جو محنت کش طبقہ کے انقلابی رجحان کی رہبری کی اہل ہو۔ ایسی پارٹی جو ہر اس کوشش کے مقابلے میں چٹان کی طرح سینہ سپر ہو جائے جو مزدوروں کو متشدد انقلاب کے راستے سے ہٹا کر باہمی سمجھوتوں اور پر امن اصلاحات کی طرف لے آئے۔ لینن زار کا تختہ الٹنا چاہتا تھا مگر اُس نے مزدروں کی آمریت کے نعرے کی آڑ لے لی تا کہ مزدور اُس کی سربراہی میں متحد ہو جائیں''۔

✡✡✡✡✡✡

لینن روس کی سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔ مگر یہ پارٹی عدم تشدد پہ یقین رکھتی تھی اور خونی انقلاب کی مخالف تھی ۔ وہ قدیم روایات سے انحراف سے انکار کرتے اور مذہب کو کسی صورت چھوڑنے پہ تیار نہ تھے۔ لینن جانتا تھا کہ یہ سب نظریات اُس کی منزل کی راہ میں رکاوٹ ہیں مگر اُس نے صبر کیا اور اس پارٹی میں شامل رہا۔ چند ہی سالوں میں اُس نے سوشلسٹ پارٹی میں اپنے ہم خیال لوگوں کا ایک گروہ پیدا کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ اُس نے سوشلسٹ پارٹی کے منشور پہ کھلم کھلا نقطہ چینی شروع کر دی ۔ اُس نے روس کی سوشلسٹ پارٹی کے اندر انتشار پیدا کر دیا تھا۔ اگر چہ سوشلسٹ پارٹی نے اُس کے نظریات کو رد کر دیا تھا مگر تب تک وہ کافی طاقت پکڑ چکا تھا بہت سی مزدور تنظیمیں

لینن کی سربراہی میں کام کرنے کو تیار تھیں۔تب لینن نے سوشلسٹ پارٹی کے اندر سے ہی ایک نئی سیاسی پارٹی قائم کرنے کا اعلان کر دیا جس کا نام اُس نے بالشویک پارٹی رکھا۔سوشلسٹ پارٹی کے اکثر اہم لوگ وقت کا دھارا دیکھتے ہوئے لینن کے ہمراہ ہوگئے اور سوشلسٹ پارٹی اپنی وقعت کھونے لگی اور بالشویک پارٹی دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر طاقتور ہوگئی کہ مزدوروں کے بے پناہ اژدھام نے زارِروس کے محلوں میں زلزلہ بپا کر دیا تھا۔وہ ایک خونی انقلاب تھا جس نے روس کو خانہ جنگی میں ڈال دیا تھا۔پھل پک رہا تھا اور روس کے مزدور اپنی آئندہ نسلوں کے خوش آئند مستقبل کے لالچ میں کارل مارکس کے نظریے پہ اپنا خون پیش کر رہے تھے اور وہ نہیں جانتے تھے کہ لینن کو کارل مارکس کے نظریہ حیات سے ذرا بھی دلچسپی نہیں بلکہ اُس کے اپنے کچھ خواب تھے جن کی تکمیل کے لیے اُس نے مزدور کے ارزاں خون کا انتخاب کیا تھا۔

لینن نے ایک پرتشدد انقلاب کے ذریعے بسیار خون خرابے کے بعد آخر زار روس کا تختہ الٹ دیا اور حکمران بن بیٹھا۔مزدور سمجھے کی انقلاب کی تکمیل ہوگئی ہے اس لیے اب اُن کے دن سنہری اور راتیں مخمور ہو جائیں گی۔مگر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ایسا کچھ نہ ہوا۔مزدور نے جس نعرے پہ اپنا خون بہایا تھا وہ تھا مزدور کی آمریت۔مگر وہاں تو لینن کی آمریت کی قائم ہوگئی تھی۔بالشویک اب ایک مزدور پارٹی نہ رہی تھی بلکہ اب وہ حکمران جماعت تھی جو روس جیسے وسیع وعریض ملک کے سیاہ وسفید کی مالک بن چکی تھی۔چنانچہ وہ بھول گئی کہ انھوں نے اُس مزدور سے کیا وعدے کیے تھے جنھوں نے اس تحریک میں اپنا خون پانی کی طرح بہایا تھا۔کچھ عرصہ گذرنے کے بعد جب مزدور کو احساس ہوا کہ سب کچھ لٹا کے اُن کے ہاتھ کیا آیا تو انھوں نے یہی سوال حکومت وقت کے سامنے رکھ دیا۔حکومت وقت نے انھیں نہایت روکھا سوکھا جواب دیا بلکہ لینن تو سرے سے مزدور کے حقوق سے انکاری ہوگیا۔لینن کی سوانح حیات لکھتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ جب مزدورں کے حزب اختلاف کے کچھ لیڈر اپنے مطالبات لے کر لینن کے پاس پہنچے اور اسے یاد دلایا کہ مزدور کا خون اس انقلاب کی وجہ ہے تو لینن نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا:

تمھارا مطلب ہے کہ اب ملک کے نظم و نسق کو مزدوروں کی ٹریڈ یونینیں چلائیں گی۔
انھوں نے کہا؛ ہاں اس لیے کہ یہی طے ہوا تھا اسی بنا پہ یہ انقلاب آیا ہے۔
لینن نے کہا:
ٹرید یونینوں کے اس حق اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر ووٹ ہوں گے ٹریڈ یونین کے لیڈر چنے جائیں گے مجھے اس نظام سے جمہوریت کی بو آتی ہے اور چونکہ اشتراکیت اور جمہوریت ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لیے میں بہ حیثیت بالشویک پارٹی کے سربراہ کے ٹریڈ یونینوں کے اس مطالبے کو رد کرتا ہوں۔
لینن نے مزید کہا:
حکومت کرنے کے لیے مزدوروں کی نہیں بلکہ ایک آہنی فوج کی ضرورت ہوتی ہے جو میرے پاس موجود ہے۔
چنانچہ بادشاہ بدل گیا، انقلاب آ گیا، مگر مزدور وہیں کا وہیں رہا۔
کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ روس میں چاہے کچھ عرصے کے لیے ہی سہی مارکس کی خیالی جنت قائم ضرور ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مارکس کی خیالی جنت کہیں بھی کبھی قائم نہ ہو سکی اس لیے کہ جب بالشویک پارٹی ہی نے کارل مارکس کے نظریات میں تحریف کر دی تو وہ جنت کس طرح وجود میں آ سکتی تھی جس کا خواب کارل مارکس نے دیکھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ روس میں مزدوروں کی حکومت قائم کرنے کا نعرہ لگایا گیا اور عالمی برادری کو یہی تاثر دایا گیا کہ روس میں انقلاب آ گیا ہے اشتراکیت قائم ہو گئی ہے مگر حقیقت میں وہ لینن اور بالشویک پارٹی کی وہ بدترین آمریت تھی جس میں مزدور کی حالت نظام سرمایہ داری کے مزدوروں سے بھی بہت پست تھی۔ بلکہ روسی مزدور تو اب اُس حالت کو ترس گیا تھا جب زار روس حکومت کرتے تھے۔ تب کم از کم وہ اس پوزیشن میں تو تھے کہ اپنے مزدور لیڈر کی وساطت سے مالک سے کچھ مراعات حاصل کر سکیں مگر بالشویک پارٹی کے منشور میں تو اس بات کی بھی کوئی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ روسی مزدوروں کے لیے لینن بدترین آمر ثابت ہوا تھا زار روس سے بھی

برا۔اس لیے کہ کسی ایسے سیاسی نظام میں جہاں ایک ہی پارٹی کی حکومت ہو، کسی کو حکومت کی مخالفت میں اپنی زبان سے ایک لفظ تک نکالنے کی اجازت نہ ہو، اظہارِرائے کی آزادی کے ہر پہلو پہ قدغن ہو۔حکمرانوں پہ تنقید گناہ ہو، دستورِزباں بندی کا عام چلن ہو تو ایسے معاشرے میں ذی اقتدار طبقے کی طرف سے نہ صرف ظلم بڑھ جاتا ہے بلکہ وہ بدعنوان اور خائن ہو جاتا ہے۔روس میں بھی ایسا ہی ہوا لینن کے دور میں چلو اشتراکیت کا بھرم پھر بھی کسی حد تک قائم تھا اگرچہ لینن بدترین آمر ثابت ہوا تھا مگر اُس کے پیشرو یعنی اسٹالن اور پھر خورد شوف کے عہد میں تو صاحب اقتدار طبقہ کا ظلم اور بدعنوانی حد سے گزر گئی ساتھ ہی مزدور بھی زمین میں دفن ہو گیا جس کی آہ سے یقیناً کارل مارکس اپنی قبر میں بھی لرزتا ہوگا۔

لینن کے انقلاب کے بعد روسی اشتراکیت میں کیا ہوا اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ حکومت کی طرف سے مزدور کو یہ جواز پیش کیا تا رہا کہ اُسے حقیقی کیمونزم کی منزل حاصل ہونے تک صبر کرنا ہو گا ابھی مزید قربانی دینی ہوگی۔ملکی اخراجات اور سماجی وسیاسی ومعاشی ڈھانچے کے استحکام تک مزدور کو ابھی مزید محنت کرنی ہوگی۔قومی معیشت کی منزل قریب ہی ہے چنانچہ مزدور ابھی صبر کرے۔حکومت کے لوگ مزدوروں کے اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے کچھ اس طرح کا انداز اپناتے۔ایک خطاب سے کچھ اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔

کہا جاتا کہ:

> ’’سوشلزم کے تحت پیداوار کے ذرائع نے اب تک جس قدر ترقی کی ہے اُس سے سوشلسٹ معاشرے کے تمام افراد کی ضروریات کی پوری طرح تکمیل ممکن نہیں۔ چنانچہ اگر پیداوار کو ضرورت مندوں کے تقاضے کے مطابق تقسیم کیا جائے تو اس کے نتیجے میں معاشرہ کی دولت ختم ہو جائے گی اور معاشی نظام ردہم برہم ہو جائے گا۔ مزدوروں کو چاہیے کہ وہ ابھی صبر کریں مستقبل میں قومی خوشحالی میں اور بھی ترقی ہوگی۔

آئندہ بیس سالوں میں فی کس آمدنی ساڑھے تین گنا بڑھ جائے گی۔ پہلے عشرے میں صنعتی، فنی اور دفتری کارکنوں کی آمدنی دگنی ہو جائے گی اور کم تنخواہ پانے والوں کی آمدن تین گنا بڑھ جائے گی۔ لوگوں کی آمدنی بڑھنے سے پیداوار کی مانگ بڑھے گی۔ ملک کی تمام آبادی متنوع اور عمدہ غذا کے تقاضوں اور اشیاء صرف یعنی کپڑوں، جوتوں، فرنیچر اور گھریلو سامان اور ثقافتی سامان کے تقاضوں کو پورا کر سکیں گے۔ آئندہ بیس سال میں رہائشی مکانوں کا مسئلہ بالکل حل ہو جائے گا۔ پہلے عشرے میں تو سر چھپانے کو جگہ مل جائے گی اور دوسرے عشرے کے اختتام تک ہر خاندان کو حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق بنا ہوا ایک بڑا مکان مل جائے گا جس میں ثقافتی تقاضوں کو پورا کیا جاسکے گا۔ حکومت اس مقصد کی تکمیل کے لیے مکانوں کی تعداد کو تین گنا تک بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مزدور کے اوقاتِ کار میں فوری طور پہ ایک گھنٹے کی کمی کی جارہی ہے آئندہ مزید کمی کی جائے گی۔ آئندہ بیس سال میں جب انقلاب کی تکمیل ہو جائے گی تو کیمونسٹ پارٹی لوگوں کی تمام ضروریات پوری کرے گی تب اشتراکی ممالک کے مزدور کا معیار زندگی سرمایہ دار ممالک کے مزدور کے مقابل بے حد بڑھ جائے گا"۔

✡✡✡✡✡✡

مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور پچاس سال گزر گئے اس لیے کہ جس معاشرے میں لینن کی طرح کی آمریت ہو وہاں منطقی طور پہ معاشرہ تین طبقوں میں منقسم ہو جاتا ہے ایک حکمرانوں کا طبقہ جو مطلق العنان ہوتا ہے، جن سے کوئی سوال نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی آزادی اور اختیار کی کوئی حد نہیں ہوتی دوسرا وہ طبقہ جس کو افسر شاہی کہا جاتا ہے۔ جو انتہائی خوش نصیب ہوتا ہے اور جس کا اختیار مہیب ہوتا ہے اس لیے کہ اُس نے شاہ کی شاہی کو قائم رکھنا ہوتا ہے اس لیے وہ شاہ کا وفادار اور معاشرے کے

نچلے طبقوں کے لیے سم قاتل ثابت ہوتا ہے۔ اور تیسرا اور سب سے بدقسمت طبقہ مزدوروں کا ہوتا ہے جن کی بدقسمتی کی کوئی حد نہیں ہوتی اور وہ سسکتی ہوئی زندگی گزارنے پہ مجبور کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اشتراکیت مزدور کی خوشحالی خبر لاتی ہے مگر روس میں اشتراکیت کی آڑ میں کچھ اور ہی کھیل کھیلا گیا جس کے نتیجے میں حکمرانوں نے اپنا چولا تو بدل لیا مگر اپنی سرشت نہ بدلی۔ مزدور جہاں تھا وہیں رہا۔ مزدور سے بے اعتنائی برتی گئی۔ اُس کی محرومیوں میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا۔ سرمایہ دار ممالک روس کو طعنے دینے لگے مگر روس کے آمر اپنے مزدور کو قومی تعمیر و ترقی کا ٹھینگا دکھاتے رہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ بونس حاصل کر ہی لیا کرتے تھے مگر اشتراکیت میں تو انسانی ہمدردی یا اخلاقی بنیادوں پر بھی مزدور کو کچھ حاصل نہ ہو سکتا تھا کہ سوشلزم کی لادینی مادیت میں اس کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔

روس میں اُن نسلوں نے عجیب بے بسی دیکھی جن کے آباء نے پچاس سال قبل لینن کے اکسانے پر سہانے خواب دیکھے تھے اور خون بہایا تھا۔ روس میں مزدور کی اجرت اس قدر کم مقرر کی گئی کہ وہ رہائش، طبی اور بچوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے نہایت ناکافی تھی۔ پچاس سال قبل جن لوگوں نے لینن کے بہکاوے میں آ کر سر کٹائے تھے اُن کی اگلی نسلوں کو روس کی بالشویک حکومت نے فراوانی تو خیر کیا دینی تھی ایک جھونپڑہ تک نہ دیا تھا۔

حالت یہ تھی کہ مزدوروں کی بیویاں تک محنت کرنے پہ مجبور تھیں اس لیے اس کے بغیر وہ اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے قابل نہ تھیں۔ اُن کے بچے سولہ سال کی عمر سے کارخانہ دار کی بھیمت کی نظر ہو جاتے اور کہنے کو وہ اشتراکی روس کے مزدور تھے مگر اُن کے والدین کے پاس اتنے وسائل نہ رکھتے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا سکیں۔ بوڑھے مزدوروں پہ کوئی رحم نہیں کیا جاتا تھا وقت نے جب اُن کے قویٰ کو مضمحل کیا تو اُن کے ہاتھوں میں پہلی سی پیداوار دینے کی سکت نہ رہی نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کی تنخواہ بھی کم ہو گئی اس لیے کہ کارل مارکس نے ہی تو کہا تھا کہ ''جتنا کام اُتنے دام'' چنانچہ وہ خیالی جنت جسے کارل مارکس نے وضع کیا تھا اشتراکی روس میں بھی اُس کی کوئی جھلک نہ دیکھی گئی۔ آخر ایک مرتبہ

پھر مزدور ہی حرکت میں آیا اور اُس نے روس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اشترا کیت اگر چہ ابھی زندہ ہے مگر جہاں جہاں بھی اشترا کیت ہے وہاں کے مزدور آسودہ نہیں ہیں اس لیے کہ کارل مارکس جھوٹا تھا اور جھوٹ کا پھل کبھی میٹھا نہیں ہو سکتا۔

✡ ✡ ✡

اسلام انسان کے معاشی مسائل کا حل پیش کرتا ہے، وہ لوگوں پر زکواۃ فرض کرتا ہے اور اُن کو صدقات کی طرف رغبت دلاتا ہے اور انسان کو انفاق کے عظیم اخروی اجر کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام کے مقابل کل کے انسان نے بھی اور آج کے انسان نے بھی بہت سے معاشی نظریات پیش کیے ہیں مگر وہ انسان کی معاشی ضروریات کا حل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کیمونزم نے دنیا بھر کے مزدوروں کے جس دکھ کا پرچار کیا تھا وہ مزدور کے زخموں پر مرحم رکھنے میں ناکام ثابت ہوا اور لوگ ایک بار پھر اُس معاشی نظام کی تلاش میں ہیں جو اُن کے مسائل کا حقیقی حل پیش کرے۔

اسلام اور اشتراکیت

چند نظریہ ہائے حیات جن کی بنا خالق کی بے اعتنائی پہ رکھی ہے انھوں نے ہی انسان کو الجھنوں اور پریشانیوں کے اُس اندھے غار میں دھکیلا ہے جہاں نظریات کے نہ ختم ہونے والے مباحث ہیں جہاں نظریات کا ٹکراؤ دنیا کا امن وسکون لوٹ لیتا ہے اور دنیا تیسری عالم گیر جنگ کی منتظر ہو جاتی ہے۔ سرمایہ داری اور کیمونزم میں سرد جنگ نے قریب پچاس سال تک لوگوں کے جذبات و احساسات کو یرغمال بنائے رکھا۔ ایٹمی ہتھیاروں کی اس ہولناک جنگ کی ہیبت نے بہت سے سال لوگوں کی نیندوں کو حرام کیے رکھا۔ تاہم روس کے نظام معیشت میں ظاہر ہونے والے بڑے زوال نے اس جنگ کو روک دیا۔ لوگوں نے کہا کہ کیمونزم ناکام ہو گیا مگر اس کا یہ غلط مطلب نکال لیا گیا کہ سرمایہ داری نظام کامیاب ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں نظام ہائے زیست بنیادی اخلاقی اقدار سے عاری ہیں اس لیے دونوں ہی غیر منصفانہ اور غیر انسانی ہیں۔ دراصل تو یہ خالق ہی کا حق ہے کہ جس نے انسان کو پیدا کیا ہے وہی انسان کو بتائے کہ اُس نے دنیا میں کس طرح رہنا ہے۔ مگر انسان

کی عقل نے اسے دھوکا دیا اور وہ سمجھا کہ عقل سے ہی وہ منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ نظام سرمایہ داری اور مارکسی نظریہ معیشت انسانی عقل کے شاخسانے ہیں بلکہ عقل کے دھوکے ہیں جنھوں نے انسانیت کو دکھ کے سوا کچھ بھی تو نہیں دیا۔ معاشیات کا تعلق چونکہ انسانی ارتقاء کی تاریخ کے ساتھ ہے اس لیے ہم بھی اس کو اسی تناظر میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اقتصادی میدان میں انسان نے تمدن کے ابتدائی دور میں تبادلہ اجناس کے سادہ عمل سے آغاز سے کیا۔ جو آج بینکنگ، انشورنس اور فارن ایکسچینج کے پیچیدہ امور تک ترقی کر چکا ہے۔ اس اقتصادی ترقی کے دوران وہ کئی حقیقی مسائل سے بھی دوچار ہوا اور کئی مصنوعی مسائل خود بھی پیدا کرتا رہا۔ اِن تمام مسائل نے نظریاتی اختلافات اور چند عملی مغالطے پیدا کر دیئے ہیں جو ہماری اقتصادی زندگی میں خلفشار کا باعث بن رہے ہیں اسلامی نظام معیشت، سرمایہ داری اور سوشلزم میں بنیادی اختلافات کا باعث یہی مسائل ہیں۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو انسان کو پیدا کرنے والے خالق نے انسانی زندگی کے قیام و بقاء کی خاطر اس کائنات میں نہایت بسیط اہتمام کیا ہے۔ انسان کو اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے قدرت نے جن اشیاء کا محتاج کیا ہے وہ سب قدرت نے پیدا کی ہیں اُن میں سے کچھ تو وافر ہیں جن کے حصول کے لیے انسان کو کسی قسم کی کوئی تگ و دو نہیں کرنی پڑتی جیسے کہ ہوا اور پانی وغیرہ اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے حصول کے لیے انسان کو کسی قدر تگ و دو کرنی پڑتی ہے جیسے کہ غذا، لباس، مکان اور سواری وغیرہ۔ انسان کو اپنے ابتدائی دور میں جب اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا کہ ایک شخص کے پاس تو وافر مقدار میں ہرن کا گوشت ہے تو دوسرے شخص کے پاس بڑی مقدار میں پھل ہیں تو وہ دونوں آپس میں تبادلے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ اب ہرن کا گوشت قیمتی ہے یا پھل؟ اس کا تعین دونوں اشخاص نے باہمی طور پہ کر لیا۔ یہی تجارت کی اولین شکل تھی۔ پھر ایک نئی صورت انسان کے سامنے آئی کہ وہ شخص جس کے پاس کل پھل تھے اُس کے پھل ختم ہوگئے مگر جس کے

پاس ہرن کا گوشت تھا اُس کا گوشت ابھی موجود تھا۔ تب پھلوں والے شخص نے ہرن کے گوشت کی ملکیت والے شخص سے کہا۔ تم مجھے گوشت دے دو جب میرے درختوں پہ پھل آئیں گے تو میں پھل تمھیں دے دوں گا۔ لین دین کی یہ صورت تجارتی قرض کہلائی۔ اِن ہی دونوں تجربوں کی بنا پہ عقل سلیم کے مطالبے کے عین مطابق اسلام نے تجارتی اور دیگر قرضوں کے متعلق احکامات نافذ کیے ہیں۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور یہ اسلامی معیشت کا پہلا اصول ہے۔ سود کی حرمت کا اظہار اور اس کے عدم جواز کا فتوی اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ سود انسانیت کے لیے مضر ہے۔ اس لیے کہ قرض صرف مصیبت میں مبتلا شخص کی عارضی اعانت ہے۔ لہٰذا اس پر کسی منفعت اور سود کی توقع انسانی ہمدردی سے مغائر ہے۔ کسی مصیبت زدہ کی اعانت کرنا ایک ایثار ہے جو ذاتی خودغرضی کے جذبہ کی قربانی کا دوسرا نام ہے۔ اس ایثار کی کوئی قیمت وصول کرنا انسانیت کی توہین ہے۔ لہٰذا قرض پہ سود کا کوئی جواز نہیں۔ اسلام میں قرض کا تصور صرف اضطراری احتیاج تک محدود ہی ہے۔ تجارتی کاروبار کے لیے اس کا کوئی جواز نہیں۔

اِن معاملات میں قرآنی احکامات اور سنت رسول سے واضح رہنمائی ملتی ہے۔ مگر یہ اِن تفصیلات کی جگہ نہیں اس معاملے کی تحقیق پہ بہت سی کتابیں خاص اسی موضوع پہ تحریر کی جا چکی ہیں جن سے اسلامی معاشیات کا اصل تصور اجاگر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جناب سیّد محمد اسماعیل کی کتاب(CRITICAL ANALYSIS OF (CAPATILISM,SOCIALISM AND ISLAMIC ORDER. یقیناً اس موضوع پہ ایک عمدہ اور تحقیقی کتاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نہ تو سلطانی کا علمبردار ہے اور نہ ہی مغربی جمہوریت کا۔ اسلام نہ جاگیرداری کا وکیل ہے نہ سرمایہ داری کا اور نہ ہی سوشلزم کا۔ اسلام نے ایک نظریہ حیات پیش کیا ہے سیاست و معیشت کی چند بنیادی قدریں نافذ کی ہیں چند حدود و قیود وضع کیے ہیں اور حکم دیا ہے کہ اِن بنیادی قدروں کی حدود و

قیود کی روشنی میں زمان و مکان کی ضرورتوں کے مطابق سماجی، سیاسی اور معاشی نظام ایجاد کرتے چلے جائیں۔لوگوں نے سود کے ضمن میں بہت سے سوال اٹھائے ہیں۔انسان نے سود کو ایک ضدی بچے کی طرح اپنایا ہوا ہے۔لوگوں کا خیال ہے کہ سود کہ بغیر انسان ترقی نہیں کر سکتا ہے دراصل یہ خالق کے ساتھ ایک ایسی ضد ہے جسے مسلمان معاشروں سمیت بہت سی اقوام نے اپنا رکھا ہے۔حالانکہ ذرا سی گہرائی میں جا کر دیکھنے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ انسان پہ انسان نے آج تک جو سب سے بڑا ظلم کیا ہے وہ سود ہے۔سود ہی سے معاشی نظام کی اُن مصیبتوں نے جنم لیا ہے جن میں انسانیت سسک رہی ہے۔جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس موضوع کی تفصیلات مہیب ہیں جنھیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔اشتراکیت بھی اپنی طرز کا ایک ظلم تھا جسے کارل مارکس نے دنیا میں رواج دیا۔اس لیے کہ اگرچہ ظاہری طور پہ اس میں انسانی ہمدردی کے تصور کو اجاگر کیا گیا تھا مگر حقیقت یہ تھی کہ مارکس کی خیالی جنت کے پیچھے خالص عقلی بنیادوں سے دلیل حاصل نہ کی گئی تھی بلکہ یہ ایک دیوانے کی بڑھتی جسے دنیا نے رد کر دیا۔یہ ایک ایسا تصور تھا جس میں نہ سرمایہ دار کی ذہنیت کو مدنظر رکھا گیا تھا اور نہ مزدور کی مجبوریوں اور پست ذہنی حالت کو سامنے رکھا گیا اس لیے کہ مارکس نہ تو مزدور تھا اور نہ سرمایہ دار۔وہ ذہنی عدم توازن کا شکار ایک ایسا شخص تھا جس نے خدا کا انکار کیا۔اس انکار کے پیچھے بھی اُس نے عقلی بنیادوں کی بجائے اپنے ذاتی تخیل کو سامنے رکھا۔مغربی اقوام نے مارکس کے نظریات کی تائید کی انھوں نے مارکس کے معاشی تخیل کو تو رد کر دیا مگر مذہب کے بارے میں اُس کے لا ابالی نظریات کو عقلی نظریات قرار دے ڈالا۔وہ ایک الہامی مذہب کے پیرو تھے اس کے باوجود انھوں نے خاموشی اختیار کی بلکہ کسی حد تک اُس کی تائید بھی کی۔اس لیے یہاں مارکس کے مادی کائنات کے نظریے کے رد میں عقلی دلائل سے استنباط کیا جاتا ہے۔

مارکس نے کہا کہ اس کائنات کی تمام نیرنگیاں صرف کائناتی مادہ اور کائناتی توانائی کی مختلف اشکال کے عمل کا ردِعمل ہیں۔اور کوئی مادی شئے یا علت موجود نہیں اور انھی کے مسلمات کے

مطابق ہر شیئے کے وجود کے نفاذ کا کوئی نہ کوئی سبب ہونا ضروری ہے۔ بے سبب اور بلا علت نہ تو کوئی چیز وجود میں آسکتی ہے اور نہ ہی کوئی تبدیلی واقعہ ہوسکتی ہے۔

اِن دو مسلمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات پہ غور کیا جائے کہ کیا مادہ اور توانائی کی تمام موجودہ اشکال ازل سے ہیں یا ایک دوسرے سے پیدا ہوئی ہیں؟ کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پیچیدہ تر اشکال سادہ تر اشکال سے پیدا ہوئی ہیں اور مادہ کی تمام شکلیں مادی عناصر سے مرکب ہیں اور مادی عناصر کے وجود کا باعث توانائی ہے۔

اور توانائی کا باعث کیا ہے؟

توانائی کو تو ازلی ابدی ہی تسلیم کرنا پڑے گا۔ تمام حقیقتوں کی ابتدائی حقیقت جواز خود ہے اور کسی سے پیدا نہیں ہوئی۔ اگر یہی مان لیا جائے کہ ازل سے خلائے بسیط میں کچھ نہ تھا مگر توانائی تھی صرف توانائی، تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ توانائی کو پہلی بار مادہ میں کس علت نے تبدیل کیا؟

علت تو کوئی تھی نہیں لہٰذا یہ فرض کرنا پڑے گا کہ خود توانائی میں ہی یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ از خود بلا علت مادہ میں تبدیل ہوسکے یعنی یہ توانائی کی خاصیت ہے۔

اس خاصیت یا صلاحیت کو اضطراری قرار دیں گے یا اختیاری؟

مشاہدہ تو یہی بتاتا ہے کہ مادہ اور توانائی کی تمام شکلوں کے خواص اضطراری ہی ہیں کیونکہ وہ صرف معینہ ماحول اور علت کی موجودگی میں ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں اور لازماً ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں۔ لیکن توانائی کی مادہ میں پہلی تبدیلی کے لیے چونکہ نہ تو کوئی ماحول تھا اور نہ ہی علت اس لیے اسے اضطراری قرار دینا مشکل ہے۔ اور اگر اسے اضطراری قرار دیا بھی جائے تو لازم آتا ہے کہ تمام کائناتی توانائی یکدم مادہ کی کسی ایک شکل میں تبدیل ہوجائے لیکن ایسا نہیں ہوتا اس لیے یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ تبدیلی اختیاری تھی۔ کوئی منطقی طریق استدلال ہمیں یہ تسلیم کرنے پہ مجبور کرتا ہے کہ فضائے بسیط میں وہ ذاتِ واحد جو ازل سے تھی کائناتی توانائی ہے۔ بدرجہ اقل جو صفات اس ذات میں ماننے پڑتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ وحدہٗ لاشریک ذات

ہمیشہ سے ہے،از خود ہے،اور کسی سے پیدا نہیں ہوئی،سب اس سے پیدا ہوئے ہیں۔وہ از خود اور اختیاری طور پر توانائی کی مختلف قسموں اور مادہ کی مختلف شکلوں میں تبدیل ہونے پر قادر ہے۔اور چونکہ اختیاری طور پر قادر ہے لہٰذا علیم بھی ہے۔اس کے علم اختیار،ارادہ اور قدرت کو ہم کتنا ہی محدود رکھنے کی کوشش کریں ہم کسی نہ کسی حد تک علت اولیٰ یعنی کائناتی توانائی سے یہ صفات منسوب کرنے ہی پڑیں گے۔

لیکن،ہم جانتے ہیں کہ کائناتی توانائی اِن صفات کی حامل نہیں لہٰذا کائناتی توانائی کو نہیں بلکہ اس کے پس پردہ کسی اور علتِ اولیٰ کو تسلیم کرنا منطقی طور پہ ناگزیر ہوگا جو اِن صفات کی حامل بھی ہو اور کائناتی توانائی کا مصدر بھی۔لادینی مادہ پرستی اس ٹھوس دلیل کا کوئی جواب نہیں دیتی۔

آیئے اب ذرا غور کریں کہ خواص الاشیاء کی ماہیت کیا ہے؟

خواص الاشیاء مادے کی مختلف انفرادی شکل سے ظاہر ہونے والی وہ خصوصیتیں ہیں جو کسی ایک شکل سے مختلف علتوں کے باعث مناسب ماحول میں یکساں طور پر اور لازماً ظاہر ہوا کرتی ہیں۔مثلاً ہائیڈروجن ایک گیس ہے اور جلتی ہے،آکسیجن بھی گیس ہے لیکن جلاتی ہے سوڈیم ایک ٹھوس عنصر ہے جو پانی کو پھاڑ کر ہائیڈروجن اور آکسیجن میں تبدیل کر دیتا ہے۔شکر پانی میں حل پذیر اور میٹھی شئے ہے اور کونین کڑوی۔سیب لذیذ اور فرحت بخش ہے لیکن سنکھیا سم قاتل ہے وغیرہ وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ اِن مختلف خواص کی علت کیا ہے؟اور کیا اِن خواص کے تعین و تقسیم کے لیے کوئی قاعدہ قانون مقرر ہے؟ آکسیجن اور ہائیڈروجن دونوں ہی گیسیں ہیں لیکن پانی جو اِن سے مرکب ہے وہ جلنے کی بجائے جلنے والی ہر چیز کو بجھا دیتا ہے۔پانی مائع ہے تو کیوں مائع ہے؟ جب توانائی محض ایک محرک اور متحرک قوت ہے،صرف ایک بے قراری ہے تو اس کے ارتکاز سے جو مادہ پیدا ہوتا ہے اُس میں بھی انھی یا اس سے ملتے جلتے خواص کا مظہر ہونا چاہیے تھا کیونکہ کوئی نئی شئے یا کیفیت از خود وجود میں نہیں آسکتی پھر اس نے بالکل جدید اور مختلف خواص

کا مظاہرہ کیسے شروع کر دیا؟

مختلف عناصر اگر اس وجہ سے مختلف ہوئے کہ اُن میں توانائی کی وحدتیں مختلف نسبتوں سے شریک تھیں تو اِن سے توانائی ہی کے خواص مختلف نسبتوں سے ظاہر ہونے چاہییں تھے یہ نئے نئے غیر متوقع اور نا قابل توجیہہ خواص کہاں سے آگئے جن کے تنوع کی انتہا نہیں اور جن کی وضاحت کرنا سائنس دان ضروری نہیں سمجھتے۔ کیا اِن کا مطالعہ اور اُن کی توجیہہ کی کوشش لادینی مادہ پرستی کا فرض نہیں۔ اس سے گریز کا سبب کہیں لادینی مادہ پرستی کی بنیادی کمزوری تو نہیں؟

سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین کی طرف ہی کیوں گرتا ہے کبھی کبھی آسمان کی طرف کیوں نہیں چلا جاتا؟ یہ نہایت قدیم سوال ہے لیکن نیوٹن سے پہلے اس سوال کو درخور اعتناء کو نہیں سمجھا گیا۔ جب کبھی یہ سوال اٹھا اہل علم نے لوگوں کو نادان ٹھہرایا اور کہا یہ تو چیزوں کی خاصیت ہے کہ وہ زمین ہی طرف گرتی ہے اور ایسے سوال مہمل ہیں۔ یہی جواب خواص الاشیاء کی علت دریافت کرنے والوں سے کیا گیا تو انھوں نے کہا یہ چیز تو خواص الاشیاء میں شامل ہے۔ چنانچہ یہ سوال محتاج توجیہہ ہی رہا اسی طرح جس طرح کہ کوئی بیان نہیں کر سکا کہ مختلف اشیاء کے مختلف خواص کا سبب کیا ہے اور یہ خواص کون سے قانون کے تحت متعین ہوتے ہیں۔ میٹھی چیز میٹھی اور کڑوی چیز کڑوی کیوں ہوتی ہے۔ سرخی، سبزی اور زردی کے امتیاز کی بنا کیا ہے؟ یعنی خواص الاشیاء کی علت کا راز کیا ہے؟ یہ ایک خالص علمی سوال ہے جس سے محض اس لیے گریز کیا جاتا ہے کہ یہ خیال خدا شناسی کی طرف رہبری کرتا ہے۔ مختلف اشیاء میں مختلف خواص کی حقیقت کا مطالعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خواص الاشیاء کی تقسیم بے مقصد اور بے ہنگم اندھی تقسیم نہیں بلکہ یہ تقسیم حیات کی مقصدیت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

خود سائنس دانوں ہی کے بیان کے مطابق یہ خواص الاشیاء کی پر مصلحت تقسیم ہی کا نتیجہ ہے کہ خلائے بسیط میں ہیلیم اور ہائیڈروجن کی سادہ شکلوں سے آغاز کر کے کائنات نے شجر و حجر اور حیوان و انسان تک ترقی کی ہے۔ اگر خواص الاشیاء کا تعین اندھا دھند بے ربط اور غیر منظم ہوتا تو

ارتقائی منازل کی نوبت ہی نہ آسکتی تھی۔ چنانچہ توانائی اور مادے نے پہلے حیات کی آمد کے لیے کارساز ماحول فراہم کیا۔ مادے کی ایک مخصوص شکل پانی ہے جسے حیات کی بنیاد بننا تھا ۔چنانچہ پانی کو کائنات میں وافر مقدار میں فراہم کیا گیا۔ پانی کو ایسے خواص فراہم کیے گئے جو حیات کے لیے نہایت معاون ہیں۔ حرارت کی تھوڑی بہت کمی بیشی سے اُسے باآسانی زمین کے ہر حصے اور فضاؤں میں پہنچانے کی خاطر اس کے نقاط تبخیر وانجماد انتہائی موزوں رکھا گیا ۔قادر مطلق نے پانی کے قانون کو سمندری مخلوقات کی حیات کے الٹ دیا۔ چنانچہ نقطہ انجماد سمندروں کی پیداوار کے لیے ناموزوں نظر آیا تو صفر سینٹی گریڈ اور چار سینٹی گریڈ کے درمیان پانی کے خواص کو الٹ دیا گیا تاکہ برف ہلکی ہو کر سطح آب پر تیرتی رہے اور سمندر کی تہوں میں آبی جانور موت سے مامون رہیں۔ خواص الاشیاء کی ایسی تقسیم جب لامذہب محققین کی سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اسے "قدرت کی ناقابل فہم فیاضی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

نگاہ تدبر ذرا اور گھمائیں اور وجودِ حیات پہ تفکر کریں کہ حیات نے اس امر کو واضح کر دیا کہ نیوکلیک ایسڈ کو ایسے خواص بخشے گئے ہیں جو قیام حیات اور بقائے حیات کے ضامن ہیں۔ توالد وتناسل کے مادوں کو وہ محیر العقول اور ناقابل فہم خواص عطا کرنا جنھیں دیکھ دیکھ کر حیرت سے انسان کے اوسان خطا ہوں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قدرت بہر قیمت بقائے حیات پہ مصر ہے۔ چنانچہ سلسلہ توالد کو برقرار رکھنے کے لیے الفت ومحبت کی کشش پیدا کرنا اولاد کی پرورش کے لیے ماں باپ کے دل میں بچے کے لیے بے پناہ محبت ڈال دینا یہ سب ایسی چیزیں ہیں جو غیر متعصب صاحب فہم کو بھی بامقصد تخلیق کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ محض خواص الاشیاء کے صدقہ میں حضرت انسان کا صاحب فہم وادراک بن جانا ہی قطعی طور پہ ثابت کرتا ہے کہ یہ "منصوبہ بندی" کسی کائناتی توانائی کے بس کا روگ نہیں بلکہ کسی "صاحب تدبر وصاحبِ ارادہ ہستی" کے امر کی کرشمہ سازی ہے۔ یہ بھی ایک برہنہ حقیقت ہے کہ کائناتی توانائی اور مادہ خواص الاشیاء کے پردے میں اضطراری قدرت کا بوجھ تو اٹھا سکتے ہیں مگر اختیاری قدرت،

ذی ارادہ اور با مقصد ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف خواص الاشیاء کے ہی مظہر ہیں۔ وہ علم و اختیار و ارادہ و مصلحت اور کسی مقصد کے حامل نہیں ہو سکتے۔ لیکن جب اِن صفات کا وجود اسی مادی کائنات میں صاف طور پر کارفرما نظر آرہا ہے تو اُن کے موصوف کی تلاش کرنا بھی منطقی مادہ پرستی کا فطری تقاضا ٹھہرا مگر مادہ پرستوں نے اس سے گریز کیا۔ اس لیے کہ یہ راہ توسیدھی خدا کی طرف لے جاتی ہے اور اُس راہ سے فرار ہی تو اس مادی تخیل کی بنیاد ہے۔

چنانچہ اب یہ امر ثابت ہو چکا کہ مادہ اور توانائی کی علت اولیٰ بھی وہی ہے جس نے اس کائناتی توانائی کو پیدا کیا جو انسان کا رب ہے اسی نے روح حیات کو نفخ کیا اور اسی نے خواص الاشیاء کی تقسیم کی۔ کارخانہ قدرت میں ذرا سے غور پہ بھی مقصد زیست کا سراغ اپنی پوشیدگی کھونے لگتا ہے۔ اس منزل تک عقل کا پہنچنا دشوار نہیں کہ خالق نے جو ذی ارادہ، ذی فہم اور شرف سے معمور مخلوق انسان کی صورت پیدا کی ہے اُس کی تخلیق کے پیچھے اس سے بہتر اور کیا مقصد ہوگا کہ جس طرح کائنات کا ذرہ ذرہ خالق کی اطاعت پہ مصر ہے انسان بھی اُن سے ہم آہنگ ہو جائے اور اپنے خالق کی منشا کے سامنے سر جھکا دے۔ یہی اہل مذہب کا استخراج ہے اور مارکس نے اسی کی نفی کی تھی۔ ذہن میں رہے کہ اہل مذہب نے مندرجہ بالا نتائج تک پہنچنے کے لیے صرف نظری استخراج پر ہی اکتفاء نہیں کیا بلکہ مادی سائنس کے ٹھوس اصولوں اور مادہ پرستوں کی منطق کے مطابق عملی مشاہدہ اور ذاتی مکاشفہ سے بھی پوری پوری رہنمائی حاصل کی ہے۔

چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ تمام ادیان کے ہادیوں نے اپنے اپنے ذاتی مشاہدہ سے اس بات کی شہادت پیش کی ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ برحق ہے۔ انبیائے کرام کے معزز گروہ نے ذات باری سے شرف تکلم حاصل کر کے اس کا مشاہداتی ثبوت فراہم کیا ہے اور اپنے منطقی استدلال اور مشاہداتی تصدیق کی بنا پہ ہی مذہب کی اشاعت کی۔ تمام انبیاء نے باری باری اس بات کی گواہی دی اور اسی بات پہ اپنے مذہب کی بنیاد رکھی کہ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَاللّٰهِ الۡاِسۡلَامِ یعنی تسلیم و رضا اور کامل ہم آہنگی ہی دین فطرت ہے۔ پھر فرمایا اِنَّ ھٰـــــذَا

لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰی۔ یعنی پہلے انبیاء کی مقدس کتابوں میں بھی یہی مذکور ہے اور براہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی یہی لکھا گیا۔

مذہب اور خدا پرستی کی معقولیت کے یہ دلائل خود مذہب نے پیش کیے ہیں یہ کسی نئی روشنی کی تازہ تنویر نہیں۔ بلکہ وہ وہی قدیم صبح ازل کے بتائے ہوئے، روح القدس کے فرمائے ہوئے، نبی اُمی ﷺ کے پڑھائے ہوئے، چودہ سو چونتیس سال سے قرآن حکیم میں مستور و محفوظ دلائل ہیں جنھیں قرآن حکیم مختلف پیرائے میں بار بار دہراتا ہے اور مغربی تہذیب کے دلدادگان ہوں یا مارکسی نظریات کے حامی اُن کو باور کراتا ہے کہ اسلام خدا پرستی کی تعلیم کی بنیاد ڈرانے دھمکانے یا کسی لالچ پہ نہیں رکھتا بلکہ کائنات کے خالص منطقی مطالعہ پہ رکھتا ہے۔ اور قرآن حکیم میں خوف و رجاء کا ذکر خداشناسی کے لیے نہیں بلکہ قدرت کے قانونِ مکافات کی وضاحت کے لیے آیا ہے۔ کتاب مقدس میں ہمارے اس استدلال کے استحکام کے لیے بہت سی آیات ہیں ۔طوالت کے خوف سے ہم یہاں صرف کچھ ہی آیات پر نظر ڈالنے پہ اکتفاء کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ ص میں ارشاد فرمایا کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًاط ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ○ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ ز اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ○ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ○

القرآن الحکیم (سورۃ ص 38 ؛ آیات 27-29)

ترجمہ:

’’ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور اِس دنیا کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے فضول ہی پیدا نہیں کر دیا۔ یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنھوں نے کفر کیا ہے، ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں ایک جیسا کر دیں؟ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پہ غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق حاصل کریں‘‘۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ حجر میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ط وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝

القرآن الحکیم (سورۃ حجر 15 ؛ آیات 84-86)

ترجمہ:

’’ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پہ خلق نہیں کیا، اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے پس اے نبیؐ تم شریفانہ درگزر سے کام لو یقیناً تمھارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے‘‘۔

✡✡✡✡✡✡

اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ص وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ O

القرآن الحکیم (سورۃ بقرۃ2 ؛ آیات164)

ترجمہ:

"جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اُن کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے، زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے، ہواؤں کی گردش میں اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، میں عقل والوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں"۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانبیاء میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ كُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ط اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ O وَجَعَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِهِمۡ ص وَجَعَلۡنَا فِیۡهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمۡ یَهۡتَدُوۡنَ O

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا ج وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانبیاء 21 ؛ آیات 30-32)

ترجمہ:

''کیا وہ جو لوگ کفر کرنے والے ہیں غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ ہماری اس صناعی کو نہیں مانتے۔ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا۔ مگر یہ لوگ ہیں کہ کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ وہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں''۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○

القرآن الحکیم (سورۃ الانحل 21 ؛ آیات 30-32)

ترجمہ:

''اللہ نے تم کو تمھاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے ۔اُس نے تمھیں کان دیئے، آنکھیں دیں، اور سوچنے والے دل دیے، اس لیے کہ تم

شکر گزار بنو"۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

القرآن الحکیم (سورۃ بنی اسرائیل 17 ؛ آیات 70)

ترجمہ:

"یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی بخشی اور انھیں خشکی وتری میں سواریاں عطا کیں اور اُن کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پہ نمایاں فوقیت بخشی"۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ کہف میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ط اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ۝ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ط لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ط بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ۝

القرآن الحکیم (سورۃ کہف 18 ؛ آیات 57-59)

ترجمہ:

”اُس سے بڑھ کے ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے اور وہ اُن سے منہ پھیر لے، اور اُس برے انجام کو بھول جائے جس کا سرو سامان اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا ہے اُن کے دلوں پہ ہم نے غلاف چڑھا دیئے ہیں جو انھیں قرآن کی بات سمجھنے نہیں دیتے، اور اُن کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے۔ تم انھیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے۔ تیرا رب بڑا درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔ وہ اُن کے کرتوتوں پر انھیں پکڑنا چاہتا تو جلد ہی عذاب بھیج دیتا، مگر اُن کے لیے وعدے کا ایک دن مقرر ہے اور وہ اُس سے بچ کر بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے“۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ کہف میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ فَاَصۡبَحَ هَشِيۡمًا تَذۡرُوۡهُ الرِّيٰحُ ط وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ مُّقۡتَدِرًا ۝ اَلۡمَالُ وَالۡبَنُوۡنَ زِيۡنَةُ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ج وَالۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيۡرٌ عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ اَمَلًا۝

القرآن الحکیم (سورۃ کہف 18 ؛ آیات 45-46)

ترجمہ:

”اور اے نبیؐ انھیں حیاتِ دنیا کی حقیقت کی اس مثال سے سمجھاؤ کہ آج ہم نے آسمان سے پانی برسایا تو زمین کی پود خوب گھنی ہوگئی۔ اور کل وہی نباتات بھس بن

کے رہ گئی جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں اللہ تعالیٰ ہر چیز پہ قدرت رکھتا ہے۔ یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی فائدے کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ اصل میں تو باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انھی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں''۔

✡✡✡✡✡✡

اللہ تعالیٰ نے سورۃ حج میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِن كُنتُمْ فِى رَيْبٍ مِّنَ ٱلْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَـٰكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ط وَنُقِرُّ فِى ٱلْأَرْحَامِ مَا نَشَآءُ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوٓا۟ أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰٓ أَرْذَلِ ٱلْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ط وَتَرَى ٱلْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا ٱلْمَآءَ ٱهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ ○ ذَٰلِكَ بِأَنَّ ٱللَّهَ هُوَ ٱلْحَقُّ وَأَنَّهُۥ يُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُۥ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ○ وَأَنَّ ٱلسَّاعَةَ ءَاتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا وَأَنَّ ٱللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِى ٱلْقُبُورِ ○ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُجَـٰدِلُ فِى ٱللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَـٰبٍ مُّنِيرٍ ○ ثَانِىَ عِطْفِهِۦ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ لَهُۥ فِى ٱلدُّنْيَا خِزْىٌ وَنُذِيقُهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ ○ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدَاكَ وَأَنَّ ٱللَّهَ لَيْسَ

بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ○

القرآن الحکیم (سورۃ حج22 ؛ آیات5-10)

ترجمہ:

''اے لوگو! اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں ہم جس کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں، (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے اُس پہ مینہ برسایا کہ یکا یک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگانی شروع کر دیں۔ اور یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ اللہ ہی حق ہے، اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے وہ ہر چیز پہ قادر ہے ، اور یہی (اس بات کی دلیل ہے) کہ قیامت کی گھڑی آ کے رہے گی، اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں اور اللہ ضرور اُن لوگوں کو اٹھائے گا جو قبروں میں جا چکے ہیں۔ اور بعض لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے خدا کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں۔ تا کہ لوگوں کو راہ خدا سے بھٹکا دیں۔ ایسے شخص کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور قیامت کے روز اُن کو ضرور آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لیے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پہ ظلم کرنے والا نہیں''۔

✡ ✡ ✡ ✡ ✡ ✡

قرآن کی اِن چند آیات سے ہی کائنات کی رنگا رنگی اور انسانی زندگی کی مقصدیت واضح ہو جاتی ہے۔ یہ امر کھل کے سامنے آجاتا ہے کہ نہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے اور نہ ہی انسان کو مادر پدر آزاد پیدا کیا گیا ہے کہ وہ زندگی کی اس مہلت کو اپنی آرزوؤں کی بھینٹ چڑھا دے۔ جیسا کہ مادہ پرستوں کے نظریہ حیات سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس باب میں ہم نے ڈارون، فرائیڈ اور کارل مارکس کے مادی نظریات پہ بحث کی ہے جنھوں نے انسانیت کو بے منزل مسافرت کے اُس آزار کی طرف بلایا جس کے دوسرے سرے پہ فلاح و کامرانی کی کوئی منزل نہ تھی۔ مغربی معاشروں کا سماجی انتشار اس بات کی علامت ہے کہ جن نظریات کو انھوں نے بطور زیست اپنایا ہے وہ عقلی بنیادوں پہ استوار نہ ہوئے تھے۔ مغربی ممالک اور اشتراکیت کے نظریات سے متاثرہ ممالک کے معاشروں کے مطالعہ سے معلوم ہوا ہے کہ چاہے وہ مادی برتری کو حاصل کر ہی چکے ہوں تب بھی وہ حقیقی خوشی سے محروم ہی ہیں۔ اس لیے کہ حقیقی خوشی اور طمانیت کا براہ راست تعلق اُس روحانی نظم سے ہے جسے عرف عام میں مذہب کہا جاتا ہے اور یہ لوگ کسی نظریہ کسی اعتقاد کسی مذہب حتیٰ کہ کسی خالق سے بھی محروم ہیں جس سے وہ اپنے دل کے دکھ کہہ سکیں اور یہی ان کی حقیقی بدقسمتی ہے۔(55*)

✡ ✡ ✡

قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ خطہ ارض پر ہمیشہ دو ہی قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور ایک وہ جو اللہ سے نہیں ڈرتے ۔ ان دونوں گروہوں کے نظریات نے انسانی تہذیب کو بھی دو واضح حصوں میں منقسم کر دیا۔ چنانچہ مادہ پرست تحریک روحانیت پسندوں کے مقابل آ گئی ۔ ان دونوں گروہوں کے مابین اس نظریاتی افتراق نے اُس خلفشار کو جنم دیا جس کی بنا پر ماضی میں بھی بہت سی جنگیں لڑیں گئیں اور مستقبل میں بھی اس امر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ تہذیبوں کا یہ تصادم انسان کو کس خونی راہ پر لے جائے کہ انسان سرشت میں تندی اور تیزی ہے۔

تہذیبوں کا تصادم

ہزاروں سال گزرے انسان کے طورِ زیست میں ذرا بھی افتراق نظر نہیں آیا۔ گزرے کل میں بھی انسانوں کے دو ہی گروہ تھے جو اپنے اپنے تخیل کے مطابق زندگی گزارتے تھے اور آج کے متمدن تہذیب و معاشرت میں بھی انسانوں کے دو ہی گروہ ہیں جو اپنے اپنے نظریات کے اسیر ہیں۔ اُن میں سے ایک گروہ کو مادہ پرست کہا جاتا ہے جن کے خیال میں ہر محسوس چیز پہ تو یقین کیا جاسکتا ہے مگر حواس سے پرے سب فریب عقل ہے، توہم ہے۔ مادہ پرستوں کے اس گروہ کا نظریہ حیات یہ ہے کہ کائنات محض اتفاق سے وجود میں آ گئی تھی اور انسان خود بخود ہی پیدا ہو گیا تھا۔ انسان کی اس زندگی کا کوئی مقصد نہیں اور نہ ہی حیات و کائنات کا کوئی خالق ہے۔ کائنات کی یہ سب رنگا رنگی سبب اور مسبب کا ایک تسلسل ہے جس کی توجیہہ سائنس نے کر دی ہے مادیت پسندوں کے نزدیک اس زندگی کا واحد مقصد خوشی کا حصول ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خالق کے انکاری جدید عہد کی پیداوار ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے قدیم زمانوں سے ہی انسانوں کا ایک گروہ خالق کے انکار

مصر رہا ہے اگرچہ ملحدین کے نظریات وقت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ مادیت پسند معاشروں میں اخلاقی اقدار مفقود ہوتی ہیں اور مادہ پرست حیوانیت سے انتہائی قریب ہیں کیونکہ اُن کی زندگی کا چلن جانوروں سے مشابہ ہے۔ مادہ پرست معاشرے جنسی حیوانیت کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ بدیانت، خائن اور ظالم ہوتے ہیں۔ اُن کے ہاں زندگی کا کوئی راست نظریہ نہیں پایا جاتا اس لیے اُن کی زندگی کا مقصد صرف خوشی ولذت کی تلاش ہے۔ اپنی اس تلاش میں وہ ظلم کی آخری حدوں تک جاتے ہیں۔

آج کے مغربی معاشروں کی حکومتی پالیسیاں اور استحصالی طرز تجارت اس بات کے شاہد ہیں کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اگر انھیں انسانیت کا چہرہ خون سے رنگنا پڑے تب بھی اُن کے چہروں پہ ندامت کا کوئی تاثر نہیں ابھرتا۔ تاریخ کی راہداریوں میں ایسی بہت سی اقوام کا تذکرہ موجود ہے جو خالق سے انکار پہ تلی بیٹھی تھیں اور خالق کے انکار پہ ہی اُن کے نظریہ حیات کا دارومدار تھا۔ الہامی کتابوں میں اُن کے انجام بد کی خبر بھی دی گئی ہے مگر مادیت پسندی کا یہ تسلسل آج بھی جاری وساری ہے اور حد تو یہ ہے کہ مادہ پرست معاشرے خود کو مہذب اور باقی دنیا کو غیر مہذب کہتے ہیں۔ مادہ پرست معاشروں میں دولت کے حصول کی ہوس نے ہی انسانیت کو پہلی اور تیسری دنیا میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مادہ پرست معاشرے مسابقت اور طرز زیست میں سہولت اور آسودگی کی فراوانی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ مادہ پرستی ایک تاریخی تسلسل ہے جس کی دلیل الہامیات نے فراہم کی ہے۔

مادہ پرست تہذیب سے انسانیت کو کس قدر سخت نقصان پہنچایا ہے اس کا جائزہ لینے سے قبل یہ ضروری ہے کہ انسانوں کے دوسرے گروہ یعنی اہل مذہب کے نظریات وعقائد پہ ایک نظر ڈال لی جائے۔ اہل مذہب چونکہ اللہ پہ یقین رکھتے ہیں اور اللہ کو دیکھے بغیر اُس کی موجودگی اور اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس لیے اُن کو روحانیت پسند کہا جاتا ہے۔ اسلام ہی دنیا کا سب سے پہلا اور سب سے قدیم مذہب ہے۔ اللہ کے پیام بر لوگوں کو اس بات کی طرف بلاتے رہے کہ اللہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ انسان کی زندگی مہلت عمل ہے جو اُس نے خالق کی اطاعت میں گزارنی

ہے۔اگراُس نے خالق کی اطاعت کی تو موت کے بعداُسے خالق کی طرف سے انعام واکرام سے نوازا جائے گا اور اگر اُس نے خالق کی ہدایات کے برعکس زندگی گزاری تو اُسے جہنم میں دہکنے والی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔خالق کی ہدایات کے مطابق اور اُس کی اطاعت میں زندگی گزارنے والوں کے سماج کو روحانی تہذیب کہا جائے گا جب کہ خالق سے بے اعتنائی اختیار کرنے والوں کو مادہ پرست کہا جائے گا۔اہل مذہب کی تاریخ مادیت پسندوں سے قدیم تر ہے اس لیے کہ اس زمین پہ جو پہلا انسانی قدم پڑا وہ حضرت آدم علیہ السلام کا تھا جو نہ صرف اللہ کے بندے بلکہ اللہ کے رسول بھی تھے۔اُن کی اولاد میں سے جن لوگوں نے اپنے آباء کی تعلیم کو بھلا دیا اور خالق کے وجود کا انکار کیا وہی اولین مادہ پرست تھے ہزاروں سال گزر گئے مگر اللہ کی زمین پہ اللہ کا اقرار کرنے والے بھی بستے رہے اور اللہ کا انکار کرنے والے بھی بستے رہے۔دونوں گروہوں کی یہ خواہش تھی کہ اُن کے نظریات غالب ہوں جس سے تہذیبوں کے تصادم کی بنا پڑی۔

حقیقت یہ ہے کہ تہذیبوں کے تصادم کی بنا تہذیب کے معرض وجود میں آنے سے قبل ہی پڑ چکی تھی۔ جب شیطان لعین نے حضرت آدم کو علیہ السلام سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اُس کا وجود ایک علیحدہ تہذیب کا نقطہ آغاز تھا۔اگرچہ اس وقت پوری کائنات میں راہ انحراف کا وہ اکیلا مسافر تھا مگر جب اُس کو مہلت عطا کر دی گئی تب اُس کا قافلہ بھی بننے لگا گو ابتداًخطہ ارض پہ بسنے والے لوگ مواحد تھے اہل مذہب تھے۔تاہم جب شیطان نے اپنا جال پھیلایا تو اُس کی خوشنمائی کی طرف لوگ جلد ہی متوجہ ہو گئے۔شیطان نے انسان کو وسوسوں میں الجھا لیا اور یوں اس زمین پر اہل مذہب کے مقابل کفار(انکار کرنے والوں) کا گروہ بھی نمودار ہو گیا۔جس کے نتیجے میں پہلی بار خطہ ارض پہ تقسیم اور تصادم کی فضا ہموار ہونی شروع ہوئی۔انسانوں کے مابین منافرت نے جنم لیا۔چنانچہ اس امر سے ظاہر ہے کہ خطہ ارض کبھی مواحدین اور منکرین کے وجود سے خالی نہیں رہا۔اُن کے مابین تصادم کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے انسان کی مدنی اور اجتماعی زندگی کے حوالے سے تہذیب ایک فطری اور بنیادی ضرورت ہے۔چنانچہ خطہ ارض پہ بسنے والا انسان آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ اجتماعی

طور پہ جینے کے گر بھی سیکھتا رہا۔اس طرح نہایت کم رفتار مگر ایک تسلسل کے ساتھ خاندان، معاشرہ ،سماج اور مدنیت اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی رہی۔ اس تاریخی تسلسل نے ایک مضبوط سماجی ڈھانچے کی بنیاد رکھی۔عام طور پہ اس سماجی ڈھانچے کی بنیادیں مذہبی اقدار پہ استوار تھیں اگرچہ انکار کرنے والوں کا ایک گروہ بھی موجود تھا۔

کسی بھی سماج اور معاشرے کی بنیادی اساس اس کے عقائد پہ مبنی ہوتی ہے۔اور تہذیب ایک ایسا گہوارہ ہے انسانیت جس میں پروان چڑھتی ہے اور کسی بھی انسانی گروہ کے عقیدے اقدار اصول و اخلاق کی اساس میں اشتراک ایک مختلف ثقافت کو جنم دیتا ہے جو اس کے سیاسی ،اجتماعی اور معاشرتی اداروں ،حتیٰ کہ بین الاقوامی سطح پہ بھی اُس کے نقطہ نظر کی ترویج کرتا ہے۔ چنانچہ دو قدیمی حریفوں یعنی خیر اور شر کے درمیان باہمی تصادم ایک فطری ضرورت بن کے سامنے آیا۔تصویر کائنات میں تضادات کا کھیل بھی ازلی ہے۔کہیں روشنی ہے تو کہیں اندھیرا، کہیں علم ہے تو کہیں جہل، کہیں بہار ہے تو کہیں خزاں، کہیں دکھ ہے تو کہیں سکھ، کہیں امن ہے تو کہیں انتشار، کہیں ظلم ہے تو کہیں عدل کہیں دھوپ ہے تو کہیں سایہ، کہیں پستی ہے تو کہیں بلندی، کہیں ابر ہے تو کہیں پیاس، کہیں محبت ہے تو کہیں نفرت، کہیں نفع ہے تو کہیں خسارہ، کہیں جبر ہے تو کہیں آسانی، کہیں تنگی ہے تو کہیں فراوانی، کہیں آس ہے تو کہیں یاس، کہیں فکر ہے تو کہیں بے اعتنائی، کہیں تدبر ہے تو کہیں جہالت کہیں سمجھوتہ ہے تو کہیں ضد، کہیں اَنا ہے تو کہیں عجز، کہیں اقرار ہے تو کہیں انکار۔چنانچہ آج کا سماج اگر اپنا عکس آئینے میں دیکھے تو آج کی یہ جدید دنیا اُسی اثبات و انکار کی آگ میں جل رہی ہے جس کی بنا شیطان کے انکار پہ رکھی تھی۔انسانیت کچھ فاصلے پہ بیٹھی انسان کی اس بے بسی کو جھانک رہی تھی اور اس کی حرماں نصیبی پہ اشک زدہ تھی کہ آج کا انسان دو واضح تہذیبوں میں منقسم آگ و خون کے کنارے بیٹھا ایک ہولناک تصادم کا منتظر ہے۔آج اسلام اور مغرب دو متقابل تہذیبوں کے طور پہ ابھر کے آمنے سامنے ہیں ۔مغربی تہذیب اپنی سیاسی عسکری اور معاشی برتری کی بدولت اپنی تہذیب کو خطہ ارض پہ غالب کرنے کے درپئے ہے تو اسلام باوجود اس کے کہ ابھی اس کی تیاری مجوزہ

تصادم کے حوالے سے بہت کم ہے مگر وہ اپنی مضبوط تہذیب، قابل رشک تاریخ اور قرآن جیسی لازوال کتاب کی موجودگی کی وجہ سے اپنا الگ تشخص برقرار رکھنے میں کافی حد تک کامیاب رہا ہے۔

اسلام اور مغربی تہذیب باہم ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لیے تاریخ کے کسی بھی دور میں اِن کا ادغام نظر نہیں آتا۔ مغرب سینکڑوں سال سے جہالت اور مذہبی تشدد کے اندھیروں میں ڈوبا رہا اور اسلام ہی عمومی دنیا میں ایک ضابطہ حیات کے طور پہ غالب رہا۔ تاہم سترہویں اور اٹھارویں صدی میں اسلام کی عظیم الشان ریاست پہ زوال آنا شروع ہوا تو مغربی اقوام میں علم کی ترویج و اشاعت نے ایک مثبت روایت کو جنم دیا جس کے نتیجے میں اہل مغرب میں جدید علوم پہ دسترس حاصل کرنے کا رجحان پایا جانے لگا اور مغرب نے اپنے منتخب کردہ میدانوں یعنی سائنس اور معاشیات میں قابل قدر ترقی کی۔

جب کہ مسلمان اِن ایام میں اپنی عظمت رفتہ پہ نوحہ کناں تھا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل مغرب نے بھی اپنی ہزار سالہ غلامی کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے مہذب ہونے کا دعویٰ کرنے میں جلدی کی ۔اس لیے کہ عملاً مغرب اپنی اخلاقی برتری کو ثابت کرنے میں ناکام رہا کہ اُنھوں نے مذہبی اخلاق کی جگہ مادی دستورِ حیات کو اپنا لیا تھا۔ مادی تہذیب اپنانے سے پہلے مغرب ایک الہامی مذہب کا پیرو تھا۔ وہ انحراف کی راہ کو نکلے تو مذہب کو خیر باد کہہ دیا۔ اپنی اجتماعی زندگی سے مذہب کو نکال باہر کیا جس کے نتیجے میں اُن کو چند جزوی فوائد تو ضرور حاصل ہوئے مگر سماج کے مجموعی ڈھانچے کی صورت بگڑ گئی اور اب اہل مغرب اور ملحدین کے اطوارِ زیست میں فرق کرنا محال ہے۔ اہل مغرب نے اُس قدیم یونانی تصور کو اپنا لیا جس کے مطابق بس وہی مہذب ہیں اور اُن کے علاوہ کہیں بھی تہذیب و تمدن کا کوئی نشان نہیں، اور کسی بھی تہذیب میں غلبہ کی لامحدود خواہش تصادم کی راہ ہموار کرتی ہے۔

چنانچہ آج دنیا کی بیشتر جنگیں امریکہ کے ایماء پہ لڑی جا رہی ہیں۔ امریکی افواج دنیا کے ایک سو بتیس ممالک میں کسی نہ کسی بہانے سے موجود ہیں۔ غیر ممالک میں امریکی فوجی اڈوں کی تعداد سات سو سے زیادہ ہے۔ اشتراکیت کے خطرے سے نمٹنے کے بعد مغرب نے اسلام کو اپنا سب سے بڑا

حریف قرار دینے میں ایک لمحے کی دیر بھی نہ کی۔ سرخ رنگ سے نمٹنے کے بعد انھوں نے اسلام کے سبز ہلالی پرچم سے نمٹنے کی صدا لگائی اور دہشت گردی کی اصطلاح وضع کی۔ دنیا کو دہشت گردی سے پاک کرنے کا نعرہ لگایا اور ویت نام، کیوبا، شمالی کوریا اور روس کو بھول کر عراق اور افغانستان پہ حملہ کر دیا کہ وہاں مسلمان بستے ہیں۔ آج پورا مغرب اسلام اور اس کے پیروکاروں سے خائف ہے ۔ اُن کے نزدیک قرآن پڑھنے والا ہر بچہ کل کا دہشت گرد ہے ہر نماز پڑھنے والا بنیاد پرست ہے اور دنیا کو بنیاد پرستی سے شدید خطرات لاحق ہیں۔ چنانچہ سلامتی کونسل جیسے امریکہ کے باج گزار ادارے صرف مغرب کے نقطہ نظر کو سمجھتے ہیں اور باقی تمام دنیا کے لیے اندھے اور بہرے ہیں۔

اِن اداروں میں اکثر و بیشتر ایسی تحاریک پیش کی جاتی رہی ہیں جس سے مسلم خون کے استحصال کی بو آتی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال پہ امت مسلّمہ کا تصور بکھر گیا جسے بیسویں صدی میں اہل مغرب نے اپنا لیا اور نیٹو امت کو مرتب کیا۔ جس نے نہ صرف معاشی طور پہ غلبہ حاصل کیا بلکہ اُن کے دفاعی حصار نے دوسری دنیا کو زچ کر کے رکھ دیا۔ معاشی طور پہ مغرب کی ترقی دنیا کے لیے حیرت انگیز ہے اگرچہ اُس کے پس منظر میں بھی بد دیانتی اور استحصالی طرزِ فکر نمایاں ہے۔ مغرب کے استحصالی معاشی نظام نے انسانیت کو تیسری دنیا کا تحفہ دیا۔ اہل مغرب کے استحصالی نظام نے دولت کے تمام تر بہاؤ کا رخ مغرب کی طرف پھیر دیا جس کی وجہ سے دنیا کی اکثریت بنیادی ضروریات سے محروم ہو گئی اور تیسری دنیا وضع ہوئی۔

تیسری دنیا کیا ہے؟

تیسری دنیا نام ہے جہالت، غربت، بیروزگاری، بے کسی اور سیاسی ابتری کے اُن جہانوں کا انسانیت جہاں سسکتی ہے۔ جہاں کھانے کو روٹی اور پینے کو پانی نہیں، جہاں گاڑیوں کے لیے سڑکیں اور مریض کے لیے دوا نہیں۔ آرزوئیں جہاں پلکوں کے راستے بہہ جاتی ہیں۔ جہاں خوشی اور راحت کا تصور ایسے ہی ہے جیسے صحرا میں بادِ نسیم ہو جہاں ہر آنکھ سے خوف اور بے یقینی جھانکتی ہے جہاں مایوسی اور اذیت کے اتھاہ اندھیرے ہیں۔ سیاسی عدم استحکام، لاقانونیت، آمریت اور دولت

کی غیر منصفانہ تقسیم اِن ممالک کا مقدر ہے۔ تیسری دنیا میں دنیا کے تقریباً اسی ممالک شامل ہیں جہاں انسان کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں ۔ جہاں کے حکمران IMF اور Word bank سے قرض لے کر کھا جاتے ہیں اور اسے عوام پہ ڈال دیتے ہیں۔ تیسری دنیا کے ایک ارب بیس کروڑ لوگ پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھا سکتے۔ 41 کروڑ شدید قسم کے قحط کا شکار ہیں اور امریکہ اپنی ضرورت سے زائد گندم سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ عالمی نظام معیشت پہ سرسری سی نگاہ ڈالنے سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ مغرب عالمی نظام اقتصاد پہ غالب ہے اور پوری دنیا کی آمدن کا 83% حصہ دنیا کے صرف آٹھ ملک لے جاتے ہیں۔

کیا یہ مادیت پرستی کا ثمر ہے؟

کیا یہ خدا سے انکار کا ثمر ہے؟

کیا ظلم کا یہ نظام خالق کی مرضی کے خلاف بپا کیا گیا ہے؟

مذہب پرستوں سے یہ سوال اکثر کیے جاتے ہیں اور وہ لوگ جو خود کو لبرل مسلمان کہتے ہیں عام آدمی کو زچ کرنے اور مغرب کو برتر ثابت کرنے کی کوشش میں اپنی ہی اساس کو کھودنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن سوالوں کی کوئی بنیاد نہیں اس لیے کہ جو کچھ ہوتا ہے خالق کی مرضی سے ہی ہوتا ہے۔ مسلمان غفلت میں ہے اور علم کے میدانوں میں پیچھے ہیں۔ مسلمان ممالک کی اکثریت نے بیسویں صدی میں مغربی سامراج سے آزادی حاصل کی۔ آزادی کی نعمت کو پانے کے بعد اِن ممالک کے عوام نے دیکھا کہ اگرچہ مغربی لوگ تو رخصت ہو گئے ہیں مگر جو لوگ اُن کے حکمران ہیں وہ انھی مغربی ممالک کے ایجنٹ ثابت ہوئے ہیں۔ مغربی استعمار کے آہنی شکنجوں تلے سسکتے ہوئے مسلمان ممالک کی عوام سسک رہی تھیں۔ جن مسلم ممالک میں بادشاہت ہے اُسے بھی جمہوریت پسند مغربی ممالک کی حمایت حاصل ہے اور جہاں آمریت ہے اسے بھی مغربی جمہوریت پسند اپنے مفاد کی خاطر قبول کر لیتے ہیں۔ اِن ممالک میں مغربی مفادات کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ وقت تیزی سے بدل رہا ہے۔ مغرب اپنی خواہش کے مطابق اپنی ننگی تہذیب کو مسلمان ممالک میں رواج دینے میں

بری طرح ناکام ہوا ہے۔ مسلمان ممالک میں آگہی وشعور کی سطح بلند ہو رہی ہے۔ مسلمان علم کے حوالوں سے بھی اپنے جھنڈے گاڑ رہا ہے۔ مسلم ممالک میں اسلامی تصورِ زندگی کو رواج دیا جا رہا ہے۔ مسلم ممالک میں جمہوریت پسند حکومتیں برسر اقتدار آ رہی ہیں۔ مسلم ممالک میں اسلام پسند تحریکیں طاقت پکڑ رہی ہیں۔ تیونس، اردن ایران، ترکی، مصر اور لیبیا میں اسلام پسند قابض ہو چکے ہیں اور برسوں کی آمریت سے جان چھڑا چکے ہیں۔ شام میں جہاد جاری ہے اور دیگر بہت سے مسلم ممالک میں بھی معاشی اور سماجی بیداری کی لہر موجود ہے۔ امریکہ عراق سے نکل چکا ہے اور افغانستان سے نکلنا چاہتا ہے مگر طالبان اُسے راستہ دینے کو تیار نہیں۔ دوسری طرف عیسائیت یہودیت اور ہندو بنئے کا اتحاد بھی اپنا رنگ دکھا رہا ہے اور وہ مسلم ممالک کے خلاف نیا محاذ کھولنے کو تیار ہو رہے ہے مگر اب مسلمان اُن کے دام میں آنے والے نہیں۔

مسلمان ممالک اپنے مقام کو پہچان رہے ہیں وہ وقت دور نہیں جب احیائے امت کے تصور کی طرف پیش قدمی ہوگی۔ مسلمان ممالک اگر نیٹو کی طرز کا ایک ڈھیلا ڈھالا معاہدہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں تو مغرب کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ اسلام ایک حقیقت ہے اور اُس کے مقابل جو کچھ ہے وہ سب سراب ہے۔ سراب حقیقت کے مقابل کبھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مغرب کی خوش قسمتی ہے کہ مسلمان ابھی قدرے غافل ہے اپنے مقام کو پہچان نہیں رہا ورنہ مغرب کی برتری خیال و خواب ہو کے رہ جائے گی۔ اس لیے کہ مغرب کو دنیا پہ حکومت کرتے ابھی چار صدیاں بھی پوری نہیں ہوئیں اور مسلمان اس دنیا پہ ہزار سال حکومت کر چکا ہے۔ جدید رجحان کے حامل مسلمان شاید اس تخیل کی نفی کریں اور اسے محض ایک خواب قرار دیں مگر وہ نہیں جانتے کہ یہ بات میں نے نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے کہ آخری فتح اسلام کی ہوگی اور رسول اللہ ﷺ کے لب مبارک سے نکلی ہوئی کوئی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ دنیا جانتی ہے کہ مغربی سماج جن عارضی بنیادوں پہ استوار ہے وہ کسی بھی وقت ریت قلعے کی طرح زمین بوس ہو سکتا ہے کہ مادیت کی بنیاد عقل پہ نہیں بلکہ خواہش نفس پہ رکھی ہے اور روحانیت کی بنیاد میں خالق کا امر کارفرما ہے۔ اور خالق کا امر ہی باقی رہنے والا ہے باقی

سب دھوکا ہے، سراب ہے۔

✡ ✡ ✡

سفر جتنا بھی ہو جیسا بھی ہو ایک روز کٹ ہی جاتا ہے جیسا کہ ان
لفظوں پہ ہمارا وہ سفر ختم ہوا جو سیرۃ المزمل ﷺ کے طویل ایوانوں
میں رنگ بکھیرنے سے شروع ہوا تھا تب منزل کا کوئی شعور نہ تھا
بس ایک جذبہ ایک جنوں تھا جس کی پیروی میں زندگی کا ایک
حصہ گزر گیا کہ سولہ سال زندگی کا ایک بڑا حصہ ہوتے ہیں مگر
حصول کے مقابل ان سولہ سالوں کی حیثیت ہے۔ میں تو اللہ کا
شکرادا کرتے نہیں تھکتا کہ اُس نے مجھے اُس تسلسل کا حصہ بنا دیا
جو پندرہ صدیوں سے جاری تھا اور قیامت تک جاری رہنے والا
ہے اس سے بڑا اعزاز میرے لیے کیا ہوگا کہ روز محشر مجھے سیرت
نگاروں میں اٹھایا جائے۔

ٹوٹتے حرف لرزتے اشک

کائنات کی ہمہ جہت مشغولیت ادراکِ خرد سے ماوراء ہے، انسان مادی رفعتوں اور اخلاقی پستیوں کا شکار ہے، خالق کی نگاہِ عمیق کارگاہ ٔحیات کو محیط ہے، تکوین عالم کی ساری رونق اسی تکون پہ استوار ہے ۔انسانی ذہن کے نہاں خانوں میں مقصدیت کا تصور اگرچہ زندہ ہے مگر منزل کے تعین میں وہ تضادات کا شکار ہے۔تماشا گاہ ٔحیات میں بدلتے منظروں کا فسوں نقشِ حیرت وہیبت کو فروزاں کرتا ہے تو اسرارِ فردہ کا دامن بھی ولولہ راستی سے تہی ہے۔انسان روحانی تشنگی کا اسیر ہے مگر اُس کے قدم مادی مسافتوں پہ بضد ہیں۔سراب منزلوں کے آبلے درد کے نوحہ میں بدلتے ہیں تو شدت اور اذیت کے وہ نغمے جنم لیتے ہیں کہ لبِ ساحل ڈوبتے جہازوں سے آتی صداؤں کو بھی مات کر دیں۔نفس پذیر رونقِ زیست الجھاوے کی وہ رِدا ہے جس کو اوڑھے حضرت انسان شبِ وحشت کے اُن سارے منظروں کا منتظم اعلیٰ ہے جس نے زمین کا چہرہ انسانی خون سے سرخ کر رکھا ہے۔دعویٰ علم وتہذیب

کے بطن سے جھانکتے خوں آشام شب وسحر کے دامن میں شرفِ انسانیت کی وہ راکھ ہے جس سے زخموں کی رفوگری سے اذیت سوا ہوجاتی ہے۔چارہ گرکی مسیحائی آفتِ مزید ہے کہ اُس کے نصاب میں روح کے آبلوں کا کوئی باب ہی نہیں۔ وہ حرکت قلب کو گننے والا ہے اور نہیں جانتا کہ مچلتے احساسات اور تشنہ آرزوؤں کے بھنور اُس کے حساب میں کس قدر تفریق ڈالنے والے ہیں۔اس گردش دوراں میں ہر ذات کا محور انفرادی ہے اور بظاہر محدود نظر آتے اس محور میں رونق جہاں کی وہ بزم سانس لیتی ہے جو اُس ذات کے احساسات سے مزین ہے۔ یہ انفرادی محور جب ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور ایک دوسرے کی حدود کو پامال کرتے ہیں تو سماج کے وہ تضادات ابھر کے سامنے آتے ہیں جنھوں نے انسانی زندگی کو وہ آزار عطا کیے جن کا مداوا روحانیت میں ہے مگر انسان نے اسے مادیت میں کھوجا ۔اور یہی کھوج اُسے اُن اندھیری منزلوں کی طرف لے گئی جہاں پُر اذیت مسافت کے کئی جہانِ دِگر اُس کے منتظر تھے۔

وہ نئے ولولے سے ایک نیا سفر شروع کرتا ہے، ستاروں پہ کمند ڈالنے کی سوچتا ہے، ہواؤں میں اڑنے کے منصوبے بناتا ہے اور بسا اوقات کامیاب بھی ہوجاتا ہے مگر سکون خوشی اور طمانیت کی نعمت پھر بھی اُس سے گریزاں رہتی ہے۔تب وہ ایک نئی منزل کو نکل کھڑا ہوتا ہے، ہر گزرتی وادی اُس کے ارادوں کو تقویت فراہم کرتی ہے مگر منزل پہ پہنچنے سے پہلے ہی کوئی نادیدہ قوت اُس کے ارادوں میں اضطراب پیدا کردیتی ہے اور ایک روز اس تماشا گاہ حیرت میں اچانک ہی اُس کا مقررہ وقت ختم ہوجاتا ہے اور وہ خالی ہاتھ تہی دامن خالق کے حضور جا پیش ہوتا ہے۔نورِ عقل کو چراغ راہ بنانے والے کم کم گزرے ہیں، خرد کی اس مہیب روشنی میں انسان دوسروں پہ نگاہ گاڑے بیٹھا رہا مگر اپنی ذات کے دروں مچلتے احساسات کو پست آرزوؤں کی بھینٹ چڑھاتا رہا۔تاریخ کے پھڑ پھڑاتے صفحات سے آتی صداؤں نے انسان کے پست اہداف کو واشگاف کردیا ہے۔انسانی طبع میں موجود فطری تنوع کے امتزاج نے جب اُس کے لوح دل پہ عزم لکھا تو اہرام مصر سامنے آئے، محبت لکھی تو تاج محل زمین کے سینے پہ ابھر آیا، نفرت لکھی تو انسانی کھوپڑیوں کے مینار ظاہر ہوئے، فتح لکھی تو

سکندر یونانی کے لشکروں کی دھول نے زمین کے بہت بڑے حصے کو لپیٹ لیا وحشت لکھی تو ہیروشیما اور ناگاساکی کے کریہہ منظر انسانی آنکھوں کو چھید گئے، ماضی لکھا تو تاریخ کے بوسیدہ دریچوں سے انسانی خون کی بو آئی، عشق لکھا تو آتش فرہاد کے سامنے پگھلتے پتھروں سے بنتی نہر کا ظہور ہوا، جنوں لکھا تو چاک گریباں کے اُس پار تمنائے وصل کی تحریر نظر آئی، خرد لکھا تو خالق کے گریباں تک پہنچتے وہ ہاتھ نظر آئے جن سے شکر کے منظروں کو روک لیا گیا تھا، علم لکھا تو رسالت اتار دی گئی، قلم لکھا تو قرآن نازل کیا گیا، سچ لکھا تو اطاعت اتاری گئی اور یہ سب وہ بدلتے منظر ہیں جن کا تذکرہ تاریخ کہلاتا ہے۔

گئے دِنوں کی دانش کو ادب، رسم و رواج کو تہذیب اور رہن سہن کو عام فہم زبان میں تمدن کہا جاتا ہے۔ تہذیب و تمدن انسانی سماج کے بدلتے منظروں کے وہ پڑاؤ ہیں جہاں شعور نے ماضی کو تیاگ دینے کا عندیہ دیا اس طرح انسان پتھر کے عہد سے اُٹھ کر نیویارک کی وال اسٹریٹ جنرل میں آ بیٹھا تاریخ اگرچہ سود زیاں کے نقوش ظاہر کرنے والی ایک دستاویز ہے مگر ساتھ ہی یہ زور آور کے ظلم کو پوشیدہ رکھنے والا ایک پردہ ہے اور مظلوم سے چشم پوشی کرنے والی ایک طوائف ہے اس لیے اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

شعوری ارتقا کے ساتھ ساتھ لالچ نے انسانی ذہن کا احاطہ کیا اور وہ حقیر سے فائدے کے لیے اپنے جیسے انسانوں کا خون بہانے لگا۔ پھر وہ خاندانوں اور قبیلوں میں منقسم ہوا اور سماجیات کی بنا پڑی۔ قبیلے اقوام بن گئے تو رنگ و نسل اور اعلیٰ و ادنیٰ کی تقسیم نے نفرت کو مزید بڑھاوا دیا۔ مگر تاریخ کے اس طویل تسلسل کا تعفن بعض اوقات اچانک معطر ہواؤں میں بدل جاتا ہے اور ہر سو روشنی ہو جاتی ہے امن کا سما بندھ جاتا ہے، حیات بخش نوید سحر کی سبک خرام ہوائیں کسی نئے چلن کسی نئے پیغام کا سندیسہ دیتی ہیں تو خبر ملتی ہے کہ اللہ کا کوئی رسول زمین پر اترا ہے۔ چنانچہ اللہ کے پیغمبر قطار در قطار اترتے رہے تاکہ انسانی کجروی کو راستی سے آشنا کر سکیں۔ نجات کی راہ دکھا سکیں، انسانی سماجوں میں پھیلے اندھیرے سمیٹ سکیں۔ انسانوں کے نظریہ حیات کی تعمیر کر سکیں، پھر ہدایت کے اس تسلسل کو

بھی ختم کر دیا گیا۔ آنحضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت و رسالت کا دروازہ بند کر دیا گیا اور قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام قرار دے دیا گیا اور واشگاف الفاظ میں اعلان کر دیا گیا کہ ہدایت اب صرف قرآن میں ہے مگر قرآن کے پیغام تک پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا جائے جن پر قرآن نازل کیا گیا۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا اور آنحضرت محمد ﷺ کی زندگی کا ایک ایک پل امت نے محفوظ کر لیا اُسے یاد رکھا کہ اس کے بغیر قرآن حکیم کے حقیقی پیغام تک رسائی ممکن ہی نہ تھی۔ علمائے امت نے اقوال رسول اور احوال رسول کو الگ الگ بیان کیا تا کہ دین کی ہر بات اور اسوہ رسول کا ہر پہلو پوری طرح واضح ہو جائے۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہی دراصل ایمان ہے اور اطاعت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زیست مبارک کے ایک ایک لمحہ سے آشنائی ضروری قرار پائی تا کہ اطاعت اور پیروی کامل ہو جائے۔ ہر دور کے صاحب علم نے مدحت رسول کو اولیت دی اور ادب میں ایک منفرد صنف تذکرہ سیرۃ کی بنیاد رکھی گئی۔ دورِ اول میں اس فن کو حضرت عاصم بن عمرو قتادہ انصاری نے اجاگر کیا وہ جامع دمشق میں لوگوں کو سیرۃ و مغازی پہ درس دیا کرتے تھے۔ امام زہری اُن کے شاگرد تھے امام زہری کی مجلس میں بہت سے صاحب علم بیٹھا کرتے تھے تب سیرۃ و مغازی کا عام مزاج پیدا ہو چکا تھا۔

امام سہیلی کے مطابق امام زہری ہی نے سب سے پہلی سیرۃ کی کتاب لکھی۔ اُن کے حلقہ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جنھوں نے خاص سیرت نگاری میں کمال حاصل کیا۔ ان کے شاگردوں میں یعقوب بن ابراہیم، محمد ابن صالح تمار، عبدالرحمان بن عبدالعزیز، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحٰق شامل ہیں۔ ابن اسحٰق تابعی ہیں اور سیرت ابن اسحٰق جس کو آج کے دور میں سیرت ابن ہشام کے نام سے جانا جاتا ہے ہی سیرت پہ سب سے اولین کتاب قرار دی جاتی ہے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری تک رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارک پہ سیر حاصل کام ہو چکا تھا۔ ابن ہشام کے بعد ابن سعد نے رسول اللہ ﷺ کے احوال پہ جامع کتاب لکھی۔ پھر یہ قافلہ بنتا گیا اور بہت سے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ

کی زیست مبارک پہ قلم اٹھایا، دوسرے عہد میں سیّد ابن الناس نے عیون الاثر لکھی، علامہ عبدالرحمان سہیلی نے الاروض الانف لکھی، علامہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ لکھی، امام حلبی نے سیرت حلبیہ لکھی۔ برصغیر پاک و ہند میں کئی زبانوں کے بطن سے جب اردو زبان وجود میں آئی تو اول اول یہ رجحان سامنے آیا کہ عرب سیرت نگاروں کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے۔ اردو زبان کی باقاعدہ تصنیفات میں (۱۹۱۶ء) میں سیّد سلیمان سلمان منصور پوری کی کتاب رحمت للعالمین سامنے آئی (۱۹۱۹ء) میں علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی شائع ہوئی، محمد کرم شاہ کی ضیا النبی (۱۹۹۴ء) میں شائع ہوئی اور محمد رفیق ڈوگر کی کتاب الامین (۱۹۹۹ء) میں سامنے آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت پاک پہ علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی ہی وہ واحد کتاب ہے جس میں تحقیق کا ایک معیار قائم کیا گیا ہے اور جابجا علمی مباحث سے قاری کی تشنگی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میں ابھی تک حیرت کے اُس مہیب حصار میں ہوں کہ پھر یہ قلم مجھے سونپ دیا گیا جس کا نہ کوئی علمی معیار تھا اور نہ تقویٰ۔ مگر اُس کی تقسیم کے سامنے کون دم مار سکتا ہے جب حکم ہو گیا تو قلم اٹھانا پڑا یہ سوچ کر پہلا لفظ لکھا کہ جب سانس ٹوٹ جائے گی، حوصلہ جواب دے جائے گا، لفظ ساتھ چھوڑ جائیں گے، علم کی کمی راہ روکے گی تو میرے پاس جواز ہوگا کہ میں اس بھاری بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہی نہ تھا، مگر پھر کیا ہوا یہ مجھے معلوم نہیں صرف اتنا یاد ہے کہ جب قلم تھاما تو وہ اس قدر تیزی سے چلا کہ جبراً اُسے روکنا پڑتا، رات گزر جاتی بات وہیں رہتی، ارادہ کیا کہ سو صفحے کا مقدمہ لکھوں جب آنکھ اٹھائی تو وہ سات سو صفحات تھے، پھر صفحات جڑتے گئے، پھر جلدیں بننے لگی پھر میں نے جانا کہ سیرۃ المزمل ﷺ تو وقت کی سب سے بڑی کتاب ہے۔ بیس جلدیں لکھ لیں تشنگی برقرار ہے، نہ قلم رکا ہے نہ عزم و حوصلہ میں کوئی کمی ہے، بارہ سال گزر گئے مجھے بخار تک نہیں آیا کہ مبادا میں آرام کرنے لگوں اور کام رُک جائے۔ کتنی ہی بہاریں اور خزائیں نمودار ہوئیں اور مجھے قلم و قرطاس میں الجھے دیکھ کر دبے پاؤں گزر گئیں، اس دوران جانے کتنی یخ بستہ راتیں آئیں جب مجھے یاد بھی نہ آیا کہ رات سونے کے لیے بنائی گئی ہے، درد کی کتنی ہی لہریں میری کمر اور کندھوں میں مقیم ہوئیں مگر میرے

عزم کو مضطرب کیے بغیر شکست کھا گئیں، کتنی سحریں ایسی تھیں جب بظاہر میں تنہا تھا مگر کون جانے کہ میں کن رونقوں میں تھا میرے گرد کتنے مقدس لوگ تھے، یہ احساس بیان کرنا دشوار ہے کہ میں وہیں تو تھا جب اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو نکال دیا تھا، میں وہیں تھا جب بدر میں ابوجہل سر بریدہ پڑا تھا، میں وہیں تھا جب مصعب بن عمیر کو پشت کی طرف سے وار کر کے شہید کیا گیا، اور میں تب بھی وہیں خندق کے اُس پار تھا جب سارا عرب اُمڈ آیا تھا اور سردی صحابہ کے جسموں کو اذیت دیتی تھی کوئی یقین کرے گا کہ میں نے بھی موسم کی اُس شدید اذیت کو اپنے جسم پر محسوس کیا تھا۔ چنانچہ اسی رونق میں گزری وہ کتنی ہی صبحیں اور شامیں تھیں جب زندگی کی تلخیوں اور نا آسودگیوں نے میرے پاؤں کی زنجیر بننا چاہا مگر مکہ کے ریگزاروں اور مدینہ کے نخلستانوں نے مجھے پناہ دی یہی وجہ ہے کہ نامساعد حالات میں بھی میرے قلم نے کبھی ضد نہ کی اور سر جھکائے مدحت رسول میں مگن رہا۔ اب حرف ٹوٹنے لگے ہیں اشک لرزنے لگے ہیں کہ طویل مسافت کے ہر راہی کو جب منزل کے آثار نظر آتے ہیں تو شکر کا گداز پلکیں بوجھل کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اب بھی اگرچہ ڈر لگتا ہے کہ جب اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہوں گا تو کیا جواب دوں گا تب ایک احساس طمانیت مجھے تسکین دیتا ہے کہ میں اپنے پروردگار سے کہوں گا اے میرے رب میں تیرے محبوب کی مدحت میں شب و روز مشغول رہا ہوں مجھے دیگر نیکیوں کا ہوش ہی کہاں تھا، تب شاید سیرۃ المزمل ﷺ میرے لیے اللہ کی رضا کا سندیسہ لائے کہ میرے دامن میں اس کے سوا اور ہے بھی کیا؟؟؟

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝

آغاز	۱۲ربیع الاول بروز جمعہ بمطابق ۱۴۲۴ھ ۔ 21مارچ بروز جمعہ 2004ء
اختتام	۱۳ربیع الثانی بروز جمعہ بمطابق ۱۴۴۰ھ ۔ 21 دسمبر بروز جمعہ 2018ء
PDF	۵جمادی الاول بروز اتوار بمطابق ۱۴۴۱ھ ؛12جنوری بروز اتوار 2020ء

اشاریہ

1*

انسان کے تہذیبی، تمدنی و مذہبی ارتقاء کے متعلق یہ مطالعہ ''کائنات اور انسان'' سے تحریر کیا گیا۔

سیّد علی عباس جلالپوری

کائنات اور انسان (ص ۔ 11)

****

2*

اِن قرآنی آیات کا ترجمہ ''تفہیم القرآن'' سے درج کیا گیا

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تفہیم القرآن

****

*3

اس مضمون کو لکھتے ہوئے سیّد علی عباس جلالپوری کی کتابیں میری نگاہ میں رہیں۔

کائنات اور انسان (سیّد علی عباس جلالپوری)

روایاتِ تمدن قدیم (سیّد علی عباس جلالپوری)

علم کی اسلامی تشکیل (خورشید احمد ندیم)

****

*4

حارث بن اسد محاسبی روافض میں سے تھا۔

مولانا عبدالرحمان کیانی۔

شریعت وطریقت (ص : 116)

****

*5

صوفی صوف سے ہے کہ موٹے اونی کپڑے کو صوف کہا جاتا تھا۔

امام ابن تیمیہ

کوکن عمری (ص : 268)

****

*6

یہ حدیث سنن ابی داؤد سے تحریر کی گئی۔

سنن ابی داؤد ابوداؤد (کتاب الادب ،باب فی الحسد)

****

*7

حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت مشکوٰۃ شریف سے درج کی گئی۔

مشکواۃ

(کتاب الصلواۃ ،باب القصد فے العمل)

****

*8

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں یہ روایت مسند اامام احمد بن حنبلؒ سے درج کی گئی۔

امام احمد بن حنبلؒ (مسند احمد ۔ ج ۵)

****

*9

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں حضرت عثمان بن مظعونؓ کی یہ روایت صحیح بخاری سے درج کی گئی۔

امام محمد بن عبداللہ بخاریؒ (صحیح بخاری)

****

*10

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی یہ روایت صحیح بخاری سے درج کی گئی۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم ، مسند احمد

****

*11

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں حضرت عثمان بن مظعونؓ کی یہ روایت طبقات ابن سعد سے درج کی گئی۔

طبقات ابن سعد از ابن سعدؒ

****

*12

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں حضرت کہمس الہلالیؓ کی یہ روایت طبقات ابن سعد سے درج کی گئی۔

طبقات ابن سعد از ابن سعد

****

*13

رہبانیت سے اجتناب کے ضمن میں یہ روایت صحیح بخاری سے درج کی گئی۔

امام محمد بن عبداللہ بخاریؒ

(صحیح بخاری ۔ کتاب النکاح)

****

*14

سینٹ پال نصاریٰ کا مشہور فلسفی اور صوفی تھا جسے قرون وسطیٰ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی

مذہب و تجدید مذہب ۔ وعظ 35 (ص : 213)

****

*15

از" انسان کامل "

مترجم (فضل میراں ص ؛108)

****

*16

حضرت علیؓ نے زنادقہ کے ستر لوگوں کو آگ میں جلا دیا تھا۔

امام عبداللہ بن محمد بخاریؒ (صحیح بخاری ۔کتاب الستتابہ المرتدین)

فتح الباری (جلد 12 ص ؛ 238)

****

*17

منصور بن حسین حلاج کے یہ اشعار تاریخ بغداد سے تحریر کیے گئے۔

للخطیب بغدادی

تاریخ بغداد (جلد8 ۔ ص ؛ 129)

****

*18

اس مضمون کی تشکیل کے دوران امام امین اصلاحیؒ کی کتاب "فلسفے کے بنیادی مسائل" اور عہد حاضر کے معروف اسلامی سکالر خورشید احمد ندیم کی کتاب "علم کی اسلامی تشکیل" میرے پیش نظر رہیں۔

****

*19

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تدبر القرآن ۔ (تفسیر سورۃ النساء   جلد سوم ۔ ص ؛ 51)

****

*20

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تدبر القرآن ۔ (تفسیر سورۃ النساء   جلد دوم ۔ ص ؛ 425)

****

*21

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

تدبر القرآن ۔

(تفسیر سورۃ فاطر جلد ششم ۔ ص ؛ 377)

****

*22

مسلمانوں کی اس سیاسی رفعت کو بیان کرنے میں اگرچہ کئی کتابیں میرے پیشِ نظر رہیں تاہم کچھ حقائق پروفیسر ارشد جاوید کی کتاب مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج سے بھی تحریر کیے گئے۔

پروفیسر ارشد جاوید

مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج

****

*23

یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات کی تفصیلات ''مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج'' سے تحریر کی گئیں۔

پروفیسر ارشد جاوید

مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج

****

*24

تفصیلات ''مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج'' سے تحریر کی گئیں۔

پروفیسر ارشد جاوید

مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج

****

*25

پوپ الیگزینڈر ششم کی بد اعمالیوں کا تذکرہ حبیب احمد صدیقی نے اپنی کتاب مسلمان اور سائنس کی تحقیق میں کیا ہے۔

حبیب احمد صدیقی

مسلمان اور سائنس کی تحقیق

****

*26

خلافت عباسیہ کے زوال کی داستان کے کچھ صفحات علامہ معین الدین احمد ندویؒ کی کتاب تاریخ اسلام سے تحریر کیے گئے۔

معین الدین احمدؒ

تاریخ اسلام(جلد چہارم)

****

*27

مسلمانوں کے اِن صاحب علم کا تذکرہ حبیب احمد صدیقی نے اپنی کتاب مسلمان اور سائنس کی تحقیق میں کیا ہے۔

حبیب احمد صدیقی

مسلمان اور سائنس کی تحقیق

****

*28

اس مضمون کو لکھتے ہوئے اِن کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

ڈاکٹر حشمت جاہ کی ''قرآن اور جدید سائنس''

حبیب احمد صدیقی کی ''مسلمان اور سائنس کی تحقیق''

پروفیسر ارشد جاوید کی ''مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج''

****

*29

علم کیمیا کے علماء کا تذکرہ بہت سے علماء نے کیا ہے دیکھیں

حبیب احمد صدیقی کی ''مسلمان اور سائنس کی تحقیق''

پروفیسر ارشد جاوید کی ''مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج''

****

*30

اس مضمون کو لکھتے ہوئے اور علمائے طبیعات کے احوال لکھتے ہوئے اِن کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

ڈاکٹر حشمت جاہ کی "قرآن اور جدید سائنس"

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

پروفیسر ارشد جاوید کی "مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج"

****

*31

علم ریاضی کے علماء کے تذکرے میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔

ڈاکٹر حشمت جاہ کی "قرآن اور جدید سائنس"

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

پروفیسر ارشد جاوید کی "مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج"

****

*32

علم ریاضی کے ماہرین کا مختصر تعارف حبیب احمد صدیقی کے حوالے سے پیش کیا گیا۔

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

****

*33

محمد ابن عثمان المعروف کی علم ریاضی پہ مشہور کتابوں کے نام حبیب احمد صدیقی کے حوالے سے پیش کیے گئے۔

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

****

*34

ناصر الدین طوسی بلاشبہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا عالم تھا اُس کی کتابوں کے نام حبیب احمد صدیقی کے حوالے سے تحریر کیے گئے۔

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

****

*35

اس مضمون میں دیئے گئے اعداد و شمار پروفیسر ارشد جاوید کے حوالے سے درج کیے گئے۔

پروفیسر ارشد جاوید کی "مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج"

****

*36

مسلم اطباء کا احوال لکھتے ہوئے یہ کتابیں میرے پیش نظر رہیں

ڈاکٹر حشمت جاہ کی "قرآن اور جدید سائنس"

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

پروفیسر ارشد جاوید کی "مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج"

****

*37

مسلمان اطباء کی مشہور کتابوں کے نام حبیب احمد صدیقی کے حوالے سے درج کیے گئے۔

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

****

*38

مسلم اطباء کے یہ نام مختلف کتابوں سے درج کیے گئے۔

ڈاکٹر حشمت جاہ کی "قرآن اور جدید سائنس"

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

پروفیسر ارشد جاوید کی "مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج"

****

*39

مورخین نے اس ضمن میں طویل مباحث چھوڑے ہیں تاریخ کی کتابیں اِن سے بھری پڑی ہیں کہ علم ہیت کی ابتداء مسلمانوں نے ہی کی۔

مؤلف سیرۃ المزمل ﷺ

افتخار احمد افتخار

****

*40

مامون الرشید عباسی خلفا میں سب سے زیادہ علم دوست مانے جاتے تھے اُن کے زمانے میں مسلمانوں نے کئی علمی معرکے سرانجام دیئے۔

خطیب بغدادی

تاریخ بغداد (جلد 5۔ ص ؛ 129)

****

*40

دیگر سینکڑوں ہزاروں ایجادات کی طرح پینڈولم بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔

پروفیسر ارشد جاوید

مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج

****

*42

اہل مغرب نے بہت سے امور میں یہی علمی بد دیانتی اختیار کی۔

مؤلف سیرۃ المزمل ﷺ

افتخار احمد افتخار

****

*43

ممتاز مسلم ہیت دانوں کے حالات لکھتے ہوئے یہ کتابیں میرے پیش نظر رہیں۔

ڈاکٹر حشمت جاہ کی ''قرآن اور جدید سائنس''

حبیب احمد صدیقی کی ''مسلمان اور سائنس کی تحقیق''

پروفیسر ارشد جاوید کی ''مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج''

****

*44

اہل مغرب کسی بھی نئی بات کو خلاف مذہب قرار دے کے رد کر دیتے تھے چنانچہ انھوں نے کہا کہ چونکہ تورات میں یہ نہیں لکھا کہ زمین گول ہے اس لیے وہ نہیں مانتے کہ زمین گول ہے۔

مؤلف سیرۃ المزمل ﷺ

افتخار احمد افتخار

****

*45

مسلمان ماہر ارضیات کے حالات لکھتے ہوئے یہ کتابیں میرے پیش نظر رہیں۔

سیّد امیر علی۔ ''مسلمانوں کی مختصر تاریخ''

ڈاکٹر حشمت جاہ کی ''قرآن اور جدید سائنس''

حبیب احمد صدیقی کی ''مسلمان اور سائنس کی تحقیق''

پروفیسر ارشد جاوید کی ''مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج''

****

*46

مسلمان ماہر میکانیات کے حالات لکھتے ہوئے یہ کتابیں میرے پیش نظر رہیں۔

سیّد امیر علی۔ ''مسلمانوں کی مختصر تاریخ''

ڈاکٹر حشمت جاہ کی ''قرآن اور جدید سائنس''

حبیب احمد صدیقی کی ''مسلمان اور سائنس کی تحقیق''

پروفیسر ارشد جاوید کی ''مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج''

****

*47

علامہ ابن جریر طبری کے مطابق علم تاریخ کا آغاز چینیوں نے کیا۔

تاریخ الامم والملوک

ابن جریر طبریؒ۔

****

*48

مسلمان علم تاریخ میں راسخ تھے اس مضمون کو لکھنے کے لیے سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کی گئی جن کی تفصیلات بیان کرنا ممکن نہیں۔

مؤلف سیرۃ المزمل ﷺ

افتخار احمد افتخار

****

*49

مسلمان فلاسفہ کے حالات لکھتے ہوئے یہ کتابیں میرے پیش نظر رہیں۔

سیّد امیر علی۔ ''مسلمانوں کی مختصر تاریخ''

ڈاکٹر حشمت جاہ کی ''قرآن اور جدید سائنس''

حبیب احمد صدیقی کی ''مسلمان اور سائنس کی تحقیق''

پروفیسر ارشد جاوید کی ''مسلمانوں کا ہزار سالہ عروج''

****

*50

اس مضمون لکھتے ہوئے یہ کتابیں میرے پیش نظر رہیں۔

سیّد امیر علی۔ ''مسلمانوں کی مختصر تاریخ''

حبیب احمد صدیقی کی ''مسلمان اور سائنس کی تحقیق''

ابن جریر طبری۔ ''تاریخ الامم والملوک''

معین الدین احمد "تاریخ اسلام" (جلد چہارم)

****

*51

اس مضمون لکھتے ہوئے یہ کتابیں میرے پیش نظر رہیں۔

سیّدامیر علی۔ "مسلمانوں کی مختصر تاریخ"

حبیب احمد صدیقی کی "مسلمان اور سائنس کی تحقیق"

ابن جریر طبری۔ "تاریخ الامم والملوک"

معین الدین احمد "تاریخ اسلام" (جلد چہارم)

علامہ ابن خلدون "تاریخ ابن خلدون"

****

*52

اس مضمون کو لکھتے ہوئے مندرجہ ذیل مورخین سے استفادہ کیا گیا۔

سبط حسن "ماضی کے مزار"

سبط حسن "موسی سے مارکس تک"

ڈاکٹر مبارک علی "یورپ میں بیداری کی لہر"

****

*53

اس مضمون کو لکھتے ہوئے وسیع مطالعہ کی ضرورت پیش آئی۔

ڈاکٹر محمود علی۔۔۔عروج آدم

سیّد محمد اسماعیل۔۔۔رسول عربی اور عصر جدید

****

*54

اِن دانشوروں کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا۔

The life and work of Sigmund Freud.

Dr.Jons peter.

Frued,His Dream and Sex Theories.

Pro, Joseph Jastrow.

New Horizons in Psychology

Pro,Brian M.Foss.

Modern Science and the Nature of life.

Pro,Walliam Back.

Uses and Abuses of psychology.

Pro,H.J.Eysenck.

****

*55

اِن دانشوروں کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا۔

The life and work of Sigmund Freud.

Dr.Jons peter.

Frued,His Dream and Sex Theories.

Pro, Joseph Jastrow.

New Horizons in Psychology

Pro,Brian M.Foss.

Modern Science and the Nature of life.

Pro,Walliam Back.

Uses and Abuses of psychology.

Pro,H.J.Eysenck.

****

*56

Marx, Engels (SELECTED WORKS).

Soviet Socialist Democracy

Fundamentels of political Economy Moscow.

Lenin Selecated Works.

Aglance at Historical Materialism.

On Scientific Communism.

****

ماخذ ومصادر ومراجع

القرآن الحکیم

سیرۃ النبی ﷺ ***** مولانا شبلی نعمانیؒ

سنن ابی داؤد ***** امام ابی داؤدؒ

موطا امام مالک ***** امام محمد مالکؒ

مشکوٰۃ شریف ***** امام محمد رازیؒ

صحیح مسلم شریف ***** امام مسلمؒ

جامع ترمذی	*****	امام ترمذیؒ
تاریخ ابن خلدون	*****	علامہ ابن خلدونؒ
تاریخ الامم والملوک	*****	امام ابن جریر طبریؒ
تاریخ اسلام	*****	اکبر شاہ نجیب آبادیؒ
تاریخ اسلام	*****	معین الدین شاہ ندویؒ
انسان کامل	*****	محمد منیر قریشیؒ
مسلمان امتیں	*****	ڈاکٹر اسرار احمدؒ
سیرت ابن ہشام	*****	ابن ہشامؒ
نقوش (رسول نمبر)	*****	ادارہ
مجموعہ مضامین	*****	پروفیسر احمد رفیق اختر

اسلام اور عصر حاضر	*****	مولانا وحید الدین خانؒ
ضیا القرآن	*****	جسٹس محمد کرم شاہؒ
تفہیم القرآن	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
خلافت وملوکیت	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
سنت کی آئینی حیثیت	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
الجہاد فی الاسلام	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
خطبات	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
سیرت سرور کونین ﷺ	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
پردہ	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ
اسلام کے بنیادی تصورات	*****	سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

پیغمبر اعظم و آخرؐ	*****	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر
محمد عربی ﷺ	*****	مولانا وحید الدین
محسن انسانیتؐ	*****	نعیم صدیقی
تدبر قرآن	*****	مولانا امین احسن اصلاحیؒ
کشت زربار	*****	پروفیسر احمد رفیق اختر
خطبات بہاولپوری	*****	ڈاکٹر حمید اللہؒ
بلوغ الارب	*****	علامہ محمود شکری آلوسیؒ
العقد الفرید	*****	ابن عبد ربہؒ
روایات تمدن قدیم	*****	سیّد علی عباس جلالپوری
الامینؐ	*****	محمد رفیق ڈوگر

سیرت الرسول ﷺ	*****	محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ
کائنات اور انسان	*****	علی عباس جلالپوریؒ
حجۃ البالغہ	*****	شاہ ولی اللہ دہلویؒ
تمدن ہند	*****	علی بلگرامیؒ
سیرت عائشہؓ	*****	سیّد سلمان ندویؒ
تحقیق ماللہند	*****	علامہ البیرونیؒ
کرم کی برسات	*****	ڈاکٹر محمد خالد عاربی
ابوسفیانؓ	*****	الطاف حسن گیلانی
تاریخ اسلام	*****	شیخ محمد رفیق
تاریخ مدینہ	*****	محمد صادق بہاولپوری

مقالات ***** سرسید احمد خان

تاریخ اسلام ***** حسن ابراہیم

جزیرۃ العرب ***** علامہ ہمدانی

تاریخ اسلام ***** ڈاکٹر حسن ابراہیم

المروج الذہب ***** المسودیؒ

تفصیل الازمنہ ***** یوسف بن عبدالملکؒ

العرب قبل از اسلام ***** علامہ جرجی زیدانؒ

الروض الانف ***** امام سہیلیؒ

شرح سنن ابی داؤد ***** امام خطابیؒ

قانون اسلام ***** سرسید احمد خانؒ

عہدنامہ قدیم

عہدنامہ جدید

احکام القرآن	*****	امام رازیؒ
الاحکام السطانیہ	*****	امام ماوردیؒ
کتاب المثالب	*****	ابن ہشام
اعلام النبوۃ	*****	امام ماوردیؒ
الطرق الحکمتیہ	*****	علامہ ابن قیمؒ
البیان والتبیان	*****	امام جاحظ
الکامل	*****	علامہ ابن کثیرؒ
کتاب البیان	*****	امام لیثیؒ

ضرب الامثال	*****	میدانیؒ
کتاب العمدہ	*****	علامہ ابن رشیقؒ
کتاب الاوائل	*****	اسماعیل بن عبداللہ موصلیؒ
الوفاء	*****	ابن جوزیؒ
مفردات القرآن	*****	علامہ راغب اصفہانیؒ
الجامع الصغیر	*****	امام سیوطیؒ
شرح المواہب اللدنیہ	*****	امام زرقانیؒ
البیان والتعریف	*****	ابراہیم بن محمد الحسینیؒ
الصحاح اللغتہ	*****	امام جوہریؒ
مقاتل الفرسان	*****	ابوعبیدہؒ

دیوان	*****	حضرت حسان بن ثابتؓ
الشفاء	*****	قاضی عیاضؒ
طبقات الکبری	*****	ابن سعدؒ
سیرت حلبیہ	*****	امام حلبیؒ
مدارج النبوۃ	*****	محدث دہلویؒ
جمع الوسائل	*****	ملا علی قاریؒ
المواہب اللدنیہ	*****	امام قسطلانیؒ
جواہر البحار	*****	امام بیہقیؒ
السیرۃ النبویہ	*****	ابن عساکرؒ
شعب الایمان	*****	امام بیہقیؒ

المعجم الصغیر	*****	امام طبرانیؒ
فتح الباری	*****	ابن حجر عسقلانیؒ
اخبار مکہ	*****	امام فاکہیؒ
الکفایہ فی العلم الراویہ	*****	خطیب بغدادیؒ
التمہید	*****	ابن عبدالبرؒ
الثقات	*****	ابن حبانؒ
سبل الہدیٰ والرشاد	*****	امام صالحیؒ
المنصف	*****	ابن ابی شیبہؒ
شرح مسلم	*****	امام نوویؒ
شمائل الرسول	*****	امام ابن کثیرؒ

صفوۃ الصفوۃ	*****	ابن جوزیؒ
امتاع الاسماع	*****	امام طبرانی
میزان الاعتدال	*****	امام ذہبیؒ
الاستیعا ب	*****	ابن عبدالبرؒ
التفسیر الکبیر	*****	امام رازیؒ
کتاب الزہد	*****	ابن مبارکؒ
السنن	*****	دارمیؒ
الآحاد ولمثانی	*****	امام شیبانیؒ
المسند	*****	ابن جعدؒ
السنن الکبریٰ	*****	امام نسائیؒ

تہذیب الکمال	*****	امام مزیؒ
المسند	*****	اسحاق بن راہویہؒ
تہذیب الاسماء	*****	امام نوویؒ
الاصابہ	*****	ابن حجر عسقلانیؒ
الریاض النضرۃ	*****	امام زرقانیؒ
شرح المؤطا	*****	طبرانیؒ
معجم الاوسط	*****	عبدالرزاقؒ
الادب المفرد	*****	امام بخاریؒ
لسان المیزان	*****	ابن حجر عسقلانیؒ
تذکرۃ الحفاظ	*****	امام ذہبیؒ

المسند	*****	ابوعوانہؒ
مسلمانوں کا ہزار سالہ اقتدار	*****	پروفیسر ارشد جاوید
رسول اکرم کی سیاسی زندگی	*****	ڈاکٹر حمید اللہؒ
قرآن اور جدید سائنس	*****	ڈاکٹر حشمت جاہؒ
رسول عربی اور عصر جدید	*****	سیّد محمد اسماعیلؒ
علم کی اسلامی تشکیل	*****	خورشید احمد ندیم
میزان	*****	جاوید احمد غامدی
شرح الشفا	*****	ملا علی قاریؒ
تاریخ الخمیس	*****	دیار بکریؒ
الایمان	*****	ابن مندہؒ

السنن	*****	ابن ماجہ ؒ
ترکۃ النبی ﷺ	*****	ابو اسماعیل بغدادی ؒ
الرسول ﷺ	*****	عبد الحلیم محمود ؒ
روح المعانی	*****	علامہ محمود شکری آلوسی ؒ
قیامت اور جدید سائنس	*****	ڈاکٹر حشمت جاہ ؒ
الدیباج	*****	امام سیوطی ؒ
مکارم اخلاق	*****	ابن ابی الدنیا ؒ
السنن الکبریٰ	*****	امام بیہقی ؒ
الخصائص الکبریٰ	*****	امام سیوطی ؒ
المسند	*****	امام احمد بن حنبل ؒ

الطبقات	*****	ابن خیاطؒ
الجامع الصحیح	*****	امام ترمذی
السنن	*****	ابوداؤدؒ
شرح معنی الآثار	*****	امام طحاویؒ
مجمع الزوائد	*****	ہیثمیؒ
فیض القدیر	*****	منادیؒ
الترغیب والترہیب	*****	منذریؒ
مشکل الآثار	*****	امام طحاویؒ
اسلامی ریاست	*****	پروفیسر خورشید احمدؒ
کیمیائے سعادت	*****	امام غزالیؒ

البیان فی التفسیر القران ***** ابن جریر طبریؒ

مشکوٰۃ المصابیح ***** الخطیبؒ

الجوامع السیاسیہ ***** امام ابن تیمیہؒ

بیان العلم و فضلی ***** ابن عبدالبرؒ

تاریخ السلامی السیاسی ***** حسن ابراہیم الدکتورؒ

النظم الاسلامیہ ***** حسن ابراہیم الدکتورؒ

کتاب الخراج ***** الامام ابو یوسفؒ

تحفۃ الاشراف ***** المزیؒ

حسن المحاضرۃ ***** امام سیوطیؒ

مقائس اللغۃ ***** ابن فارسؒ

اعلام الموقین	*****	ابن قیمؒ
سنن الدارمی	*****	الدارمیؒ
الزھد	*****	امام احمد بن حنبلؒ
تفسیر ابن کثیر	*****	از ابن کثیرؒ
تاریخ الکامل	*****	ابن اثیرؒ
فتوح البلدان	*****	امام بلازریؒ
المذاہب الاربعہ	*****	عبدالرحمانؒ
کتاب النوبیہ	*****	ابن ہشامؒ
عیون الاخبار	*****	ابن قتیبہؒ
شذرات الذہب	*****	ابن عمادؒ

الشفاء	*****	قاضی عیاضؒ
غریب الحدیث	*****	امام ابن اثیرؒ
وفاالوفا	*****	امام سمہودیؒ
کتاب الاصنام	*****	ابن قتیبہ
لسان العرب	*****	ابن منظورؒ
الرسول القائد	*****	خطاب محمود شیثؒ
البدر الطالع	*****	امام شوکانیؒ
الاداب	*****	امام بیہقیؒ
دلائل النبوۃ	*****	ابن ندیمؒ
الشمائل	*****	امام ترمذیؒ

المنار	*****	رضا رشیدؒ
علم الراویہ	*****	خطیب بغدادیؒ
السنۃ قبل التدوین	*****	خطیب العجاجؒ
الکشاف	*****	زمخشریؒ
مسند الفردوس	*****	دیلمیؒ
معجم الکبیر	*****	طبرانیؒ
تفسیر در منشور	*****	امام جلال الدین سیوطیؒ
المبسوط	*****	شمس الائمہؒ
المراسیل	*****	سجستانیؒ
غریب الحدیث	*****	خطابیؒ

صحیح ابن حبان	*****	از ابن حبانؒ
عمل الیوم ولیلۃ	*****	للنسائیؒ
تاریخ الادب الجاہلی	*****	شوقی ضیف الدکتورؒ
مفتاح الجنۃ	*****	امام سیوطیؒ
علوم الحدیث	*****	صبحی صالحیؒ
شرح معانی الاثار	*****	امام الطحاویؒ
تاریخ الادب الاسلامی	*****	شوقی ضیف الدکتورؒ
شرح مسلم	*****	شبیر احمد عثمانیؒ
فلسفہ التشریح فی الاسلم	*****	صبحی صالحیؒ
الاحدیث المھشرہ	*****	شمس الدین سخاویؒ

حدیث دفاع ***** میجر جنرل اکبر خانؒ

اسلامی طریق جنگ ***** میجر جنرل اکبر خانؒ

الفیض القدیر ***** المناویؒ

الکامل فی الضعفاء ***** ابن عدیؒ

محاسن التاویل ***** قاسمی جمال الدینؒ

مسلمانوں کا نظم مملکت ***** حسن ابراہیمؒ

سود ***** سیّد مودودیؒ

حیات محمدؐ ***** محمد حسنین ہیکلؒ

الوثائق الساسیہ ***** ڈاکٹر حمید اللہؒ

تجدید احیائے دین ***** سیّد مودودیؒ

الاحکام القرآن ***** محمد بن احمد قرطبیؒ

مسلم نشاۃ ثانیہ ***** ڈاکٹر محمد امین

مسلمان اور سائنس کی تحقیق ***** حبیب احمد صدیقیؒ

نامور مسلمان سائنس دان ***** حمید عسکریؒ

نظام الحکومت نبویہ ***** شیخ عبدالحیؒ

الاسلام والحضارۃ العربیہ ***** کرد علیؒ

سائنس وطب میں مسلمانوں کا عروج ***** حفیظ الرحمٰن صدیقیؒ

فیض الباری ***** محمد انور شاہؒ

سو مسلم سائنس دان ***** رفیق انجمؒ

شاندار سائنسی کارنامے ***** زکریا ورقؒ

تخریج الحدیث	*****	مولانا محمد سعیدؒ
سنت کا تشریحی مقام	*****	محمد ادریس میرٹھیؒ
احادیث الموضوعہ	*****	ملا علی قاریؒ
ترجمان القرآن	*****	مولانا ابوالکلام آزادؒ
رسول عربیؐ	*****	مولانا ابوالکلام آزادؒ
رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی	*****	ڈاکٹر حمید اللہؒ
منصب امامت	*****	شاہ اسماعیل شہیدؒ
یورپ پر اسلام کے احسانات	*****	غلام جیلانی برقؒ
حسنت جمیع خصالہ	*****	طالب ہاشمیؒ
دعوت دین اور اس طریق کار	*****	امین احسن اصلاحیؒ

فی ظلال القرآن	*****	سیّد قطب شہید ؒ
احسن التفاسیر	*****	احمد حسن دہلوی ؒ
قصص الانبیاء	*****	محمد حفظ الرحمٰن ؒ
مدارج النبوہ	*****	معین فراحی ؒ
سیرت الرسول	*****	محمد بن عبدالواہاب ؒ
الرحیق المختوم	*****	صفی الرحمان مبارک پوری ؒ
محمد عربیؐ	*****	محمد احمد برانق ؒ
اسلامی ریاست	*****	امین احسن اصلاحی ؒ
ترجمان السنۃ	*****	بدر عالم میرٹھی ؒ
اسلام کا معاشرتی نظام	*****	خالد علوی ؒ

اسلام کا سیاسی نظام ***** محمد اسحٰق سندیلوی ؒ

تفہیمات ***** سیّد مودودیؒ

سیرت نبویؐ ***** ڈاکٹر مصطفیٰ صباحیؒ

پیغمبر انسانیت ***** شاہ محمد جعفر پھلواریؒ

سیرت رسول عربی ***** علامہ نور بخش توکلیؒ

خطبات مدارس ***** سید سلیمان ندویؒ

عہد نبوی نظام حکمرانی ***** ڈاکٹر حمید اللہؒ

سیرۃ المصطفیٰؐ ***** محمد ادریس کاندھلویؒ

تاجدار دو عالمؐ ***** عزائم عبد الرحمانؒ

اسلام کا اقتصادی نظام ***** حفظ الرحمٰنؒ

محمد رسول اللہؐ ***** شیخ محمد رضا مصریؒ

محمد رسول اللہ ﷺ ***** توفیق الحکمؒ

پیغمبر انقلاب ***** مولانا وحید الدین خانؒ

عبقریت محمدؐ ***** عباس محمود العقادؒ

نبی اکرمؐ کی معاشی زندگی ***** ڈاکٹر نور محمد غفاریؒ

خاندان نبوت ***** محمد ادریسؒ

معرکہ اسلام اور جاہلیت ***** صدر الدین اصلاحیؒ

مغازی رسولؐ ***** حضرت عروہ بن زبیرؓ

تاریخ مکہ ***** منظور احمد شاہؒ

منصب نبوت ***** سیّد ابوالحسن ندویؒ

شمائل کبری ***** عبدالحکیم خانؒ

سیرۃ اکبریٰ ***** مولانا ابوالقاسمؒ

راہِ عمل ***** مولانا جلیل احسنؒ

زادِراہ ***** مولانا جلیل احسنؒ

وفودِ عرب ***** طالب ہاشمیؒ

سیرت سیّدہ فاطمہؓ ***** طالب ہاشمی

معارف القرآن ***** مفتی محمد شفیعؒ

ترجمہ قرآن ***** سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

البستان ***** واثق باللہ

کتاب السماء ولغات ***** امام نووی

محمد رسول اللہؐ ***** محمد صادق ابراہیمؒ

رسول مبینؐ ***** محمد احسان الحق سلیمانیؒ

سیرت محمدیؐ ***** سرسید احمد خانؒ

سیرت سرور کونینؒ ***** سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

WESTERN AUTHORS.

Dalbeer...Mater ,Eather,Motion.

J.G.Freezer... Man God and Immortalilty.

S. Hussan Naser... Islamic Science.

J.Heksely... Religion Without Revolation.

Philps Hitty... History of Arabs.

Springler...Fall of west.

Carbin... EN Iranien Islam.

Sir jamees jeen...Modren Islimic Thought.

Johan Wellosan...Philosophy of Reilgion.

R.I.Gulick..Muhammad The educator.

Cob..Islamic Contribution to word culture.

Briffault...The making of Humanity.

Bosworth... The Lagacy of Islam.

S, Charles Darwen...Origion of Species.

Mont Watt...History of Islamic Spain.

B.Russal...The Conquest of Happiness

Michael H Hart... The 100

M,White...The limitaaions of Sciens

Ameer Ali... The Spirit of Islam.

Edendton...The age of analysis.

James jeans...The Mysterious Univers.

Hanes Berg...Modren scientefec thought.

W Back...Modern Science & natur Life.

Zohansicy...Gentic and origen of Species.

Karal Marx...Das Kapital.

Lebon...The Erab Civilazation.

Genetic Code .... Issaac Asimov.

Trawleing...History of Religion.

B, Russiall History of civiliazation.

Freud... Toam and Tabuos.

Freud....Pleasure thinking.

Robert Semith....Religion of Erabs.

well deurant...The age of faith.

Walteare...The History of China.

Freud...His Dream & Sex Theories.

Pierre Lecomde... Human Destiny.

Pro, Brian..New Horizons in Psychology.

P.Nik... Fondamentals of Politics.

Glance at Historical Materialism.ASpirken.

Pro, Hageel... Wonder Of Life

Dr. Hehoom... Human Understanding.

Fraied.... Totam and Taboos

Fried.....Pleasure Thinking

Robert Smith...Religion of the semites.

RussallBurtrand ...The Conquest of Happiness.

JOHAN WILLSON ...Philosophy and Religion

Tyndall...Matter and Motion.

MORTEN WHITE....The Limitations of Science.

ARUTHOR ENDEKTAN...The age of Analysis

Sir Jameus Jeens...Modren Scitefic Thought.

Dob Zohans..Genetic and The origin of species.

Raney Grew...Civilization of the east.

Sir Leonard Woolley...Abraham.

Freazer...The Golden Bough.

Edward Mc Nall.... Westren Civilization.

Breufalt.... The Making of Humanity.

Dr, Dedat ... The Ultimate Miracle.

A. Curte...Discover Behind The iron Curtain.

Dr,Harwey Day...The Hidden Power of vibration.

Russal...History of Westren Philosophy.

Jon Stevens... Secred Calligraphy of east.

Dr,simith... Divin Origin.

B Russal...History of Arebs.

Dr,Zafar, Towards understandin Qurran.

DR, mir Aneesudin... The Holly Quran.

Dr M Taqi... The Noble Quran.

Asimov... Exploring the earth and cosmos.

S,Hawhing...A Brief History of Time.

Al,Gore ... Erth in Balance.

J.Sylvester... The Gene Age.

R.Hill.... Physical Methalogy.

David Burine... Micro Life.

STephen Jay Gold... The Panda Thumb.

Rachel Carson... Silent Spring.

Mir,Steween... Geodetic Survey.

J.Parker ... Erth Sciences.

Aavagardo.... Water Realities.

Lyantan Keith...Between Two Words.

Allan Baratan...Recovery and Recycil.

Oliver Owen... Natural Conservations.

A.J.Longly....Environment of Technology.

Richard Wedford....Envionmetel Management

Robert Raymond...Out of Fiery.

P.R.Trevidi....Energy Resources.

Dr.Shafi Hader... Four Tools for a Musilm.

Dr.Shafi Hader... Scince in Quraan.

M.A.Qazi.... Quranic Concept.

A.Ryabchikov....Changing Face of earth.

Dr.Shafi Hader... Deep Thinking.

S.Manzoor...Scientific Significance in Quraan.

Dr.Shafi Hader...Quraan and Miracle Life.

Dr.Shafi Hader...Quraan and Fate of Cosmos.

Muhammad Shihabuddin nadvi... Cloning.

Syed Mubarak... Quranic Phlosephy.

Ellisow Hawks...Mysteries Of Science.

E.L.Abel... Moon Madnes.

Abdul Mobin Khan... Basic Immunology.

Dr.Shafi Hader...Creation Of Life.

Dr.Shafi Hader...Creation Of Universe.

Barnaby Rogerson... The Prophet Muhammad

Ingird Mattson.... The Study of Qurran.

Dr, Mohammad Rana... History of Islam.

Adrinne Jansen... Asian Face Of Islam.

Thomos C,... Years of Innovation.

Erich.V, ... Miracles Of God.

I.A. Ibrahim... Understanding Islam.

Dr,Kazmi ...Guinness Concept.

Dr.Shafi Hader..Quraan and Quality Concepts

Judit Bower...Enviromental Systems.

Syed Mubarak...Quranic Therapy.

Shah Manzoor... Quranic Verses.

B.Person...History of Prophet Mohammad.